هٰذا بلٰغٌ للناس

تفسیر البلاغ

جلد: اوّل

مولانا محمد رفیق حفظہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ قرآنیات، لاہور

هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ (ابراہیم 52:14)

"یہ (اللہ کی طرف سے) ایک پیغام ہے، تمام لوگوں کے لیے"

تفسیر البلاغ

مولانا محمد رفیق مدظلہ العالی

جلد اوّل

سورۃ الفاتحہ اور سورۃ البقرہ

مکتبہ قرآنیات، لاہور

نام کتاب : تفسیر البلاغ (جلد اوّل)

مترجم ومفسّر : پروفیسر مولانا محمد رفیق

ناشر : مکتبہ قرآنیات، یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ،
اُردو بازار لاہور۔ پاکستان
فون: 5811297، موبائل: 0321-7724032
0333-4399812

طابع : روشن پریس، لاہور

اہتمام : حافظ تقی الدین

سن اشاعت : اپریل 2013ء

مکتبہ قرآنیات۔ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اُصولِ ترجمہ وتفسیر

قرآن مجید کے ترجمہ وتفسیر کی ضرورت ہر دور میں رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نہایت قیمتی اور قابل قدر کام کیا ہے۔

صحیح فہم قرآن کے لیے چند مسلمہ بنیادی اصول ہیں جن کا علم ضروری ہے اور ہم نے اس کتاب میں ان اصولوں کو پوری طرح ملحوظ رکھا ہے۔

1۔ قرآن کو سمجھنے سے قبل آدمی اپنے دل و دماغ کو اُن تصورات اور تعصّبات سے بالکل خالی کر دے، جو اس نے پہلے سے قائم کر رکھے ہیں، ورنہ وہ قرآنی عبارات میں اپنے ہی خیالات پڑھتا رہ جائے گا، اور اسے اِس کتابِ ہدایت سے کوئی رہنمائی میسر نہ آ سکے گی۔

2۔ فہم قرآن کے لیے عربیت یعنی عربی زبان کا پورا لحاظ رکھا جائے۔ قرآنی الفاظ ومحاورات کے وہی معنی مراد لیے جائیں جو نزولِ قرآن کے وقت لیے جاتے تھے کیونکہ قرآن اپنے دور کے عربوں کی فصیح و بلیغ زبان میں اترا ہے۔

مشہور ماہر لُغت ابو زکریا الفرّاء کا قول ہے کہ:

((اِنَّ لُغَةَ الْقُرْآنِ اَفْصَحُ اَسَالِيْبِ الْعَرَبِيَّةِ عَلَى الْاِطْلَاقِ))

”بے شک قرآن کی زبان نہایت اعلیٰ فصیح عربی اسلوب میں ہے۔“

لیکن اس حوالے سے ایک مشکل یہ ہے کہ دنیا کی دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان بھی وقت کے ساتھ ساتھ بہت حد تک تبدیل ہو چکی ہے۔ یہاں تک کہ اب اس کے بیشتر الفاظ ان معنوں میں استعمال ہی نہیں ہوتے جن معنوں میں وہ قرآن مجید میں آئے ہیں، جیسے قوم، فرقہ، فقہ، فاسق، فطور، تاویل، تفصیل، دلیل، وسیلہ، لبن اور سیارہ وغیرہ۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں کے بعض اردو تراجم میں دانستہ یا غیر دانستہ قرآنی الفاظ کے وہ معنی لیے گئے ہیں جو اردو زبان میں مستعمل ہیں، جبکہ عربیت کی رو سے وہ معنی مراد لینا ہرگز درست نہیں۔ مثال کے طور پر ”وسیلہ“ کا لفظ ہے جو قدیم عربی اور قرآن و حدیث کی زبان میں ”قرب“ کے معنوں میں آتا ہے مگر اسے ”ذریعے“ اور ”واسطے“ کے معنوں میں لے کر شرک و گمراہی کا دروازہ کھول دیا گیا۔ حد یہ ہے کہ ایک مشہور مترجم و مفسر نے قرآن کے الفاظ ﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ﴾ (حٰمٓ السجدہ 41:50) کا ترجمہ ”انہیں ہم بڑے گندے عذاب کا مزا چکھائیں گے۔“ کر دیا ہے جو کہ عربیت کے سراسر خلاف ہے۔

اس تفصیل سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ صحیح فہمِ قرآن کے لیے عربیت کا لحاظ رکھنا بنیادی شرط ہے۔ اُس عربی زبان کا ذوق اور اس میں ملکہ و مہارت ضروری ہے، جس میں قرآن عظیم نازل ہوا ہے۔ اس کے لیے "ادب جاہلی" کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ اس کے علاوہ ابتدائی اسلامی دور کے علمی و ادبی سرمائے سے مدد لینی چاہیے اور قدیم مستند عربی لغات سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔

لیکن اس ضمن میں یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ قرآن مجید کے وہ الفاظ جو دینی اصطلاحات (TERMS) کے طور پر آئے ہیں اُن کے لغوی یا کوئی اور خود ساختہ اصطلاحی معنی مراد نہیں لیے جا سکتے۔ ان کا صرف وہی مفہوم لیا جائے گا جو صاحبِ وحی، معلمِ قرآن، شارع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے متعین فرما دیا ہے، جیسے حج، عمرہ، اقامت صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم، ہجرت اور جہاد فی سبیل اللہ وغیرہ۔

3۔ قرآن کی تفسیر خود قرآن سے کی جائے گی۔ اس مسلمہ قاعدے کو اپنایا جائے گا کہ ((اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا)) "کہ قرآن کا ایک حصہ اس کے دوسرے حصے کی تفسیر کر دیتا ہے۔"

مثال کے طور پر سورۃ البقرہ میں ہے کہ:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۝﴾ (البقرہ 2:34)

"اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کے آگے جھک جاؤ تو وہ جھک گئے، مگر ابلیس نہ جھکا۔ اس نے انکار کیا اور تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔"

اس مقام پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید ابلیس فرشتوں میں سے کوئی فرشتہ تھا لیکن سورۃ الکہف (18) میں وضاحت ہے کہ وہ جنوں میں سے ایک جن تھا، کوئی فرشتہ نہ تھا:

﴿وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ (الکہف 50:18)

"اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدمؑ کے آگے جھک جاؤ، تو وہ سب جھک گئے، مگر ابلیس نہ جھکا۔ وہ جنوں میں سے تھا۔ اُس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔"

اس طرح قرآن نے اپنی ایک مجمل بات کو دوسری جگہ وضاحت سے بیان کر دیا ہے اور یہ قرآن حکیم کا خاص اسلوب ہے۔

4۔ قرآن کی تفسیر حدیث و سنت کے مطابق کی جائے گی۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا یہ فرضِ منصبی تھا کہ تلاوتِ آیات کے علاوہ آپ ﷺ قرآن کی تعلیم بھی دیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ

﴿وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۖ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَٰلٍ مُّبِينٍ ۝﴾
(آل عمران 164:3)

''بے شک اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ انہی میں سے اُن کے پاس ایک رسول بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں سناتا، اُن کو پاک کرتا اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، جب کہ اس کی بعثت سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔''

دوسرے مقام پر فرمایا گیا کہ نبی ﷺ کی بعثت کا ایک مقصد وحیٔ الٰہی کی 'تبیین' ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ حضور ﷺ قرآن مجید کا مدعا بیان کریں، اس کی مراد واضح کریں اور اس کی تشریح فرمائیں:

﴿وَأَنزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ ۝﴾ (النحل 44:16)

''اور ہم نے آپ ﷺ کی طرف ذکر یعنی قرآن نازل کیا تاکہ آپ ﷺ اس چیز کو لوگوں پر واضح کر دیں جو ان کی طرف اتاری گئی، اور تاکہ وہ غور وفکر کریں۔''

یہی وجہ ہے کہ جب قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی کہ:

﴿الَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يَلْبِسُوا إِيمَانَهُم بِظُلْمٍ أُولَٰئِكَ لَهُمُ الْأَمْنُ وَهُم مُّهْتَدُونَ ۝﴾ (الانعام 82:6)

''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا، صرف ان کے لیے امن و سلامتی ہے اور وہی ہدایت پر ہیں۔''

تو صحابہ کرام گھبرا گئے کہ ہم میں سے کون ہے جس سے کبھی ظلم سرزد نہ ہوا ہو، تو کیا ہم کو امن و ہدایت اور جنت نصیب نہ ہوگی؟ تو اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں پڑھی کہ:

﴿إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ ۝﴾ (لقمان 13:31)

''بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔''

اس آیت میں بھی ظلم سے مراد شرک ہے۔ اس کے بعد صحابہ کرام کو اطمینان حاصل ہو گیا۔ (صحیح بخاری، رقم: 32)

اس طرح نبی ﷺ نے قرآن کے مدعا کی وضاحت فرما دی۔

5۔ صحابہ کرام کے مستند اقوال کی روشنی میں قرآن کی تفسیر کی جائے گی۔ صحابہ کرام کے تفسیری اقوال کو اس لیے ترجیح حاصل ہے کہ وہ خود صاحبِ وحی رسول اللہ ﷺ سے قرآن سنتے تھے، اپنی نمازوں میں اسے دُہراتے تھے۔ کچھ پوچھنا ہوتا تو حضور ﷺ سے براہِ راست پوچھ لیتے تھے۔ انہوں نے خود نبی ﷺ سے قرآن سیکھا اور سمجھا تھا۔ اُن میں بعض صحابہ کرام ایسے تھے جو فہم قرآن کے ماہرین شمار ہوتے تھے۔ اُن کی اِس خوبی کی تصدیق وتصویب (CONFIRMATION) خود حضور ﷺ نے فرمائی تھی۔ جیسے حضرت عبد اللہ بن مسعود اور عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما۔ یہ محض عقیدت کی بات نہیں ہے بلکہ بالکل فطری حقیقت ہے کہ جن لوگوں نے کتاب کا مطلب خود

صاحبِ کتاب سے سمجھا ہو، اُن کے فہم کو بعد والوں کے فہم پر ترجیح ہونی چاہیے۔

افسوس بعد کے لوگوں نے صحابہ کرام کے بارے میں یہاں تک کہہ دیا کہ:

''سلف ایمان میں قوی ہیں مگر علم میں خلف کا طریقہ قوی ہے۔''

حالاں کہ صحابہ کرام کے بارے میں خود عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ:

((من كان منكم متأسيا فليتأسّ بأصحاب محمدﷺ، فإنّهم كانوا أبرّ هذه الأمة قلوبًا، وأعمقها علمًا، وأقلّها تكلّفا، وأقوم هديًا، وأحسنها حالًا، قوماً اختارهم الله لصحبة نبيه...... ﷺ واقامة دينه، فاعرفوا لهم فضلهم، واتبعوهم في آثارهم، فإنّهم كانوا على الهدى المستقيم))

(جامع بيان العلم وفضلهٗ، لابن عبد البر: 198/2)

''جس شخص نے کسی کی پیروی کرنی ہو تو وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے صحابہ کی پیروی کرے، کیونکہ پوری امت میں اُن کے دل سب سے زیادہ نیک تھے۔ ان کا علم سب سے زیادہ گہرا تھا۔ وہ بہت کم تکلف کرتے تھے اور نیکی کرنے میں سب سے بڑھ کر تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی ﷺ کی صحبت کے لیے اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے چن لیا تھا۔ لہٰذا اُن کے مقام و مرتبے کو پہچانو اور اُن کے نقش قدم پر چلو، کیونکہ وہ سیدھی راہ پر تھے۔''

صحابہ کرام کے اکثر تفسیری اقوال تفسیر طبری، تفسیر المحر رالوجیز لابن عطیہ، تفسیر قرطبی اور تفسیر ابن کثیر جیسی کتب تفسیر میں مل جاتے ہیں۔

لیکن ان اقوال میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی آیت کی تفسیر میں بظاہر اختلاف پایا جاتا ہے لیکن اصل میں وہ ایک ہی قول ہوتا ہے، جسے مختلف انداز میں بیان کیا ہوتا ہے۔

یہی بات حافظ ابن کثیر نے اپنی مشہور تفسیر کے دیباچے میں لکھی ہے کہ:

((فتذكر اقوالهم في الآية فيقع في عبارتهم تباين في الألفاظ، يحسبها من لا علم عنده اختلافاً فيحكيها اقوالاً، وليس كذلك، فان منهم من يعبر عن الشئی بلازمه أو بنظيره، ومنهم من ينص على الشئی بعينه، والكل بمعنى واحد في أكثر اماكن، فليتفطن اللبيب لذلك))

''اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کسی آیت کی تفسیر میں جب ان (صحابہ کرام) کے اقوال بیان کیے جاتے ہیں، اور ان کے الفاظ میں بظاہر اختلاف نظر آتا ہے تو ناواقف شخص یہ سمجھتا ہے کہ اس بارے میں کئی مختلف اقوال ہیں، حالاں کہ حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ بلکہ کسی نے ایک چیز کی تعبیر میں اس کے لازمی یا

مرادی معنی لیے ہوتے ہیں، کسی نے اس کی نظیر یا مثال پیش کی ہوتی ہے اور کسی نے اصل چیز ہی کو بیان کیا ہوتا ہے۔ مگر سب کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں۔ لہٰذا عقل مند آدمی کو اس بارے میں دھیان کرنا چاہیے۔''

6۔ قرآن کی تفسیر اجماعِ امت کے مطابق کی جائے گی۔ کسی قرآنی لفظ یا آیت کی ایسی کوئی تفسیر نہیں کی جا سکتی جو اجماعِ قطعی کے خلاف ہو۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ جن امور پر امت متفق ہے ان کی پیروی میں ہدایت ہے اور ان کی خلاف ورزی میں گمراہی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ مَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا ۝﴾ (النساء 115:4)

''جو شخص رسول کی مخالفت کرے اور مسلمانوں کا راستہ چھوڑ کر کسی اور راستے پر چلے، جب کہ اس پر صحیح راستہ واضح ہو چکا تھا تو اسے ہم اسی طرف پھیر دیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔''

اس آیت میں مسلمانوں کے راستے یا طریقے کو صحیح قرار دیا گیا ہے اور اس کے خلاف چلنے پر دوزخ کی وعید ہے۔ اب جس چیز پر مسلمان متفق ہو جائیں گے، وہی ان کا راستہ اور طریقہ ہے اور یہی اجماع امت ہے، جس کی خلاف ورزی گمراہی بھی ہے اور دوزخ میں جانے کا سبب بھی۔

ابن ماجہ کی ایک حدیث ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اُمَّتِيْ لَا تَجْتَمِعُ عَلٰى ضَلَالَةٍ)) (ابن ماجه، رقم: 3950)

''بے شک میری امت گمراہی پر کبھی متفق نہ ہوگی۔''

اس حوالے سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا یہ قول ہے کہ:

((مَا رَاٰهُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنًا))

''جس بات کو سب مسلمان اچھا سمجھیں، وہ اللہ کے ہاں بھی اچھی ہے۔''

اس تفصیل سے واضح ہو جاتا ہے کہ اجماعِ امت کا راستہ ہدایت کا راستہ ہے اور اس کی خلاف ورزی کرنا گمراہی ہے۔ لہٰذا کسی اجماعِ قطعی کے خلاف جو تفسیر کی جائے گی، وہ ہدایت کی بات نہ ہوگی بلکہ گمراہی کی چیز ہوگی جس سے بچنا ضروری ہے۔

7۔ قرآن مجید کی سورتوں اور آیتوں کی تفسیر اُن کے شانِ نزول کے لحاظ سے کی جائے گی۔

فہم قرآن کے لیے شانِ نزول کی بڑی اہمیت ہے۔ شانِ نزول (یا سببِ نزول) سے مراد وہ خاص پس منظر

(BACK GROUND) اور مخصوص حالات و واقعات ہیں، جن میں قرآن کی بعض سورتوں اور آیتوں کا نزول ہوا ہے۔ اس طرح کے قرآنی مقامات کو ان کا شانِ نزول جانے بغیر نہ تو صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے اور نہ ان کی درست تفسیر ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور سورۂ البقرہ میں ہے کہ:

﴿اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ۝﴾ (البقرہ 2:158)

"بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس لیے جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان دونوں (پہاڑیوں) کے درمیان سعی (کے چکر) لگا لے اور جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے تو اللہ قدر دان اور سب کچھ جاننے والا ہے۔"

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ حج اور عمرے میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا ضروری نہیں ہے۔ کوئی شخص سعی کرے یا نہ کرے، اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے، بلکہ ہر عمرے یا حج میں سعی کرنا واجب اور ضروری ہے۔

اس آیت کا پس منظر یہ ہے کہ جاہلیت کے دور میں مشرکین نے ان دونوں مقامات پر دو بت...... اُساف اور نائلہ...... رکھے ہوئے تھے۔ ان بتوں کی موجودگی میں مسلمانوں کو سعی کرنے میں تامل (HESITATION) ہوا تو فرمایا گیا کہ ان بتوں کی موجودگی میں بھی سعی کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ پھر جب نبی ﷺ نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی فرمائی تو اب یہ سعی واجب اور ضروری ٹھہری۔ (صحیح بخاری، رقم: 4495)

یاد رہے کہ شانِ نزول کے بارے میں مفسرین اور علمائے اصول کا ایک متفقہ قاعدہ یہ ہے کہ:

((اَلْعِبْرَةُ بِعُمُوْمِ اللَّفْظِ لَا بِخُصُوْصِ السَّبَبِ))

مطلب یہ ہے کہ قرآنی الفاظ کے عام ہونے کا اعتبار کیا جائے گا، اور اسے کسی موقع کی وجہ سے خاص نہیں سمجھا جائے گا۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں کہا جا سکتا ہے کہ جن آیات کا کوئی خاص شانِ نزول ہوتا ہے، ان کے حکم کو صرف اسی موقع کے لیے مخصوص یا محدود نہیں سمجھا جائے گا، بلکہ اس حکم کو عام قرار دیا جائے گا۔ یہ نہیں کہا جائے گا کہ چونکہ فلاں آیت فلاں شخص کے بارے میں نازل ہوئی ہے، اس لیے اس کے بارے میں جو حکم آیا ہے وہ بھی اسی شخص کے ساتھ خاص ہے، بلکہ وہ حکم عام ہوسکتا ہے اور سب کے لیے ہوسکتا ہے۔

مثال کے طور پر سورۂ المجادلہ میں ظہار کے بارے میں جو آیتیں نازل ہوئی ہیں، وہ اگرچہ دو مخصوص میاں بیوی کے حق میں نازل ہوئی ہیں، لیکن ظہار کا حکم عام ہے۔ صرف انہی میاں بیوی کے لیے مخصوص یا محدود نہیں ہے، بلکہ اس کا اطلاق (APPLICATION) دوسرے لوگوں پر بھی ہوگا۔

البتہ شانِ نزول کے حوالے سے ایک مشکل پیش آتی ہے اور وہ یہ ہے کہ تفسیر کی کتابوں میں بعض اوقات ایک ہی

سورت یا آیت کے کئی مختلف شان نزول لکھے ہوتے ہیں، جب کہ حقیقت میں اس کا ایک ہی شان نزول ہوتا ہے۔ لیکن صحابہ کرام اور تابعین جب یہ دیکھتے تھے کہ فلاں آیت یا سورت کے حکم کا اطلاق (APPLICATION) اس جیسے کسی اور واقعے پر بھی ہوتا ہے تو وہ اس دوسرے واقعے کو بھی اسی آیت کا شان نزول قرار دیتے تھے۔ اس طرح ایک ہی آیت یا سورت کے بعض اوقات کئی کئی شان نزول ہو جاتے تھے۔

اس بارے میں امام بدرالدین زرکشی رحمہ اللہ اپنی کتاب "البرهان فی علوم القرآن" میں لکھتے ہیں کہ:

((وقد عرف من عادة الصحابة والتابعين أنَّ أحدهم اذا قال: نزلت هذه الآية فی كذا، فإنّه يريد بذلك أن هذه الآية تتضمّن هذا الحكم، لا أنّ هذا كان السبب فی نزولها))

(البرهان فی علوم القرآن، ج 1، ص: 31,32)

''صحابہ وتابعین کی یہ عام عادت ہے کہ جب وہ کہتے ہیں کہ فلاں آیت فلاں کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو اس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ وہ آیت اس حکم پر مشتمل ہے۔ یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ بات واقعی اس آیت کے نزول کا سبب ہے۔''

بہر حال تفسیری کتب میں موجود کئی مختلف شان نزول والی آیتوں یا سورتوں کا اصل شان نزول معلوم کرنا خاصا دشوار کام ہوتا ہے اور اس میں ایک مفسر کے لیے بڑا امتحان ہوتا ہے کہ وہ غور وفکر اور تحقیق کر کے اصل شان نزول معلوم کرے۔ اس سلسلے میں ان کتابوں کا مطالعہ بہت مفید ہے جو خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہیں، جیسے امام واحدی کی "اسباب النزول" وغیرہ۔

8۔ فہم قرآن کے لیے اس کی ناسخ ومنسوخ آیات کی پہچان ضروری ہے۔

نسخ کے اصل معنی تو کسی چیز کو ہٹانے، دور کرنا یا زائل کرنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے۔

((رفعُ الحكمِ الشرعی بدليل شرعيٍ متاخّر)) (مناهل العرفان، 127:2)

''کسی بعد کی شرعی دلیل کے ذریعے پہلے کے شرعی حکم کا اٹھ جانا یا باقی نہ رہنا۔''

گویا پہلے سے موجود کسی شرعی حکم کی جگہ کوئی نیا شرعی حکم آجانے کو نسخ کہتے ہیں۔ پھر پہلا شرعی حکم ''منسوخ'' اور اس کی جگہ لینے والا نیا حکم اس کا ''ناسخ'' کہلاتا ہے۔ اس کے بعد منسوخ حکم پر عمل نہیں ہوگا۔ بلکہ اس کے ناسخ حکم پر عمل کیا جائے گا اور اسی کے مطابق فتویٰ بھی دیا جائے گا۔

یاد رہے کہ نسخ میں قرآن کی کسی آیت کا صرف حکم منسوخ ہوتا ہے مگر آیت بدستور قرآن کا حصہ رہتی ہے اور اس کی تلاوت بھی کی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى﴾ (النساء، 43:4)

''اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ.....''

یہ پہلا حکم تھا کہ شراب پی کر نماز کی طرف آنا ممنوع اور حرام ہے۔ اس کے سوا دوسرے اوقات میں شراب نوشی منع نہ تھی۔ مگر پھر سورۃ المائدہ میں یہ حکم آ گیا کہ:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَيْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (المائدہ 5:90)

''اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے آستانے اور تیروں سے فال لینا، یہ سب گندے کام ہیں شیطان کے، لہٰذا ان سے بچو تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

اس آیت کے حکم کے نتیجے میں شراب نوشی مستقل طور پر ہمیشہ کے لیے ممنوع اور حرام قرار دی گئی۔ گویا پہلے شراب پی کر نماز کے قریب جانا منع اور حرام تھا۔ اب شراب نوشی ہمیشہ کے لیے ممنوع اور حرام ٹھہری۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں گے کہ پہلے حکم میں نمازوں کے سوا دوسرے اوقات میں شراب پی لینے کی جو اجازت تھی وہ اس دوسرے حکم سے منسوخ ہو گئی۔

تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے؟

ایک حدیث میں تفسیر بالرائے کی مذمت کی گئی ہے۔ لیکن تفسیر بالرائے میں لفظ 'رائے' کا مطلب سمجھنے میں بعض لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس لیے ہم اس پر تفصیل سے گفتگو کریں گے۔

جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((...... وَمَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِرَأْيِهٖ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ)) (ترمذی، رقم: 2951)

''......اور جس نے قرآن کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ کہا تو وہ اپنا ٹھکانہ دوزخ میں بنا لے۔''

امام ترمذی رحمہ اللہ نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔

لیکن اس حدیث سے پہلے امام ترمذی نے یہ حدیث بھی نقل کی ہے کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ قَالَ فِي الْقُرْاٰنِ بِغَيْرِ عِلْمٍ فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ)) (ترمذی، رقم: 2950)

''جس نے علم کے بغیر قرآن کے بارے میں کوئی بات کہی، وہ اپنا ٹھکانا دوزخ میں بنا لے۔''

امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن صحیح کہا ہے۔

اس دوسری زیادہ مضبوط حدیث نے پہلی حدیث کے لفظ ((بِرَأْيِهٖ)) ''اپنی رائے سے'' کا مطلب واضح کر دیا ہے کہ اس سے مراد ((بِغَيْرِ عِلْمٍ)) ''علم کے بغیر'' ہے۔ گویا تفسیر بالرائے ایسی تفسیر کو کہا جائے گا جو علم کے بغیر کی جائے۔

خود امام ترمذی رحمہ اللہ نے ((بِرَأْيِهٖ)) والی حدیث کی وضاحت میں لکھا ہے کہ: ''اس سے مراد علم کے بغیر اپنے جی سے قرآن کی تفسیر کرنا ہے جو کہ قابل مذمت ہے۔ رہا علم کی رو سے تفسیر کرنا، تو یہ بالکل درست اور جائز ہے، کیونکہ اس

طرح کی تفسیر مشہور تابعین مجاہد رحمہ اللہ، قتادہ رحمہ اللہ اور دوسرے اہل علم نے کی ہے اور ان لوگوں کے بارے میں یہ بدگمانی نہیں ہوسکتی کہ خدانخواستہ وہ لوگ علم کے بغیر محض اپنے جی سے قرآن مجید کی تفسیر کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں 'رائے' کا لفظ اپنے لغوی معنوں میں نہیں ہے بلکہ ایک اصطلاح کے طور پر آیا ہے، جس کا مطلب ہے: ''علم کے بغیر قرآن کی من مانی تفسیر کرنا'' گویا ایسی تفسیر کرنا جس میں کوئی شخص یہ نہ دیکھے کہ قرآن کیا کہتا ہے، بلکہ یہ دیکھے کہ اس کی اپنی خواہش یا پہلے سے قائم کی ہوئی کوئی رائے کیا چاہتی ہے اور کس طرح قرآن کو کھینچ تان کر اس کے مطابق کر لیا جائے۔ گویا یہ حالت ہو کہ:

خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں

اس سے واضح ہوا کہ تفسیر بالرائے کا یہ مطلب لینا صحیح نہیں ہے کہ قرآن مجید کو سمجھنے کے لیے عقل و بصیرت سے کام نہ لیا جائے۔ اگر یہی مطلب ہوتا تو پھر قرآن کا سمجھنا سمجھانا ہی فضول اور بے کار ہوتا۔ حالاں کہ خود قرآن ہمیں بار بار غور و فکر کرنے اور عقل و بصیرت سے کام لینے کی دعوت و ترغیب دیتا ہے۔

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد 47:24)

''کیا پھر یہ لوگ قرآن پر تدبر نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔''

حقیقت یہ ہے کہ صحابہ و تابعین اپنے علم اور اپنی عقل و بصیرت سے کام لے کر قرآن کی تفسیر بھی کرتے تھے اور اس سے مختلف احکام و مسائل نکالنے کے لیے اجتہاد بھی کرتے تھے۔

بعد کے مفسرین کرام نے تفسیر بالرائے کی دو قسمیں قرار دیں:

ایک تفسیر بالرائے محمود اور دوسری تفسیر بالرائے مذموم۔

تفسیر بالرائے محمود یہ ہے کہ قرآن کو سمجھنے میں عقل و بصیرت اور اجتہاد و استنباط سے بھی کام لیا جائے اور یہی پسندیدہ طریقہ ہے۔ اگرچہ ایسی صورت میں تفسیری اختلاف بھی پیدا ہوسکتا ہے جو ایک فطری امر ہے اور بالکل جائز ہے کیونکہ اس سے شریعت میں تنوع (Variety) اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔

تفسیر بالرائے مذموم یہ ہے کہ یہ نہ دیکھا جائے کہ قرآن کا منشا کیا ہے اور وہ کیا کہنا چاہتا ہے، بلکہ صرف یہ دیکھا جائے کہ ہماری اپنی خواہش یا پہلے سے کوئی ٹھہرائی ہوئی بات کیا چاہتی ہے اور قرآن کی عبارت اور اس کے مضمون کو کسی طرح کھینچ تان کر اپنی خواہش یا اپنے پہلے سے قائم نظریے کے مطابق کر لیا جائے۔ یہ طریقہ مذموم، ناپسندیدہ اور حرام ہے۔ ایسی تفسیر کرنے والے کے لیے دوزخ کی وعید آئی ہے۔

تفسیر بالرائے مذموم کی بعض صورتیں:

تفسیر بالرائے مذموم کی کئی صورتیں ہوسکتی ہیں، مثلاً:

1۔ اپنی خواہش یا اپنے کسی خاص نظریے یا مخصوص فکر کو لے کر اس کے مطابق قرآن کی تفسیر کرنا۔ اس میں یہ نہ دیکھا

جائے کہ خود قرآن کیا کہتا ہے بلکہ قرآن کی معنوی تحریف کر کے اسے اپنی خواہش، اپنے نظریے اور مخصوص فکر کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ یہ ایک من مانی تفسیر ہے جو کبھی عربیت کے خلاف کی جاتی ہے اور کبھی قرآن کی بات کو اس کے اصل سیاق وسباق (CONTEXT) سے ہٹا کر کی جاتی ہے۔

2۔ فرقہ پرستی کے تعصب سے تفسیر کرنا تاکہ قرآن کو اپنے مخصوص فرقے کے عقائد ونظریات کے مطابق ڈھال لیا جائے۔ اس طرح کی تفسیر کے نمونے فرقہ پرستوں کی تفسیروں میں عام مل جاتے ہیں۔

3۔ قادیانیوں نے جو کہ غیر مسلم ہیں، اپنے غیر اسلامی عقائد و اعمال کو قرآن کے مطابق ثابت کرنے کے لیے تفسیر بالرائے مذموم کا ارتکاب کیا ہے۔

4۔ بعض صوفیا نے اپنے گمراہانہ تصوّرات ونظریات (جیسے وحدت الوجود وغیرہ) اور بعض باطنی احوال و واردات پر مبنی قرآن کی اشاری تفسیر کی ہے جو کہ تفسیر بالرائے مذموم کے ضمن میں آتی ہے۔

5۔ دور جدید کے بعض مفسرین جب سائنسی حقائق کی بجائے سائنسی نظریات (THEORIES) کے مطابق تفسیر کرتے ہیں تو وہ بھی تفسیر بالرائے مذموم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جیسے ڈارون (DARWIN) کے نظریۂ ارتقا (EVOLUTION THEORY) کو قرآنی تعلیمات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرنا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی نظریات وقت کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور کبھی غلط ثابت ہوتے ہیں، اس لیے ان کے مطابق تفسیر کرنے سے قرآن مجید کی حقانیت اور صداقت پر حرف آ سکتا ہے۔ البتہ وہ سائنسی اور طبعی حقائق جو تجربے (EXPERIMENT) اور مشاہدے (OBSERVATION) سے ثابت ہیں، ان کے مطابق تفسیر کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ جیسے زمین کا گول ہونا وغیرہ۔

6۔ کسی خاص مسلک و مذہب کے تعصب میں مبتلا ہو کر اس کی بے جا حمایت وطرف داری کے لیے کی گئی تفسیر بھی تفسیر بالرائے مذموم ہے۔

7۔ یہودیوں کے وہ بے سروپا قصے اور ان کی مذہبی داستانوں کی خرافات جسے اصطلاح میں 'اسرائیلیات' کہا جاتا ہے، کے مطابق تفسیر کرنا بھی تفسیر بالرائے مذموم ہے۔

8۔ مغربی تہذیب سے مرعوب ہو کر اس کے سانچے میں قرآنی تعلیمات کو ڈھالنا بھی تفسیر بالرائے مذموم ہے۔ اس طرح کی تفسیر کے نمونے سرسید مرحوم اور جناب غلام احمد پرویز جیسے لوگوں کی کتب تفسیر میں موجود ہیں۔

9۔ زمانۂ حال میں 'فراہی مکتب فکر' کے نام سے ایک نیا گمراہ فرقہ وجود میں آیا ہے، جو دراصل مغربی تہذیب سے مرعوب و مسحور ہے۔ ان لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ بھی اہل سنت میں سے ہیں مگر ان کے عقائد ونظریات اہل سنت کے بالکل خلاف ہیں کیونکہ وہ:

...... قرآن مجید کی صرف ایک ہی قراءت کو صحیح مانتے ہیں اور اس کی دوسری تمام قراءتوں کے منکر ہیں۔

...... مرتد کے لیے سزائے قتل کو نہیں مانتے۔

...... شادی شدہ زانی کے لیے رجم یعنی سنگ ساری کی حد کا انکار کرتے ہیں۔

...... صرف اللہ تعالیٰ اور آخرت پر ایمان لانے کو نجات کے لیے کافی سمجھتے ہیں۔

...... ان کے نزدیک سنت وہ نہیں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے قول و فعل اور تقریر و تصویب پر مشتمل ہے بلکہ وہ اس کا تعلق سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے جوڑتے ہیں۔ پھر اس کے ثبوت کے لیے اجماع اور تواتر کی شرط لگاتے ہیں۔

...... ان کی رائے میں کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا۔ (حالاں کہ ایسا سمجھنا قرآن کے نصوص کو جھٹلانا ہے)

...... اجماع قطعی کے حجت ہونے کے قائل نہیں ہیں۔

اس کے علاوہ اور کئی قسم کے گمراہانہ تصورات رکھتے ہیں۔

ہم اس گروہ کے جملہ گمراہ کن عقائد و نظریات پر مفصل تنقید اپنی مطبوعہ کتاب ''فتنۂ غامدیت کا علمی محاسبہ'' میں کر چکے ہیں۔

پھر جہاں تک قرآن فہمی کا تعلق ہے، یہ لوگ قرآن مجید کو بھی انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کی طرح ایک کتاب سمجھتے ہوئے پہلے اس کی تمہید اور مقدمہ تجویز کرتے ہیں، پھر قرآن کو اپنے کچھ خاص عنوانات دے کر اسے سات ابواب یا گروپس (GROUPS) میں تقسیم کرتے ہیں اور آخر میں کچھ سورتوں سے اس کا اختتامیہ ظاہر کرتے ہیں۔ تمام سورتوں کو جوڑا جوڑا (IN PAIRS) مانتے ہیں۔ سورۂ النصر کو مکی سورت قرار دیتے ہیں اور اپنی اس اختراع کو 'فلسفۂ نظم قرآن' کا نام دیتے ہوئے دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے ایجاد کردہ ''نظم'' کے اس فلسفے کو سمجھے بغیر کوئی شخص قرآن کو سمجھ نہیں سکتا۔

حالاں کہ بات سیدھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب میں انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں جیسے وضعی و منطقی ترتیب اور مضامین کا ربط ڈھونڈنا ایسا ہی فضول کام ہے جیسے کوئی شخص کسی قدرتی چمن کو دیکھ کر اس میں مصنوعی باغ کی سی روشیں اور قطاریں تلاش کرے۔ یا کرۂ زمین کے مختلف پہاڑی سلسلوں اور ان کی چوٹیوں میں ربط و نظم کی جستجو کرے۔

یہ انسانی نفسیات ہے کہ کوئی شخص ایک ہی موضوع پر مسلسل سوچ بچار نہیں کر سکتا۔ اُس کا ذہن ایک دائرے سے دوسرے دائرے اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اسی فطری مناسبت سے قرآن مجید کے مضامین میں بھی تنوع پایا جاتا ہے۔

قدیم اہل عرب کے شعراء کے قصیدوں میں اور ان کے خطباء کے خطبوں میں بھی کتابی اور منطقی ترتیب نہیں ہوتی تھی، بلکہ ان کے مضامین میں بھی تنوع اور رنگا رنگی ہوتی تھی اور قرآن مجید انہی کے اسلوب میں نازل ہوا ہے۔ جس میں بعض مقامات پر مضامین میں کچھ مناسبت تو ہوتی ہے مگر فلسفۂ نظم نہیں ہوتا۔

اس امت کے محققین علماء کبھی ''نظم قرآن'' کے نظریے کے قائل نہیں رہے۔ اس لیے فراہی مکتب فکر کے حاملین کی تفسیری کتب بھی تفسیر ~~بالرائے~~ مذموم کے ذیل میں آتی ہیں۔

تیرہویں صدی ہجری کے مجدد اور مجتہد، امام شوکانی رحمہ اللہ اپنی شہرہ آفاق تفسیر 'فتح القدیر' میں 'نظمِ قرآن' کے نظریے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

((إعلم أن كثيراً من المفسرين جاءوا بعلم متكلف، وخاضوا فى بحر لم يكلفوا سباحته، واستغرقوا اوقاتهم فى فنّ لا يعود عليهم بفائدة، بل أوقعوا انفسهم فى التكلم بمحض الرأى المنهى عنه فى الامور المتعلقة بكتاب الله سبحانهٗ، وذلك أنهم ارادوا أن يذكروا المناسبة بين الآيات القرآنية المسرودة على هذا الترتيب الموجود فى المصاحف، فجاءوا بتكلفات، وتعسفات يتبرء منها الانصاف، ويتنزه عنها كلام البلغاء فضلاً عن كلام الرب سبحانهٗ، حتى افردوا ذالك بالتصنيف، وجعلوه المقصد الأهمّ من التأليف، كما فعله البقاعى فى تفسيره......))

(فتح القدير للشوكانى، ص: 60,61۔ طبع 2001ء رياض)

''جاننا چاہیے کہ بعض مفسرین ایک ایسے علم کے پیچھے پڑ گئے جس میں تکلف ہی تکلف تھا۔ وہ ایک ایسے سمندر میں غوطے لگاتے رہے جس میں تیرنے کے وہ مکلّف ہی نہ تھے۔ انہوں نے ایک بے فائدہ فن میں اپنا وقت صرف کیا۔ وہ اللہ تعالیٰ کی کتاب کے معاملے میں تفسیر بالرائے مذموم کے مرتکب ہوئے۔ وہ ساری عمر موجودہ قرآنی ترتیب کی آیات میں باہمی ربط اور نظم ڈھونڈتے رہے۔ بالکل غیر منصفانہ انداز میں انہوں نے اللہ سبحانہٗ کے کلام کو اس قسم کے تصنع اور بے جا تکلفات کا حامل قرار دے دیا جن سے انسانی فصیح و بلیغ کلام بھی مبرا اور پاک ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اس حوالے سے انہوں نے کتابیں تصنیف کر لیں اور اس کام کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا۔ بقاعی نے اپنی تفسیر میں یہی کچھ کیا ہے......''

اس کے بعد امام شوکانی رحمہ اللہ مذکورہ بحث کو سمیٹتے ہوئے آخر میں لکھتے ہیں:

((...... ولنكتف بهذا التنبيه على هذه المفسدة التى تعثر فى ساحاتها كثير من المحققين، وإنما ذكرنا هذا البحث فى هذا الموطن، لأن الكلام هنا قد انتقل مع بنى إسرائيل بعد أن كان قبله مع أبى البشر آدم علیہ السلام، فاذا قال متكلف: كيف ناسب هذا ما قبله؟ قلنا: لا كيف:))

''اور ہم اس فتنے سے، جسے بعض محققین (RESEARCHERS) پھیلا رہے ہیں، لوگوں کو خبردار کرنا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے اس مقام پر جہاں ابو البشر آدم علیہ السلام کے واقعے کے بعد بنی اسرائیل کا واقعہ شروع ہوتا ہے، یہ بحث چھیڑی ہے تاکہ جب کوئی ''ربطی'' (یا ''نظمی'') یہ سوال اٹھائے کہ ان دونوں واقعات میں باہمی ربط و نظم کیا ہے؟ تو ہم اس کے جواب میں کہیں گے کہ: کوئی ربط و نظم نہیں ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ امام شوکانی رحمہ اللہ ''نظم قرآن' اور ربط آیات کے فلسفے کے سخت خلاف تھے اور وہ اسے ایک فتنہ اور مفسدہ سمجھتے تھے۔

امام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ بھی نظم قرآن کے قائل نہ تھے اور قرآن مجید کو ایک ''مرتب'' کتاب نہیں مانتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب الفوز الکبیر میں لکھتے ہیں کہ:

((حکمت دریں باب موافقت مبعوث الیھم است در لسان و اسلوب بیان۔ تا نزول قرآن درمیان عرب ھیچ کتابے نہ بود۔ نہ کتاب الٰھی نہ مؤلّف بشر۔ وترتیبے کہ حالا مصنفین اختراع نمودہ اند، عرب آن را نمی دانستند۔ اگر ایں را باور نمی داری قصائد شعرائے مخضرمین را تامل کن و رسائل آنحضرت ﷺ ومکاتیب عمر رضی اللہ عنہ را بر خواں۔ تا ایں معنی روشن شود۔ پس اگر خلاف طور ایشاں گفتہ شود بحیرت در مانند۔ وچیزے نا آشنا بگوش ایشاں مشوش سازد۔ ونیز مقصود نہ مجرد افادہ است بلکہ افادہ مع التکرار والاستحضار۔ وایں معنی در غیر مرتب اقویٰ و اتم است))

''(قرآن کے غیر مرتب ہونے میں) حکمت یہ ہے کہ ایسا اس کے مخاطبین کے لحاظ سے ہے۔ دراصل قرآن کے نزول کے وقت عربوں کے پاس کوئی کتاب نہ تھی۔ نہ الہامی اور نہ کسی انسان کی لکھی ہوئی۔ لہٰذا جو ترتیب آج کتابوں کے مصنفوں نے اختیار کی ہے اہل عرب اس سے بالکل ناواقف تھے۔ اگر ان شاعروں کا کلام دیکھا جائے جنہوں نے اسلام کا زمانہ پایا۔ یا اگر نبی ﷺ کے خطوط اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خطوط کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اگر قرآن کی ترتیب کے لیے کوئی ایسا انداز اختیار کیا جاتا، جس سے اہل عرب واقف نہ ہوتے تو وہ اس قرآن کو سن کر اجنبیت (STRANGENESS) محسوس کرتے۔ ان کا ذہن الجھ کر رہ جاتا، وہ صاف صاف باتیں بھی سمجھ نہ پاتے۔ لیکن قرآن کا مقصد ان کو صرف کوئی بات سمجھا دینا یا کسی واقعے کی خبر پہنچا دینا نہ تھا۔ بلکہ اس کا مقصود یہ تھا کہ تمام باتیں ان کے ذہن نشین کی جائیں۔ یہ مقصد صرف اسی صورت میں حاصل ہوسکتا تھا، جب ہر بات اچانک غیر متوقع طور پر سامنے آئے۔ سننے والا اسے سن کر چونک اٹھے۔ وہ اس پر پوری توجہ دے، تاکہ وہ بات اس کے دل و دماغ پر نقش ہو جائے۔''

کچھ اس کتاب کے بارے میں:

یہ تفسیر موجودہ دور میں قرآن حکیم کو صحیح طور پر سمجھنے سمجھانے کی ایک ادنیٰ کوشش ہے۔ اس کے مخاطبین میں جدید تعلیم یافتہ طبقہ اور دینی حلقہ دونوں شامل ہیں۔ اس کی زبان اور اندازِ بیان کو حتی الوسع مربوط اور آسان بنانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ قاری کو بات سمجھنے میں دشواری نہ ہو۔

میں اس بارے میں اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ موجودہ مذہبی گروہ بندی اور فرقہ پرستی کے انتہائی متعصب اور جنونی ماحول میں رہنے کے باوجود، میں نے ہر طرح کے گروہی اور مسلکی تعصّبات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے یہ کام کیا ہے۔ مجھے اپنی علمی کم مائیگی کا پورا احساس ہے لیکن تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میری شعوری عمر کا بڑا حصہ قرآن مجید کو سمجھنے سمجھانے اور اس کی نحوی و تفسیری مشکلات حل کرنے میں گزرا ہے۔ شہادۃ العالمیہ کے علاوہ میں نے جامعہ پنجاب سے عربی اور اسلامیات میں ماسٹرز کیا ہے۔ اس سے پہلے کئی دینی کتب کی تالیف کے علاوہ قرآن کریم کا اردو اور انگلش میں ترجمہ کر چکا ہوں۔ یہ دونوں تراجم مطبوعہ موجود ہیں۔ اردو اور عربی زبان کی درجنوں قدیم و جدید تفاسیر میرے زیر مطالعہ رہی ہیں، علوم قرآن سے متعلق کئی اُمہات کتب نظر سے گزر چکی ہیں اور میں نے اس کام میں ان سب سے استفادہ کیا ہے۔ اس کے بعد جیسا کچھ قرآن کو سمجھ سکا ہوں، اسے میں نے آیندہ صفحات میں پیش کر دیا ہے۔ اگرچہ قرآن فہمی کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کہ ؏

در رہِ عشق نشد کس بہ یقیں محرمِ راز
ہر کسے بر حسبِ فہم گمانے دارد

تفسیر البلاغ کی پہلی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس کام کو مکمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، ہماری خطاؤں سے درگزر کرے۔ جس مقصد کے لیے یہ کاوش کی گئی ہے، وہ پورا ہو۔ لوگ اِس سے مستفید ہوں اور یہ میرے لیے آخرت میں مغفرت کا ذریعہ بن جائے۔ آمین!

وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ، عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ

والسلام

محمد رفیق عفی عنہ

2 جنوری 2013ء مطابق 19 صفر...... 1434ھ

❀❀❀❀❀❀

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

''شروع اللہ کے نام سے، جو بڑی رحمت والا اور ہمیشہ رحمت کرنے والا ہے۔''

الفاظ کی تحقیق:

بِسْمِ :...... یہ 'ب' اور 'اسم' کا مرکب ہے۔ اسم کے معنی نام کے ہیں۔ اس کی جمع اَسْمَاءٌ آتی ہے۔

اَللّٰہُ :اس کے معنی ''خاص معبود'' کے ہیں، جو ساری کائنات کا خالق اور مالک ہے۔ اللہ اسم ذات ہے اور باقی تمام اسمائے حسنیٰ اس کے صفاتی نام ہیں۔ جیسے: رازق، قادر، رحیم وغیرہ۔ یاد رہے کہ کسی مخلوق کے لیے اللہ کا لفظ استعمال نہیں کیا جا سکتا۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ :...... یہ دونوں الفاظ ''رحم'' اور ''رَحْمَةٌ'' سے بنے ہیں جس کے معنی ہیں: نرمی اور رقت کا ایسا جذبہ جس سے کسی دوسرے کے لیے بھلائی اور شفقت کا ارادہ جوش میں آ جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ لفظ ''رحمة'' میں محبت، شفقت، مہربانی اور فضل واحسان کا جامع مفہوم پایا جاتا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ اور الرَّحِيْمِ کے معنی ایک دوسرے کے قریب قریب ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی دو الگ الگ صفات کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ دونوں اسمائے حسنیٰ میں سے ہیں اور اللہ سُبحانہٗ کی رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو واضح کرتے ہیں۔

رحمان فعلان کے وزن پر ہے اور اَلرَّحْمٰنُ کے معنی ہیں، وہ ذات جس میں رحمت ہی رحمت ہے، رحمت کا جوش وخروش ہے، رحمت کی فراوانی ہے، جس کے پاس رحمت کے بے پناہ خزانے ہیں، جس کی رحمت کا کوئی ٹھکانہ نہیں، وہ بے پایاں اور لامحدود ہے۔ یہ لفظ گویا اللہ تعالیٰ کی رحمت کی صفاتی حیثیت کو نمایاں کرتا ہے۔

رَحِيْمٌ فَعِيْلٌ کے وزن پر ہے۔ اس کے معنی اس ذات کے ہیں جو اپنی تمام مخلوقات پر ہمیشہ رحمت کرتی ہے اور کرتی رہے گی۔ اس کی رحمت میں ہمیشگی اور دوام ہے۔ اس کی رحمت کا فیضان کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ اس طرح اَلرَّحِيْمِ کا لفظ اللہ تعالیٰ کی فعلی حیثیت کو ظاہر کرتا ہے۔

جو لوگ الرَّحْمٰنِ کے بعد الرَّحِيْمِ کی صفت کو محض مبالغے، تاکید، یا برائے بیت کے معنوں میں لیتے ہیں، ان کی رائے عربیت کے خلاف ہے۔

اَلرَّحْمٰن کے ساتھ اَلرَّحِيْم کی صفت لا کر رحمت خداوندی کے جامع تصور کو اُجاگر کیا گیا ہے کہ اللہ وہ ہستی ہے، جس میں نہ صرف رحمت کا جوش اور خزانہ پایا جاتا ہے، بلکہ وہ ہر لمحہ اپنی یہ رحمت دوسروں پر کرتی رہتی ہے۔ اس طرح اَلرَّحْمٰن کے بعد اَلرَّحِيْم کی صفت نے گویا پہلی صفت کے لیے دلیل بھی مہیا کر دی کہ جو لوگ اَلرَّحْمٰن کی ان دیکھی صفت کا تصور ذہن میں لانا چاہیں، وہ اس کی صفت اَلرَّحِيْم کی کارفرمائی کا نظارہ کر لیں، جس کے آثار ومظاہر ان کے

چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ رحمان کا لفظ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔اس کے سوا کسی اور کے لیے اس کا استعمال درست نہیں ہے۔

نظاہر وشوائد (PRECEDENTS):

قرآن مجید میں درج ذیل مقامات پر بسم اللہ کا مضمون آیا ہے:

(1)....﴿اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَاِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝﴾ (النمل 30:27)

''بے شک یہ سلیمان کی طرف سے ہے اور یہ ہے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔''

(2)....﴿وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ۭ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (ھود 41:11)

''اور اس (نوح علیہ السلام) نے کہا: کشتی میں سوار ہو جاؤ، اللہ کے نام سے اس کا چلنا اور اللہ کے نام سے اس کا رکنا ہے۔ بے شک میرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔''

تسمیہ اور قرآن:

تسمیہ کے بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ یہ قرآن کا حصہ اور اس کا جزء ہے۔لیکن بعض اسے صرف سورۂ الفاتحہ کی ایک آیت مانتے ہیں۔بعض نے اسے ہر سورت کا جزء اور اس کی ایک ابتدائی آیت مانا ہے۔بعض کے نزدیک یہ سورۂ الفاتحہ سمیت کسی بھی سورت کی آیت نہیں ہے بلکہ صرف سورتوں کی ابتدا اور اختتام کو ظاہر کرنے اور ان کے درمیان فصل (الگ الگ کرنے) کے لیے آئی ہے۔

ہماری رائے میں ان تینوں میں سے آخری قول کو ترجیح حاصل ہے، جس کے حق میں صرف یہی دلیل کافی ہے کہ جس عبارت کے قرآن ہونے یا نہ ہونے کا اختلاف پایا جائے، اسے قرآن کا حصہ یا جزء تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قرآن کا متن اور اس کی ترتیب امت کے تواتر اور اجماعِ قطعی کے ذریعے یقینی ہے اور اس میں کسی اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں۔ اس کے علاوہ بعض صحیح احادیث میں بھی جہاں سورۂ الفاتحہ کا ذکر آیا ہے، وہاں بسم اللہ موجود نہیں ہے۔ (ملاحظہ ہو، صحیح بخاری، رقم 4474، صحیح مسلم، رقم: 878، 1457۔نسائی، رقم: 910، 914۔ ابوداؤد، رقم: 821)

تفسیر:

بسم اللہ کو تسمیہ اور بسملہ بھی کہا جاتا ہے۔اس کے آغاز میں ''میں شروع کرتا / کرتی ہوں'' کا مضمون محذوف ہے، جسے ترجمے میں کھول دینا چاہیے۔

قرآن کے نزول سے پہلے عرب مشرکین میں یہ رواج تھا کہ وہ اپنے کاموں کا آغاز بتوں کا نام لے کر کیا کرتے تھے تاکہ برکت حاصل ہو۔ جیسے بِاِسْمِ اللَّاتِ (لات کے نام سے) اور بِاِسْمِ الْعُزّٰى (عزیٰ کے نام سے) وغیرہ۔

بعض دوسری بت پرست قوموں میں بھی ایسا رواج موجود تھا، یہاں تک کہ بعض قومیں اپنے بادشاہوں (KING GODS) کا نام لے کر اپنے کام شروع کرتی تھیں، تاکہ اس طرح ان کی برکت اور خوشنودی حاصل کی جائے۔ قرآن میں ہے کہ جب مصر کے جادوگروں نے موسیٰ علیہ السلام سے مقابلہ شروع کیا تو پہلے فرعون کا نام اسی مقصد کے لیے لیا تھا۔

﴿فَأَلْقَوْا حِبَالَهُمْ وَعِصِيَّهُمْ وَقَالُوا بِعِزَّةِ فِرْعَوْنَ إِنَّا لَنَحْنُ الْغَالِبُونَ۝﴾

(الشعرا 26:44)

''پھر انہوں (جادوگروں) نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالیں اور کہا: عزت مآب فرعون کی قسم! ہم غالب رہیں گے۔''

پھر چونکہ قرآن مجید ہر قسم کے شرک کا مخالف ہے اور اسے ہر حال میں ختم کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے اس نے اس عالمگیر مشرکانہ رسم کے خاتمے کے لیے بسم اللہ کا طریقہ سکھایا تاکہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ پختہ کیا جائے کہ برکت صرف اللہ تعالیٰ سے حاصل کرنی چاہیے اور ہر کام میں صرف اسی کی رضا اور خوشنودی پیش نظر رکھنی چاہیے۔

ہر نیک اور اہم کام کا آغاز بسم اللہ سے کرنا انبیائے کرام کا طریقہ رہا ہے۔ جب نوح علیہ السلام کی قوم پر پانی کا عذاب آیا، تو حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے مومن ساتھیوں کو کشتی میں سوار کراتے وقت بسم اللہ پڑھی تھی۔ (ھود، 11:41)۔ سیدنا سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا (بلقیس) کو جو دعوتی خط بھیجا تھا، اس خط کی پیشانی پر بھی بسم اللہ لکھی تھی (النمل، 27:30)۔ جب حضرت محمد ﷺ پر وحی کا آغاز ہوا تو اس کی ابتدا میں بھی حضور ﷺ کو رب کا نام لے کر قرآن پڑھنے کا حکم دیا گیا۔ (العلق، 96: 1 تا 3)

یہ اسلامی شعائر میں سے ہے کہ ہر جائز، نیک، مشروع اور اہم کام کا آغاز بسم اللہ سے کیا جائے۔ اس سے ایک مسلمان کی پہچان ہوتی ہے اور کام میں برکت ہوتی ہے۔ ایسا کرنا نبیوں کی سنت بھی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے مختلف بادشاہوں اور حکمرانوں کو جو دعوتی و تبلیغی خطوط بھیجے، ان کے شروع میں بھی بسم اللہ لکھی گئی تھی۔

تسمیہ سے کام کے آغاز میں حکمتیں:

تسمیہ سے کام کا آغاز کرنے میں کئی حکمتیں ہیں، جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

1۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِىْ خَلَقَ۝﴾ (العلق 96:1)

''پڑھو، اپنے رب کے نام سے جس نے پیدا کیا۔''

گویا وحی الٰہی کا سب سے پہلا حکم اور سب سے پہلی تعلیم بسم اللہ ہے۔

2۔ بسم اللہ ایک دعا ہے جو اللہ تعالیٰ سے مانگی جاتی ہے، اور چونکہ ہر دعا عبادت ہے اس لیے بسم اللہ پڑھنے سے عبادت کا ثواب ملتا ہے۔

3۔ بسم اللہ سے کام کی ابتدا کر کے بندہ اپنی ذات کی نفی کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا اثبات کرتا ہے کہ وہ یہ کام اپنی خواہش نفس کو پورا کرنے کے لیے نہیں کر رہا، بلکہ اس کے پیش نظر اللہ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ بندہ صرف نیک کام ہی انجام دینے کی کوشش کرے گا، اور برے کاموں سے بچے گا۔

4۔ تسمیہ کے ذریعے مومن اپنے رب کے آگے اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اسے ہر نیک کام کرنے کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملتی ہے۔ خود بندے کا اپنا کوئی کمال نہیں ہے، بلکہ وہ تو اس کام کو سرانجام دینے کی طاقت ہی نہیں رکھتا، اس لیے وہ اپنے رب سے مدد مانگتا ہے۔

5۔ تسمیہ سے کام کی ابتدا کے نتیجے میں برکت بھی حاصل ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی غیبی مدد اور اس کا فضل و کرم بندے کے شامل حال ہو جاتا ہے۔

سنن ابن ماجہ میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((كُلُّ أَمْرٍ ذِيْ بَالٍ لَا يُبْدَءُ فِيْهِ بِالْحَمْدِ، أَقْطَعُ)) (ابن ماجه، رقم: 1894)

”ہر اہم کام جو اللہ کی حمد کے بغیر کیا جائے، وہ ناقص اور بے برکت ہے۔“

6۔ قرآن کی سورتوں کے شروع میں بسم اللہ آنے کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے یہ حقیقت ظاہر کی گئی کہ آگے آنے والے تمام احکامات اور تعلیمات صرف اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں، کسی اور کی طرف سے نہیں ہیں، نہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام ہے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے، اور اُسی کا کلام ہے۔ اس کی پیروی میں لوگوں کے لیے برکت و سعادت ہے اور اس میں ان کے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی اور کامیابی ہے۔

افسوس آج بہت سے مسلمان، جہاں دوسرے اسلامی شعائر سے غافل ہو چکے ہیں، وہاں وہ بسم اللہ پڑھ کر اور دائیں ہاتھ سے کام شروع کرنے کے اسلامی طریقے کو بھی بھولے ہوئے ہیں۔ اس طرح انہوں نے اپنے آپ کو ایک عظیم برکت و سعادت سے محروم کر رکھا ہے۔

❀❀❀❀❀❀

1 .... اَلْفَاتِحَةُ

سورت کا نام:

اس سورت کے کئی نام ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور نام الفاتحہ ہے، جو اصل میں فَاتِحَةُ الْكِتَابِ یعنی کتاب کا آغاز، قرآن کی ابتداء تھا۔ (صحیح بخاری، رقم: 756) پھر مختصر ہو کر 'الفاتحہ' رہ گیا۔

اس سورت کے اور نام بھی آئے ہیں، جو اس کی بعض خصوصیات کو ظاہر کرتے ہیں جیسے: الحمد، سورۃ الصلوٰۃ (نماز والی سورت)، سبع مثانی (نماز میں سات دہرائی جانے والی آیتیں)، اساس القرآن (قرآن کی بنیاد)، ام القرآن (قرآن کے مضامین کی جامع)، ام الکتاب (اللہ کی کتاب کی جامع)، سورۃ الدعاء اور سورۃ الشفا وغیرہ۔

زمانۂ نزول:

یہ سورت جس طرح قرآن کی ترتیب میں سب سے پہلی ہے، اسی طرح نزولی ترتیب کے لحاظ سے بھی یہ سب سے پہلی سورت ہے۔ اگرچہ بعض مفسرین نے اسے مدنی کہا ہے اور بعض اسے بیک وقت مکی اور مدنی مانتے ہیں، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ یہ مکی سورت ہے۔ اس کے مکی ہونے کی بالکل واضح اور قطعی دلیل خود قرآن میں موجود ہے۔ سورۂ الحجر جس کے مکی ہونے پر سب کا اتفاق ہے، اس میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنٰكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِيْ وَ الْقُرْاٰنَ الْعَظِيْمَ ۝﴾ (الحجر 15:87)

''اور ہم نے آپ کو سات (7) دہرائی جانے والی آیتیں عطا کی ہیں، جو قرآن عظیم (کا حصہ) ہیں۔''

پھر صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ ''سبع مثانی'' سے سورۂ الفاتحہ مراد ہے۔ (صحیح بخاری، رقم: 4474۔ صحیح مسلم، رقم: 1457) اور اسی پر اجماعِ امت ہے۔ لہٰذا سورۂ الحجر، جس کے مکی ہونے پر سب متفق ہیں، اس میں سورۂ الفاتحہ کا ذکر آ گیا تو پھر اس سورت کے مکی ہونے میں کوئی شبہ باقی نہ رہا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ سورت بالکل ابتدائی مکی دور میں نازل ہوئی۔ آثار و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلی نازل ہونے والی مکمل سورت یہی ہے۔ اس سے پہلے کچھ متفرق اور تمہیدی آیات نازل ہو چکی تھیں جو سورۂ العلق، سورۂ المزمل اور سورۂ المدثر میں شامل ہیں۔

اس کے علاوہ اس سورت کو سورۃ الصلوٰۃ (نماز والی سورت) بھی کہا گیا ہے اور واقعۂ معراج کے موقع پر پانچ نمازوں کے فرض ہونے سے بہت پہلے نماز فرض ہو چکی تھی، جس کا حکم ان ابتدائی سورتوں میں موجود ہے، جو واقعۂ معراج سے پہلے نازل ہوئی تھیں، جیسے سورۂ المزمل کی ابتدائی آیات اور سورۂ الکوثر کہ جس میں نماز کا حکم موجود ہے۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ابتدائی مکی دور میں نماز فرض ہونے سے پہلے پوری سورۂ الفاتحہ نازل کی گئی تھی، تا کہ اسے نمازوں میں پڑھا جا سکے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو الفاتحہ ہی ایسی سورت ہے جو سب سے پہلے مکمل طور پر نازل ہوئی۔

مرکزی مضمون:

اِس سورت کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان ہوئی ہے۔ پھر اُس کی چند صفات کا ذکر ہے۔ آگے ایک آیت میں توحید کا اقرار و اظہار کرتے ہوئے اللہ اور بندے کا باہمی تعلق ظاہر کیا گیا ہے۔ آخری آیتوں میں اللہ سبحانہٗ سے دعا کی گئی ہے کہ وہ ہماری رہنمائی فرمائے، تا کہ ہم اس کی بتائی ہوئی راہِ ہدایت......صراطِ مستقیم...... پر چل کر اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کر سکیں اور اس کے نتیجے میں دنیا اور آخرت میں کامیاب اور سر بلند ہوں۔

سورۂ الفاتحہ میں اسلام کے بنیادی عقائد......توحید، آخرت اور نبوت و رسالت کا مختصر اور اجمالی ذکر ہے، اس لیے یہ سورت پورے قرآن کی تعلیم کا خلاصہ ہے۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

❀❀❀❀❀❀

اٰيَاتُهَا ۔ 7 | 1 ...... سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ | رُكُوْعُهَا ۔ 1

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝٤ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝٥ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ۬ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝٧

’’شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان اور نہایت رحم والا ہے۔‘‘

’’تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا رب ہے۔ بڑا مہربان، نہایت رحم والا اور بدلے کے دن کا مالک ہے۔ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔ ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔ ان لوگوں کے راستے پر جن پر تو نے انعام فرمایا۔ نہ اُن کے جن پر تیرا غضب نازل ہوا اور نہ ان کے جو گمراہ ہوئے۔‘‘

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝٢ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٣﴾

اَلْحَمْدُ:...... عربی زبان میں حمد کے اصل معنی ’’ثناء جمیل‘‘ ہیں، جس کا مطلب ہے ’’کسی کی کوئی خوبی یا اچھائی بیان کرنا‘‘، اس کی تعریف کرنا۔ لیکن حمد کے معنی شکر کے بھی آتے ہیں۔ اگرچہ شکر خود عربی زبان ہی کا لفظ ہے۔

قرآن میں حمد کا لفظ دونوں معنوں میں آیا ہے۔ تعریف اور خوبی کے معنوں میں بھی اور شکر کے معنوں میں بھی۔ لیکن اس کے استعمال میں فرق ہوتا ہے۔ جس مقام پر یہ اللہ سبحانہٗ کی قدرت اور عظمت کو ظاہر کرتا ہے، وہاں حمد کے معنی تعریف اور خوبی کے ہوتے ہیں اور جہاں حمد کے بعد کسی نعمت کا ذکر آتا ہے، وہاں اس کے معنی شکر کے ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر سورۃ الانعام کے شروع میں حمد کا لفظ تعریف اور خوبی کے معنوں میں آیا ہے، کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کا اظہار ہے۔

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ﴾ (الانعام 1:6)

’’تعریف اُس اللہ کے لیے ہے، جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا فرمایا اور اندھیروں اور روشنی کو بنایا۔‘‘

اسی طرح ایک صحیح حدیث میں اسی آیت کے لفظ حمد کے معنی حَمِدَنِيْ عَبْدِيْ ’’میرے بندے نے میری تعریف کی۔‘‘ آئے ہیں، یہ نہیں آئے کہ شَكَرَنِيْ عَبْدِيْ ’’کہ میرے بندے نے میرا شکر کیا۔‘‘ (صحیح مسلم،

رقم: 878، نسائی، رقم: 910)

اسی طرح شکر کے معنوں میں حمد کا لفظ سورۂ ابراہیم میں آیا ہے، کیونکہ اس کے فوراً بعد ایک نعمت کا ذکر ہے:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ وَهَبَ لِیْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ﴾ (ابراهيم، 14:39)

''شکر ہے، اُس اللہ کا جس نے مجھے بڑھاپے کے باوجود اسماعیلؑ اور اسحاقؑ (دو بیٹے) عطا فرمائے۔''

یا جیسے ایک مسنون دعا میں ہے کہ:

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ)) (ابو داؤد، رقم: 3850)

''شکر ہے اللہ کا جس نے ہمیں کھلایا، پلایا اور مسلمانوں میں سے بنایا۔''

تو اِس دعا میں چونکہ نعمتوں کا ذکر ہے، اس لیے اس میں حمد کے معنی شکر کے لیے جائیں گے۔

لیکن سورۂ فاتحہ میں حمد کا لفظ تعریف اور خوبی کے معنوں میں آیا ہے، کیونکہ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا ذکر تو ہے مگر کسی نعمت کا ذکر یا قرینہ نہیں آیا ہے۔ لہٰذا اس جگہ حمد کے معنی شکر کے نہیں ہو سکتے۔

رَبّ:......عربی زبان میں ''ربّ'' کے معنی ہیں: پالنے والا، پرورش کرنے والا، مالک اور آقا۔

مخلوق کے لیے یہ ربوبیت اور پالنا جسمانی طور پر بھی ہے اور عقلی و روحانی طور پر بھی۔ اس میں کسی چیز کو پال کر، اس کی صحیح پرورش کر کے، اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا مفہوم بھی شامل ہے۔ یہ لفظ جہاں اکیلا آتا ہے، وہاں اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کی صفت کے طور پر آتا ہے، لیکن جہاں یہ اضافت کے ساتھ آئے، وہاں یہ غیر اللہ اور مخلوقات کے لیے بھی آجاتا ہے، اُس وقت اس کے معنی مالک اور آقا کے ہوتے ہیں، جیسے رَبُّ الدَّارِ (گھر کا مالک)۔

اَلْعَالَمِیْنَ: یہ اَلْعَالَمُ (عَالِمٌ) کی جمع سالم مذکر ہے، جس کے معنی ہیں، جہان، دنیا، مخلوقات، کائنات۔

اس کے علاوہ یہ لفظ ہر اس مخلوق کے لیے بھی آتا ہے، جو علم وشعور رکھتی ہے، جیسے انسان، جن اور فرشتے۔ کسی ایک زمانے کے لوگوں کے لیے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے پھر اس سے ہر وہ چیز بھی مراد ہوسکتی ہے جو اپنے خالق کا پتہ دیتی ہے، جیسا کہ شاعر نے کہا ہے:

وَ فِیْ كُلِّ شَیْءٍ لَهٗ اٰيَةٌ
تَدُلُّ عَلٰی اَنَّهٗ وَاحِدٌ

''اور ہر شے میں اللہ کی نشانی موجود ہے، جو اِس بات کا پتہ دیتی ہے، کہ وہ ذات ایک ہی ہے۔''

لہٰذا رَبُّ الْعَالَمِیْنَ کے معنی ہیں، وہ ذات جو سارے جہانوں کی بلکہ ہر شے کی پرورش کرنے والی اور اس کی مالک ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ:......ان الفاظ کی تحقیق بسم اللہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

مٰلِكِ:......اس کے معنی ذُوْ مِلْكٍ کے ہیں جس کا مطلب ہے: آقا، مالک، صاحب تصرف اور بااختیار۔

اس لفظ کی مشہور قرأت مٰلِكِ (مَالِكِ) ہے لیکن ایک اور متواتر قراءت میں اسے مَلِكِ بھی پڑھا جاتا ہے۔ تاہم دونوں کا مفہوم ایک ہی ہے۔

یَوْمِ :......عربی زبان میں اس لفظ کے معنی ہیں: دن، دن رات، مرحلہ (PERIOD) اور واقعہ (EVENT)۔ سورۃ الفاتحہ میں یَوْمِ سے مراد قیامت یا آخرت کا دن ہے۔ اس لفظ کی جمع آیَّامٌ آتی ہے۔

اَلدِّیْنِ:......''دِیْنٌ'' کا لفظ مصدر ہے اور قرآن میں یہ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔

1۔ بدلہ، حساب اور جزا و سزا کے معنوں میں، جیسے:

﴿یَوْمَئِذٍ یُّوَفِّیْهِمُ اللّٰهُ دِیْنَهُمُ الْحَقَّ﴾ (النور 24:25)

''اس دن اللہ ان کے کاموں کا انہیں پورا پورا بدلہ دے گا۔''

2۔ اطاعت اور فرماں برداری کے معنوں میں، جیسے:

﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّیْنُ الْخَالِصُ﴾ (الزمر 2:39)

''یاد رکھو، اللہ ہی کے لیے خالص اطاعت ہے۔''

3۔ قانون یا ملکی قانون (LAW OF THE LAND) کے معنوں میں، جیسے:

﴿کَذٰلِكَ کِدْنَا لِیُوْسُفَ ؕ مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاهُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِكِ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ (یوسف 76:12)

''اس طرح ہم نے یوسفؑ کے لیے تدبیر کی۔ (ورنہ) بادشاہ کے قانون کی رُو سے وہ اپنے بھائی کو نہیں لے سکتا تھا، مگر جو اللہ چاہے۔''

4۔ ضابطۂ حیات (CODE OF LIFE) یا نظامِ زندگی کے معنوں میں:

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران 19:3)

''بے شک اللہ کے نزدیک سچا دین صرف اسلام ہے۔''

سورۃ الفاتحہ میں اَلدِّیْنُ کا لفظ اپنے پہلے معنوں میں آیا ہے، یعنی بدلے اور جزا و سزا کے معنی میں۔

خلاصۂ مضمون:

سورۃ الفاتحہ کی ان ابتدائی آیتوں میں اللہ سبحانہٗ کی تعریف اور حمد و ثنا کا بیان ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کی چار صفات...... رب، رحمان، رحیم اور مالک کا ذکر آیا ہے، جو کہ اسمائے حسنٰی میں سے ہیں۔ اس کے علاوہ ان آیات میں توحید اور آخرت کے عقیدوں کا مضمون آ گیا ہے۔

4۔ آیات کی تفسیر:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ:......سورۃ الفاتحہ کی ابتدا اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور اس کی چند صفات سے ہوئی ہے۔ فطری طور پر جب

کوئی انسان حق کی تلاش میں (IN SEARCH OF TRUTH) نکلے گا تو اسے سب سے پہلے یہ حقیقت معلوم ہو گی کہ اس کو اور اس کے ارد گرد دنیا کی تمام چیزوں کو کسی خالق نے پیدا کیا ہے۔ پھر وہ غور کرے گا کہ جب تخلیق (CREATION) موجود ہے تو اس کا کوئی خالق (CREATOR) بھی موجود ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔

دنیا میں ہم کسی مخلوق کی جو تعریف کرتے اور خوبی بیان کرتے ہیں، تو وہ اصل میں خالق ہی کے لیے تعریف اور خوبی بیان کرتے ہیں، جس نے ہر مخلوق کو پیدا فرمایا ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کے الفاظ میں تمام تعریفیں، خوبیاں اور کمالات صرف ایک اللہ کی ذات میں جمع ہونے کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ وہ ذات جس کی حمد وثنا ہر وقت ہوتی ہے، صبح کو بھی اور شام کو بھی، جس کی تحمید ہر جگہ ہوتی ہے، آسمانوں پر بھی اور زمین پر بھی۔

رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ:...... یہ اللہ تعالیٰ کی پہلی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ رب العالمین ہے۔ سارے جہانوں کا پالنے والا اور ساری کائنات کا مالک ومختار ہے۔

بچے کی پرورش تو والدین بھی کرتے ہیں، مگر یہ ربوبیت نہیں ہے۔ ربوبیت کے معنی ہیں: ''کسی چیز کو جس وقت، جتنی اور جیسی کچھ ضرورت ہو، وہ اسے مہیا کر دینا تا کہ اس کی پرورش کی ہر طرح تکمیل ہو جائے۔'' اور یہ کام اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اور نہیں کر سکتا، اس لیے کوئی اور رب نہیں ہو سکتا۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ:...... اس کی تفسیر بسم اللہ کی تفسیر میں پہلے گزر چکی ہے۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ:...... یہ سورۃ الفاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی چوتھی اور آخری صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ بدلے کے دن کا مالک ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں آج ہر کام کا بدلہ نہیں مل رہا لیکن خالق کائنات نے لوگوں کے اچھے برے اعمال کا پورا پورا بدلہ دینے کے لیے آخرت کا دن مقرر کر رکھا ہے۔

اس دنیا میں بھی اگرچہ انسان کو اس کے بعض نیک اعمال کا کچھ بدلہ مل جاتا ہے جو عام طور پر صحت وتندرستی، امن وسلامتی، دل کے سکون واطمینان اور نیکی کی توفیق کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ اسی طرح بندے کو اس کی کسی برائی یا گناہ کی کچھ نہ کچھ سزا دنیا ہی میں مل جاتی ہے جو بعض اوقات بیماری، مصیبت، پریشانی اور بری صحبت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔

سورۃ الفاتحہ میں پہلے اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ کے الفاظ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت اور نرمی کو نمایاں کیا گیا اور پھر مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کہہ کر اللہ سبحانہٗ نے اپنے عدل وانصاف اور قانون کی سختی کو ظاہر فرمایا ہے۔ ترغیب وترہیب کا یہ قرآنی اسلوب ہے جس کی مثالیں قرآن مجید میں جا بجا ملتی ہیں، جیسے ارشاد ہوا کہ:

﴿نَبِّئْ عِبَادِيْۤ اَنِّيْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَ اَنَّ عَذَابِيْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِيْمُ ۝﴾

(الحجر 50,49:15)

''میرے بندوں کو آگاہ کر دیجیے کہ میں بخشنے والا مہربان ہوں، مگر میرا عذاب بڑا دردناک عذاب ہے۔''

اس کے علاوہ ثواب کے ساتھ عذاب کا اور جنت کے ساتھ دوزخ کے ذکر کا قرآنی اسلوب بھی عام ہے۔

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾

''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔''

الفاظ کی تحقیق:

نَعْبُدُ:...... یہ عِبَادَةٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ''خشوع وخضوع سے جھکنا''۔

گویا دل میں کسی کی عظمت اور بڑائی تسلیم کرتے ہوئے امید یا خوف سے اس کے آگے اس خیال سے جھکنا کہ اس کے پاس کوئی ایسی غیبی طاقت ہے، جو انسانی عقل میں نہیں آ سکتی۔ عبادت کی روح یہی ہے۔ اردو زبان میں عبادت کو بندگی، پرستش اور پوجا پاٹ کے الفاظ سے ادا کیا جاتا ہے۔

نَسْتَعِيْنُ:...... یہ اِسْتِعَانَةٌ سے ہے جس کا مطلب ہے ''کسی سے ایسے کام میں مدد مانگنا جسے ظاہری اسباب و وسائل کے ذریعے پورا کرنا ممکن نہ ہو۔'' گویا کسی غیبی اور روحانی طاقت سے مدد طلب کرنا ''استعانت'' ہے۔

آیت کی تفسیر:

اس آیت میں اللہ اور بندے کے باہمی تعلق کو واضح کیا گیا ہے۔ یہ تعلق خالق اور مخلوق کا ہے۔ معبود اور عابد کا ہے اور مُسْتَعَانُ ''جس سے مدد مانگی جائے۔'' اور مُسْتَعِيْنُ ''مدد مانگنے والا'' کا ہے۔

بندے کا کام ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کرنا ہے۔ قرآن نے جنوں اور انسانوں کے پیدا کیے جانے کا مقصد یہ بتایا ہے کہ وہ ایک اللہ کی عبادت کریں:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاریات 56:51)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

اسلام میں عبادت صرف اللہ کا حق ہے اور اس کے سوا کسی اور کی عبادت جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ﴾ (بنی اسرائیل 23:17)

''اور تیرے رب نے فیصلہ فرما دیا کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔''

پھر اِيَّاكَ کو نَعْبُدُ کے بعد لانے کی بجائے پہلے لایا گیا، تاکہ یہ حقیقت ظاہر ہو کہ اصل عبادت وہ ہے جو صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور دوسری ہر عبادت جو غیر اللہ کے لیے ہو، یا اللہ کی عبادت کے ساتھ ملا کر ہو۔ وہ محض شرک اور گمراہی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے عبادت کی ہر شکل مثلاً سجدہ، دعا، توکل، استغفار، نذر اور قربانی وغیرہ کو صرف اللہ تعالیٰ

کے ساتھ مخصوص کر دیا کیونکہ توحید کا یہی تقاضا تھا۔

سورۃ الفاتحہ اکیلا شخص بھی پڑھتا ہے اور اسے باجماعت نماز میں بھی پڑھا جاتا ہے۔ نَعْبُدُ میں جمع کا صیغہ لانے میں یہ نکتہ ہے، کہ بندہ یہ نہ سمجھے کہ اس دنیا میں صرف وہی اللہ کی عبادت کرتا ہے کیونکہ ایسا سمجھنا اس میں غرور اور تکبر پیدا ہونے کا باعث بن سکتا تھا جو کہ ناپسندیدہ چیز ہے۔ اس جگہ جمع کے صیغے نے انسان کے دل میں عاجزی اور انکساری کا جذبہ پیدا کر دیا ہے کہ اکیلا وہ نہیں بلکہ بے شمار لوگ ہیں جو اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔

مزید فرمایا: وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ''کہ ہم صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔'' اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غنی اور بے نیاز ہے اور سب لوگ اس کے محتاج اور اس کے در کے سوالی ہیں:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ﴾ (الفاطر 15:35)

''اے لوگو! تم اللہ کے محتاج ہو اور اللہ بے نیاز اور تعریف کے لائق ہے۔''

پھر اِيَّاكَ کے ذریعے جتنی تاکید اس کی ہوئی کہ عبادت صرف اللہ کے لیے ہے اور اسی کا حق ہے، بالکل اتنی ہی تاکید اس بات پر ہوئی کہ استعانت یعنی مدد مانگنا بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ غیر اللہ سے مدد مانگنی جائز نہیں ہے اور اس غیر اللہ میں اللہ تعالیٰ کی ہر مخلوق شامل ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ استعانت بھی ایک طرح کی عبادت ہے اور کوئی عبادت جائز نہیں ہوسکتی جو کسی مخلوق کے لیے کی جائے۔

پھر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ لفظ استعانت سے مراد وہ مدد نہیں ہے جو اسباب و وسائل کے ذریعے ہم ایک دوسرے کے لیے کرتے ہیں۔ ظاہری اسباب کے ذریعے ایسی مدد کرنا توحید کے خلاف نہیں ہے اور یہ جائز ہے۔

مثال کے طور پر کوئی شخص کسی سے پانی مانگ کر پی لے، یا کوئی مریض کسی ڈاکٹر یا طبیب سے علاج کرانے میں مدد لے تو ایسی مدد دینا اور مدد کرنا دونوں جائز ہیں، کیونکہ ان میں مادی اسباب و وسائل کا عمل دخل ہے اور یہ درست ہے اور نیکی کا کام بھی ہے۔

لیکن اگر اللہ کے سوا کسی مخلوق سے اس تصور کے ساتھ مدد مانگی جائے کہ وہ کوئی اَن دیکھی قوت و طاقت رکھتی ہے اور بغیر مادی وسائل و اسباب کے غیبی اور روحانی طور پر ہماری مدد کر سکتی ہے تو یہ استعانت (مدد مانگنا) ہے اور یہ شرک اور حرام ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے سوا کسی اور سے دعا نہیں کی جاسکتی۔ اس کے سوا کوئی حاجت روا اور مشکل کشا نہیں ہے۔ اس کے سوا کوئی مرادیں پوری کرنے والا نہیں۔ اس کے سوا کوئی اولاد دینے والا نہیں اور اس کے سوا کوئی بگڑی بنانے والا نہیں۔

افسوس! آج بہت سے مسلمان اپنی نمازوں میں سورۃ الفاتحہ کی یہ آیت بھی پڑھتے ہیں اور غیر اللہ کی پوجا بھی کرتے ہیں، اسے اپنا مشکل کشا سمجھتے ہیں اور اس سے استعانت طلب کرتے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے ایمان کو شرک سے آلودہ کر

دیتے ہیں۔ قرآن نے ایسے ہی لوگوں کے بارے میں کہا ہے کہ:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُشْرِكُوْنَ﴾ (یوسف 106:12)

''اور ان میں سے اکثر اللہ کو بھی مانتے ہیں اور شرک بھی کرتے ہیں۔''

اگر غلط تاویلوں سے غیر اللہ سے استعانت کو جائز قرار دے لیا جائے تو پھر غیر اللہ کی عبادت بھی جائز مانی جائے گی جو کہ شرک اور حرام ہے، کیونکہ قرآن نے استعانت اور عبادت دونوں کو ایک ہی انداز میں صرف اللہ ہی کے ساتھ مخصوص کر کے بیان کیا ہے۔

لیکن سورۃ الفاتحہ کی اس آیت نے ہر قسم کے شرک کا قلع قمع کر دیا ہے اور خالص توحید کو اجاگر کر دیا ہے کہ بندہ صرف ایک اللہ کی عبادت کرے۔ ہر معاملے میں صرف اسی پر بھروسا رکھے، اسی کو اپنا کارساز سمجھے اور مشکل میں صرف اسی کو پکارے، کیونکہ وہی ایک ذاتِ مستعان ہے جس سے مدد مانگنی چاہیے۔

﴿وَرَبُّنَا الرَّحْمٰنُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ﴾ (الانبیاء 112:21)

''اور ہمارا رب رحمان اور مستعان ہے، تمہاری غلط باتوں کے مقابلے میں ہم اسی سے مدد مانگتے ہیں۔''

وہ خود ہی کہہ رہا ہے کہ مانگو مدد مگر
اِيَّاكَ شرط یاد رہے نَسْتَعِيْنُ کی

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اِهْدِنَا: (تو ہمیں ہدایت دے)۔ یہ هِدَايَةٌ (ہدایت) سے ہے، جس کے معنی ہیں راستہ دکھانا، راہ پر چلانا اور منزل تک پہنچانا۔ گویا ہدایت وہ کامل رہنمائی ہے، جس میں مادی اور روحانی ہر قسم کی رہنمائی شامل ہے۔

اَلصِّرَاطَ: اس کے معنی راستے کے ہیں۔

اَلْمُسْتَقِيْمَ: ...... یہ اِسْتِقَامٌ سے اسم فاعل ہے۔ اس کے معنی ہیں: ''سیدھا''۔ صراطِ مستقیم کا مطلب ہے ''سیدھا راستہ۔''

اَنْعَمْتَ: ...... یہ اِنْعَامٌ سے ہے جس کے معنی ہیں: انعام کرنا، فضل کرنا۔

اَلْمَغْضُوْبِ: ...... یہ غَضِبَ سے اسم مفعول ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اس کے غضب کے مستحق ہوئے۔

اَلضَّآلِّيْنَ: ...... یہ اَلضَّالُّ کی جمع سالم ہے جس کے معنی گمراہ کے ہیں۔ اس سے وہ لوگ مراد ہیں، جن کو ہدایت

کی راہ دکھائی گئی مگر وہ اس سے بھٹک کر گمراہ ہو گئے۔

خلاصہ مضمون:

اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا، اس کی چند صفات اور بندے کے ساتھ اس کے تعلق کو واضح کرنے کے بعد اب اصل مدعا بیان ہوا ہے جس میں بندہ اپنے لیے اور تمام انسانوں کے لیے رب سے دعا کرتا ہے کہ وہ سب کو اس راہِ حق پر چلنے کی توفیق دے جس پر اللہ تعالیٰ کے نیک، پسندیدہ اور انعام یافتہ لوگ چلتے رہے۔

ان آیات میں ضمنی طور پر عقیدۂ نبوت و رسالت کا ذکر بھی آ گیا کیونکہ اس کے بغیر صحیح راہِ حق معلوم کرنا اور اس پر چلنا ممکن نہیں ہے۔

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ ۝﴾

اس آیت میں بندہ اپنے رب کو خطاب کر کے اس سے ہدایت کی دعا کرتا ہے۔ اس سے پہلے تمہید کے طور پر اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بیان کی گئی۔ بندے اور رب کے باہمی تعلق کو ظاہر کیا گیا اور آخر میں دعا کے ذریعے اپنا عرض مدعا کیا گیا ہے۔ مانگنے کا یہ نہایت ہی عمدہ انداز اور بہترین طریقہ ہے۔

پھر جمع کا صیغہ استعمال کر کے بندے نے اپنی دعا میں دوسروں کو بھی شامل کر لیا ہے کیوں کہ سارا جہان ہی اللہ کے در کا سوالی ہے۔

اس آیت سے لے کر سورت ختم ہونے تک جو دعا کی گئی ہے، وہی اس سورت کا اصل مضمون ہے، جس کی رو سے اس سورت کو سورۃ الدعا، یعنی دعا والی سورت کہا گیا ہے۔

یہی وہ مقام ہے جہاں سے مذہب (RELEGION) کی ابتدا ہوتی ہے اور نبوت و رسالت کی ضرورت پڑتی ہے۔ کیونکہ خود انسان اپنے لیے کوئی ایسی راہِ عمل تجویز نہیں کر سکتا، جس پر چل کر وہ دنیا اور آخرت میں اپنے لیے فائدے حاصل کر سکے اور نقصان سے بچ سکے۔ بلکہ وہ تو یہ بھی نہیں جانتا کہ کس چیز میں اس کے لیے فائدہ اور کس کام میں اس کے لیے نقصان ہے۔ وہ قدم قدم پر وحی اور نبوت و رسالت کی رہنمائی کا محتاج ہے۔

اس کائنات کے خالق نے دوسری حاجتوں کی طرح انسان کی اس حاجت کو بھی پورا کر دیا اور اس کی ہدایت و رہنمائی کے لیے وحی اور نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری کر دیا۔ کیونکہ جس ہستی نے انسان کے جسم کی ضروریات پوری کرنے کا سامان پیدا فرمایا ہے، اُسی ذات نے انسان کی روح کے لیے بھی غذا فراہم کر دی ہے اور اس کی رہنمائی کے لیے وحی کا نظام قائم کیا ہے۔

اس مقام پر بندہ اپنے رب سے جو ہدایت مانگتا ہے، اسے اللہ تعالیٰ نے وِجدان، حواس، عقل اور وحی کے چار درجوں میں عطا فرمایا ہے:

وِجدان (INTUTION) کی ہدایت یہ ہے کہ ایک بچہ پیدا ہوتے ہی غذا کے لیے رونے لگتا ہے اور بغیر کسی کے

سکھائے ماں کی چھاتی منہ میں لے کر اسے چوسنا شروع کر دیتا ہے اور اپنی غذا حاصل کر لیتا ہے۔

اس کے بعد حواس (SENSES) کا درجہ آتا ہے۔اس درجے میں ہمیں دیکھنے، سننے، چکھنے، چھونے اور سونگھنے کی صلاحیتیں دی گئی ہیں، جن کے ذریعے ہم اپنے سے باہر کی معلومات حاصل کرتے ہیں۔

پھر حواس کے بعد عقل کا درجہ ہے جو حواس کے ذریعے حاصل شدہ معلومات سے نتائج اخذ کر کے فیصلے کرتی ہے۔لیکن اس کا دائرہ کار (JURISDICTION) بھی محسوسات تک محدود ہے۔ یہ کبھی حواس کی طرف سے غلط معلومات (DISINFORMATION) ملنے کی وجہ سے درست فیصلے نہیں کر سکتی اور اپنی خامیوں اور نقائص کی اصلاح کے لیے وحی کی رہنمائی کی محتاج ہے۔اس کے علاوہ زندگی کے بعض مسائل ایسے ہیں، جن کو تنہا عقل حل نہیں کر سکتی۔

آخر میں وحی (REVELATION) کی ہدایت کا درجہ ہے۔ جو ہدایت کا سب سے اعلیٰ و افضل درجہ ہے کیونکہ یہ یقین پر مبنی، ہر نقص وعیب سے پاک اور ہر خامی اور کمی سے مبّرا ہے۔ اس میں حقیقت کی روشنی ہے۔ یہ سراپا حق ہے۔اس میں انسان کے لیے مکمل ہدایت و رہنمائی ہے۔جس خالق نے انسان کو وجدان، حواس اور عقل کی ہدایت بخشی، اُسی نے اس کی کامل رہنمائی کے لیے نبوت کے ذریعے وحی کا سلسلہ قائم کیا۔اس کی ابتداء سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام سے کی جو اللہ کے نبی اور صاحب وحی تھے۔ پھر ہر زمانے میں ہر قوم کے لیے کوئی نہ کوئی نبی یا رسول بھیجا گیا جو لوگوں کو وحی کی ہدایت اور رہنمائی دکھاتا رہا۔اس سلسلے کی آخری کڑی خاتم الانبیاء حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کی نبوت و رسالت قیامت تک کے لیے ہے۔

صراطِ مستقیم کیا ہے؟

بندہ اپنے رب سے جس صراطِ مستقیم کی ہدایت مانگتا ہے اس سے کون سی سیدھی راہ مراد ہے؟ اس سے مراد دین اسلام ہے جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿قُلْ اِنَّنِيْ هَدٰىنِيْ رَبِّيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ دِيْنًا قِيَمًا﴾ (الانعام 162:6)

اس جگہ، جیسا کہ مشہور مفسّر زمخشری نے لکھا ہے، دِيْنًا قِيَمًا بدل ہے صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ کا۔ گویا صراط مستقیم سے مراد صحیح دین ہے جسے اسلام کہا جاتا ہے۔

دین اسلام کے لیے صراط مستقیم کی تعبیر اور تشبیہ کتنی عمدہ اور سچی ہے!

سیدھے راستے کی چند خصوصیات یہ ہیں:

1۔ کسی ایک نقطے یا مقام سے دوسرے نقطے یا مقام تک صرف ایک ہی سیدھا راستہ ہوسکتا ہے۔

2۔ سیدھے راستے کو سمجھنا آسان ہوتا ہے۔

3۔ سیدھے راستے کو اختیار کرنا آسان بھی ہے۔

4۔ سیدھے راستے پر چلنے اور منزل تک پہنچنے میں زیادہ مشکل پیش نہیں آتی۔

5۔ سیدھا راستہ فطری اور قدرتی راستہ ہوتا ہے۔

6۔ سیدھی راہ پر چلنے کے لیے عقل، ہدایت، روشنی اور رہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ٹیڑھے راستوں پر چلنے کے لیے ان چیزوں کی ضرورت نہیں ہوتی۔

دین اسلام یہ تمام خصوصیات رکھتا ہے۔ یہ فطری بھی ہے، سچا بھی ہے، قابل فہم بھی ہے، آسان اور قابل عمل بھی ہے۔

پھر دین اسلام کے صراط مستقیم پر چلنے کے لیے ایک یا دو بار دعا نہیں کی جاتی، بلکہ اسے بار بار نمازوں میں دہرانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس راہ پر ہمیشہ ثابت قدم رہنے کے لیے روزانہ کم سے کم سترہ (17) بار دعا کی جاتی ہے۔

﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ﴾

پہلے مجمل اور مختصر طور پر سیدھے راستے کی ہدایت کے لیے دعا کی گئی۔ اب اسی کی وضاحت اور تفصیل کے لیے مثبت (POSIVTIVE) اور منفی (NEGATIVE) دونوں طرح سے پوری نشاندہی کی جا رہی ہے کہ وہ راہ ان لوگوں کی ہونی چاہیے، جن پر اللہ تعالیٰ کا انعام اور فضل و کرم ہوا اور جو اس کے فرماں بردار بندوں کی راہ ہے۔ ان لوگوں کی راہ نہیں ہونی چاہیے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا اور نہ ان کی جو گمراہ ہو گئے۔

یہ انعام یافتہ گروہ کون سا ہے؟ قرآن نے اس کی وضاحت اور پہچان کرا دی ہے، کیونکہ قرآن اپنی تفسیر آپ بھی کرتا ہے۔ ((اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا))۔ ارشاد ہوتا ہے کہ:

﴿وَ مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَ الرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا﴾ (النساء 4:69)

''اور جو اللہ اور رسول کی اطاعت کریں گے، وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے، جن پر اللہ نے انعام کیا...... انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ کیسی اچھی ہے ان کی رفاقت اور ہمراہی!''

اس آیت میں انبیائے کرام، صدیقین، شہداء اور صالحین...... سب کو ایک ہی انعام یافتہ گروہ کہا گیا ہے۔

﴿غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ (7)

بندہ جب اپنے رب سے دعا کرتا ہے کہ وہ اسے نیک اور انعام یافتہ لوگوں کے راستے پر چلنے کی توفیق دے، تو اس کے ساتھ ہی وہ اُن برے لوگوں کی راہ سے بچنے کی دعا بھی کرتا ہے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا، یا جو گمراہ ہو گئے۔

یہ دونوں قسم کے برے لوگ کون ہیں؟ ترمذی کی ایک حدیث میں بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد یہودی اور عیسائی قومیں ہیں۔ (ترمذی، رقم: 2954)

قرآن نے بھی یہودیوں کو مغضوب قرار دیا ہے کہ یہ وہ قوم ہے جس پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔

﴿فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ﴾ (البقرہ 2:90)

''تو ان (یہود) پر اللہ کا غضب ہی غضب ہوا۔''

اسی طرح قرآن نے نصاریٰ یعنی عیسائیوں کو گمراہ ٹھہرایا:

﴿وَ لَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَ اَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ (المائدہ 5:77)

''اور ان لوگوں کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، جو اس سے پہلے گمراہ ہوئے، جنہوں نے دوسرے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا اور خود سیدھی راہ سے بھٹک گئے تھے۔''

لیکن دنیا میں صرف یہودی قوم ہی ایسی قوم نہیں جو اللہ تعالیٰ کی مغضوب ٹھہری ہو اور نہ عیسائی ایسی قوم ہے کہ صرف وہی گمراہ ہوئی ہو۔ قرآن کے مطابق ایسی اور بھی قومیں ہو گزری ہیں اور ایسے افراد بھی تھے جو اللہ کے غضب کا شکار ہوئے اور گمراہ ٹھہرے، جن کی تفصیل سورہ ہود، 11:71۔ سورۂ الانفال، 8:16، سورۂ الصافات، 37: 69 تا 71 میں دیکھی جاسکتی ہے۔

دراصل حدیث کا منشاء اور مقصد بطورِ مثال ان قوموں کو بیان کرنا تھا، جو اس وقت کے عرب ماحول میں مغضوب کے لیے یہود اور ضالین کے لیے نصاریٰ، دو انتہائی موزوں اور سامنے کی مثالیں تھیں۔

عربیت کی رو سے یہ مطلب بھی درست ہے کہ اَلَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اور اَلْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ اور اَلضَّآلِّيْنَ سے ایک ہی گروہ یا جماعت مراد لے لی جائے اور یہ مفہوم لیا جائے کہ ان لوگوں کے راستے پر چلنے کی دعا کی گئی ہے جن پر اللہ تعالیٰ کا فضل اور انعام ہوا، جن پر اللہ کا غضب نازل نہیں ہوا اور جو گمراہ نہیں ہوئے۔

5۔ سورۂ الفاتحہ کے فضائل:

صحیح احادیث میں سورۂ الفاتحہ کے کئی فضائل بیان ہوئے ہیں، جیسے:

1۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ایک متفق علیہ حدیث مروی ہے، جس میں نبی ﷺ نے سورۂ الفاتحہ کو قرآن کی سب سے زیادہ عظمت والی سورت قرار دیا، اسے سبع مثانی اور قرآن عظیم (کا حصہ) قرار دیا۔

(صحیح بخاری، رقم: 4474۔ صحیح مسلم، رقم: 1457، سنن نسائی، رقم: 914)

2۔ ایک دفعہ نبی ﷺ کسی سفر میں ایک مقام پر ٹھہرے، ایک اور شخص بھی آپ ﷺ کے پاس ٹھہرا تو آپ ﷺ نے اسے فرمایا:

((اَلَا اُخْبِرُكَ بِاَفْضَلِ الْقُرْاٰنِ؟ قَالَ: بَلٰى، فَتَلَا: ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾))

(صحیح ابن حبان، مستدرك حاكم عن انس رضی اللہ عنہ)

''کیا میں تمہیں قرآن کی سب سے افضل سورت نہ بتاؤں؟ اس شخص نے عرض کیا: جی ہاں، ضرور بتائیے، پھر آپ ﷺ نے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ....﴾ سورۂ الفاتحہ تلاوت فرمائی۔''

3۔ سید ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم ایک مرتبہ سفر میں ایک جگہ ٹھہرے۔ اچانک ایک لونڈی آئی اور بولی کہ یہاں کے قبیلے کے سردار کو سانپ (یا بچھو) نے ڈس لیا ہے۔ ہمارے آدمی یہاں موجود نہیں، آپ میں سے کوئی جھاڑ پھونک کرنے والا ہو تو وہ اس کا علاج کر دے۔ ہم میں سے ایک شخص اٹھ کر اس کے ساتھ چلا گیا۔ ہمیں معلوم نہ تھا کہ وہ دم کرنا بھی جانتا ہے۔ اس نے وہاں جا کر کچھ دَم کیا تو اللہ کے فضل سے وہ سردار بالکل ٹھیک ہو گیا۔ اس موقع پر اس نے ہمارے آدمی کو تیس (30) بکریاں تحفے میں دیں اور ہماری مہمانی کے لیے بہت سا دودھ بھیجا۔ جب وہ شخص واپس آیا تو ہم نے اس سے پوچھا: کیا تمہیں دم کرنا بھی آتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے تو سورۃ الفاتحہ پڑھ کر دَم کر دیا تھا۔ ہم نے کہا کہ اس آئے ہوئے مال کا معاملہ ملتوی رکھو۔ پہلے رسول اللہ ﷺ سے اس بارے میں پوچھ لو۔ مدینے پہنچ کر ہم نے حضور سے اس واقعے کا ذکر کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا:

''اسے کیسے معلوم ہو گیا کہ یہ پڑھ کر دَم کرنے کی سورت ہے؟ اس مال کے حصے کر لو اور اس میں سے ایک حصہ میرے لیے بھی رکھو۔'' (صحیح بخاری، رقم: 2276۔ ابو داؤد، رقم: 3418)

4۔ اس سورت کی فضیلت میں ایک حدیث قدسی بھی ہے کہ

''سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:
میں نے نماز (سورۃ الفاتحہ) کو اپنے اور اپنے بندوں کے درمیان آدھا آدھا تقسیم کر رکھا ہے۔ میرے بندے کو وہ کچھ ملے گا جو اس نے مانگا۔ جب بندہ کہتا ہے ﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میرے بندے نے میری تعریف کی۔ جب وہ ﴿اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری حمد و ثنا بیان کی۔ پھر جب وہ ﴿مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے: میرے بندے نے میری بزرگی بیان کی اور پھر ایک مرتبہ فرمایا: میرے بندے نے اپنے آپ کو میرے سپرد کر دیا۔ پھر جب وہ ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے: یہ میرے اور میرے بندے کے درمیان مشترک (COMMON) ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا ہے۔ پھر جب وہ ﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ o صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ غَیْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَیْهِمْ وَ لَا الضَّآلِّیْنَ o﴾ کہتا ہے تو اللہ فرماتا ہے کہ یہ میرے بندے کے لیے ہے اور میرے بندے کو وہ ملے گا جو اس نے مانگا ہے۔ (صحیح مسلم، رقم: 878۔ نسائی، رقم: 910)

بندہ اِدھر اپنی دعا پوری کرتا ہے تو اُدھر اللہ کی طرف سے اسے قرآن پیش کیا جاتا ہے کہ یہ تیری دعا کا جواب ہے۔ اسی میں وہ ہدایت ہے جو تو نے مانگی ہے:

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ﴾

''یہ اللہ کی کتاب ہے، اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ سراپا ہدایت ہے، اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے۔''

6۔سورۃ الفاتحہ کے مسائل واحکام:

سورۃ الفاتحہ کے حوالے سے چند مسائل واحکام یہ ہیں:

1۔ سورۃ الفاتحہ کی کل سات آیتیں ہیں۔اس پر امت کا اتفاق اور اجماع ہے۔

2۔ جمہور فقہا کے نزدیک نماز میں سورۃ الفاتحہ پڑھنی واجب ہے۔

3۔ باجماعت نماز میں امام کے پیچھے مقتدی سورۃ الفاتحہ پڑھے یا نہ پڑھے۔اس بارے میں تین مسلک ہیں:

پہلا مسلک یہ ہے کہ جہری نماز میں جب امام قراءت کررہا ہوتو مقتدی سورہ الفاتحہ نہ پڑھے اور سری نماز میں پڑھ لے۔ یہ امام مالک رحمہ اللہ ،امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اور امام محمد رحمہ اللہ کا مسلک ہے۔

دوسرا مسلک یہ ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کسی نماز میں بھی خواہ وہ جہری ہو یا سری، سورۃ فاتحہ نہیں پڑھے گا۔ کیونکہ ایک حدیث کے مطابق امام کی قراءت ہی مقتدی کے لیے کافی ہے۔ یہ مسلک امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا ہے۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی ہر نماز میں خواہ وہ جہری ہو یا سری ہو، سورۃ الفاتحہ ضرور پڑھے گا، کیونکہ صحیح حدیث میں ہے کہ سورۃ الفاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔ (صحیح بخاری، رقم: 756۔ صحیح مسلم، رقم: 874۔ ابو داؤد، رقم: 822۔ ترمذی، رقم: 247، نسائی، رقم: 910)

یہ مسلک امام شافعی رحمہ اللہ اور اہل حدیث کا ہے۔

ہماری رائے میں پہلا مسلک بہتر اور راجح ہے، کیونکہ اس صورت میں قرآن وحدیث دونوں پر عمل ہو جاتا ہے اور ان کی باہم مطابقت بھی ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس دوسرے مسلک میں ایک صحیح حدیث کی خلاف ورزی کا پہلو نکلتا ہے اور تیسرے مسلک میں قرآن کے اس حکم کی خلاف ورزی کا امکان ہے جس میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ:

﴿وَ اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَ اَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ٥﴾ (الاعراف 204:7)

''اور جب قرآن پڑھا جائے تو اسے غور سے سنو اور خاموش رہو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

4۔ سورۃ الفاتحہ پڑھ کر مریض پر دَم کرنا (رقیہ) جائز اور مشروع ہے۔

5۔ سورۃ الفاتحہ کے بعد آمین کہنا سنت سے ثابت ہے۔

2 ...... اَلْبَقَرَة

نام:

قرآن مجید کی سورتوں کے نام عام طور پر ان کے مضامین کے اعتبار سے نہیں ہیں، بلکہ محض نشانی اور علامت کے طور پر رکھے گئے ہیں۔ اس سورت کا نام البقرہ (گائے) ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سورت جس میں گائے کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے۔ لیکن احکام ومضامین کی کثرت اور جامعیت کی وجہ سے اس سورت کو "فُسطاط القرآن" (قرآن کا خیمہ) بھی کہا گیا ہے۔

زمانۂ نزول:

یہ سورت مدنی ہے۔ ہجرت کے بعد ابتدائی ڈیڑھ دو برس کے اندر نازل ہوئی ہے۔ اس میں کچھ آیتیں، خاص طور پر وہ آیات جو سود سے متعلق ہیں، بھی شامل ہیں۔ حالاں کہ وہ بالکل آخری مدنی دور میں نازل ہوئی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کی آخری چند آیات جو مکے میں اتری تھیں، مضمون کی مناسبت سے اس میں شامل کر دی گئیں۔

سورۂ البقرہ کے فضائل:

ذیل میں سورۂ البقرہ کے بہت سے فضائل میں سے کچھ بیان کیے جاتے ہیں جو صحیح احادیث سے ثابت ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ:

1...... ((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: لَا تَجْعَلُوْا بُیُوْتَكُمْ مَقَابِرَ، اِنَّ الشَّیْطَانَ

يَنْفِرُ مِنَ الْبَيْتِ الَّذِيْ تُقْرَءُ فِيْهِ سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ)) (صحيح مسلم، رقم: 1824۔ ترمذی، رقم: 2877)

''سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے گھروں کو قبریں (قبرستان) نہ بناؤ۔ بے شک شیطان اس گھر سے بھاگ جاتا ہے جس میں سورۂ البقرہ پڑھی جاتی ہے۔''

ایک اور حدیث میں اس سورت کی یہ فضیلت بیان ہوئی ہے کہ:

2...... ((عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ الْبَاهِلِیُّ رضی اللہ عنہ قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ:...... اِقْرَءُ وْا سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ، فَاِنَّ اَخْذَهَا بَرَكَةٌ، وَتَرْكَهَا حَسْرَةٌ، وَلَا يَسْتَطِيْعُهَا الْبَطَلَةُ))

(صحیح مسلم، رقم: 1874)

''حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا:...... سورۂ البقرہ پڑھا کرو۔ اس کو حاصل کرنے میں برکت ہے۔ اس کو چھوڑ دینے میں حسرت و پشیمانی ہے اور اس پر شیطان اور جادوگروں کا کوئی زور نہیں چلتا۔''

آيَاتُهَا — 286 | 2...... سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ | رُكُوْعَهَا — 40

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ﴿١﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿٢﴾ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣﴾ وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ﴿٤﴾ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۗ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿٥﴾

''الف، لام، میم۔ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے۔ یہ سراپا ہدایت ہے، اللہ سے ڈرنے والوں (متقین) کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے نیکی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ اور جو لوگ اس چیز پر ایمان لاتے ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کی گئی اور اس پر بھی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل کی گئی اور وہی آخرت پر بھی ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سب لوگ اپنے رب کی ہدایت پر ہیں اور یہی کامیاب ہونے والے ہیں۔'' (5-1)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿الٓمّٓ ۝﴾ (الف، لام، میم) (1)

اس طرح کے حروف جو قرآن مجید کی بعض سورتوں کے شروع میں آئے ہیں ''حروف مقطعات'' کہلاتے ہیں کیونکہ یہ الگ الگ کر کے پڑھے جاتے ہیں۔ ان کے معنی کے بارے میں بہت سے اقوال ہیں مگر ہمارے نزدیک ان میں سے دو قول زیادہ اہم اور قابل غور ہیں۔

1۔ پہلا قول یہ ہے کہ یہ حروف اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن مجید واقعی اللہ تعالیٰ کا کلام اور ایک معجزہ ہے۔ یہ انسانی کلام ہرگز نہیں ہے۔ ان کے ذریعے گویا اہل عرب کو تحدی اور چیلنج (CHALLENGE) دیا گیا ہے کہ دیکھو، اگرچہ یہ پورا قرآن تمہاری ہی عربی زبان کے حروف تہجی (ALPHABETS) پر مشتمل ہے مگر تم سب مل کر بھی اس جیسا کوئی کلام پیش نہیں کر سکتے۔ بلکہ اس جیسی کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورت بھی بنا کر نہیں لا سکتے۔

2۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ان حروف کی حیثیت ''حروف ندا'' یا ''حروف تنبیہ'' کی ہے تاکہ مخاطبین کو متوجہ کیا جائے اور پھر اصل مقصود و مدعا بیان کیا جائے۔ یہ اس وقت کا ایک اسلوبِ کلام تھا جسے قرآن نے اختیار کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی یہ حروف آئے ہیں، عام طور پر اس کے بعد قرآن مجید کا ذکر آیا ہے، یا پھر وحی و رسالت کا مضمون ہے جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ حروف وحی کے کلام کی عظمت و اعجاز کو ظاہر کرنے کا پیش خیمہ ہیں۔

ہماری رائے میں دوسرے قول ہی کو ترجیح حاصل ہے۔

یاد رہے کہ تمام حروفِ مقطعات قرآن مجید ہی کا حصہ ہیں اور ان کی تلاوت کی جاتی ہے۔

﴿ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (2)

ذٰلِكَ:...... عربی زبان میں عام طور پر قریب کے اشارے کے لیے ھٰذَا (یہ۔This) اور دور کے اشارے کے لیے ذٰلِكَ (وہ۔That) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ لیکن جب کسی چیز کی خاص اہمیت اور شان ظاہر کرنی ہو تو اس کے لیے ھٰذَا کی جگہ ذٰلِكَ لے آتے ہیں۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی کتاب کی اہمیت، عظمت اور شان کو نمایاں کرنے کے لیے ھٰذَا کی بجائے ذٰلِكَ آیا ہے۔

اَلْكِتٰبُ:...... اس سے مراد قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ کا کلام اور اس کی کتاب ہے، اس کی نظیر یہ ہے۔

﴿وَ هٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ وَ لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَ مَنْ حَوْلَهَا ۝﴾ (الانعام 6:92)

''اور یہ کتاب (قرآن) ہم نے نازل کی ہے جو برکت والی ہے۔ اپنے سے پہلی کتابوں کو سچ ثابت کرنے والی ہے، تاکہ آپ اس کتاب کے ذریعے مکے والوں کو اور اس کے آس پاس والوں کو خبردار کر دیں۔''

"کتاب" کا لفظ قرآن مجید میں کئی دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے خط، پیغام، تحریر، حکم، تقدیر، اعمال نامہ اور الہامی کتب وغیرہ۔

﴿لَا رَيْبَ ۛ فِيْهِ ۛ﴾ "اس بارے میں کوئی شک نہیں۔" (2)

اس جگہ معانقہ کا وقف ہے جو فِيْهِ سے پہلے بھی ہوسکتا ہے اور فِيْهِ کے بعد بھی۔ ہماری رائے میں فِيْهِ کے بعد کے وقف کو ترجیح حاصل ہے کیونکہ یہ قرآنی اسلوب کے زیادہ قریب ہے۔

قرآن نے لَا رَيْبَ فِيْهِ "اس بارے میں کوئی شک نہیں" کی وضاحت دوسرے مقامات پر کر دی ہے۔ مثال کے طور پر ایک جگہ ارشاد ہوا کہ:

﴿الٓمّٓ ۝ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (السجدہ 1:32)

"الف، لام، میم۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کتاب رب العالمین کی طرف سے نازل ہوئی ہے۔"

مطلب یہ ہے کہ اس بارے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہونا چاہیے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے اور یہ کسی مخلوق کا کلام نہیں ہے۔ پھر رَيْبَ سے پہلے لَا (لائے نفی جنس) لا کر اس حوالے سے ہر قسم کے شک وشبہ کی نفی کر دی گئی۔

قرآن کے مخالفین یہ نہ کہتے تھے کہ ان کو قرآن کی بتائی ہوئی باتوں پر شک ہے۔ ان کا اصل اعتراض یہ تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ نہیں ہے اور اسے نبی ﷺ نے خود گھڑ لیا ہے:

(1)..... ﴿بَلِ افْتَرٰهُ﴾ (الانبیاء 5:21)

"بلکہ اس (نبی) نے اسے یعنی قرآن کو خود گھڑ لیا ہے۔"

(2)..... ﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰهُ ۚ بَلْ هُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اَتٰهُمْ مِّنْ نَّذِيْرٍ مِّنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَهْتَدُوْنَ ۝﴾ (السجدہ 3:32)

"کیا وہ لوگ کہتے ہیں، آپ نے اس (قرآن) کو خود گھڑ لیا ہے؟ نہیں یہ تو آپ کے رب کی طرف سے برحق نازل ہوا ہے تاکہ آپ اس قوم کو خبردار کر دیں، جن کے پاس آپ سے پہلے کوئی خبردار کرنے والا نہیں آیا تاکہ وہ ہدایت پائیں۔"

یہاں مخالفین کے اسی جھوٹے دعوے کی تردید کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے جو نبی ﷺ پر وحی کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس بارے میں کسی کو کوئی شک نہیں ہونا چاہیے۔

پھر جب یہ مان لیا جائے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی کتاب ہے اور اُس کی طرف سے نازل شدہ ہے تو اس میں بیان کی گئی تمام باتوں کے بارے میں ویسے ہی کوئی شک وشبہ باقی نہیں رہتا۔

﴿هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (2)

"هُدًی" کے معنی ہدایت اور رہنمائی کے ہیں۔ جس کے لغوی معنی بچنے کے ہیں۔ اصطلاح میں گناہوں سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں۔

"متقین" متقی کی جمع ہے جو تقویٰ (وق ی) سے بنا ہے۔ جس کے لغوی معنی "بچنے" کے ہیں۔ اصطلاح میں گناہوں سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں متقی وہ شخص ہے جو گناہوں سے بچنے کی کوشش کرتا ہے اور نیکیاں کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

فرمایا گیا کہ یہ کتاب، جس کے کتابِ الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں، "متقین" کے لیے ہدایت ہے اور ان کی رہنمائی کرتی ہے۔

اس جگہ بعض لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ قرآن صرف متقی لوگوں کے لیے ہدایت کیوں ہے، وہ تو پہلے سے ہدایت یافتہ ہیں، یہ گناہ گاروں اور عام لوگوں کے لیے ہدایت کیوں نہیں ہے؟ اس سوال کا جواب قرآن نے اپنے آپ کو هُدًی لِّلنَّاس (سب لوگوں کے لیے ہدایت) کہہ کر دے دیا ہے:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًی لِّلنَّاسِ....﴾ (البقرہ 185:2)

"رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔"

اس کے علاوہ اس کے مخاطب صرف 'متقین' نہیں ہیں بلکہ وہ اپنی دعوت کے لیے تمام انسانوں کو کئی مقامات پر "یَآ اَیُّهَا النَّاسُ" (اے لوگو) کہہ کر پکارتا ہے:

"یَآ اَیُّهَا النَّاسُ"...... (البقرہ 21:2)

حقیقت یہ ہے کہ متقین کو بھی اسلامی زندگی گزارنے کے لیے قدم قدم پر قرآن کی ہدایت و رہنمائی کی ضرورت پڑتی ہے، جو ان کی ہدایت میں اضافے کا سبب بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًی....﴾ (محمد 17:47)

"اور جنہوں نے ہدایت کی راہ اختیار کی، اللہ ان کو اور زیادہ ہدایت دیتا ہے۔"

تقویٰ کیا ہے؟

تقویٰ کے لفظی معنی 'بچنے' کے ہیں۔ قرآنی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جب بندہ اللہ سے ڈرتے ہوئے برائی سے بچتا اور نیکی اختیار کرتا ہے۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے تقوے کے بارے میں سوال کیا کہ اس کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے جواب میں فرمایا: کیا آپ کا گزر کبھی ایسے راستے سے ہوا جہاں جھاڑیاں کانٹے ہوں؟ انہوں نے جواب دیا: جی ہاں، پھر پوچھا: ایسی جگہ سے گزرتے ہوئے تم کیا کرتے تھے؟ کہا: میں اپنے آپ کو سنبھال کر اور اپنے کپڑوں کو سمیٹ کر احتیاط سے گزر جاتا ہوں۔ اس پر انہوں نے فرمایا: بس تقویٰ یہی ہے کہ آدمی سنبھل سنبھل کر احتیاط کے ساتھ

اپنی زندگی گزارے۔“

یاد رہے کہ اس جگہ قرآن کی تین خصوصیات بیان ہوئی ہیں۔ایک یہ کہ وہ اللہ کی کتاب ہے۔دوسری یہ کہ اس کے کتاب الٰہی ہونے میں کوئی شک نہیں۔تیسری یہ کہ وہ متقین کے لیے ہدایت ہے۔

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ (3)

یہ متقین کی پہلی صفت بیان ہوئی ہے کہ وہ ”غیب“ پر یعنی غیب کی چیزوں پر ایمان لاتے ہیں۔وہ ان چھپی حقیقتوں کو مانتے ہیں جو ان کی نظروں سے اوجھل ہیں، اگرچہ وجدان ان کو محسوس کرتا ہے۔جیسے اللہ تعالیٰ، فرشتے، وحی، نبوت و رسالت، آخرت اور جنت و دوزخ وغیرہ۔بعض لوگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ نبی اور کتاب تو غیب نہیں ہوتے، پھر ان پر ایمان لانے کو ایمان بالغیب کیسے کہا جائے گا۔

اس شبے کا جواب یہ ہے کہ کسی شخص کی شخصیت اور اس کا فلاں بن فلاں ہونا تو بے شک ظاہر کی چیز ہے مگر اس شخص کا نبی اور صاحبِ وحی ہونا سراسر غیب کی چیز ہے کیونکہ نبوت اور وحی کا تعلق صرف غیب سے ہے جسے ہم دیکھ نہیں سکتے۔رہی کتاب تو قرآن مجید نہ تو کتابی صورت میں آسمان سے نازل ہوا اور نہ نبی ﷺ لوگوں کو قرآن کے لکھوائے ہوئے اجزاء دکھا کر ان پر ایمان لانے کی دعوت دیتے تھے۔یہ بھی وحی ہی کی صورت میں تھا جو کہ غیب کی چیز ہے اور جسے ہماری آنکھیں دیکھ نہیں سکتیں۔

یاد رہے کہ ایمان کی بنیاد انسانی حواس کے تجربے (EXPERIMENT) اور مشاہدے (OBSERVATION) پر نہیں ہے، بلکہ اس کی بنیاد چند اَن دیکھی حقیقتوں کو ماننے اور یقین کرنے پر ہے۔

اس جملے کے دوسرے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو لوگ غائبانہ طور پر بن دیکھے، ان چیزوں پر ایمان لاتے ہیں جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔اسی میں بندوں کے لیے ان کے رب کی طرف سے امتحان بھی ہے کہ کون ان غیبی حقائق پر ایمان لاتا اور کون ان کو جھٹلاتا ہے۔

اس مقام پر کوئی شخص یہ خیال نہ کرے کہ ”متقین“ کا ایمان اندھا ایمان (BLIND FAITH) ہوتا ہے اور اس میں عقل و شعور کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔کیونکہ ایسا خیال صحیح نہیں ہے۔متقین جن چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں، ان کی کوئی نہ کوئی عقلی بنیاد بھی ہوتی ہے اور ان کا ایمان عقل کے تقاضوں کے عین مطابق ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر اس دنیا میں بے شمار مخلوقات پائی جاتی ہیں اور عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ہر مخلوق کے لیے ایک خالق کا ہونا ضروری ہے۔بغیر خالق کے کوئی تخلیق نہیں ہو سکتی۔خواہ وہ خالق ہمیں نظر آئے یا نظر نہ آئے۔

وحی عقل کے اسی تقاضے کا جواب دیتی ہے اور کہتی ہے کہ مخلوق کے لیے جو خالق ”ہونا چاہیے“۔وہ خالق حقیقت میں موجود ہے اور اسی کا نام اللہ ہے۔

اسی طرح ہماری عقل کا ایک تقاضا ہے کہ ہر شخص کو انصاف ملنا چاہیے۔مگر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تقاضا پورا نہیں ہوتا اور

لوگوں کو پورا انصاف نہیں ملتا۔ تو کیا یہ بات عقل کے تقاضے کے خلاف ہوگی، اگر وحی یہ بتا دے کہ خالقِ کائنات نے ہر شخص کو انصاف مہیا کرنے کے لیے دنیا کے بعد آخرت کا ایک دن مقرر کر رکھا ہے؟

اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ متقین کا ایمان کوئی اندھا بہرا اور اندھی تقلید کا حامل نہیں ہوتا، بلکہ عقلی تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ اسلام کے ہر عقیدے کی کوئی نہ کوئی عقلی بنیاد ہے، وہ ہمارے کسی فطری تقاضے اور طلب کا جواب ہوتا ہے۔ وجدان اسے محسوس کرتا ہے اور ہمارا ضمیر اس پر مطمئن ہوتا ہے۔

﴿وَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ﴾ (3)

یہ متقین کی دوسری صفت بیان ہوئی ہے۔ ''کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں۔''

''يُقِيْمُوْنَ'' اِقَامَة سے ہے جس کے لفظی معنی ہیں: کسی چیز کو اس طرح سیدھا کر دینا کہ اس میں کوئی ٹیڑھ اور نقص باقی نہ رہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ﴾ (الکھف 18:77)

''پھر وہاں ان دونوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرا چاہتی تھی، تو اس شخص نے اسے سیدھا کر دیا۔''

اَلصَّلٰوة:...... صلٰوۃ کے لغوی معنی دعا کے ہیں، جیسا کہ قرآن میں ہے:

﴿وَصَلِّ عَلَيْهِمْ.....﴾ (التوبہ 9:103)

''اور آپ اُن کے لیے دعا کریں۔''

شریعت کی اصطلاح میں 'الصلوۃ' سے وہ نماز مراد ہے جو مسلمانوں کے ہاں رائج ہے۔ اس سے کوئی اور معنی لینا گمراہی اور زندقہ ہے۔

قرآن نے صرف نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا بلکہ اس نے اپنی خاص اصطلاح میں ''اقامت الصلوٰۃ'' یعنی نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور اس اقامت الصلوٰۃ میں نماز کے اوقات، اس کے ادا کرنے کا طریقہ، اس کے ارکان، شرائط، واجبات، سنن، مستحبات، اس میں خشوع وخضوع، باجماعت نماز، اور نمازوں کی ہمیشہ پابندی وغیرہ سب شامل ہیں۔ قرآن وحدیث میں ان تمام چیزوں کی وضاحت موجود ہے۔

یاد رہے کہ نماز دین اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ہے۔ یہ ایمان کا لازمی تقاضا، اس کی خاص نشانی اور کفر و اسلام کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے۔

بعض گمراہ لوگ کہتے ہیں کہ چونکہ قرآن نے نماز قائم کرنے کا حکم دیا ہے، نماز پڑھنے کا حکم نہیں دیا ہے، لہٰذا نماز نہیں پڑھنی چاہیے۔ ایسے لوگ نہیں جانتے کہ جس چیز کو قرآن نے نماز قائم کرنا کہا ہے، اسی چیز کو اردو محاورے میں نماز پڑھنا کہتے ہیں۔ بلکہ اسی چیز کو فارسی محاورے میں 'نماز کردن' کہتے ہیں، جس کے معنی ہیں: ''نماز کرنا۔'' اس کے علاوہ قرآن مجید میں کئی مقامات پر نماز قائم کرنے کی بجائے نماز پڑھنے کا ذکر بھی موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ o﴾ (الکوثر 108 : 2)

''پس آپ اپنے رب کے لیے نماز پڑھیں اور اسی کے لیے قربانی کریں۔''

مزید حوالوں کے لیے دیکھئے: الاعلیٰ 87: 15۔ العلق 96: 10

﴿وَ مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝﴾ (3)

قرآن سے ہدایت پانے کے بعد متقین میں پیدا ہونے والی یہ تیسری صفت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے عطا کیے ہوئے مال میں سے نیکی کی راہ میں بھی خرچ کرتے ہیں۔

قرآن مجید میں عام طور پر نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر آیا ہے لیکن اس جگہ زکوٰۃ کی بجائے انفاق کا بیان ہے جو زکوٰۃ سے بھی زیادہ وسعت رکھتا ہے۔ اس میں زکوٰۃ کے علاوہ ہر قسم کے صدقات اور خیرات شامل ہیں۔

اس جگہ یہ نہیں فرمایا گیا کہ وہ سارا مال اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے ہیں بلکہ مِنْ کا لفظ استعمال ہوا ہے کہ اپنے مال کا کچھ حصہ نیکی کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

یاد رہے کہ عربی زبان میں 'رزق' کا لفظ صرف مال و دولت کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ اس کے علاوہ وہ انسان کی تمام جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں اور نعمتوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

پھر انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دلانے کے لیے فرمایا کہ یہ مال ہمارا ہی دیا ہوا ہے۔ یہ سارا نہیں بلکہ اس کا صرف کچھ حصہ ہی ہماری راہ میں خرچ کر دو تو اسی میں اللہ کی خوشنودی ہے۔

یہ جو متقین کی صفات بیان ہوئی ہیں کہ وہ ایسا کرتے ہیں، تو اس میں یہ مفہوم بھی پایا جاتا ہے کہ ان کو ایسا کرنا چاہیے، جب ہی وہ متقین کی صف میں شامل ہو سکتے ہیں۔

اس مقام پر متقین کی صرف تین صفات بیان ہوئی ہیں کہ وہ غیب پر ایمان لاتے، نماز قائم کرتے اور اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔ لیکن قرآن میں بعض دوسرے مقامات پر متقین کی کئی دوسری صفات کا ذکر بھی آیا ہے۔ گویا اس جگہ اجمال ہے اور باقی جگہوں پر اس کی تفصیل ہے۔

مثال کے طور پر آیت بِرّ میں، ان لوگوں کو متقی قرار دیا گیا ہے، جو چند دوسری صفات کے علاوہ عہد کو پورا کرنے اور مشکل حالات میں صبر کرنے کی صفات رکھتے ہیں۔

﴿....وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ o﴾ (البقرہ 2:177)

''اور جب وعدہ کریں تو اسے پورا کریں۔ کوئی مالی پریشانی یا جسمانی تکلیف ہو تو صبر کریں اور جہاد میں ثابت قدم رہیں۔ ایسے لوگ ہی سچے اور پرہیز گار ہیں۔''

زیرِ بحث آیت کے بارے میں کسی کا نہایت عمدہ قول ہے کہ:

''ایمان میں نجات ہے، نماز میں اللہ سے مناجات ہے اور انفاق فی سبیل اللہ میں بلندیِ درجات ہے۔''

﴿وَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝﴾ (4)

اُنْزِلَ:...... یہ نازل ہونے سے ہے۔ اس جگہ اس سے مراد وہ وحی اور الہامی کتب ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اتاری گئیں۔

يُوْقِنُوْنَ:...... یہ یقین اور ایقاق سے ہے، جس کے معنی یقین کرنے اور یقینی علم ہونے کے ہیں۔ اس کی ضد شک اور گمان ہیں۔ جس طرح ایمان کی ضد کفر اور انکار ہے۔

اس آیت سے کون لوگ مراد ہیں، جو قرآن، پہلی الہامی کتب اور آخرت کو ماننے والے ہیں۔ اس بارے میں دو قول ہیں اور عربیت کے لحاظ سے دونوں درست ہیں:

پہلا قول یہ ہے کہ اس آیت سے بھی وہی لوگ مراد ہیں، جن کا ذکر اوپر سے چلا آ رہا ہے کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے، نماز قائم کرتے اور اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں خرچ کرتے ہیں۔

دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے وہ اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) مراد ہیں، جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ امام ابن جریر طبری نے اسی قول کو ترجیح دے کر اسے اختیار کیا ہے اور بتایا ہے کہ اصل میں یہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ آیت 3 میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو عام عرب مشرکین میں سے ایمان لائے اور آیت 4 میں ان کا ذکر ہے جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے۔

ہمارے نزدیک یہی قول صحیح ہے اور اس کے دلائل یہ ہیں:

1۔ اس سے پہلے ایمان بالغیب کے ذکر میں پہلی کتابوں اور آخرت پر ایمان لانا بھی شامل تھا۔ اس کے بعد اس ایمان کو دوبارہ بیان کرنے کی خاص ضرورت نہ تھی۔ اس لیے آیت 4 میں کوئی دوسرا گروہ تسلیم کرنا پڑے گا، جس کا الگ سے ذکر کیا گیا ہے۔

2۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ، جن کو ترجمان القرآن بھی کہا جاتا ہے، کا قول بھی اسی کے حق میں ہے کہ آیت 4 میں ایک اور گروہ کا ذکر ہے، جو ایمان بالغیب والے گروہ سے مختلف ہے۔ ظاہر ہے ان کا یہ قول بجائے خود ترجیح رکھتا ہے۔

3۔ قرآن کے نزول کے وقت اس کے مخاطب لوگوں میں پہلا گروہ عرب کے عام مشرکین کا تھا۔ دوسرا گروہ اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) کہلاتا تھا۔ پہلے گروہ میں ایسے افراد بھی تھے جو موحدین تھے، بت پرستی نہیں کرتے تھے اور ابراہیمی طریقے پر تھے۔ اس کے علاوہ اس گروہ میں کچھ ایسے سلیم الفطرت لوگ تھے، جن کو دین حق کی تلاش تھی، کیونکہ وہ بت پرستی کے ماحول میں گھٹن محسوس کرتے تھے۔ ان دونوں قسم کے افراد نے جب قرآن کی دعوت سنی تو

اسے جلد قبول کر لیا۔ مکی دور میں اسلام لانے والے یہی صحابہ تھے جو بعد میں 'السابقون الاوّلون' کہلائے۔ ان کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ انہوں نے اسلام کی سچائی اور حقانیت سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا تھا۔ ایسا نہیں ہوا کہ یہ لوگ اسلام کے غلبے اور طاقت سے مرعوب ہو کر ایمان لائے ہوں۔

البقرہ کی آیت 3 میں انہی لوگوں کا ذکر ہے۔

دوسری طرف اہل کتاب (یہودیوں اور عیسائیوں) میں بھی کچھ ایسی سعید روحیں تھیں جو حق پسند اور حق کی متلاشی تھیں۔ یہ لوگ بھی اپنے مروجہ مذہب سے متنفر تھے۔ پھر ان کو ایک آنے والے نبی کا انتظار بھی تھا، جس کا ذکر ان کی الہامی کتابوں توریت اور انجیل میں موجود تھا۔ ان لوگوں نے جب یہ سنا کہ وہی نبی مبعوث ہو گیا ہے، جس کی پیش گوئی ان کی کتابوں میں پائی جاتی تھی، تو انہوں نے بھی فوری طور پر حضور ﷺ کی دعوت پر لبیک کہی۔ جیسے عبد اللہ بن سلام (یہودی عالم) اور تمیم داری (عیسائی عالم)۔

قرآن نے کئی مقامات پر اس طرح کے حق پسند اہل کتاب کی تحسین فرمائی ہے۔ جیسے:

﴿لَيْسُوْا سَوَآءً ؕ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَ هُمْ يَسْجُدُوْنَ ○ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ؕ وَ اُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ (آل عمران 113,114:3)

''سب اہل کتاب ایک جیسے نہیں ہیں۔ ان میں ایک گروہ سیدھی راہ پر ہے۔ وہ راتوں کو اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں، اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔''

پھر اہل کتاب ہی کے ایک گروہ نصاریٰ کے حق پسند لوگوں کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ○ وَ مَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَ نَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ الصّٰلِحِيْنَ ○ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ○﴾

(المائدہ 5: 83 تا 85)

''اور جب وہ (نصاریٰ) کلام سنتے ہیں جو رسول پر نازل ہوا تو تم دیکھو گے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، کیونکہ انہوں نے حق بات کو پہچان لیا۔ وہ پکار اٹھتے ہیں: ''اے ہمارے رب! ہم ایمان لائے، ہمیں دین حق کی گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔'' اور وہ کہتے ہیں: ''آخر ہم کیوں ایمان نہ لائیں اللہ پر اور اس حق پر جو ہم تک پہنچا ہے؟ ہماری آرزو ہے کہ ہمارا رب ہمیں نیک لوگوں کے ساتھ شامل کرے۔'' ان کی

اس بات کے صلے میں اللہ انہیں ایسے باغ دے گا، جن میں نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ وہاں ہمیشہ رہیں گے اور نیک لوگوں کی یہی جزا ہے۔''

سورۃ البقرہ کی اس آیت 4 میں انہی حق پسند اہل کتاب کا ذکر ہے۔ ان کو الگ سے اس لیے بیان کیا گیا کہ وہ قرآن کے علاوہ پہلی آسمانی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے تھے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ لوگ آخرت پر پختہ اور سچا ایمان رکھنے والے بن گئے، جب کہ دوسرے عام اہل کتاب کا عقیدۂ آخرت برائے نام تھا اور اس میں اتنا بگاڑ پیدا ہو چکا تھا کہ اس کی اصل روح ہی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔

ایک آخری اشکال یا سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ وَالَّذِيْنَ کا عطف عام طور پر ایک ہی گروہ کے لیے آتا ہے تو اس سے دو الگ الگ گروہ کیسے مراد لیے جا سکتے ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ بعض اوقات وَالَّذِيْنَ کا عطف دو الگ الگ گروہوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اس وقت اس سے دو الگ الگ گروہ مراد ہوتے ہیں اور کبھی ان کو جمع کر کے ایک جماعت بھی مراد لی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر قرآن مجید میں اس کی ایک نظیر یہ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ الَّذِيْنَ اٰوَوْا وَّنَصَرُوْٓا اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّرِزْقٌ كَرِيْمٌ﴾ (الانفال 74:8)

''اور جو لوگ ایمان لائے، انہوں نے ہجرت کی، اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور جن لوگوں نے ان کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، یہ سب سچے مومن ہیں، ان کے لیے بخشش ہے اور عزت کی روزی۔''

دیکھ لیجیے، اس جگہ قرآن مجید نے پہلے اَلَّذِيْنَ میں مہاجرین کا ذکر کیا، پھر اَلَّذِيْنَ میں انصار کا ذکر کیا اور پھر اُولٰٓئِكَ کے ذریعے ان دونوں کو ملا کر سچے مومنین کا ایک ہی گروہ قرار دیا اور پھر ان کے یکساں ثواب کا ذکر فرمایا۔

﴿اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (5)

مُفْلِحُوْنَ جمع ہے مُفْلِحٌ کی، جس کے معنی فلاح پانے والے اور کامیاب کے ہیں اور قرآن میں فلاح و کامیابی سے مراد آخرت کی فلاح و کامیابی ہے جو کہ حقیقی زندگی ہے۔

اس آیت میں دونوں طرح کے ان مومنین کو جمع کر دیا گیا ہے، جن کا ذکر آیت 3 اور 4 میں آیا ہے۔ (جس کی نظیر بھی دی جا چکی ہے)۔ ان کے بارے میں فرمایا گیا کہ اگر کسی کو یہ دیکھنا ہو کہ اس وقت کون لوگ اس ہدایت پر مضبوطی سے قائم ہیں جو ہدایت اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہے، تو وہ ان دونوں قسم کے اہل ایمان کو دیکھ لیں، ان میں سے ایک قسم کا تعلق پہلے مشرکین عرب سے تھا لیکن اب وہ ایمان لا چکے ہیں، دوسری قسم کا تعلق پہلے اہل کتاب سے تھا لیکن اب وہ بھی ایمان لے آئے ہیں۔ ان دونوں قسم کے اہل ایمان دنیا میں سچی ہدایت پر قائم ہیں اور آخرت میں ان کے لیے فلاح و کامرانی ہے جہاں ان لوگوں کو جنت میں عیش و عشرت کی زندگی نصیب ہو گی۔ اسی سے ملتا جلتا مضمون سورۃ المومنون کی ابتدائی گیارہ آیتوں میں ایک اور اسلوب سے آیا ہے، جہاں فلاح سے مراد جنت لی گئی ہے۔

آیت 4 اور 5 میں ان اہل کتاب پر طنز وتعریض بھی ہے جو اپنے آپ کو ایمان کا علم بردار اور ہدایت کا ٹھیکے دار سمجھتے تھے، اور جنت کو صرف اپنا استحقاق قرار دیتے تھے۔قرآن نے ان کو ایسی خام خیالوں اور غلط فہمیوں کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ اہل کتاب میں سے صرف وہی لوگ صحیح ایمان والے، آخرت پر یقین رکھنے والے، سچی ہدایت والے اور آخرت میں فلاح و کامرانی سے ہم کنار ہونے والے ہیں جو حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت اور قرآن پر ایمان لا چکے ہیں۔ان کے سوا باقی اہل کتاب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔

اہل ایمان کے بعد اُن کفار کا ذکر آ رہا ہے جو دینِ اسلام کے سخت مخالف تھے۔جنہوں نے حق کے مقابلے میں باطل کو پسند کیا اور ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٦﴾ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٧﴾ ع

”بے شک جو لوگ کافر ہو گئے، آپ کا ان کو ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے، وہ ہرگز ایمان نہیں لائیں گے۔اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے، ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔ایسے لوگوں کے لیے بڑا عذاب ہے۔“(7-6)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

كَفَرُوْا:...... یہ كُفْرٌ سے بنا ہے۔اس کے اصل معنی کسی چیز کو ڈھانپنے یا چھپانے کے ہیں۔معلقہ کے مشہور شاعر لبید کا مصرع ہے:

((فِيْ لَيْلَةٍ كَفَرَ النُّجُوْمَ غَمَامُهَا))

”ایک رات جس میں بادلوں نے ستاروں کو ڈھانپ (چھپا) دیا تھا۔“

عربی میں کسان کو بھی کافر کہتے ہیں، کیونکہ وہ زمین میں بیج کو چھپا دیتا ہے۔کافر کو کافر اس لیے کہتے ہیں کہ وہ حق بات کو دل میں چھپا لیتا ہے۔کافر کی جمع كُفَّارٌ ہے۔قرآن مجید میں 'کفار' کا لفظ کسانوں کے لیے بھی آیا ہے:

﴿كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا﴾

(الحدید 20:57)

”جیسے زمین پر بارش برسی۔پھر اس کی پیداوار دیکھ کر کسان خوش ہوئے۔پھر وہ کھیتی خشک ہو کر زرد نظر آنے لگی اور پھر چورا چورا ہو کر رہ گئی۔“

کافر کے مقابل میں مومن کلمہ اور کفر کے مقابل میں ایمان کا لفظ آتا ہے۔

اسلامی اصطلاح میں کفر سے مراد ان چیزوں کا انکار ہے، جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پھر کفر کا لفظ ناشکری کے معنوں میں بھی آتا ہے لیکن ایسے موقع پر اس کے ساتھ کسی نعمت کا حوالہ یا قرینہ موجود ہوتا ہے جیسے:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّ اَحَلُّوْا قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِo﴾

(ابراھیم 14:28)

''کیا تو نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا، جنہوں نے اللہ کی نعمت کی ناشکری کی، اور اپنی قوم کو ہلاکت کے گھر تک پہنچا دیا۔''

کبھی کفر کا لفظ شکر کے مقابل میں بھی آتا ہے:

﴿فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِo﴾ (البقرہ 2:152)

''پس تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو، میری ناشکری نہ کرو۔''

خَتَمَ: ...... اس کے معنی 'مہر لگانے' کے ہیں۔ مہر (SEAL) کو عربی میں خَاتَمٌ کہتے ہیں۔ خَتَمَ کا مطلب ہے، کسی چیز کو اس طرح بند کر دینا کہ اس میں نہ کوئی چیز داخل ہو سکے اور نہ اس پر کوئی اور چیز اثر انداز ہو سکے۔

قُلُوْبِهِمْ: ......قلوب، قلب کی جمع ہے، جس کا ترجمہ عام طور پر 'دل' کیا جاتا ہے، لیکن عربی زبان میں قَلْب اور فُؤَاد کے معنی صرف 'دل' کے نہیں ہوتے بلکہ اس سے 'دل و دماغ' دونوں مراد ہوتے ہیں۔

سَمْعِهِمْ: ...... 'سمع' کے معنی ہیں: سننا، سننے کی طاقت یعنی سماعت اور کان۔ یہ لفظ قرآن میں ان تینوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ البتہ جہاں سمع کا لفظ قُلُوْب (دلوں)، اَبْصَار (آنکھوں) کے ساتھ عطف کے طور پر آتا ہے، وہاں اس کے معنی، 'اذَانٌ' یعنی کانوں (EARS) کے ہوتے ہیں اور اس جگہ یہ کانوں ہی کے معنوں میں آیا ہے۔ اس کی ایک اور نظیر یہ ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَo﴾

(النحل 16:108)

''یہی لوگ ہیں، جن کے دلوں اور کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے اور وہ غافل ہیں۔''

گویا اس اسلوب میں مصدریت غالب آ جاتی ہے اسمیت پر۔

اَبْصَارِهِمْ: ...... اَبْصَار جمع ہے بَصَرٌ کی، جس کے معنی آنکھ کے ہیں اور یہ نظر کے معنی میں بھی آتا ہے۔ اس جگہ اس سے مراد آنکھیں ہیں۔

غِشَاوَةٌ: ......اس کے معنی 'پردے' کے ہیں۔ ﴿وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ﴾ میں جَعَلَ محذوف ہے۔ اصل میں یوں ہے: ﴿وَجَعَلَ عَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَة﴾ ''اور اس نے ان کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا ہے۔''

ان دو آیتوں میں جن کافروں کا ذکر ہے وہ عام کافر نہیں ہیں، بلکہ کٹر قسم کے کفار ہیں، کیونکہ ان کے بارے میں یہ

کہا گیا ہے کہ:

1۔ ان کو ڈرانا نہ ڈرانا برابر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو سمجھانا یا نہ سمجھانا برابر ہے۔ (یاد رہے کہ ہر نبی کی دعوت و تبلیغ کا پہلا مرحلہ ڈرانا ہے اور دوسرا خوش خبری دینا)

2۔ وہ کبھی ایمان نہیں لائیں گے۔

3۔ ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

ظاہر ہے یہ حال سب کافروں کا نہیں ہو سکتا۔ ان میں بہت سے ایسے تھے جو شروع میں کافر تھے، مگر بعد میں انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اصل میں اس جگہ جن کافروں کا ذکر ہے، اس سے قریش اور اہل کتاب کے وہ سردار مراد ہیں جنہوں نے اپنے مخصوص مفادات کی خاطر نبی ﷺ کی دعوتِ دین کا بڑی شد و مد سے انکار کیا اور حسد، تکبر اور غرور کے ساتھ اسلام کی مخالفت پر اتر آئے۔ ان سرداروں کا کفر عام کفر نہ تھا بلکہ کفرِ جحود یعنی ضد کا کفر تھا جس کے بعد ان میں ایمان لانے کے صلاحیت اور استعداد ہی باقی نہیں رہی تھی، جیسے قریش میں سے ابوجہل اور عتبہ اور یہودیوں میں سے کعب بن اشرف اور حیّی بن اخطب وغیرہ۔

ان دونوں آیات میں نبی ﷺ کے لیے تسلی ہے کہ ایسے لوگ کبھی ایمان نہ لائیں گے، اس لیے آپ ﷺ ان کے ایمان نہ لانے کا غم نہ کریں۔

دل پر مُہر لگ جانے سے کیا مراد ہے؟

اس جگہ دلوں پر مہر لگ جانے کا ذکر آیا ہے۔ اسی چیز کو قرآن نے کہیں ''دلوں پر ٹھپہ لگ جانے'' سے تعبیر کیا ہے:

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَ سَمْعِهِمْ وَ اَبْصَارِهِمْ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۝﴾ (النحل 108:16)

''یہی لوگ ہیں، جن کے دلوں، کانوں اور آنکھوں پر اللہ نے ٹھپہ لگا دیا ہے اور وہ غافل ہیں۔''

کہیں اسے ''دلوں کا سخت ہو جانا'' کہا ہے:

﴿ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً﴾ (البقرہ 74:2)

''پھر اس کے بعد تمہارے دل ایسے سخت ہو گئے جیسے پتھر بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت۔''

﴿فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ؕ﴾ (الزمر 22:39)

''پس ہلاکت ہے، ان کے لیے جن کے دل اللہ کی یاد سے غافل ہو کر سخت ہو گئے۔''

کسی مقام پر اسے ''دلوں پر زنگ لگ جانا'' قرار دیا ہے:

﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝﴾ (المطففین 14:83)

''ہرگز نہیں، بلکہ ان لوگوں کے دلوں پر ان کی بداعمالیوں کا زنگ لگ گیا ہے۔''

کسی جگہ اسے ''غافل ہونا'' یا ''دلوں کا غافل ہونا'' بتایا ہے:

﴿وَ لَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَ الْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۫ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ۝﴾ (الاعراف 179:7)

''اور ہم نے بہت سے جنوں اور انسانوں کو اُن کے برے اعمال کی وجہ سے دوزخ کے لیے پیدا کیا ہے۔ اُن کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں، اُن کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے نہیں، اُن کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ ایسے ہیں جیسے جانور بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے۔ یہی لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔''

﴿لَاهِيَةً قُلُوْبُهُمْ ؕ﴾ (الانبیاء 3:21)

''ان کے دل غافل ہیں۔''

اسی مضمون کو ایک حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

((عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ ؓ ، عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ قَالَ: اِنَّ الْعَبْدَ اِذَا اَخْطَاَ خَطِيْئَةً نُكِتَتْ...... فِیْ قَلْبِهٖ نُكْتَةٌ سَوْدَاءُ فَاِذَا هُوَ نَزَعَ وَاسْتَغْفَرَ وَتَابَ سُقِلَ قَلْبُهٗ، وَاِنْ عَادَ زِيْدَ فِيْهَا حَتّٰى تَعْلُوْ قَلْبَهٗ وَهُوَ الرَّانُ الَّذِیْ ذَكَرَ اللّٰهُ "كَلَّا ، بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ))

(ترمذی، رقم: 3334۔ ابن ماجه، رقم: 4244)

''جب کوئی مومن گناہ کر بیٹھتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے دل میں ایک سیاہ دھبہ سا پڑ جاتا ہے۔ پھر اگر وہ باز آ جاتا ہے، اللہ سے معافی مانگ لیتا ہے اور توبہ کر لیتا ہے تو اس کے دل کا وہ دھبہ صاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ بار بار گناہ کرتا ہے تو ان گناہوں کی سیاہی پورے دل پر چھا جاتی ہے۔ یہی وہ رَیْن (زنگ) ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمایا ہے کہ:

﴿كَلَّا بَلْ ۜ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ۝﴾ (المطففین 14:83)

''ہرگز نہیں، بلکہ ان لوگوں کے دلوں پر ان کی بداعمالیوں کا زنگ لگ گیا ہے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار نہیں ہے بلکہ جب وہ جان بوجھ کر حق بات کی مخالفت کرتا ہے تو پھر اس کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور یہ مہر لگنا اس کے اپنے گناہوں کا قدرتی نتیجہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہوتا ہے کیونکہ بندے نے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کی ہوتی ہے اور خداداد صلاحیتوں کو صحیح طور پر کام میں نہیں لایا ہوتا۔ اسی لیے آخر میں فرما دیا کہ ﴿وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ﴾ ''اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔'' گویا آخرت کا یہ عذاب، گناہوں کے نتیجے میں دلوں پر مہر لگنے کا شاخسانہ ہوگا۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ٨

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا

يَشْعُرُوْنَ ٩ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ

اَلِيْمٌ ۢ ۙ بِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ١٠ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا

اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ١١ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ١٢

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ١٣ وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ١٤

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ١٥ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ

اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۠ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ١٦

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَاۗءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ

بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ١٧ صُمٌّ ۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا

يَرْجِعُوْنَ ١٨ اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَاۗءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ

اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ ۢ

بِالْكٰفِرِيْنَ ١٩ يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَهُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ۙ

وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ۭ

اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۲۰

''بعض لوگ کہتے ہیں ''ہم بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔'' حالاں کہ وہ ایمان والے نہیں۔ وہ اللہ کو اور ایمان والوں کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، مگر وہ صرف اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں اور وہ نہیں سمجھتے۔ ان کے دلوں میں کھوٹ ہے، جسے اللہ نے اور بڑھا دیا ہے۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے، کیونکہ وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ جب ان سے کہا جاتا ہے زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں: ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ یاد رکھو، یہی لوگ فسادی ہیں مگر سمجھتے نہیں۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے، تم بھی ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے تو کہتے ہیں: کیا ہم اس طرح ایمان لائیں جیسے بے وقوف لوگ ایمان لائے۔ یاد رکھو، اصل میں بے وقوف یہی ہیں لیکن یہ نہیں جانتے۔ جب یہ ایمان والوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم بھی ایمان لائے۔ اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں: ہم تمہارے ساتھ ہیں، مسلمانوں سے تو ہم مذاق کرتے ہیں۔ اللہ ان لوگوں کو ان کے مذاق کا مزہ چکھائے گا۔ ابھی ان کی سرکشی میں انہیں ڈھیل دے رہا ہے اور وہ بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ انہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی۔ انہیں اس سودے میں نہ کوئی نفع ہوا اور نہ وہ ہدایت پا سکے۔''

ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے آگ جلائی۔ جب آگ نے اس کے آس پاس کو روشن کر دیا تو اللہ نے ان کی روشنی بجھا دی اور ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا۔ اب انہیں کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، کبھی سیدھی راہ پر نہیں آئیں گے۔

یا ان کی مثال ایسی ہے جیسے آسمان سے بارش برسے، اس میں اندھیرا ہی اندھیرا ہو، اور گرج اور بجلی ہو۔ وہ کڑک سے ڈر کر موت سے بچنے کے لیے اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس رہے ہوں۔ حالاں کہ اللہ نے کافروں کا گھیراؤ کر رکھا ہے۔ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اچک لے۔ جب بجلی چمکتی ہے تو یہ چل پڑتے ہیں، اور جب ان پر اندھیرا چھا جاتا ہے تو رک جاتے ہیں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں چھین لیتا۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' (8-20)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸﴾ (8)

مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ صاحب ایمان ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں، مگر حقیقت میں ایمان والے نہیں ہیں۔

اس آیت میں جن لوگوں کا ذکر ہے، اس سے عام طور پر منافقین کا وہ گروہ مراد لیا گیا ہے جو ظاہری طور پر مسلمان تھا، مگر باطن میں کافر تھا۔ لیکن ہمارے نزدیک اس مقام پر عام اہل کتاب کے منافق لوگ مراد ہیں اور اس جگہ عام منافقین مراد لینا صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ ان دونوں قسم کے منافقوں میں بڑا نمایاں فرق تھا۔

1۔ عام منافقین اپنے آپ کو مسلمانوں میں شامل رکھتے تھے مگر یہ گروہ ظاہری اور باطنی طور پر اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار نہیں کرتا تھا۔

2۔ عام منافقین اپنے آپ کو مسلمانوں کا دشمن ظاہر نہیں کرتے تھے۔ اگرچہ بعض موقعوں پر ان کی دشمنی خود بخود کھل کر سامنے آجاتی تھی، لیکن یہ لوگ غرور اور حسد کا شکار تھے اور مسلمانوں کو علانیہ بے وقوف کہتے تھے۔

3۔ ان آیات کے نزول تک عام منافقین کا گروہ ابھی نمایاں طور پر سامنے نہیں آیا تھا۔ جب کہ اہل کتاب میں سے عام یہودی بالکل نمایاں تھے اور اس جگہ وہی مراد ہیں۔ اور قرآن نے ان کو بھی ان کے غرور، حسد، بغض اور بدنیتی کی وجہ سے منافق قرار دیا ہے۔

اگرچہ قرآن میں جہاں بھی ﴿فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ﴾ کے الفاظ آئے ہیں، ان سے عام طور پر منافقین ہی کا گروہ مراد لیا گیا ہے اور یہ صحیح بھی ہے۔ لیکن عربی زبان میں ((فُلَانٌ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ)) کے یہ معنی ہوتے ہیں: ''فلاں شخص کے دل میں بدنیتی ہے۔'' ''اس کے دل میں کھوٹ ہے۔'' ''اس کی نیت خراب ہے۔'' ''وہ بدنیت آدمی ہے۔'' اور ضروری نہیں کہ ایسا شخص اصطلاحی طور پر ''منافق'' ہی ہو۔

سورۂ الاحزاب میں ازواج مطہرات کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ:

﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًاۚ﴾ (الاحزاب 32:33)

''اے نبی کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ اگر تم اللہ سے ڈرنے والی ہو تو کسی نامحرم سے بات کرتے ہوئے اپنے لہجے میں نرمی اختیار نہ کرو کہ جس شخص کی نیت خراب ہو وہ لالچ میں پڑ جائے، بلکہ صاف اور کھری بات کہو۔''

اس آیت میں ﴿الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ﴾ ''جس کے دل میں کھوٹ ہے۔'' ''جس کی نیت خراب ہے۔'' ''جو بدنیت ہے۔''

ظاہر ہے اس سے اصطلاحی ''منافق'' مراد لینا ضروری نہیں ہے۔

قرآن کے اولین مخاطبین دو ہی گروہ تھے۔ ایک عرب کے مشرکین۔ جن کو ''امیین'' کہا جاتا تھا، اور دوسرے اہل کتاب تھے۔

پھر مشرکین میں کچھ ایسے تھے جو دینِ حنیفی کے پیروکار اور موحد تھے۔ بت پرستی سے بیزار تھے۔ ان کو حق کی تلاش تھی۔ جب ان لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچی تو انہوں نے اسے جلد قبول کر لیا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو شروع میں کافر تھے مگر بعد میں مسلمان ہو گئے۔ سورۂ البقرہ آیت 3 میں ان دونوں قسم کے مومنین کا ذکر ہے۔ لیکن ان میں سے کئی مشرک سردار ایسے تھے جنہوں نے ضد اور ہٹ دھرمی کے ساتھ کفر کی راہ اختیار کی اور وہ آخر دم تک اسلام کے دشمن رہے۔ ان

کے دلوں پر مہر لگا دی گئی اور یہ ایمان لانے کی صلاحیت سے عاری ہو گئے۔ آیت 6 اور 7 میں انہی کٹر قسم کے کافروں کا ذکر آیا ہے۔

قرآن کا دوسرا مخاطب گروہ اہل کتاب یعنی یہود ونصاریٰ کا تھا لیکن ان میں بھی کئی طرح کے لوگ تھے۔

ایک وہ تھے جو اپنے مذہب یہودیت یا نصرانیت کے سچے پیروکار تھے۔ حق پسند اور سلیم الفطرت تھے۔ جب ان کو رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا علم ہوا تو ان لوگوں نے بہت جلد اسلام قبول کر لیا۔ آیت 4 میں انہی کا ذکر ہے۔

پھر ان میں بعض علماء اور سردار تھے جو آخر وقت تک اسلام کے مخالف رہے۔ ان کے دلوں پر بھی مہر لگ گئی اور یہ لوگ بھی ایمان لانے سے محروم ہوئے۔ آیت 6 اور 7 میں جن کٹر کفار کا ذکر ہے، ان میں یہ لوگ بھی شامل ہیں، جیسے کعب بن اشرف اور حیی بن اخطب وغیرہ۔

ان کے علاوہ عام اہل کتاب بھی تھے جو ایمان کا دعویٰ تو کرتے تھے، مگر ایمان سے خالی تھے۔ آخرت کو بھی مانتے تھے مگر ان کا آخرت کو ماننا یا نہ ماننا برابر تھا۔ کیونکہ وہ اپنے آپ کو ''بخشے بخشائے'' سمجھتے تھے۔ یہ بگڑے ہوئے اہل کتاب تھے۔ اوہام (SUPERSTITIONS) کا شکار تھے اور خوش فہمیوں (امانی) میں مبتلا تھے۔ قرآن نے ان کو بھی ان کے کفر، غرور، حسد اور تعصب کی وجہ سے منافقین کہا ہے، حالاں کہ یہ عام منافقین کی طرح نہ تھے جو ظاہر میں مسلمان اور باطن میں کافر تھے اور جن کا ذکر آگے چل کر سورۂ آل عمران اور سورۂ النساء میں آئے گا جو سورۂ البقرہ کے کچھ عرصہ بعد نازل ہوئی ہیں، جب منافقین کا گروہ معاشرے میں نمایاں ہو کر سامنے آچکا تھا۔

اس مقام پر بعض لوگوں کو، جو قرآن کے ایک خاص اسلوب سے صحیح طور پر واقف نہیں ہیں، یہ غلط فہمی لاحق ہو گئی ہے کہ یہودی منافقین کا مذکورہ گروہ صرف اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھنے کا دعویٰ کرتا تھا جب کہ حقیقت یہ ہے کہ وہ لوگ پورے ایمان کا دعویٰ کرتے تھے، جس میں نبیوں اور کتابوں وغیرہ پر بھی ایمان لانا شامل تھا کہ ہم بھی ایمان والے ہیں۔ لیکن چونکہ وہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت اور قرآن پر ایمان نہیں رکھتے تھے، اس لیے ان کے بارے میں کہا گیا کہ ﴿مَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ﴾ کہ ''وہ مومن نہیں ہیں۔'' قرآن کا یہ اسلوب بہت عام ہے کہ وہ صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا ذکر کر کے اس سے پورا ایمان مراد لیتا ہے جس میں نبیوں اور کتابوں وغیرہ پر بھی ایمان لانا شامل ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۂ النور میں ہے کہ:

﴿اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۚ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ۝﴾

(النور 2:24)

''زانی عورت اور زانی مرد دونوں میں سے ہر ایک کو سو (100) کوڑے مارو، اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو تو اللہ کے حکم کی تعمیل میں تمہیں ان دونوں پر رحم نہیں آنا چاہیے۔ اور ان دونوں کی سزا کے

وقت مسلمانوں کا ایک گروہ وہاں موجود ہونا چاہیے۔"

دیکھ لیجیے، اس جگہ صرف ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت کا ذکر ہے مگر اس سے مراد مکمل ایمان ہے۔

ایک اور مثال دیکھیے۔ سورۃ النساء میں ہے کہ:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَیْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِیْلًا۠﴾ (النساء 59:4)

"اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی، اطاعت کرو رسول کی، اور ان کی جو تم میں سے صاحبِ اختیار ہیں۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور اس کے رسول کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔"

مذکورہ آیت میں بھی صرف اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کو پورا ایمان لانا قرار دیا گیا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اس آیت 8 میں عام اہل کتاب مراد ہیں اور ان کے کفر، حسد، تعصب اور بغض کی وجہ سے ان کو بھی منافق کہا گیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

یہ آیت آج ان مسلمانوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے جو زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر اپنے اعمال میں کافروں سے بھی بدتر ہیں۔

﴿یُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَ مَا یَخْدَعُوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَ مَا یَشْعُرُوْنَ ۟ؕ﴾ (9)

پہلے ان یہودی منافقوں کے بارے میں بتایا گیا کہ یہ ایمان کے مدعی تو ہیں مگر حقیقت میں ایمان والے نہیں ہیں۔ اب اس جگہ ان کی یہ خصوصیت بیان کی جا رہی ہے کہ یہ لوگ اپنے دل کا حسد اور تعصب چھپا کر اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ جب کہ اللہ سبحانہٗ ان کی ہر چھپی اور ظاہر حرکت کو جانتا ہے۔ اس لیے یہ اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کو دھوکا دینے کی جو کوشش کر رہے ہیں، وہ حقیقت میں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں لیکن ان کو اس کا شعور نہیں ہے۔ بالآخر یہ لوگ اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے۔

﴿فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ۬ ۙ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۟﴾ (10)

عربی محاورہ ہے کہ ((فُلَانٌ فِیْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ)) "فلاں شخص کے دل میں فتور ہے" یا اس کے دل میں بدنیتی ہے، یا اس کی نیت خراب ہے۔ مَرَضٌ کے اصل معنی تو شک کے ہیں مگر یہ منافقت، تعصب، حسد اور دشمنی کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس آیت میں اہل کتاب کے عام یہود مراد ہیں۔ جنہوں نے حسد اور تعصب کی بنا پر نبی ﷺ کی

دعوت کا انکار کیا۔ پھر جس قدر اسلام پھیلتا گیا، اسی نسبت سے ان لوگوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف حسد، تعصب اور بغض بڑھتا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں فرما دیا کہ ان کو ان کے ایمان کے جھوٹے دعوے اور اسلامی دشمنی کی وجہ سے آخرت میں دوزخ کا دردناک عذاب ہوگا۔

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ﴿١١﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَ لٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿١٢﴾﴾ (12,11)

'فساد فی الارض' قرآن کی ایک اصطلاح ہے، جس سے مراد کوئی متعین جرم یا گناہ نہیں ہوتا، بلکہ اس کے مفہوم میں شریعت کے کسی بھی حکم کی خلاف ورزی سے لے کر اسلامی نظم اجتماعی کے خلاف بغاوت تک، ہر قسم کے جرائم اور گناہ شامل ہوتے ہیں۔ قرآن کی رُو سے چوری بھی فساد فی الارض ہے، جیسا کہ سورۂ یوسف 73:12 میں چوری کا الزام لگنے پر یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کا بیان ہے کہ:

﴿قَالُوْا تَاللّٰهِ لَقَدْ عَلِمْتُمْ مَّا جِئْنَا لِنُفْسِدَ فِي الْاَرْضِ وَمَا كُنَّا سٰرِقِيْنَ﴾ (یوسف 73:12)

''انہوں (یوسف علیہ السلام کے بھائیوں) نے کہا: اللہ کی قسم! تمہیں معلوم ہے ہم لوگ زمین میں فساد کرنے نہیں آئے، ہم چور نہیں ہیں۔''

اسی طرح ناپ تول میں کمی کرنا بھی فساد فی الارض ہے۔ (ہود 85:11)۔ تکبر اور استکبار بھی فساد فی الارض ہے۔ (القصص 83:28) اور اسلامی حکومت سے بغاوت کرنا بھی فساد فی الارض ہے۔ (المائدہ 33:5)

عربی زبان میں ''فساد'' کی ضد ''صلاح'' (یا اصلاح) ہے۔

اس مقام پر عام یہودیوں کا فساد فی الارض یہ تھا کہ انہوں نے حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت اور قرآن پر ایمان لانے کی بجائے ان کا انکار کیا۔ اپنی یہودیت کو راہِ ہدایت، دین حق اور نجات کا راستہ سمجھا۔ مسلمانوں کو سرعام بے وقوف کہا۔ کفر و اسلام کی کشمکش میں کفار و مشرکین کا ساتھ دیا اور دین اسلام کو پھیلنے سے روکنے کے لیے اس کی راہ میں روڑے اٹکائے۔

﴿اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ﴾ ''ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔'' کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس کا قول ہے کہ:

((إنما نُريد الاصلاح بين الفريقين من المؤمنين واهل الكتاب))

''ہم تو مسلمانوں اور اہل کتاب (یہودیوں) کے درمیان صلح صفائی چاہتے ہیں۔''

افسوس! آج مسلمانوں کے کتنے ہی حکمران، سیاسی لیڈر اور مذہبی پیشوا ایسے ہیں جو اصلاح کے نام پر فساد فی الارض کے مرتکب ہیں۔

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ وَ لٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣﴾﴾ (13)

اَلسُّفَهَاءُ:...... یہ سَفِیْہٌ کی جمع ہے جس کے معنی بے وقوف اور احمق کے ہیں۔

جب یہودیوں کو دین حق کی دعوت دی جاتی اور ان سے یہ کہا جاتا کہ جس طرح دوسرے لوگ...... مہاجرین، انصار اور دوسرے صحابہ کرام جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ ایمان لائے ہیں، اس طرح تم بھی ایمان لاؤ، تو جواب میں بڑی رعونت اور تکبر سے کہتے "یہ سب تو بے وقوف ہیں۔ ہم ان کی طرح کے نہیں ہیں کہ ایمان قبول کر کے اپنی حماقت کا ثبوت دیں۔

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ یہ لوگ تمہیں بے وقوف کہہ رہے ہیں حالاں کہ بے وقوف یہ خود ہیں اور نہیں جانتے کہ صحیح ایمان کیا ہوتا ہے۔ فساد اور اصلاح میں کیا فرق ہے اور خود ان کا اپنا نفع نقصان کس چیز میں ہے۔

﴿كَمَآ آمَنَ النَّاسُ﴾ "جیسے دوسرے لوگ ایمان لائے۔" میں لفظ "كَمَا" (جیسے) سے بعض لوگوں نے یہ مطلب سمجھا ہے کہ سچائی اور خلوص سے ایمان لانا مراد ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ محض تکلف ہے کیونکہ دوسرے مقام پر انہی یہودیوں کے بارے میں فرمایا کہ:

﴿فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَآ آمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ﴾ (البقرہ 137:2)

"پھر اگر یہ اہل کتاب یہودی بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم مسلمان ایمان لائے ہو تو پھر یہ بھی ہدایت پا گئے۔ لیکن اگر وہ منہ موڑیں تو پھر وہ ضد میں اَڑے ہوئے ہیں۔"

﴿وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿١٤﴾﴾ (14)

شَيَاطِيْنُ جمع ہے شیطان کی۔ ہر سرکش، شریر اور خودسر خواہ وہ انسان ہو یا جن، شیطان ہے۔ اس جگہ کفار و یہود کے سرداروں کو شیاطین کہا گیا ہے کیونکہ وہی اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ جب عام یہودی لوگ مسلمانوں سے ملتے تو کہتے "جناب! صرف آپ لوگ ہی ایمان والے نہیں ہو، ہم بھی ایمان والے ہیں۔ بلکہ جدی پشتی مومن ہیں۔" وہ کبھی یوں نہ کہتے کہ: ہم بھی ان سب چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں جن پر تم ایمان رکھتے ہو۔ کیونکہ اس طرح کا ایمان رکھنے والوں کو وہ علانیہ بے وقوف کہا کرتے تھے۔ یاد رہے کہ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور قرآن پر ایمان لانے والوں کو ہی وہ احمق کہتے تھے۔

یہ عام قسم کے یہودی بھی اگرچہ اسلام کے خلاف تھے مگر اپنے ان سرداروں کی طرح اسلام کے کٹر دشمن نہ تھے، جن کا ذکر آیت 6 اور 7 میں آیا ہے۔ بلکہ یہ لوگ چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان کوئی سمجھوتہ (COMPROMISE) ہو جائے جس کے بعد وہ ایک دوسرے کو برداشت کر لیں۔ ہر فریق اپنے دین پر چلے مگر دوسرے کے دین میں کوئی دخل نہ دے۔ گویا یہ لوگ بین المذاہب ہم آہنگی اور مکالمے (INTER FAITH HARMONY AND DIALOGUE) کے قائل تھے۔ ان کے خیال میں اسلام کی دعوت نے ملک میں افراتفری اور باہمی فساد کی حالت پیدا کر دی ہے جس کی اصلاح کی ضرورت ہے۔ اس لیے جب ان سے کہا جاتا کہ تم

لوگ سچا ایمان قبول کر کے کفر و اسلام کی کشمکش میں اپنا وزن اسلام کے پلڑے میں ڈالو۔ جھوٹ، فریب اور تعصب کے ذریعے فساد فی الارض کا ارتکاب نہ کرو تو یہ جواب دیتے کہ ''ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔'' مسلمانوں سے ''مفاہمت'' اور ''مذہبی رواداری'' کا اظہار کرنے کے بعد جب یہ لوگ اپنے شریر سرداروں کی مجلسوں میں جاتے تو وہاں ان پر ان کے اس طرز عمل پر سخت اعتراض ہوتا تو جواب میں ان سے کہتے ''ارے میاں! ہم تمہارے ہی ساتھی ہیں، مسلمانوں سے سمجھوتے اور صلح صفائی کی باتیں ہم صرف دل لگی اور مذاق کے طور پر کرتے ہیں۔

﴿ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ يَمُدُّهُمْ فِىْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ۝۱۵ ﴾ (15)

مُسْتَهْزِءُ وْنَ کے جواب میں ﴿اَللّٰهُ يَسْتَهْزِءُ بِهِمْ﴾ ''اللہ بھی ان سے مذاق کرتا ہے۔'' فرمانا عربی زبان کے ایک خاص اسلوب کے لحاظ سے ہے، جسے اصطلاح میں ''مشاکلہ'' کہا جاتا ہے۔ اس میں کسی لفظ کے جواب میں وہی لفظ دہرایا جاتا ہے جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ایک غلط کام جس نے کیا ہے، وہ اس کا بدلہ پائے گا، اس کا نتیجہ بھگتے گا اور اسے اس کی غلط حرکت کی سزا دی جائے گی۔ جیسا کہ قرآن مجید میں دوسرے مقام پر ہے کہ:

﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ﴾ (الشوریٰ 40:42)

''اور برائی کا بدلہ اتنی برائی سے لیا جا سکتا ہے جتنی برائی کی گئی۔''

حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ برائی کے بدلے میں جو برائی کی جائے گی وہ حقیقت میں برائی نہیں ہوتی لیکن 'مشاکلت' کی وجہ سے اسے بھی برائی سے تعبیر کیا گیا۔

مشہور جاہلی شاعر عمرو بن کلثوم اپنے ''معلقہ'' میں کہتا ہے:

اَلَا لَا يَجْهَلَنْ اَحَدٌ عَلَيْنَا فَنَجْهَلَ فَوْقَ جَهْلِ الْجَاهِلِيْنَا

''خبردار! کوئی ہمارے خلاف جہالت نہ کرے، ورنہ جاہلوں کی جہالت سے بڑھ کر ہم جہالت کریں گے۔''

مراد ہے کہ بدلہ لیں گے۔

انگلش میں ایسے موقع کے لیے یہ محاورہ بولا جاتا ہے:

"TO PAY IN THE SAME COIN"

طُغْيَان:...... یہ طغی سے ہے جس کے معنی حد سے بڑھنے یا سرکشی کرنے کے ہیں۔

يَعْمَهُوْنَ:...... اس کا ماضی عَمِهَ ہے جس کے معنی ہیں: کسی شخص کا بے بصیرت ہونا۔ عقل کا اندھا ہونا، بدحواس ہونا اور بھٹکا یا بہکا ہوا ہونا۔

اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کے مذاق کرنے کی سزا دے گا۔ ابھی انہیں اتمامِ حجت کے لیے ڈھیل اور مہلت دی جا رہی ہے تاکہ یہ لوگ اپنی سرکشی اور نافرمانی میں ساری حدیں پھلانگ لیں اور گمراہی کی حالت میں پریشان پھریں۔

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى ۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا

مُهْتَدِيْنَ ﴿۱۶﴾ (16)

اِشْتَرٰی کے معنی ''خریدنے'' کے ہیں لیکن قرآن میں یہ لفظ اکثر ''ترجیح دے کر کوئی چیز حاصل کرنے'' کے معنوں میں آیا ہے۔ کیونکہ جو چیز خریدی جاتی ہے وہ اپنی رقم پر ترجیح دے کر ہی خریدی جاتی ہے۔ اس جگہ بھی یہ اسی مفہوم میں ہے۔

عام یہودیوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ انہوں نے ہدایت کی بجائے گمراہی خرید لی۔ ایمان کی جگہ کفر لے لیا۔ اپنے لیے گھاٹے کا سودا کیا۔ اہل ایمان کو بے وقوف کہنے والے خود احمق اور بے وقوف ثابت ہوئے۔ ہدایت کی سیدھی راہ پر چلنے کی بجائے گمراہی کی بھول بھلیّوں میں بھٹکتے پھرنے کو ترجیح دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ایمان سے محروم اور ہدایت کی منزل سے دور ہو گئے۔

یاد رہے کہ عرب یہودیوں کی اکثریت نے اسلام قبول نہیں کیا تھا۔

﴿مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَاءَتْ مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِيْ ظُلُمٰتٍ لَّا يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾﴾ (17)

مَثَلٌ (یا مِثْلٌ) کے معنی ''مثال''، ''حالت'' اور ''کیفیت'' کے ہیں۔

ذَهَبَ (بِ) کے معنی اَذْهَبَ کے ہیں کہ ساری روشنی لے گیا۔

یہ مثال ان یہودی سرداروں (جیسے کعب بن اشرف وغیرہم) کے بارے میں بیان ہوئی ہے جو اپنے ذاتی مفادات کی خاطر اسلام کے کٹر دشمن اور مخالف بن گئے تھے اور جن کا ذکر آیت 6 اور 7 میں آ چکا ہے۔ ان کے سامنے ایک روشنی نمودار ہوئی، جس نے اپنے ماحول میں اجالا کر دیا، لیکن جب ان لوگوں نے نہ تو اس روشنی کی کوئی قدر کی، اور نہ اس سے کوئی فائدہ اٹھایا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے روشنی ختم کر دی، ان کو اندھیروں میں چھوڑ دیا، جہاں ان کو کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ (18)

﴿صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ﴾ کے الفاظ حرف عطف ''واؤ'' کے بغیر لانے میں بلاغت کا یہ نکتہ ہے کہ ان لوگوں میں بیک وقت یہ تینوں صفات پائی جاتی ہیں۔ جیسا کہ اسمائے حسنیٰ بھی بغیر واؤ کے آتے ہیں۔ اب گویا ان لوگوں کے کان بہرے ہیں کہ حق بات سن نہیں سکتے۔ ان کی زبانیں گنگ ہیں کہ حق بات کہہ نہیں سکتیں۔ ان کی آنکھیں اندھی ہیں کہ حق ان کو نظر نہیں آتا۔ یہ لوگ سوچنے سمجھنے اور غور وفکر کرنے کی ساری صلاحیتوں سے عاری ہو چکے ہیں۔ اب ان کا راہ ہدایت کی طرف پلٹنا ناممکن ہو گیا ہے کیونکہ ان کی فطرتِ سلیمہ مردہ ہو گئی ہے اور ان میں قبول حق کی استعداد ختم ہو چکی ہے، ان کی اسی حالت کو آیت 6، اور، 7 میں ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ....﴾ ''اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی۔'' کے الفاظ سے بیان کیا ہے۔

﴿اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹﴾﴾ (19)

صَیِّبٌ:...... کے معنی ''موٹے موٹے قطروں کی زوردار برسنے والی بارش'' کے ہیں۔

صَوَاعِقُ:...... یہ صاعقہ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: آسمانی بجلی جو زمین پر گرتے ہی ہر شے کو جلا کر راکھ کر دیتی ہے۔

یہ دوسری مثال ان عام یہودیوں کی ذہنی حالت کی ہے جن کا ذکر آیت 8 کے الفاظ ﴿وَمِنَ النَّاسِ﴾ سے شروع ہوا ہے۔ گویا ان لوگوں کے سامنے ایک ایسی بارش برسی جس کی کالی گھٹاؤں سے اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا۔ جس میں بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک تھی۔ بجلی گرنے کے خوف اور موت کے ڈر سے وہ اپنی انگلیاں اپنے کانوں میں ٹھونس لیتے ہیں۔ جب وہ چمکتی ہے تو اس کی روشنی میں دو چار قدم چل لیتے ہیں۔ پھر اندھیرا ہو جاتا ہے تو کھڑے رہ جاتے ہیں۔

اس مثال میں بارش سے مراد اسلام کی دعوت ہے، جو بارش کی طرح اہل زمین کے لیے فائدہ مند ہے۔ گرج، کڑک اور اندھیرے اسلامی احکامات ہیں جو ان یہودیوں پر، جو ایمان اور شریعت کے جھوٹے دعوے دار تھے، سخت گراں گزرتے تھے۔ یہ بات ان کے قومی غرور اور نسلی تفوق کے خلاف تھی کہ وہ بنی اسماعیل علیہ السلام کے نبی حضرت محمد ﷺ پر ایمان لائیں۔ یہ لوگ توریت کے علاوہ قرآن مجید کو اللہ کا کلام ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھے۔ ان پر نماز، روزے، زکوٰۃ اور جہاد جیسے احکام بہت بھاری تھے۔ وہ خواہشات کے پجاری، جھوٹی آرزوؤں کے دل دادہ اور نجات پا لینے کی خوش فہمی میں مبتلا تھے۔ ابتدائی دور کے مہاجرین کی تنگ دستی دیکھتے ہوئے ان مفاد پرستوں کو اسلام میں کوئی کشش محسوس نہیں ہوتی تھی۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ یہ اس کے قابو میں ہیں۔ اس کی گرفت سے بچ کر کہیں نہیں جا سکتے، وہ جب چاہے گا ان کو ان کے گناہوں کی سزا دے گا۔

﴿يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ أَبْصَارَهُمْ ۖ كُلَّمَا أَضَاءَ لَهُم مَّشَوْا فِيهِ وَإِذَا أَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوا ۚ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَأَبْصَارِهِمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٢٠﴾﴾ (20)

وہ اسلام کی دعوت کو پھولتا پھلتا دیکھ کر سخت پریشان اور حواس باختہ ہو گئے تھے۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس صورت حال کا مقابلہ کیسے کریں۔ یہودی سرداروں کے گروہ کے برعکس ان عام یہودیوں میں قبول حق کی تھوڑی بہت صلاحیت موجود تھی مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا اور اسلام کی مخالفت کر کے وہ استعداد بھی ضائع کر دی۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، وہ چاہے تو انسان کو اپنی عطا کی ہوئی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتوں سے جب چاہے، محروم کر دے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴿۲۱﴾ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾

''اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو، جس نے تمہیں پیدا کیا اور ان لوگوں کو بھی جو تم سے پہلے ہو گزرے، تاکہ تم عذاب سے بچ جاؤ۔ اسی نے تمہارے لیے زمین کا فرش بنایا، آسمان کی چھت بنائی، وہ بادلوں سے بارش برساتا اور اس کے ذریعے تمہاری روزی کے لیے پھل اور اناج پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا تم جانتے بوجھتے کسی کو اللہ کا شریک نہ بناؤ۔'' (22-21)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ وَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۙ﴿۲۱﴾﴾ (21)

مومنین، کفار اور یہودی منافقین کے ذکر کے بعد اب تمام انسانوں کو خطاب کر کے وہ اصل دعوت دی جا رہی ہے، جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے ہر زمانے میں پیغمبر بھیجے کہ صرف ایک اللہ کی عبادت کی جائے:

﴿وَ لَقَدْ بَعَثْنَا فِيْ كُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ اجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ ۚ﴾

(النحل: 36:16)

''اور ہم نے ہر امت میں کوئی نہ کوئی پیغمبر بھیجا کہ (اے لوگو!) ایک اللہ کی عبادت کرو اور شیطان سے بچو۔''

بندوں پر اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا حق یہی ہے کہ بندے صرف اسی کی عبادت کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں۔

عبادت کی تشریح سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ اب اس حوالے سے فطری دلیل دی گئی ہے کہ جب تم سب کا خالق ایک ہے تو معبود بھی ایک ہونا چاہیے۔ جب دوسرا کوئی خالق نہیں ہے تو دوسرا کوئی معبود بھی نہیں ہو سکتا۔

یاد رہے کہ قرآن کے اولین مخاطبین اللہ تعالیٰ ہی کو اپنا خالق مانتے تھے، جیسا کہ ارشاد ہوا ہے:

﴿وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ....﴾ (الزخرف 87:43)

''اور اگر ان سے پوچھو کہ ان کو کس نے پیدا کیا؟ تو کہیں گے ''اللہ نے۔''

آخر میں فرمایا کہ صرف اللہ کی عبادت کر کے تم اس کے غضب اور عذاب سے بچ سکتے ہو اور اس کی رضا اور

خوشنودی حاصل کر کے دنیا اور آخرت میں کامیاب ہو سکتے ہو۔

﴿الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّ السَّمَآءَ بِنَآءً ....﴾ (22)

بِنَاءً کے اصل معنی ''کسی چیز پر کوئی دوسری چیز رکھ کر مخصوص شکل بنا دینے'' کے ہیں۔ اس جگہ اس سے مراد یہ ہے کہ آسمان کو گویا ایک شامیانے، یا خیمے، یا گنبد کی گول چھت کی طرح زمین پر تان دیا گیا ہے۔

اس جگہ یہ ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تم انسانوں کے لیے زمین کو فرش کی طرح بچھا دیا تا کہ وہ تمہارے رہنے کی جگہ بن جائے۔ اسی مضمون کو قرآن نے دوسری جگہ اس طرح بیان کیا ہے:

﴿اَللّٰہُ الَّذِیْ جَعَلَ لَکُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا﴾ (المومن 64:40)

''اسی اللہ نے تمہارے لیے زمین کو ٹھکانہ بنایا۔''

اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کے لیے آسمان کو چھت کی طرح بنا دیا۔ اسی بات کو سورۃ الانبیاء میں یوں فرمایا گیا:

﴿وَ جَعَلْنَا السَّمَآءَ سَقْفًا مَّحْفُوْظًا....﴾ (الانبیاء 32:21)

''اور ہم نے آسمان کو محفوظ چھت بنایا۔''

﴿وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّکُمْ ۚ﴾ (22)

اور تمہارا وہی رب ہے جو آسمان (یا بادلوں) سے پانی اتارتا ہے۔ اسے بارش کی صورت میں برساتا ہے۔ پھر اس کے ذریعے پھل میوے اور اناج پیدا کرتا ہے تا کہ تمہیں غذا مہیا کرے۔

جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہوا:

﴿قُلْ مَنْ یَّرْزُقُکُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ....... فَسَیَقُوْلُوْنَ اللّٰہُ ۚ﴾ (یونس 31:10)

''کہہ دیجیے! کون تمہیں آسمان اور زمین سے روزی دیتا ہے؟..........تو وہ کہیں گے، اللہ۔''

﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰہِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۲۲﴾ (22)

اَنْدَادٌ جمع ہے نِدٌّ کی جس کے معنی حریف، مدمقابل اور شریک کے ہیں۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی یہ ساری قدرتیں اور نعمتیں دیکھنے کے بعد تم کسی اور کو اس کا شریک یا حریف نہ بناؤ۔ کیونکہ تم جانتے ہو کہ تمہیں پیدا کرنے والا ایک ہی ہے، اس کے سوا کوئی اور خالق نہیں۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ زمین کا فرش بچھانے والا، آسمان کی چھت بنانے والا، بارش برسانے والا، اس کے ذریعے تمہاری روزی کی خاطر زمین سے پھل میوے اور اناج پیدا کرنے والا ایک ہی ہے، اس کے سوا کوئی اور نہیں۔ جب تم یہ سب کچھ جانتے اور مانتے ہو تو اسی ایک رب کو اپنا معبود سمجھو۔ کسی اور کو اپنا معبود نہ بناؤ صرف اسی کی عبادت کرو۔ اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔ توحید کا اقرار کرو اور ہر قسم کے شرک سے بچو۔

وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۴﴾

''اور اگر تمہیں اس کلام میں ذرا بھی شک ہو جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اتارا ہے، تو تم بھی اس جیسی کوئی سورت بنا لاؤ اور اللہ کے مقابلے میں اپنے سارے حمایتیوں کو مدد کے لیے بلا لو، اگر تم سچے ہو۔ پھر اگر تم ایسا نہ کر سکو، اور تم ہرگز نہ کر سکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن بنیں گے آدمی اور پتھر، اور جو کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔'' (23-24)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۪ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۲۳﴾﴾ (23)

شُهَدَآءُ، شہید کی جمع ہے جس کے اصل معنی گواہ کے ہیں، لیکن اس جگہ یہ ''حمایتی'' اور ''مددگار'' کے معنوں میں ہے، خواہ وہ بت ہوں، یا انسان ہوں، یا جنات ہوں۔ جیسا کہ فرمایا گیا:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَ الْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا۝﴾ (بنی اسرائیل 17:88)

''کہہ دیجیے، اگر تمام انسان اور جنات مل کر اس جیسا قرآن لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔''

مطلب یہ ہے کہ جن منکرین کو حضرت محمد ﷺ پر اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہونے کے بارے میں شک ہے اور وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اس شخص کا اپنا کلام ہے جسے وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کے طور پر پیش کر رہا ہے، تو اگر وہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں تو ان کے لیے چیلنج ہے کہ وہ خود بھی طبع آزمائی کریں، اس کام میں اپنے سارے حمایتیوں کی مدد بھی حاصل کر لیں اور سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا کر پیش کریں۔ پھر فیصلہ ہو جائے گا کہ خالق اور مخلوق کے کلام میں کیا فرق ہوتا ہے۔

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَ لَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ ۚۖ

اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾ (24)

اَلْحِجَارَةُ جمع ہے حَجَرٌ کی، جس کے معنی پتھر ہیں۔ لیکن اس جگہ وہ بت مراد ہیں جن کی دنیا میں پوجا کی گئی۔

فرمایا کہ اگر وہ اس جیسی ایک سورت لانے کے چیلنج کا جواب نہ دے سکیں، اور وہ کبھی بھی اس کا جواب نہیں دے سکیں گے، تو ڈریں جہنم کی اُس آگ سے، جو انسانوں اور پتھروں کو اپنا ایندھن بنالے گی، جو اُن کافروں کے لیے تیار کی گئی ہے جو وحی اور رسالت کا انکار کرتے ہیں۔

اس سے پہلے قرآن مجید نے اپنے مخالفین کو مکے میں چیلنج کیا تھا کہ اگر وہ اسے اللہ تعالیٰ کا کلام نہیں مانتے، کسی مخلوق کا کلام مانتے ہیں تو اس جیسی کوئی ایک سورت ہی بنا کر دکھا دیں، یا اس جیسی دس سورتیں بنا کر لائیں، جیسا کہ سورۂ ہود میں ہے:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (ہود 11:13)

”کیا وہ کہتے ہیں، اس شخص نے قرآن خود گھڑ لیا ہے۔ آپ کہیں: تم بھی ایسی دس (10) سورتیں بنا لاؤ اور اپنی مدد کے لیے اللہ کے مقابلے میں جن کو بلا سکتے ہو، بلا لو، اگر تم سچے ہو۔“

اور تیسرا چیلنج یہ دیا کہ اس قرآن جیسا کوئی قرآن (یا کتاب) بنا کر لاؤ جیسا کہ اوپر سورۂ بنی اسرائیل (17) کی آیت (88) کے حوالے میں آ چکا ہے۔ یہ چیلنج بھی مکی دور میں دیا گیا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ قرآن کے اس چیلنج کا جواب نہ تو اُس زمانے کے منکرین دے سکے تھے جب قرآن کا نزول ہوا، اور نہ اس کے بعد آج تک قرآن کا مخالف کوئی شخص اس چیلنج کا جواب دے سکا ہے۔ ایک آدھ نے اس کی کوشش بھی کی مگر منہ کی کھائی۔ اس کا سبب ظاہر ہے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور معجزہ ہے، جس کی نظیر پیش کرنے سے تمام مخلوقات عاجز اور قاصر ہیں۔

کافروں کے ساتھ جن پتھروں کو دوزخ کی آگ کا ایندھن کہا گیا ہے، ان سے مراد دیوی دیوتاؤں کے وہ بت ہیں جو پتھروں سے تراش کر بنائے گئے اور جن کو معبود سمجھ کر ان کی پوجا کی گئی۔ ان بتوں کو دوزخ میں ڈالنے سے ان کے پجاریوں کو یہ دکھانا مقصود ہے کہ جن کو تم نے خدائی کا درجہ دیا اور معبود بنا کر پوجا، وہ دنیا میں خود کتنے بے بس اور کمزور ہیں کہ اپنے آپ کو عذاب سے نہیں بچا سکتے۔

یہی مضمون ایک اور جگہ بھی آیا ہے:

﴿اِنَّكُمْ وَ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ ۝ لَوْ كَانَ هٰٓؤُلَآءِ اٰلِهَةً مَّا وَرَدُوْهَا ؕ وَ كُلٌّ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ (الانبیاء 21:98,99)

”بے شک تم اور تمہارے معبود جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے تھے، سب دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔ تمہیں وہیں

جانا ہے۔ اگر وہ سچے معبود ہوتے تو دوزخ میں نہ جاتے۔ اور تم سب کو اس میں ہمیشہ رہنا ہے۔"

اعجاز القرآن

اعجاز القرآن یعنی قرآن مجید کے معجزہ (Miracle) ہونے کے کئی پہلو ہیں۔ ذیل میں اس کی چند نمایاں خصوصیات بیان کی جاتی ہیں:

1۔ کلام الٰہی (Word of God):

قرآنِ مجید اللہ تعالیٰ کا کلام (Word of God) ہے۔ اس کی دلیل خود قرآنِ میں موجود ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَه ؕ
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ o﴾ (التوبة:6)

"اور اگر کوئی مشرک آپؐ سے پناہ طلب کرے، تو اسے پناہ دے دیں تا کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کی امان کی جگہ پہنچا دیں۔"

آج دنیا میں کوئی اور ایسا کلام نہیں جو کلام الٰہی کہلانے کا مستحق ہو اور کوئی کتاب ایسی نہیں جو اللہ کی کتاب ہو۔ یہ اعزاز آج صرف اور صرف قرآنِ مجید کو حاصل ہے کہ وہ اللہ کا کلام بھی ہے اور اللہ کی کتاب بھی۔

2۔ محفوظ کلام:

قرآنِ مجید سے پہلے کئی الہامی کتب نازل ہوئیں، لیکن آج وہ اپنی اصلی صورت میں کہیں موجود نہیں۔ امتدادِ زمانہ، مذہبی پیشواؤں کی خواہشاتِ نفسانی اور شرارت کے باعث آج کوئی الہامی کتاب اپنی اصلی حالت میں محفوظ نہیں رہی۔ یہ خصوصیت صرف قرآنِ عزیز کو حاصل ہے کہ وہ اول روز سے آج تک اپنی اصلی صورت میں بالکل محفوظ ہے اور ان شاء اللہ قیامت تک محفوظ رہے گا۔ کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔ قرآن اہل ایمان کے سینوں میں اور تحریری طور پر مصاحف کی شکل میں سوا چودہ سو برس سے محفوظ ہے اور اس میں آج تک کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ اس حقیقت کو اپنے اور بیگانے سب تسلیم کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ o﴾ [الحجر:9]

"بے شک ہم نے اس ذکر یعنی قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔"

3۔ مُعجز کلام:

قرآن ایک ایسا معجزہ (Miracle) ہے جس کی زبان، جس کا اسلوب (Style)، جس کا نظم، جس کی فصاحت و

بلاغت اور جس کی اثر انگیزی (Effectiveness) سب معجزہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد ﷺ کو یہ مستقل اور ابدی (Permanent and Eternal) معجزہ عطا فرمایا ہے اس کے علاوہ قرآن عربی زبان کا بھی شاہکار (Masterpiece) ہے۔

قرآن نے اپنے منکرین اور مخالفین (Opponents) کو چیلنج دیا ہے کہ اگر وہ اسے اللہ کا کلام نہیں مانتے تو اس جیسا کوئی اور کلام پیش کریں۔ اس جیسی دس سورتیں لا کر دکھائیں یا کم سے کم ایک ہی سورت اس جیسی بنا کر لے آئیں۔ مگر کوئی شخص قرآن کے اس چیلنج کا جواب نہیں دے سکتا اور کوئی بھی اس جیسا کلام پیش کرنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔

1۔ ایک مقام پر ارشاد ہوا کہ:

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝﴾ [بنی اسرائیل: 88]

''کہہ دیجیے کہ اگر تمام انسان اور جنات مل کر اس جیسا قرآن لانا چاہیں تو نہیں لا سکتے، اگرچہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔''

2۔ دوسرے مقام پر فرمایا کہ:

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ [ھود: 13]

''کیا وہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے قرآن خود گھڑ لیا ہے؟ آپؐ کہیں کہ تم بھی ویسی ہی دس (10) سورتیں بنا کر لے آؤ اور اپنی مدد کے لیے اللہ کے سوا جس کو بلا سکتے ہو بلا لو، اگر تم سچے ہو۔''

3۔ تیسری جگہ ارشاد ہوا کہ:

﴿وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۠ وَ ادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ [البقرۃ: 23]

''اور اگر تمہیں اس کلام کے بارے میں ذرا بھی شک ہو، جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اتارا ہے تو تم بھی اس جیسی کوئی سورت بنا لاؤ اور اللہ کے سوا اپنے سارے حمایتی بھی اپنی مدد کے لیے بلا لو، اگر تم سچے ہو۔''

4۔ کامل ہدایت (Complete Guidance):

قرآنِ مجید پوری انسانیت کے لیے مکمل ہدایت نامہ ہے۔ انسانی زندگی کے ہر شعبے سے متعلق قرآنی ہدایات موجود ہیں۔ قرآن کے علاوہ دوسری ہر الہامی کتاب اس طرح زندگی کے تمام شعبوں کے بارے میں کامل ہدایت دینے سے قاصر ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ ﴾ [البقرۃ:185]

''رمضان وہ مہینہ ہے، جس میں ایسا قرآن نازل ہوا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے۔''

اور یہ قرآنی ہدایت انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط ہے۔

5۔ عالمگیر کتاب:

قرآن سے پہلے کی تمام الہامی کتب کسی خاص علاقے، قوم یا نسل کے لیے ہدایت بن کر آئی تھیں کیونکہ وہ جن پیغمبروں پر نازل ہوئی تھیں وہ بھی کسی خاص علاقے، قوم یا نسل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ لیکن قرآن عالمگیر کتاب ہے، کیونکہ یہ اللہ کے جس رسول حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا وہ سارے جہان کے لیے مبعوث ہوئے تھے۔

قرآن کا ایک عالمگیر ہونا خود قرآنِ مجید سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ وَمَا هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [القلم: 52]

''اور یہ قرآن سارے جہان والوں کے لیے نصیحت ہے۔''

اسی طرح حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا عالمگیر ہونا درج ذیل آیات سے ثابت ہوتا ہے:

1 ....﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ﴾ [الاعراف: 158]

''کہہ دیجیے، اے لوگو! بے شک میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔''

دوسرے مقام پر ارشاد ہوا کہ:

2 ....﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴾ [الانبیاء: 107]

''اور ہم نے آپؐ کو سارے جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔''

6۔ فصیح و بلیغ کلام:

قرآنِ مجید ایک فصیح و بلیغ کلام ہے۔ اس کی فصاحت و بلاغت کی نظیر لانا مخلوق کے بس کی بات نہیں۔ قرآن کے الفاظ کی فصاحت، اس کے معانی کی بلاغت اور اس کا اندازِ بیان (Style)، سب معجزہ ہیں۔ قرآنِ کا اندازِ بیان نظم یا شاعری (Poetry) کا بیان نہیں ہے، لیکن اس میں اعلیٰ درجے کی شعریت موجود ہے۔ اس کا اندازِ بیان نثر (Prose) کا بھی نہیں کیونکہ اس میں جو سجع اور آہنگ (Rythm) پایا جاتا ہے وہ کسی اور نثر میں نہیں۔

دورِ جدید کے نامور مصری ادیب ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے اس حوالے سے کیسی عمدہ بات کہی ہے:

((اَلْقُرْآنُ لَا نَظْمٌ وَّ لَا نَثْرٌ بَلْ هُوَ الْقُرْآنُ))

''قرآن نہ تو نظم ہے، اور نہ نثر، بلکہ قرآن قرآن ہے۔''

7۔ تضاد (Contradiction) سے پاک:

قرآنِ حکیم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور اللہ کا علم ہر شے پر محیط اور حاوی ہے۔ اس کے لیے ماضی، حال اور مستقبل

سب ایک جیسے ہیں۔ اس لیے قرآنِ مجید کی تعلیمات (Teachings) میں کوئی تضاد اور باہم اختلاف نہیں پایا جاتا، بلکہ اس کے مضامین میں مکمل آہنگی (Harmony) اور ارتباط (Integrity) پایا جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿ اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا۝ ﴾

[النساء: 82]

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے آیا ہوتا تو وہ اس کے اندر بڑا اختلاف اور تضاد پاتے۔''

اس کے برعکس دنیا کے فلسفیوں اور دانشوروں کے افکار ونظریات میں ہمیشہ تضاد پایا جاتا ہے۔

8۔ پُرتاثیر (Effective) کلام:

قرآنِ مجید ایک پُرتاثیر کلام ہے۔ اس کی اثر انگیزی مسلّم ہے۔ یہ انسان کے دل ودماغ پر اثر کرتا ہے۔ جب کوئی قاری قرآن پڑھتا ہے، تو اسے سننے والا شخص خواہ قرآن کو سمجھے یا نہ سمجھے اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

قرآن کا یہی وہ اعجاز تھا، جس نے کفار اور مشرکین کی نیندیں حرام کردی تھیں۔ وہ اس کی اثر انگیزی کو جادو سے تعبیر کرتے تھے اور صاحب قرآن علیہ الصلوٰۃ والسلام کو نعوذ باللہ جادوگر کہتے تھے۔

صحابہ کرام کی ایک تعداد صرف قرآن سن کر مسلمان ہوئی تھی۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ اپنی بہن حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے قرآن سن کر اسلام لائے۔ اسی طرح عرب کا سب سے مشہور شاعر لبید بھی قرآن سن کر ہی دائرۂ اسلام میں داخل ہوا تھا۔

اسی مضمون کی یہ متفق علیہ حدیث بھی ہے:

((عَنْ اَبِیْ هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا مِنَ الْاَنْبِيَاءِ مِنْ نَبِيٍّ اِلَّا قَدْ اُعْطِیَ مِنَ الْاٰيَاتِ مَا مِثْلُهٗ آمَنَ عَلَيْهِ الْبَشَرُ، وَاِنَّمَا كَانَ الَّذِیْ اُوْتِيْتُ وَحْيًا اَوْحَى اللّٰهُ اِلَیَّ، وَاَرْجُوْ اَنْ اَكُوْنَ اَكْثَرَهُمْ تَابِعًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

(صحیح بخاری، رقم: 4981۔ صحیح مسلم، رقم: 385)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تمام انبیاء کرام علیہم السلام کو معجزے دیے گئے، جن کے مطابق بعض انسان ان پر ایمان لائے۔ مجھے جو معجزہ عطا ہوا وہ وحی یعنی قرآن مجید ہے جو اللہ تعالیٰ نے میری طرف نازل کیا۔ مجھے امید ہے کہ قیامت کے دن ان (انبیائے کرام) کے مقابلے میں میرے پیروکاروں کی اکثریت ہوگی۔''

وَ بَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَ اُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَ لَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

''اور آپ ﷺ ان کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے، یہ خوش خبری دیں کہ ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے، جن میں نہریں بہتی ہوں گی۔ جب انہیں کھانے کو کوئی پھل پیش کیا جائے گا، تو کہیں گے: یہ وہی ہے جو اس سے پہلے ہمیں دیا گیا۔ حالاں کہ انہیں ملے گا ایک دوسرے سے ملتا جلتا۔ اور وہاں ان کے لیے پاکیزہ جوڑے (SPOUSES) ہوں گے اور وہ ہمیشہ رہیں گے۔'' (25)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اَزْوَاجٌ:...... یہ زوج کی جمع ہے، جس کے معنی جوڑے (SPOUSE) کے ہیں۔ مرد کے لیے عورت زوج اور جوڑا ہے، عورت کے لیے مرد زوج اور جوڑا ہے۔

اس سے پہلے کافروں کے لیے دوزخ کی آگ کے عذاب کا ذکر تھا۔ اب ایمان والوں کے لیے جنت اور اس کی نعمتوں کا ذکر ہے۔ قرآن میں ترہیب و ترغیب کا یہ اسلوب عام ہے۔

ارشاد ہوا کہ اے نبی! آپ ان لوگوں کو جو ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے نیک کام کیے ہیں، جنت کی خوش خبری دے دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنت میں داخلے کا معیار (MERIT) ایمان اور نیک اعمال ہیں۔

فرمایا کہ اہل ایمان جس جنت میں جائیں گے، وہاں سدا بہار باغات ہوں گے جن میں نہریں ہر وقت بہتی ہوں گی۔

مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کے الفاظ سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ باغات کہیں بلندی پر واقع ہوں گے اور ان کے نشیب میں نہریں جاری ہوں گی۔ لیکن عربیت کی رو سے یہ ضروری نہیں ہے۔ بلکہ باغوں کے پاس یا اُن کے بیچوں بیچ بہنے والی نہروں کو بھی مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ کہنا عربی زبان اور روز مرے کے لحاظ سے بالکل درست ہے جس کی دلیل سورۂ الزخرف (51:43) میں موجود ہے۔

﴿وَ نَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ قَالَ يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ﴾ [الزخرف : 51]

''اور فرعون نے اپنی قوم کو جمع کر کے کہا ''اے میری قوم! کیا مصر کی بادشاہی میری نہیں اور یہ میرے پاس بہتی ہوئی نہریں بھی میری نہیں؟ کیا تم لوگ دیکھتے نہیں۔''

ظاہر ہے مصر کی ساری نہریں اور دریا فرعون کے نیچے یا نشیب میں نہ تھے۔

اہل جنت کو جب جب کھانے کے لیے پھل پیش کیے جائیں گے تو وہ دل میں، یا زبان سے کہیں گے کہ اس طرح کے پھل تو ہم پہلے بھی کھا چکے ہیں۔ حالاں کہ وہ صرف شکل وصورت میں ملتے جلتے ہوں گے، لیکن اپنے ذائقے اور لذت کے لحاظ سے مختلف ہوں گے۔ اس کے علاوہ وہاں ان کے لیے پاکیزہ جوڑے (SPOUSES) ہوں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ مرد اور عورتیں ہر طرح کی نجاست اور آلائش سے ہر وقت پاک رہیں گے۔ میاں بیوی پاکیزہ سیرت و اخلاق کے مالک ہوں گے۔ عورتیں حیض ونفاس سے پاک رہیں گے۔

اہل جنت کے بارے میں حدیث میں ہے کہ:

((عَنْ جَابِرٍ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ: اِنَّ اَھْلَ الْجَنَّةِ یَاْكُلُوْنَ فِیْھَا وَیَشْرَبُوْنَ، وَلَا یَتْفِلُوْنَ وَلَا یَبُوْلُوْنَ، وَلَا یَتَغَوَّطُوْنَ، وَلَا یَمْتَخِطُوْنَ۔" قَالُوْا: فَمَا بَالُ الطَّعَامِ؟ قَالَ: جُشَاءٌ وَرَشْحٌ كَرَشْحِ الْمِسْكِ، یُلْھَمُوْنَ التَّسْبِیْحَ وَالتَّحْمِیْدَ كَمَا تُلْھَمُوْنَ النَّفَسَ))

(صحیح مسلم، رقم: 7152)

''حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اہل جنت وہاں کھائیں پئیں گے۔ لیکن نہ وہ تھوکیں گے۔ نہ ان کو پیشاب پاخانے کی حاجت ہوگی۔ اور نہ ان کی ناک سے آلائش نکلے گی۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: تو پھر کھانا کدھر جائے گا؟ فرمایا: صرف ڈکار اور پسینہ آئے گا (جس سے کھانا ہضم ہو جائے گا)۔ پسینہ بھی کستوری کی طرح خوشبودار ہوگا۔ وہ لوگ اس طرح (آسانی اور تسلسل کے ساتھ) اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتحمید کریں گے جیسے تم سانس لیتے ہو۔''

ایک متفق علیہ حدیث قدسی میں جنت کی نعمتوں کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

((عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَةَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی: اَعْدَدْتُ بِعِبَادِیَ الصَّالِحِیْنَ مَا لَا عَیْنٌ رَاَتْ، وَلَا اُذُنٌ سَمِعَتْ، وَلَا خَطَرَ عَلٰی قَلْبِ بَشَرٍ. وَاقْرَءُوْا اِنْ شِئْتُمْ "فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ))

(صحیح بخاری، رقم: 3498۔ صحیح مسلم، رقم: 7132)

''حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے اپنے بندوں کے لیے (جنت میں) ایسی نعمتیں تیار کر رکھی ہیں جن کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کسی کان نے سنا، اور نہ ان کا خیال بھی کسی انسان کے دل و دماغ میں کبھی آیا۔ اگر تم چاہو تو یہ (قرآنی آیت) پڑھ لو ''کوئی کیا جانے کہ لوگوں کے لیے ان کے اعمال کے بدلے میں آنکھوں کی کیا ٹھنڈک چھپا رکھی گئی ہے!''

(السجدہ 17:32)

جنت کے بارے میں عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا یہ قول بھی بہت مشہور ہے کہ:

((لَيْسَ فِي الدُّنْيَا مِمَّا فِي الْجَنَّةِ شَيْءٌ إِلَّا الْأَسْمَاءُ))

مطلب یہ ہے کہ جنت اور اس کی نعمتوں کو وحی کی زبان میں جن الفاظ اور ناموں سے بیان کیا گیا ہے، ان کی اصل حقیقت اس دنیا میں رہتے ہوئے معلوم نہیں ہوسکتی۔

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَأَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَأَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ أَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ إِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ أَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ أَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْأَرْضِ ۭ أُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ وقف لازم

”بے شک اللہ اِس بات سے نہیں شرماتا کہ مچھر یا اس سے بڑھ کر کسی چیز کی مثال بیان کرے۔ پھر جو ایمان والے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ جو مثال اُن کے رب نے دی ہے، وہ ٹھیک ہے۔ مگر جو کافر ہیں، وہ کہتے ہیں: اللہ کا اس مثال کو بیان کرنے سے کیا مطلب ہے؟ اس طرح اللہ اپنی مثالوں کے ذریعے بہتوں کو گمراہ کرتا اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے۔ مگر گمراہ صرف نافرمانوں کو کرتا ہے، جو اللہ سے عہد کر کے اسے توڑ ڈالتے ہیں۔ اللہ نے جس چیز کے جوڑنے کا حکم دیا ہے، وہ اسے توڑتے ہیں اور زمین میں فساد کرتے ہیں۔ یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔“ (26-27)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ أَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ﴾ (26)

ضرب المثل یعنی مثال بیان کرنے کا مطلب ہے: ”کسی حقیقت کو مثال یا تشبیہ کے ذریعے واضح کر کے سمجھانا۔“ ہر فصیح و بلیغ کلام میں مثالیں اور تشبیہیں پائی جاتی ہیں جو اس کلام کا حُسن ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں بھی، جو فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ ہے، مضامین کو واضح کرنے کے لیے مثالوں اور تشبیہوں سے کام لیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ ۚ وَمَا يَعْقِلُهَآ إِلَّا الْعٰلِمُوْنَ ۝﴾ (العنکبوت 43:29)

”اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے (غور کرنے کے) لیے بیان کرتے ہیں۔ لیکن صرف علم والے ہی ان کو سمجھتے ہیں۔“

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ مدینے کے یہودیوں نے قرآن مجید کے بارے میں یہ اعتراض کیا تھا کہ اس میں مکھی (الحج 73:22)، مچھر اور مکڑی (العنکبوت 41:29) جیسی حقیر چیزوں کا ذکر ہے، اس لیے یہ اللہ کا کلام نہیں ہو سکتا۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ وہ اس سے نہیں شرماتا کہ اپنی کوئی بات انسانوں کو سمجھانے کے لیے مچھر یا اس سے بھی چھوٹی چیزوں (مثلاً جراثیم) کی مثال دے۔ کیونکہ مثالیں دینے کا مقصد بعض حقائق اور تصورات (CONCECPTS) کو واضح کر کے لوگوں کو سمجھانا ہوتا ہے۔ اس مقصد کے لیے کسی چھوٹی، بڑی یا حقیر چیز کی مثال دی جا سکتی ہے۔ اس طرح کی مثال کسی کلام کا عیب نہیں ہوتا بلکہ اس کی خوبی اور حسن ہوتا ہے۔ مگر جن لوگوں نے اعتراض ہی کرنا ہوتا ہے، وہ یہ تو نہیں دیکھتے کہ ان کے کسی اعتراض میں کتنی معقولیت (RATIONALE) ہے۔ وہ تو اعتراض برائے اعتراض کرتے ہیں۔

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ ....﴾ (26)

اہل ایمان جب وحی کے کلام میں ایسی مثالیں دیکھتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ ان کا رب جو مثال بھی بیان کرتا ہے، وہ صحیح، برمحل اور مفید ہوتی ہے۔ چونکہ یہ لوگ ہدایت و رہنمائی کے طالب ہوتے ہیں، اس لیے ان کو ایسی مثالوں سے مزید ہدایت و رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ۝﴾ (الشوریٰ 13:42)

''اللہ جسے چاہتا ہے چن لیتا ہے، اور ہدایت اسے دیتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے۔''

مگر جہاں تک منکرینِ حق کا معاملہ ہے، انہیں تو اعتراض کے لیے کوئی بہانہ چاہیے، اس لیے وہ ایسی مثالیں دیکھ کر کہتے ہیں کہ یہ تو ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔ دیکھو جی! اتنی حقیر چیزوں کا ذکر! یہ اللہ کا کلام کیسے ہو سکتا ہے؟

اس کے جواب میں مزید فرمایا:

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّ يَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَ مَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾ (26)

فَاسِقِيْنَ:...... فاسق کی جمع ہے جو ''فسق'' سے بنا ہے۔ فسق کے اصل معنی ((خُرُوْجُ عَنِ الشَّيْءِ)) یعنی ''کسی چیز سے نکل جانے'' کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابلیس کے بارے میں فرمایا ہے کہ وہ اطاعت سے نکل گیا تھا:

﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ﴾ (الکہف 50:18)

''وہ (ابلیس) جنات میں سے تھا۔ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔''

اس مقام پر منافق یہودیوں کو فاسقین کہا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل چکے تھے۔ اس لیے قرآن پر فضول اعتراض کرتے تھے۔

یاد رہے کہ قرآن کی زبان میں فاسق وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے دائرے سے نکل جائے اور اس کی نافرمانی کرے، خواہ یہ نافرمانی چھوٹی ہو یا بڑی، اور خواہ اس کا کرنے والا مسلمان ہو یا کافر۔ اگرچہ قرآن مجید میں یہ لفظ عام طور پر بڑے نافرمانوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ چنانچہ قرآن کہتا ہے کہ:

﴿اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ۭ لَا يَسْتَوٗنَ﴾ (السجدہ 18:32)

”کیا مومن اور فاسق ایک جیسے ہیں؟ یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔“

اس آیت میں ’مومن‘ کے مقابل میں ’فاسق‘ کا لفظ آیا ہے جو کہ کافر کے معنوں میں ہے۔

بعد میں علم فقہ اور علم کلام کی اصطلاح میں فاسق ایسے مسلمان کو کہا جانے لگا جو کبیرہ گناہ کرتا ہو جیسے شرابی اور بے نماز۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے ذریعے جو مثالیں بیان فرماتا ہے، تو اس کے نتیجے میں بہت سے لوگ گمراہ ہوتے ہیں اور بہت سے ہدایت پاتے ہیں۔ ایسی مثالوں سے اہل ایمان کو ہدایت و رہنمائی ملتی ہے، وہ سمجھ جاتے ہیں کہ فلاں مثال دینے میں کیا حکمت ہے اور اصل حقیقت کیا ہے؟ مگر جن کے دلوں میں جہالت اور اسلام دشمنی سمائی ہوئی ہے اور جن کی زندگی سرکشی اور اللہ کی نافرمانی سے عبارت ہے، ان کو ان مثالوں سے سوائے گمراہی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

بارش کی مثال لیجیے، یہ جب زرخیز زمین پر برستی ہے تو اس کو سرسبز و شاداب کر دیتی ہے۔ مگر جب وہ کوڑا کرکٹ کے ڈھیر پر برسے تو اس میں تعفن اور بدبو پیدا کر دیتی ہے۔ یہی کیفیت قرآن مجید کی مثالوں کی ہے، جو اہل ایمان کے لیے ہدایت و رہنمائی کا ذریعہ بنتی ہیں، مگر سرکشوں اور ہٹ دھرموں کے لیے گمراہی کا سبب بن جاتی ہیں۔ شیخ سعدی رحمہ اللہ نے کیا خوب کہا ہے:

باراں کہ در لطافتِ طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در بوم خار و خس

بارش کے عمدہ اور لطیف ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ اُس کے برسنے سے باغوں میں لالے کے پھول اُگتے ہیں مگر ویرانوں میں کانٹے اور جھاڑیاں پیدا ہوتی ہیں۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَ يَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ ؀﴾ (27)

یہ فاسقین کے بارے میں ہے کہ یہ لوگ زبان سے اللہ تعالیٰ کو مانتے اور اس کی اطاعت کا پختہ عہد کرتے ہیں، مگر شریعت کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جن روابط اور تعلقات کو جوڑنے کا حکم دیا ہے، ان کو توڑ ڈالتے ہیں قطع رحمی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کو نہ تو حقوق اللہ کا خیال آتا ہے اور نہ حقوق العباد کا پاس ہوتا ہے۔

ایسے لوگ 'فساد فی الارض' کرتے ہیں۔ دنیا میں اصلاح کی بجائے بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ ان کا کاروبار نفع کی بجائے گھاٹے کا سودا ہے۔ ان کے لیے دنیا میں ذلت و رسوائی ہے اور آخرت میں ان کو اللہ تعالیٰ کا عذاب ملے گا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٨﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ۭ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٩﴾ ع ۹ / ۳

''تم اللہ کا انکار کیسے کر سکتے ہو، جب کہ تم بے جان تھے، اسی نے تمہیں زندگی عطا کی۔ پھر وہی تمہیں موت دے گا۔ پھر وہی زندہ کرے گا، اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔ اسی نے تمہارے لیے زمین میں سب کچھ پیدا کیا۔ پھر وہ آسمانوں کی طرف متوجہ ہوا، اور سات آسمان درست کر کے بنا دیے۔ اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔'' (28-29)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿٢٨﴾ ﴾ (28)

یہ انہی 'فاسقین' کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ تم اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان لانے اور اس کے احکام کی صحیح اطاعت کرنے سے انکار کیسے کر سکتے ہو؟ اس کے لیے تمہارے پاس کیا دلیل ہے؟

اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ توحید کے عقیدے کو نہیں مانتے، اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب، یا اس کے کسی ایک نبی کا بھی انکار کرتے ہیں اور علانیہ اللہ سبحانہٗ کے احکام کی نافرمانی کرتے ہیں، وہ سچے ایمان والے نہیں ہیں۔

فرمایا، انسان ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے مگر خود اپنے وجود کا انکار نہیں کر سکتا۔ جب وہ اپنے وجود کا انکار نہیں کر سکتا تو جس نے اسے وجود بخشا ہے اس کا انکار کیسے کر سکتا ہے؟ کیا کوئی تخلیق یہ دعویٰ کر سکتی ہے کہ اس کا کوئی خالق نہیں؟ کیا کوئی تصویر کہہ سکتی ہے کہ اس کا کوئی مصور نہیں؟ کیا کوئی کتاب بول سکتی ہے کہ اس کا کوئی مصنف نہیں؟

ارشاد ہوا کہ کیا تم اس اللہ کو ماننے سے گریز کر سکتے ہو، یا اُس کی اطاعت کرنے سے فرار کی راہ اختیار کر سکتے ہو، جس نے تمہیں وجود بخشا اور زندگی عطا کی، جس نے ایک دن تم کو موت کے گھاٹ اتار دینا ہے، پھر تمہیں دوبارہ اس لیے اٹھا کھڑا کرنا ہے تا کہ تم سب کو جمع کر کے تمہارے اعمال کا حساب لے؟

اس آیت میں دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی کے لیے دلیل بنایا گیا ہے کہ جو ہستی کسی چیز کو عدم سے وجود میں لا سکتی ہے، کیا وہ مردہ انسانوں کو زندہ نہیں کر سکتی؟

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا﴾ (29)

اس میں لَكُمْ کا لام (لَ) انتفاع کا ہے جس کا مطلب ہے، زمین کی تمام چیزیں انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ پرندے، جانور، مچھلیاں، پہاڑ، دریا، سمندر، درخت، پودے، خوشبو، رنگ اور پھل پھول سب اس لیے بنائے گئے ہیں کہ انسان ان سے فائدہ اٹھائے۔ اور خود اسے کس مقصد کے لیے پیدا کیا گیا؟ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے!

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ﴾ (الذاریات 56:51)

''اور میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا کہ وہ میری عبادت کریں۔''

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ انسان کا درجہ روئے زمین کی تمام مخلوقات سے بڑھ کر ہے، جو صرف اس لیے پیدا کی گئی ہیں کہ انسان ان سے خدمت لے، ان کو اپنے کام میں لائے اور فائدے اٹھائے۔

پھر اس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ انسان جو کہ اشرف المخلوقات ہے، جب وہ زمین کی کسی مخلوق کے آگے جھکتا اور اسے معبود سمجھتا ہے تو نہ صرف شرک کرتا ہے بلکہ انسانیت کی توہین وتذلیل کرتا ہے۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ (29)

اَلسَّمَاءُ:..... اس کے معنی ایک آسمان کے بھی ہیں اور اسم جنس کے لحاظ سے ''آسمانوں'' کے بھی ہیں۔ چونکہ اس کے بعد اس کی ضمیر هُنَّ جمع آئی ہے اس لیے یہ اس جگہ جمع کے معنوں میں ہے۔ اس کی نظیر یہ ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِی السَّمَآءِ﴾ (آل عمران 5:3)

''بے شک اللہ سے کوئی شے چھپی ہوئی نہیں، نہ زمین میں نہ آسمانوں میں۔''

یہ مطلب نہیں ہوسکتا کہ ایک آسمان میں تو کوئی چیز چھپی نہیں، لیکن باقی چھ آسمانوں میں چھپ سکتی ہے۔

مُراد یہ ہے کہ زمین کو بنانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آسمان بنائے۔ پھر ایک نہیں بلکہ سات آسمان اوپر تلے ٹھیک طرح سے بنا دیے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا:

﴿اَلَّذِیْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ؕ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِیْرٌ﴾ (الملك 4,3:67)

''اسی (اللہ) نے اوپر تلے سات آسمان بنائے۔ تم خدائے رحمان کی اس تخلیق میں کوئی نقص نہیں دیکھو گے۔ پھر نگاہ ڈال کر دیکھ لو۔ کہیں تمہیں کوئی نقص دکھائی دیتا ہے؟ بار بار نگاہ دوڑا کر دیکھو، تمہاری نظر تھک ہار کر ناکام واپس لوٹ آئے گی۔''

﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝٢٩﴾ (29)

آخر میں فرمایا کہ جس خالق نے یہ سب کچھ پیدا فرمایا اور جو پوری کائنات کا نظام چلا رہا ہے، وہ زمین و آسمان کی ایک ایک چیز کا علم رکھتا ہے، کوئی چھوٹی بڑی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتی۔

وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّىْ جَاعِلٌ فِى الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ؕ قَالُوْٓا
اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ
بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٣٠ وَ عَلَّمَ اٰدَمَ
الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنْۢبِئُوْنِىْ بِاَسْمَآءِ
هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝٣١ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ
اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ۝٣٢ قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ
اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّىْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۝٣٣ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ
اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ۫ وَ كَانَ مِنَ
الْكٰفِرِيْنَ ۝٣٤ وَ قُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا
رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝٣٥
فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا
بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِى الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝٣٦
فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝٣٧

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٣٩﴾

ع ٤

''اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا: ''میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔'' انہوں نے کہا: کیا تو اسے بنائے گا جو اس میں فساد کرے اور خون بہائے؟ جب کہ ہم تیری تعریف کرتے اور تیری پاکیزگی بیان کرتے رہتے ہیں۔'' اللہ نے فرمایا: ''جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے۔

اور اللہ نے آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام سکھا دیے۔ پھر انہیں فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور فرمایا: اگر تم سچے ہو تو مجھے ان چیزوں کے نام بتاؤ؟ فرشتوں نے کہا: تو پاک ہے۔ ہم صرف اتنا جانتے ہیں جتنا تو نے ہمیں سکھایا۔ بے شک تو علم والا، حکمت والا ہے۔ پھر فرمایا: اے آدم! ان کو بتاؤ ان چیزوں کے نام! جب آدم نے انہیں ان چیزوں کے نام بتا دیے تو اللہ نے فرشتوں سے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ آسمانوں اور زمین کے بھید میں ہی جانتا ہوں اور میں تمہارا ظاہر و باطن سب جانتا ہوں۔''

اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ ''آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا اس نے حکم نہ مانا، الٹا تکبر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

پھر ہم نے آدم سے کہا: تم اور تمہاری بیوی دونوں جنت میں رہو، اور اس میں جہاں سے چاہو، خوب مزے سے کھاؤ پیو لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا، ورنہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔'' لیکن شیطان نے ان دونوں کو بہکا دیا اور انہیں اس عیش کی جگہ سے نکلوا دیا، جس میں وہ تھے۔ اور ہم نے حکم دیا: تم سب یہاں سے چلے جاؤ۔ تم دونوں فریق ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ تمہیں دنیا میں ایک مدت تک رہنا اور فائدہ اٹھانا ہے۔

پھر آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لیے، جن کی برکت سے اللہ نے ان کی توبہ قبول کی۔ بے شک وہ توبہ قبول کرنے والا، رحم والا ہے۔ پھر ہم نے حکم دیا ''تم سب یہاں سے چلے جاؤ۔ اگر میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس آئے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے، انہیں نہ کوئی خوف ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ لیکن جو کفر کی راہ پر چلیں گے اور ہماری نشانیوں کو جھٹلائیں گے، وہ دوزخی ہوں گے اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔'' (30-39)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً ۭ﴾ (30)

اِذْ:...... عربی قاعدے کے لحاظ سے جب فقرے کے شروع میں اِذْ آتا ہے تو اس سے پہلے ایک فعل محذوف

(UNDERSTOOD) ہوتا ہے جیسے اُذْکُرْ (یاد کر)۔ عام طور پر اس کے بعد کوئی واقعہ بیان ہوتا ہے جو یا تو مخاطب کے علم میں ہوتا ہے، یا وہ کوئی مسلمہ حقیقت ہوتی ہے۔ اس جگہ یہ دوسری صورت مراد ہے۔

مَلَائِکَۃُ: ...... یہ مَلَكٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ''فرشتے'' (ANGEL) کے ہیں جو ایک صاحب عقل وشعور اور سمجھ بوجھ رکھنے والی مخلوق ہے اور نور سے پیدا ہوئی ہے، جیسا کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں ہے:

((خُلِقَتِ الْمَلَائِكَةُ مِنْ نُوْرٍ، وَخُلِقَ الْجَانُّ مِنْ نَّارٍ، وَخُلِقَ اٰدَمُ مِمَّا وُصِفَ لَكُمْ))

(صحیح مسلم، رقم: 7495)

''فرشتے نور سے پیدا کیے گئے، جنات آگ سے، اور انسانوں کو تم جانتے ہو (مٹی سے پیدا کیا گیا)۔''

فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کا خاص قرب حاصل ہے۔ یہ لاتعداد ہیں۔ انسانی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کائنات کا نظام چلاتے ہیں۔ ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ جو لوگ (جن میں منکرین حدیث شامل ہیں) ان کو محض قوتیں سمجھتے ہیں اور ان کی ''شخصیت'' کے منکر ہیں، وہ غلطی پر ہیں اور جو لوگ فرشتوں کی پوجا کرتے ہیں، وہ شرک کرتے ہیں اور یہ سب سے بڑا گناہ ہے۔

خَلِیْفَۃٌ: ...... یہ خلف سے بنا ہے۔ عربی زبان میں خلیفہ کے معنی نائب (DEPUTY) یا جانشین (SUCCESSOR) کے ہوتے ہیں۔ اس کی جمع خلفاء اور 'خلائف' ہے۔ قرآن مجید میں خلیفہ کا لفظ ان دونوں معنوں میں آیا ہے۔

خلیفہ، نائب یا قائم مقام کے معنوں میں:

﴿یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ﴾ (صٓ 38:26)

''اے داؤد! بے شک ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے۔ لہٰذا لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلے کریں۔''

خلیفہ، جانشین کے معنوں میں

﴿ثُمَّ جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَیْفَ تَعْمَلُوْنَ﴾ (یونس 10:14)

''پھر ہم نے ان کے بعد زمین پر تمہیں ان کا جانشین بنایا تاکہ ہم دیکھیں تم کیسے اعمال کرتے ہو۔''

اس بارے میں اختلاف ہے کہ مذکورہ آیت میں خلیفہ کا لفظ کن معنوں میں آیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس جگہ یہ 'نائب' یا قائم مقام کے معنی میں ہے۔ انسان اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ اس سے مراد ایسا شخص ہے جو اپنے حقیقی آقا کے دیے ہوئے اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے وہ خود اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرے اور دوسرے انسانوں پر ان کو نافذ کرے۔ لیکن اگر وہ خود آقا بن بیٹھے اور دیے گئے اختیارات کا ناجائز استعمال کرنے لگے تو غدار اور باغی کہلائے گا۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ آپ ﷺ اپنی امت کو وہ واقعہ یاد دلائیں جب اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا تھا کہ میں زمین پر اپنا خلیفہ بنانے لگا ہوں اور اس کے لیے آدم کو پیدا کر رہا ہوں جس کی اولاد ہو گی اور نسل چلے گی۔

اس پر فرشتوں نے عرض کیا:

﴿قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَ يَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ﴾ (30)

فرشتوں نے تعجب سے پوچھا کہ کیا اسے خلیفہ بنایا جا رہا ہے جو زمین پر فساد پھیلائے گا اور خوں ریزی کرے گا؟ یہ بات انہوں نے اس لیے کہی ہو گی کہ جسے اختیار مل جائے گا، وہ اس کا غلط استعمال بھی کر سکتا ہے، جس کے نتیجے میں دنیا میں فتنہ وفساد برپا ہو سکتا ہے اور قتل و غارت ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

پھر اپنے بارے میں کہنے لگے:

﴿وَ نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَ نُقَدِّسُ لَكَ ؕ﴾ (30)

تسبیح:...... اس کے معنی "تنزیهه تعالیٰ عمّا لا يليق به" کے ہیں، جس کا مطلب ہے، اللہ تعالیٰ کو ایسی چیزوں سے پاک اور منزہ سمجھنا جو اس کی شان کے شایاں نہیں ہیں۔ جیسے اسے ہر عیب، نقص اور کمزوری سے پاک سمجھنا۔

تحمید:...... یہ حمد سے ہے۔ اس کے معنی تعریف کرنے اور خوبی بیان کرنے کے ہیں۔

تقدیس:...... یہ قدس سے ہے۔ جس کے معنی ہیں پاکیزگی۔ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر لحاظ سے پاک اور پاکیزہ صفات رکھتا ہے۔

فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہم تو ہر وقت تیری حمد و ثنا اور تسبیح و تقدیس میں لگے رہتے ہیں۔ اس کام سے بڑھ کر کسی مخلوق سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے، جب وہ ہر وقت تیری عبادت کرے؟

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿قَالَ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (30)

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو جواب دیا گیا کہ جو کچھ میں جانتا ہوں، تم نہیں جانتے ہو کہ خلافتِ ارضی کا کون اہل ہے۔ اس معاملے میں تم کیا جانو کون زمین پر میرے قوانین کا نفاذ کر سکتا ہے، عدل و انصاف قائم کر سکتا ہے اور اصلاح کر سکتا ہے۔

یہ گویا پہلی دلیل تھی کہ تمہیں کیا معلوم نئی پیدا ہونے والی مخلوق کن اوصاف کی حامل ہو گی۔ ان میں کیسی کیسی ہستیاں ہوں گی، جن کے علمی و عملی فضائل و محاسن تم سے بھی بڑھ کر ہوں گے۔

اب دوسری دلیل آگے آ رہی ہے، جو انسان کو خلیفہ بنانے کا باعث بنی۔

﴿وَ عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا﴾ (31)

اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو سب چیزوں کے نام سکھا دیے۔ جیسے اونٹ، گائے، بکری، چڑیا وغیرہ۔ یہ گویا کسی چیز کا نام رکھنے اور اس کے اوصاف و خصوصیات کو سمجھنے کی صلاحیت تھی جو سب سے پہلے انسان...... آدم علیہ السلام کو دی گئی۔ یہ علم کی فطری استعداد ہے اور سارے علوم و فنون کی کلید (KEY) جو انسانوں کو عطا ہوئی ہے اور جو ان کی مادی، روحانی اور علمی ترقی کا زینہ ہے۔ لیکن فرشتے اس علمی استعداد اور علم اسمائے اشیاء سے محروم ہیں۔

﴿ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِيْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ﴾ (31)

پھر وہی چیزیں، جن کے نام آدم علیہ السلام کو سکھائے جا چکے تھے، فرشتوں کے سامنے پیش کی گئیں اور ان سے کہا گیا کہ اگر وہ اپنی بات میں سچے ہیں تو ان سب چیزوں کے نام بتائیں تاکہ ثابت ہو جائے کہ صرف وہی افضل ترین مخلوق ہیں اور ان کے ہوتے ہوئے ان سے بہتر کسی اور مخلوق کے پیدا کیے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

﴿قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ﴾ (32)

فرشتوں نے عرض کیا: تیری ذات پاک ہے۔ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں، جتنا آپ نے ہمیں سکھایا ہے۔ اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں جانتے۔ بے شک تو ہی علم والا اور حکمت والا ہے۔ تیرے علم کی کوئی انتہا نہیں ہے اور تیرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

﴿قَالَ يٰٓاٰدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآئِهِمْ ۙ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّيْٓ اَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ (33)

پھر فرمایا: اے آدم! اب تم ان چیزوں کے نام بتاؤ۔ تو انہوں نے ان سب چیزوں کے نام بتا دیے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا: کہ کیا تمہیں اچھی طرح معلوم نہیں ہے کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب چھپی چیزوں کو جانتا ہوں اور یہ کہ مجھے تمہارے ظاہر و باطن کا پورا علم ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ علم کو عبادت پر فضیلت حاصل ہے۔ یہی علمی فوقیت (SUPERIORITY) ہے جو انسان کے لیے خلافتِ ارضی کی دوسری دلیل بن گئی کہ آدم اور اس کی اولاد ہی کو زمین پر اللہ کا خلیفہ ہونا چاہیے۔

﴿مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ﴾ کے الفاظ سے کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ فرشتے اللہ تعالیٰ کے سامنے کچھ چیزیں ظاہر کرتے اور کچھ اس سے چھپاتے تھے۔ بلکہ یہ عربی زبان کا روزمرہ اور قرآن مجید کا ایک عام اسلوب ہے اور اس سے مراد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے ظاہر اور باطن کا علم ہے۔ ہم نے ترجمے میں بھی اسے واضح کر دیا ہے۔ جب کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہوا:

﴿مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ﴾ (المائدہ 5:99)

''رسول پر صرف پہنچا دینے کی ذمہ داری ہے۔ آگے اللہ تمہارے ظاہر اور باطن (کے اعمال) کو جانتا ہے۔''

یا جیسے فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ مَسْكُوْنَةٍ فِيْهَا مَتَاعٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ٥﴾ (النور 29:24)

''اس میں کوئی گناہ نہیں کہ تم ایسے گھروں میں داخل ہو جن میں کوئی نہ رہتا ہو اور ان میں تمہارا کچھ سامان پڑا ہو۔ اور اللہ تمہارے ظاہر اور باطن کو جانتا ہے۔''

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَ اسْتَكْبَرَ ۫ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۴﴾﴾ (34)

''سجدہ'' کے اصل معنی اَلتَّذَلُّلُ وَالْخُضُوْعُ کے ہیں یعنی عاجزی کرنا اور جھکنا۔ شریعت میں سجدے سے مراد ''وَضْعُ الْجَبْهَةِ عَلٰى قَصْدِ الْعِبَادَةِ.'' ہے جس کا مطلب ہے، عبادت کی نیت سے پیشانی زمین پر رکھ دینا۔

اِبْلِيْسُ: ...... یہ شیطان کا دوسرا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں۔

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ عبادت کا سجدہ نہ تھا بلکہ تعظیم و تکریم کے لیے سجدہ تھا جو پہلی امتوں میں بھی جائز تھا، جیسا کہ سیدنا یوسف علیہ السلام کو ان کے والدین اور بھائیوں نے سجدہ کیا تھا۔

﴿وَ رَفَعَ اَبَوَيْهِ عَلَى الْعَرْشِ وَ خَرُّوْا لَهٗ سُجَّدًا ۚ﴾ (یوسف 100:12)

''اور اس (یوسف علیہ السلام) نے اپنے والدین کو تخت پر بٹھایا اور سب نے اسے سجدہ کیا۔''

مگر ہماری شریعت میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے لیے کسی قسم کا سجدہ جائز نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَوْ كُنْتُ آمِرُ اَحَدًا اَنْ يَّسْجُدَ لِاَحَدٍ لَاَمَرْتُ الْمَرْءَةَ اَنْ تَسْجُدَ لِزَوْجِهَا))

(ترمذی، رقم: 1159، ابن ماجہ، رقم: 1852)

''اگر میں کسی کو حکم دیتا کہ وہ دوسرے کو سجدہ کرے تو میں عورت کو حکم دیتا کہ وہ اپنے شوہر کو سجدہ کرے۔''

اسی مضمون کی حدیث سنن ابی داؤد، رقم: 2140 میں بھی ہے۔ اس سے بیوی پر شوہر کے حق کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

اس آیت کے ظاہری الفاظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابلیس بھی کوئی فرشتہ تھا کیونکہ آدم کے لیے سجدہ کرنے کا حکم فرشتوں کو دیا گیا تھا۔ لیکن خود قرآن نے دوسرے مقام پر تصریح کر دی ہے کہ وہ فرشتہ نہ تھا بلکہ جنات میں سے ایک جن تھا۔

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ﴾ (الکہف 50:18)

''اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، تو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس نے سجدہ نہ کیا۔ وہ

جنات میں سے تھا۔ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔"

اور جب فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ وہ آدم کو سجدہ کریں تو اس حکم کا مخاطب ابلیس بھی تھا۔ قرآن نے اس کی صراحت بھی کر دی ہے۔

﴿قَالَ مَا مَنَعَكَ اَلَّا تَسْجُدَ اِذْ اَمَرْتُكَ ۝﴾ (الاعراف 12:57)

"فرمایا: جب میں نے تجھے حکم دیا تو کس چیز نے تجھے (آدم کو) سجدہ کرنے سے روکا۔"

اس سے معلوم ہوا کہ جب فرشتوں جیسی افضل مخلوق کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا، تو ابلیس جو کہ جن تھا اور نسبتاً کم درجے کی مخلوق میں سے تھا، وہ بھی جیسا کہ قاضی بیضاوی رحمہ اللہ (تفسیر بیضاوی) اور علامہ آلوسی رحمہ اللہ (تفسیر روح المعانی) نے اپنی اپنی تفسیر میں لکھا ہے، عربی زبان کے ایک قاعدے "علیٰ سبیل التغلیب" کے مطابق اس حکم میں شامل تھا، اس نے حکم کا انکار کیا تھا، جس کی طرف قرآن مجید کا لفظ "اَبیٰ" اشارہ کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ تکبر اور گھمنڈ بھی کیا کہ:

﴿قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝﴾ (الاعراف 12:7)

"وہ (ابلیس) بولا: میں اس (آدم) سے بہتر ہوں۔ مجھے تو نے آگ سے پیدا کیا اور اسے مٹی سے۔"

یہ عجیب ابلیسی منطق (LOGIC) تھی کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے اور آدم مٹی سے، تو آگ افضل ہے مٹی سے، اعلیٰ گھٹیا کے آگے کیوں جھکے۔ اس نے یہ نہ سوچا کہ فرشتے جو نور سے پیدا ہوئے ہیں اور افضل ترین مخلوق ہیں، جب وہ آدم کو سجدہ کر رہے ہیں، تو وہ کیوں سجدہ کرنے سے انکار کر رہا ہے۔ دوسرے یہ اللہ سبحانہٗ کا حکم تھا، کوئی افضل و مفضول، یا اعلیٰ اور ادنیٰ کا معاملہ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کرنی ضروری تھی۔ لیکن ابلیس نے دوہرا جرم اور گناہ کیا۔ ایک اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار، دوسرا غرور و تکبر کا اظہار۔ گویا یہ "عذرِ گناہ بدتر از گناہ" والی بات ہوگئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کافروں میں سے ہو گیا۔

یاد رہے کہ عربی زبان میں کَانَ (کَوْنٌ سے فعل ماضی صیغہ واحد مذکر غائب) کا لفظ تین مختلف معنی دیتا ہے۔ (1) وہ تھا (HE WAS)، (2) وہ ہے (HE IS) اور (3) وہ ہو گیا (HE BECAME)۔

(1) کَانَ، "تھا" یا "وہ تھا" کے معنوں میں:

﴿مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّ لَا نَصْرَانِيًّا﴾ (آل عمران 67:3)

"ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی۔"

(2) کَانَ، "ہے" یا "وہ ہے" کے معنوں میں:

﴿وَ كَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا﴾ (النساء 17:4)

"اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔"

(3) کَانَ، ''وہ ہوگیا'' (صَارَ) کے معنوں میں:

﴿وَ حَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ﴾ (ھود 11:43)

''اور ان دونوں (نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے) کے درمیان موج حائل ہوگئی اور (دوسرے) غرق ہونے والوں کے ساتھ وہ (نوح علیہ السلام کا بیٹا) بھی غرق ہوگیا۔''

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا:

﴿وَ قُلْنَا يٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَ زَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَ كُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۪ وَ لَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ۝۳۵﴾ (35)

رَغَدًا:...... اس کے معنی ہیں: وَاسِعًا هَنِيْئًا یعنی خوب سیر ہو کر مزے سے۔

ظالمین:...... یہ ظالم کی جمع ہے جو ظلم سے بنا ہے۔ ظلم کے اصل معنی ''وضع الشی فی غیر موضعہ'' کے ہیں کہ کسی چیز کو ایسی جگہ رکھنا جو اس کے رکھنے کی صحیح جگہ نہ ہو۔ پھر اسی سے اور معنی پیدا ہو گئے، جیسے کسی چیز میں کمی کر دینا، کسی کا حق مارنا، اسے نقصان پہنچانا اور اس پر زیادتی کرنا، سب ظلم میں شامل ہے۔ پھر شرک اور گناہ حقوق اللہ میں ظلم ہے۔ دوسروں کی حق تلفی اور ان پر زیادتی کرنا حقوق العباد میں ظلم ہے، اور ہر قسم کا گناہ اپنے آپ پر ظلم ہے کہ اس کی سزا یا عذاب بھگتنا پڑے گا۔

آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے اور فرشتوں سے ان کو سجدہ کرانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام سے فرمایا کہ آپ اور آپ کی بیوی حواء (یہ نام احادیث سے ثابت ہے) جنت میں جا کر عیش و آرام سے رہیں۔ وہاں جو چاہیں اور جہاں سے چاہیں، خوب سیر ہو کر کھائیں پئیں، مگر فلاں درخت کے قریب نہ جائیں اور اس کا پھل نہ کھائیں، ورنہ وہ ظالم اور گناہ گار ہو جائیں گے۔

جمہور مفسرین کے نزدیک جس جنت میں آدم علیہ السلام اور ان کی بیوی کو رہنے کا حکم دیا گیا، وہ وہی جنت ہے جو آخرت میں نیک اہل ایمان کو عطا ہوگی۔ صحیح احادیث کے ظاہری الفاظ بھی اسی بات کی تائید کرتے ہیں۔

جنت میں وہ کون سا درخت تھا، جس کے قریب جانے اور اس کا پھل کھانے سے آدم علیہ السلام اور حوا علیہا السلام کو روکا گیا تھا؟ اس بارے میں کئی اقوال ہیں، مگر کوئی قول بھی قرآن مجید یا کسی صحیح حدیث سے ثابت نہیں ہے۔ اس لیے اس کی کھوج کرید میں پڑنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یہی بات امام المفسرین ابن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں لکھی ہے۔

بہر حال وہ کوئی خاص درخت تھا جس کے قریب جانے اور اس کا پھل کھانے سے دونوں میاں بیوی کو منع کیا گیا تھا۔ لیکن انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی ہے کہ جس چیز سے اسے روکا جائے، اسی کی طلب اور تجسس میں لگ جاتا ہے اور شیطان اس کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر وسوسوں کے ذریعے اسے گمراہ کرتا ہے۔

منکرین حدیث اور بعض دوسرے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن میں جس آدم کا ذکر ہے، اس سے کوئی خاص فرد یا

شخصیت مراد نہیں ہے بلکہ اس سے پوری نوع انسانی (HUMANITY) مراد ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس جگہ ﴿اَنْتَ وَزَوْجُكَ﴾ ''تو اور تیری بیوی'' کے الفاظ ان لوگوں کے مذکورہ خیال کی تردید کے لیے کافی ہیں۔

احادیث سے بھی آدم علیہ السلام کا ابوالبشر ہونا (صحیح مسلم، رقم: 480) اور سب سے پہلا نبی ہونا (ابن ابی شیبہ، طبرانی اور مسند احمد، رقم: 21879 عن ابی ذر غفاری رضی اللہ عنہ) ثابت ہے۔ ظاہر ہے پوری نوع انسانی نہ تو ابوالبشر ہو سکتی ہے اور نہ نبی ہے۔

اس کے علاوہ بائبل میں بھی آدم (ADAM) اور حواء (EVE) مخصوص شخصیات کے نام آئے ہیں۔

﴿فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠ وَ قُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝﴾ (36)

لیکن آدم علیہ السلام اور حواء علیہا السلام دونوں کو شیطان نے بہکا دیا۔ اس نے ان سے جھوٹ بولا۔ ان کو دھوکا دیا۔ (الاعراف 22:7) ان سے کہا کہ زندگی اور لازوال بادشاہی چاہتے ہو تو اس درخت کا پھل کھا لو جس سے تمہیں روکا گیا ہے۔ جیسا کہ طٰہٰ میں ہے:

﴿فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى ۝﴾

(طٰہٰ 120:20)

''پھر شیطان نے اس (آدم علیہ السلام) کے دل میں وسوسہ ڈال دیا اور کہا: اے آدم! کیا میں تجھے ہمیشگی کا درخت بتاؤں اور ایسی بادشاہی جس کو زوال نہ ہو۔''

اس طرح شیطان کے بہکاوے میں آ کر دونوں میاں بیوی اس درخت کا پھل کھا بیٹھے، جس کے نتیجے میں ان کو جنت اور وہاں کے عیش و آرام سے محروم ہونا پڑا اور دنیا میں آ کر محنت و مشقت کی زندگی گزارنی پڑی۔

اس بارے میں قرآن کا بیان بالکل واضح ہے کہ شیطان نے آدم اور حواء علیہا السلام، دونوں کو بہکایا تھا۔ دونوں ہی نے ممنوعہ درخت کا پھل کھایا اور دونوں ہی سے یہ لغزش ہوئی تھی۔ اس لیے اس حوالے سے عیسائیت کی طرح صرف حواء علیہا السلام کو مطعون کرنا اور ان کو برائی کی جڑ قرار دینا کہ ان کے باعث آدم علیہ السلام نے اس درخت کا پھل کھایا تھا، ایک غیر قرآنی اور بالکل غلط تصور ہے۔

محققین نے تصریح کی ہے کہ جنت کے ممنوعہ پھل کھانے کا واقعہ اس وقت پیش آیا تھا جب آدم علیہ السلام ابھی نبی نہیں بنائے گئے تھے۔ اس لیے یہ واقعہ عصمت انبیاء کے مسلّمہ عقیدے کے منافی نہیں ہے۔

جنت سے نکالے جاتے وقت اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرما دیا کہ آئندہ آدم و حواء علیہما السلام اور ابلیس، دونوں فریق، ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے۔ شیطان اور اولادِ آدم میں ہمیشہ دشمنی اور عداوت رہے گی۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿فَقُلْنَا يٰاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰىo﴾ (طٰهٰ 117:20)

''پھر ہم نے کہا: اے آدم! بے شک یہ (ابلیس) تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے۔ ایسا نہ ہو وہ تم دونوں کو جنت سے نکلوا دے اور پھر تمہیں مشقت اٹھانی پڑے۔''

پھر جنت سے زمین پر بھیجتے ہوئے اللہ سبحانہٗ نے ارشاد فرمایا کہ تمہیں زمین میں ایک عارضی مدت تک رہنا اور وہاں کی چیزوں سے فائدہ اٹھانا ہے۔ یہ عارضی مدت آدم وحواء علیہما السلام کے لیے ان کی عمروں تک اور نوع انسانی کے لیے قیامت تک کے لیے ہے۔

﴿ فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾ (37)

تَابَ:...... اس کے اصل معنی لوٹنے اور رجوع کرنے کے ہیں۔ جب اس کی نسبت بندے کی طرف ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ بندے نے اپنے گناہ پر شرمندہ اور نادم ہو کر اپنے رب کی طرف رجوع کیا۔ جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ وہ اپنے بندے کی طرف رحم کے ساتھ متوجہ ہوا۔ لیکن اس صورت میں تَابَ کے بعد عَلٰی کا صلہ ضرور آتا ہے۔

پھر جب آدم علیہ السلام کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ نادم و پشیمان ہوئے تو انہوں نے دعا مانگی جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو چند ایسے کلمات سکھا دیے جن کو پڑھ کر وہ اپنے گناہ سے توبہ کر سکتے تھے۔ ان کلمات کو جیسا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے، قرآن نے دوسرے مقام پر اس طرح بیان کیا ہے:

﴿قَالَ رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا ۫ وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَo﴾

(الاعراف 23:7)

''ان دونوں نے دعا کی: اے ہمارے رب! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا، اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔''

اس دعا کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم وحوا علیہما السلام دونوں کی توبہ قبول فرمالی۔ بے شک اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا اور ان پر رحم فرماتا ہے۔

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ ﴾ (38-39)

﴿قُلْنَا اهْبِطُوْا﴾ ''ہم نے کہا: تم اتر جاؤ'' کا ارشاد دو بار فرمایا گیا۔ ایک جب آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی اور اس کے نتیجے میں ان کو جنت سے زمین کی طرف آنے کا حکم ہوا۔ پھر دوسری بار اس وقت جب ان کی توبہ قبول ہوئی اور اس کے بعد ان کو نئے امتحان میں ڈال دیا گیا کہ آیندہ انسانوں کے اچھے اور برے انجام کا فیصلہ وحی کی ہدایت

کی پیروی کرنے یا پیروی نہ کرنے کے اعتبار سے ہوگا۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی اور نبیوں اور رسولوں کی لائی ہوئی ہدایت یعنی دین اسلام کی سچی پیروی کریں گے، وہی جنت کے مستحق ہوں گے، جہاں ان کو نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ کوئی غم۔ مگر جو لوگ کفر کی راہ اختیار کریں گے اور دینِ اسلام کو جھٹلائیں گے تو وہ دوزخ کی آگ میں ڈالے جائیں گے اور اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

یاد رہے کہ ﴿فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ کے الفاظ سے جنت مراد ہے، جہاں نہ کوئی خوف یعنی آیندہ کا خطرہ ہوگا اور نہ حزن یعنی ماضی کا کوئی غم۔ حزن اور غم کی ضد سرور (خوشی) ہے۔ جنت کی تعبیر کے لیے قرآن مجید کا یہ ایک خاص اسلوب ہے، جس کی طرف اگلی آیت (39) بھی واضح طور پر اشارہ کر رہی ہے۔ اس اسلوب کی بارہ (12) مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔

قصۂ آدم و ابلیس میں حکمتیں:

مذکورہ دس (10) آیات میں بعض اہم حقائق اور حکمتیں پوشیدہ ہیں جن میں سے چند ایک یہ ہیں:

1۔ انسان اس زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب ہے۔ وہ خود مختار اور مطلق العنان نہیں ہے کہ جو چاہے کرتا پھرے، بلکہ وہ اپنے رب کا محکوم اور تابع بندہ ہے۔ وہ خود بخود اتفاقاً (BY CHANCE) پیدا نہیں ہوا، اسے ایک خالق اللہ سبحانہٗ نے پیدا فرمایا ہے، جس کا کوئی شریک نہیں، جس کے سوا کوئی اور معبود نہیں۔ اسی نے انسان کو سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں عطا کی ہیں۔ نیکی اور بدی کی تمیز بخشی ہے اور ان میں سے ہر ایک کو اختیار کرنے کی پوری آزادی دی ہے۔ یہ دنیا انسان کے لیے امتحان کی جگہ ہے کہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں نبیوں کی بتائی ہوئی نیکی کی راہ پر چل کر آخرت میں جنت کی نعمتوں کا مستحق ٹھہرتا ہے اور شیطان کی سجھائی ہوئی برائی کی راہ اختیار کر کے آخرت میں دوزخ کے عذاب کا سزاوار ہوتا ہے۔

2۔ انسان پیدائشی طور پر گناہ گار نہیں ہے۔ اس کی فطرت میں نیکی ہے۔ مگر شیطان کے بہکانے سے برائی بھی کر لیتا ہے۔ لیکن اس کے بعد اگر وہ آدم علیہ السلام کی طرح اپنے کیے پر نادم ہو کر توبہ کر لیتا ہے تو اس کا رب اس کی توبہ قبول کر کے اس کا گناہ معاف کر دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ ابلیس کی طرح اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کر کے اُلٹا تکبر کا اظہار کرتا ہے تو اس کے لیے معافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے عذاب ہے۔

3۔ انسان اپنی زندگی کے اصل مقاصد کو محض اپنی عقل کے بل بوتے پر حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ کی وحی کا محتاج ہے۔ اسے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی گزارنے کے لیے وحی و نبوت کی ہدایت ناگزیر ہے۔ اس کے لیے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ وہ انبیائے کرام کی لائی ہوئی ہدایت کی پیروی کرے، تاکہ اسے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل ہو۔ اگر وہ اس ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چلے گا تو دنیا اور آخرت میں ناکامی سے دوچار ہوگا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ
اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿٤٠﴾ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا
مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ
فَاتَّقُوْنِ ﴿٤١﴾ وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ﴿٤٢﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿٤٣﴾
اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ۭ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٤٤﴾ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا
عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴿٤٥﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ
ع ٥ ٧ ٥ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿٤٦﴾ ع

’’اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو، جو میں نے تمہیں عطا کیں۔ اُس اقرار کو پورا کرو، جو تم نے مجھ سے کیا تھا۔ میں اُس اقرار کو پورا کروں گا، جو میں نے تم سے کیا تھا اور صرف مجھ سے ڈرو۔ اور اس کتاب پر ایمان لاؤ جو میں نے اتاری ہے، جو اُس کتاب کو سچا کرنے والی ہے، جو تمہارے پاس پہلے سے موجود ہے۔ ایسا نہ ہو، دوسروں سے پہلے تم اس کا کفر و انکار کر بیٹھو اور دنیا کا حقیر معاوضہ لے کر میری آیتیں نہ بیچو اور مجھی سے ڈرو۔ حق کو باطل کے ساتھ نہ ملاؤ اور سچ کو جان بوجھ کر نہ چھپاؤ۔ نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ یہ کیا ہے کہ تم لوگوں کو نیکی کرنے کا کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو، حالاں کہ تم کتاب پڑھتے ہو! کیوں تم سمجھتے نہیں؟ اور صبر اور نماز سے مدد لو۔ یہ کام مشکل تو ہے مگر اُن لوگوں کے لیے مشکل نہیں جو اللہ کے آگے عاجزی کرتے ہیں۔ جو یقین رکھتے ہیں کہ ایک دن اپنے رب سے ملنے والے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔‘‘ (40-46)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ

وَ اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿40﴾

اِسْرَآئِيْلَ:...... یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے جس کے معنی ہیں ''اللہ کا بندہ''۔ بنی اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ (12) بیٹے اور ان کی اولاد ہے جو اسباط کہلاتے ہیں۔ تمام یہود ان کی نسل میں سے ہیں اور یہودیت (JUDAISM) ایک نسلی مذہب ہے۔

فَارْهَبُوْنِ:...... یہ رھبۃ سے بنا ہے۔ جس کے معنی کسی کے رعب وجلال اور خوف سے کانپ اٹھنے کی حالت کے ہیں۔

اس سے پہلے یَآ اَيُّهَا النَّاسُ (اے لوگو) کا خطاب عام تھا (آیت 21) اور اب یَا بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ کا خطاب خاص ہے۔ درمیان میں آدم علیہ السلام کا قصہ بیان ہوا جو دراصل انسان کی ابتداء کا قصہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی وحی ونبوت کا سلسلہ جاری ہو گیا تھا۔

پھر قرآن کے نزول کے وقت چونکہ یہود (بنی اسرائیل) ہی کو وحی و کتاب کا سب سے بڑا حامل سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے اب ان کو خطاب کر کے بتایا جا رہا ہے کہ تمہیں تمہارے منصب سے معزول کر دیا گیا ہے۔ تم نام کے اہل کتاب رہ گئے ہو، ورنہ اللہ کی کسی کتاب سے تمہارا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اب تمہاری جگہ امت مسلمہ کو وحی و کتاب کا علم بردار بنا دیا گیا ہے۔ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب...... قرآن مجید نازل ہو رہا ہے۔ اب تمہارے لیے نجات کی ایک ہی صورت ہے کہ تم لوگ حضرت محمد ﷺ کی نبوت اور قرآن مجید پر ایمان لاؤ، ورنہ تمہارے لیے دنیا میں ذلت ورسوائی اور آخرت میں جہنم کا عذاب تیار ہے۔

بنی اسرائیل کے قصے کے بارے میں یہ بات تمہید کے طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ اس میں جو واقعات بیان ہوئے ہیں، ان کا براہ راست تعلق اگرچہ مدینے کے یہودیوں سے نہیں تھا لیکن چونکہ یہ لوگ اپنے آباء واجداد کے تمام اچھے برے کاموں کو نہ صرف اپنا سرمایہ سمجھا (OWN) کرتے تھے، بلکہ ان پر فخر کا اظہار بھی کرتے تھے، اس لیے ان کے بڑوں کے احوال وواقعات کو بھی مدینے کے یہودیوں سے منسوب کر کے ہر جگہ ان کو مخاطب کیا گیا ہے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل یہودیوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میری ان نعمتوں کو یاد کرو اور میرا شکر کرو جو نعمتیں میں نے تمہاری قوم کو عطا کیں۔ نِعْمَتِيَ میں نعمت کا لفظ اگرچہ واحد آیا ہے مگر یہ مضاف ہونے کی وجہ سے جمع کے معنوں میں ہے۔ ان نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی صورت یہ ہے کہ نافرمانی کا رویّہ چھوڑو اور میری سچی اطاعت کرو۔ میرے آخری نبی محمد ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان لاؤ۔ میرے ساتھ کیے ہوئے عہد واقرار کو پورا کرو تو میں بھی تمہارے ساتھ کیے ہوئے عہد واقرار کو پورا کروں گا۔

بنی اسرائیل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا یہ عہد کیا تھا؟ اس بارے میں کئی اقوال ہیں۔

ہمارے نزدیک اس عہد سے مراد یہودیوں کی پوری شریعت ہے جس کی پابندی کرنے کا ان کو حکم دیا گیا تھا اور جسے

قرآن نے کئی مقامات پر بیان کیا ہے۔ جیسے سورۃ المائدہ میں ہے:

﴿وَ لَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَ بَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ وَ اٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَ عَزَّرْتُمُوْهُمْ وَ اَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَ لَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ۝﴾ (المائدہ 12:5)

''اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور اُن میں بارہ (12) سردار مقرر کیے۔ اللہ نے اُن سے کہا: میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو، میرے پیغمبروں پر ایمان لاؤ، اُن کا ساتھ دو اور اللہ کو قرض حسنہ دو تو میں تم سے تمہارے گناہ دُور کروں گا، تمہیں ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن میں نہریں بہتی ہوں گی۔ مگر تم میں سے اس کے بعد جس نے کفر کیا وہ سیدھے راستے سے بھٹک گیا۔''

مگر قرآن کے نزول کے وقت تک یہودیوں کی اکثریت اس عہد کو پس پشت ڈال چکی تھی۔

شریعت کے اس عہد میں دوسرے احکامات کے علاوہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت کے بارے میں بھی بڑی واضح پیش گوئیاں موجود تھیں۔

قرآن نے آگے چل کر یہودیوں کی لگاتار بدعہدیوں کو یوں بے نقاب کیا ہے:

﴿اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ۝﴾ (البقرہ 101,100:2)

''(بنی اسرائیل کا حال یہ ہے کہ) جب کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کا ایک گروہ اسے توڑ پھینکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ رسول آ گیا جو ان کی اپنی کتاب کو سچا کرنے والا ہے، تو اہل کتاب کے ایک گروہ نے کتابِ الٰہی کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک دیا، گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں۔''

اس طرح قرآن نے یہ واضح کیا ہے کہ یہودی قوم بدعہد اور عہد شکن واقع ہوئی ہے اور بدعہدی اور عہد شکنی کی عادت ان کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔

آخر میں فرمایا ﴿اِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ﴾ ''کہ صرف مجھ سے ڈرو۔'' فَارْهَبُوْنِ اصل میں فَارْهَبُوْنِيْ تھا۔ فقرے کے آخر میں سجع کے طور پر آنے سے نِيْ کا یٰ حذف ہو جانے سے صرف نِ رہ گیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر اس عہد کی پابندی کرنے اور اسلام قبول کر لینے سے تمہیں اپنے دنیوی مفادات ضائع ہونے کا ڈر ہے تو اس کی پروا نہ کرو۔ بلکہ تمہاری بدعہدی کی سزا کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو قہر و غضب نازل ہوگا،

اُس سے ڈرو۔

قصۂ بنی اسرائیل کے مقاصد:

اس مقام پر بنی اسرائیل کا قصہ بیان کرنے کے چار اہم مقاصد ہیں:

1۔ اس میں نبی ﷺ کی نبوت کے سچا ہونے کی دلیل ہے کہ اس سے پہلے آپ ﷺ بنی اسرائیل کے حالات و واقعات سے واقف نہ تھے اور قرآنی وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو ان کے بارے میں علم دیا گیا۔

2۔ اس قصے میں بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا تفصیلی ذکر موجود ہے جو مدینے کے یہودیوں کے آباء و اجداد کو عطا کی گئی تھیں تاکہ وہ ان نعمتوں کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کریں اور اس کے آخری نبی ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان لائیں اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنے کی بجائے اس کی اطاعت اور فرماں برداری کریں۔

3۔ اس میں نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کے لیے تسلی کا پہلو ہے کہ جو قوم اپنے محسن نبیوں کی نافرمان رہی ہے، ان کے قتل کے درپے ہوتی رہی اور جو اللہ کی کتاب میں لفظی اور معنوی تحریف (DISTORTION) کرتی رہی، ان کی نسل اگر آج محمد ﷺ اور قرآن مجید پر ایمان نہیں لاتی اور اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتی ہے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔

4۔ اس میں مدینے کے یہودیوں کے لیے تنبیہ (WARNING) بھی ہے کہ اگر وہ اسلام قبول نہیں کریں گے تو ان کا انجام اچھا نہیں ہوگا اور ان پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوگا۔

﴿ وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝ ﴾ (41)

مُصَدِّقًا:...... (تصدیق کرنے والا۔ مصداق): یہ صدق سے بنا ہے جس کے معنی سچائی کے ہیں۔ لیکن قرآن میں مُصَدِّق کا لفظ قرآن مجید کی ایک صفت کے طور پر استعمال ہوا ہے جس کے دو معنی ہیں: ایک یہ کہ قرآن صرف اس لحاظ سے مُصَدِّق ہے کہ وہ اپنے سے پہلی کتابوں مثلاً توریت، زبور اور انجیل کی تصدیق (CONFIRMATION) کرتا ہے کہ وہ سب اللہ تعالیٰ کی کتابیں تھیں مگر بعد میں ان کے بدبخت حاملین نے ان میں ردوبدل کر کے ان کو مشکوک اور مشتبہ بنا دیا اور اب وہ ناقابل اعتبار ہیں۔ (البقرہ 79:2)

دوسرے قرآن ان معنوں میں مُصَدِّق ہے کہ پہلی کتابوں میں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ، آپ ﷺ کے صحابہ کرام اور قرآن مجید کے بارے میں جو پیش گوئیاں (FORTELLINGS) موجود تھیں، ان کو سچا ثابت کرنے والا ہے۔ گویا قرآن کے نزول سے پہلی کتابوں کی پیش گوئیاں سچی ثابت ہوگئی ہیں اور وہ ان پیش گوئیوں کا صحیح مصداق ہے۔ انہی معنوں میں کسی حماسی کا شعر ہے:

فَدَتْ نَفْسِیْ وَ مَا مَلَکَتْ یَمِیْنِیْ
فَوَارِسَ صَدَّقَتْ فِیْهِمْ ظُنُوْنِیْ

''میری اور میرے غلام لونڈیوں کی جانیں، اُن شہسواروں پر قربان! جنہوں نے اپنے بارے میں میری توقعات کو سچ کر دکھایا۔''

اس جگہ یہود کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے کہ یہ وہ قرآن ہے جو تمہاری توریت کی ان پیش گوئیوں کو سچا ثابت کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں تھیں اور جن کے پورا کرنے کا تمہیں انتظار بھی تھا۔ گویا قرآن پر تمہارا ایمان لانا تمہارے خود اپنی کتابوں پر ایمان لانے کے مترادف ہے۔ اس لیے تم کو اس سے انکار نہیں ہونا چاہیے۔

﴿وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ﴾ (41)

یہ بھی یہود سے فرمایا گیا کہ تم اس قرآن کی دعوت کا انکار کر کے ''سب سے پہلے کافر'' نہ بن جانا۔ لیکن معلوم ہے کہ اس سے پہلے قرآن کا انکار کر کے قریش مکہ کی اکثریت ''سب سے پہلے کافر'' بن چکی تھی۔ پھر قرآن کے اس خطاب کا کیا مطلب ہے؟

ہمارے نزدیک اس کا مطلب، جیسا کہ امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اور امام شوکانی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''فتح القدیر'' میں لکھا ہے، یہ ہے کہ اس جگہ مدینے کے یہود سے کہا گیا ہے کہ وہ اہل کتاب میں سے پہلے کافر نہ بنیں۔ یہود کی اپنی کتابوں (توریت وغیرہ) میں جو پیش گوئیاں موجود تھیں، ان کا مصداق قرآن بھی تھا اور حضرت محمد ﷺ بھی تھے۔ اس لیے یہودیوں سے یہی توقع تھی کہ وہ آگے بڑھ کر قرآن کی دعوت پر لبیک کہیں گے اور اس پر ایمان لائیں گے، اس کا انکار نہیں کریں گے کیونکہ اس صورت میں ان کا اپنی کتابوں کی تمام باتوں پر ایمان بھی سچا ثابت ہو سکتا تھا۔ مگر انہوں نے نہ صرف قرآن کا انکار کیا، بلکہ اُلٹا اسلام دشمنی میں پہل کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اہل کتاب میں ''سب سے پہلے کافر'' بن گئے۔

چنانچہ کتبِ سیرت میں ہے کہ مدینے کے یہودیوں میں سب سے پہلے بنو قینقاع، پھر بنو قریظہ، پھر بنو نضیر نے قرآن کی دعوت کو ٹھکرایا اور وہ اولین کفار بنے اور ان کے بعد خیبر کے یہودی اسلام کے دشمن بن گئے۔ جزیرۃ العرب میں ہزاروں کی یہودی آبادی میں سے صرف دس بارہ افراد ایمان لائے۔ جب کہ ان کے مقابل میں عرب مشرکین کی بہت بڑی تعداد (اَفْوَاجًا) نے بعد میں اسلام قبول کر لیا۔

﴿وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ (41) 4718

یہ یہودیوں کے علما سے فرمایا گیا کہ وہ اللہ کی آیتوں اور شریعت کے احکام کو حقیر مال کے بدلے میں نہ بیچیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر زیادہ رقم مل جائے تو بیچ دیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات اور اس کی شریعت کے بدلے میں ساری دنیا کا مال و دولت بھی ﴿ثَمَنًا قَلِيْلًا﴾ حقیر پونجی ہے اور تھوڑے پیسے ہیں۔ یاد رہے کہ یہودی علماء

رشوت لے کر دنیوی مفاد کی خاطر اللہ تعالیٰ کے احکام بدل دیتے، غیر شرعی عدالتی فیصلے کرتے اور فتوے بیچتے تھے۔ افسوس آج مسلمانوں کے علمائے سوء بھی دین فروشی کا یہی دھندا کر رہے ہیں!

﴿ وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ۝ ﴾ (41)

پہلے فَارْهَبُوْنِ (صرف مجھ سے ڈرو) فرمایا اور اب فَاتَّقُوْنِ فرمایا ہے۔ کیونکہ پہلے بغیر ایمان کا ڈرنا (رھبۃ) تھا اور اب ایمان کا ذکر کر کے، ایمان کے بعد کا ڈرنا (تقویٰ) ہے۔ جب ایمان ہوگا تو دل میں غیر اللہ کا ڈر بھی نہیں ہوگا، صرف اللہ کا ڈر ہوگا کیونکہ ایمان اور غیر اللہ کا ڈر کسی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

﴿ وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (42)

تَلْبِسُوْا:...... یہ "لبس" سے ہے جس کے اصل معنی 'خلط' یعنی ملانے کے ہیں۔ عربی زبان میں ((لَبْسُ الشَّيْئِ بِالشَّيْئِ)) کا مطلب ہوتا ہے "کسی چیز کو کسی اور چیز کے ساتھ ملا دینا۔" یا "کسی چیز کو کسی دوسری چیز سے ڈھانک دینا۔" لباس کو لباس اس لیے کہتے ہیں کہ یہ جسم کو ڈھانک (یا ڈھانپ) دیتا ہے۔

تَكْتُمُوْا:...... یہ کتم، کتمان سے ہے جس کے معنی چھپانے کے ہیں۔ اس جگہ اس سے پہلے وہ 'لا' محذوف ہے جو تَلْبِسُوْا سے پہلے آیا ہے۔ اس لیے یہ ﴿لَا تَكْتُمُوْا﴾ "تم نہ چھپاؤ" کے معنوں میں ہے۔

وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ:...... میں وَ (واؤ) حالیہ ہے جس کے معنی ہیں۔ "حالاں کہ" یا "جب کہ"۔

اس آیت میں بھی یہود کے علماء سے خطاب ہے کہ وہ حق کو باطل کے ساتھ نہ ملائیں اور حق کو نہ چھپائیں۔ یہودی علما یہ گھناؤنی اور مکروہ حرکت کرتے تھے کہ اپنی گھڑی ہوئی باتوں کو توریت کی عبارتوں میں گڈمڈ (MIX UP) کر دیتے تاکہ حق و باطل کی الگ الگ پہچان نہ رہے۔ یہ پتہ نہ چلے کہ اس میں حق یعنی اللہ کا کلام کون سا ہے اور اس میں باطل، جو علمائے یہود کی اپنی طرف سے گھڑی ہوئی باتیں ہیں، وہ کون سی ہیں؟ اس کے علاوہ وہ ہندو برہمنوں اور پنڈتوں کی طرح توریت کے احکام بھی عام لوگوں سے چھپاتے تھے۔ توریت کے اندر ان پیش گوئیوں کو بھی وہ چھپاتے تھے جو حضرت محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی نبوت کے بارے میں موجود تھیں تاکہ عام یہودی ان کو دیکھ کر اسلام قبول نہ کر لیں۔ اور وہ یہ سب کچھ جان بوجھ کر کیا کرتے تھے۔

﴿ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ﴾ (43)

﴿وَ ارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ﴾ "اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔" رکع، رکوع کے اصل معنی "جھکنے" کے ہیں۔ اس جگہ رکوع سے مراد نماز ہے۔ گویا جزو کہہ کر کُل مراد لیا گیا ہے جو ہر زبان کی طرح عربی زبان کا بھی ایک اسلوب ہے۔

اس سے پہلے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی۔ اب ان کو نیک اعمال کی دعوت دی جا رہی ہے اور اس میں سب سے پہلے نماز کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ دین میں ایمان کے بعد اعمال میں سب سے زیادہ اہمیت نماز ہی کی ہے۔

پھر زکوٰۃ کا حکم دیا گیا ہے۔ اس لیے کہ نماز کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ آخر میں باجماعت نماز کی تاکید کے طور پر یہود سے فرمایا کہ اب تم لوگ مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو جاؤ اور ان کے ساتھ رکوع والی باجماعت نماز ادا کرو۔ یاد رہے کہ یہود کی شریعت میں جو نماز تھی، اس میں رکوع نہیں تھا۔ یہ گویا ﴿وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ﴾ ”نماز قائم کرو“ کے پہلے حکم کی مزید وضاحت اور تاکید ہو گئی۔

﴿ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾﴾(44)

بِرّ: ......اس کے معنی نیکی، بھلائی، دین داری، وفا داری، فرض شناسی اور حق کی ادائیگی کے ہیں۔

یہ بھی علمائے یہود کو خطاب کیا گیا، جن کا حال یہ تھا کہ وہ دوسروں کو نیکی کا وعظ کرتے مگر خود بے عمل تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس نفاق اور قول و فعل میں تضاد پر گرفت فرمائی ہے۔ بالکل یہی مضمون انجیل میں بھی ہمیں ملتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے یہودی علماء کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

”اے شرع کے عالمو! تم پر افسوس ہے کہ تم ایسے بوجھ، جن کا اٹھانا مشکل ہے، آدمیوں پر لادتے ہو اور اپنی ایک انگلی بھی ان بوجھوں کو نہیں لگاتے۔“ (لوقا، باب 47:11)

پھر ارشاد ہوا کہ ﴿وَ اَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْکِتٰبَ﴾ کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم اللہ کی کتاب، توریت بھی پڑھتے پڑھاتے ہو، شریعت کو بھی جانتے ہو، اس کے باوجود اپنی ذمہ داریاں ادا نہیں کرتے ہو۔ نفاق اور قول و فعل میں تضاد کی بیماری میں یہودی علماء مبتلا ہوئے تھے۔

افسوس، آج ہمارے مذہبی پیشواؤں کی اکثریت بھی اسی مرض کا شکار ہے۔ جب کہ ان کو بھی قرآن نے اس سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ o کَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ o﴾ (الصف 3,2:61)

”اے ایمان والو! تم کیوں ایسی بات کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ اللہ کے نزدیک یہ بہت ناراضی کی بات ہے کہ تم ایسی بات کہو، جو کرو نہیں۔“

اس کے بعد عام یہود کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿وَ اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوۃِ وَ اِنَّهَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخٰشِعِیْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَ اَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾ (46,45)

اِسْتَعِیْنُوْا: ......یہ استعانت (مدد مانگنا) سے ہے۔ اس کی تشریح سورۂ الفاتحہ کی تفسیر میں ”نَسْتَعِیْنُ“ کے تحت گزر چکی ہے۔

صَبْر: ......عربی زبان میں اس کے اصل معنی ”حبس“ یعنی روکنے کے ہیں۔

استعمال کے لحاظ سے اس کے یہ معنی مراد ہوتے ہیں: ہر حال میں ثابت قدم رہنا، مشکل حالات کا مقابلہ کرنا اور رکاوٹوں کے باوجود اپنے موقف پر مضبوطی سے جمے رہنا۔

'صبر' کے ان معانی کو قرآن مجید کے درج ذیل مقامات بالکل واضح کر دیتے ہیں:

(1)..... ﴿وَ الصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِیْنَ الْبَاْسِ﴾ (البقرہ 2:177)

''اور صبر کرنے والے مالی پریشانی میں، جسمانی تکلیف میں اور جنگ کے وقت۔''

(2)..... ﴿اِنْ کَادَ لَیُضِلُّنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَیْهَا﴾ (الفرقان 25:42)

''اس (نبی) نے تو ہمیں ہمارے معبودوں سے ہٹا دیا ہوتا اگر ہم ان پر جمے نہ رہتے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ اردو زبان میں لفظ ''صبر'' کے معنوں میں ''بے بسی'' اور ''بے چارگی'' کا جو غالب مفہوم پایا جاتا ہے، وہ عربی زبان کے لفظ ''صبر'' میں بالکل نہیں پایا جاتا۔

اِنَّهَا:..... اس میں هَا کی ضمیر کے مرجع کے بارے میں تین قول ہیں:

(1) ایک یہ کہ اس کا مرجع ''اَلصَّلٰوۃ'' ہے۔ اس بارے میں مجاہد رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ مراد یہ ہے کہ نماز ایک بھاری اور مشکل کام ہے۔

(2) دوسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر صبر اور الصلوٰۃ دونوں کی طرف لوٹتی ہے اور اس کا مطلب ہے کہ صبر اور نماز دونوں بڑے بھاری اور مشکل کام ہیں۔

(3) تیسرا قول یہ ہے کہ یہ ضمیر ان تمام احکام کے مضمون کی طرف لوٹتی ہے جو اس سے پہلے مذکور ہوئے ہیں۔

اگرچہ عربیت کے لحاظ سے یہ تینوں اقوال اپنی اپنی جگہ پر درست ہو سکتے ہیں، اور ان میں سے ہر ایک کے حق میں خود قرآن مجید سے بھی دلائل مل سکتے ہیں۔ مگر ہمارے نزدیک اس میں پہلے قول کو، جو مجاہد رحمہ اللہ کا قول بھی ہے، ترجیح حاصل ہے۔

کَبِیْرَۃ:..... اس کے معنی ''شاقة'' اور ''ثقیلة'' کے ہیں، یعنی بھاری، گراں، کٹھن اور مشکل چیز۔ تحویلِ قبلہ کے حوالے سے بھی یہ لفظ اپنے انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے:

﴿وَ اِنْ کَانَتْ لَکَبِیْرَۃً اِلَّا عَلَی الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ﴾ (البقرہ 2:143)

''اور بے شک قبلے کی تبدیلی اللہ کے ہدایت یافتہ بندوں کے سوا سب پر گراں گزری ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ قبلے کی تبدیلی لوگوں پر شاق اور گراں گزری ہے، اور یہ ان کے لیے سخت امتحان تھا۔

اسی مفہوم میں کَبُرَ کا لفظ بھی قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے۔ جیسے:

﴿کَبُرَ عَلَی الْمُشْرِکِیْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَیْهِ﴾ (الشوریٰ 42:13)

''مشرکین پر وہ بات گراں گزرتی ہے جس کی طرف آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو بلاتے ہیں۔''

مراد یہ ہے کہ جس توحید کی دعوت ان کو دی جاتی ہے وہ ان کو سخت نا گوار اور گراں گزرتی ہے۔

خَاشِعِیْنَ: ...... یہ خشوع سے ہے اور خَاشِعٌ کی جمع سالم مذکر ہے۔

خشوع کے اصل معنی نرمی، جھکاؤ، پستی اور عاجزی کے ہیں۔ اس کا مترادف لفظ ''خضوع'' ہے۔ قرآن میں خاشعین کا لفظ اُن مومنین کی صفت کے طور پر آیا ہے جو اللہ سے ڈرتے ہوں، جن میں غرور اور تکبر نہ ہو اور جن کو ہر وقت آخرت کی جواب دہی کا احساس رہتا ہو۔ جیسا کہ سورۂ الاحزاب میں ہے۔

﴿...وَالْخٰشِعِیْنَ وَالْخٰشِعٰتِ...﴾ (الاحزاب 35:33)

''......اور خشوع کرنے والے اور خشوع کرنے والیاں......''

ایک اور مقام پر ہے:

﴿قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ o الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَo﴾ (المومنون 2,1:23)

''وہ ایمان والے یقیناً فلاح پائیں گے جو اپنی نماز میں عاجزی کرتے ہیں۔''

یَظُنُّوْنَ: ...... یہ ''ظن'' سے بنا ہے جس کے اصل معنی ''گمان'' کے ہیں، مگر ''یقین'' کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے بعض علماء نے اسے ''اضداد'' میں شمار کیا ہے۔

جمہور مفسرین نے اس مقام پر ''ظن'' کو ''یقین'' کے معنوں میں لیا ہے۔ ان کے نزدیک گویا یَظُنُّوْنَ کے معنی (وہ یقین رکھتے ہیں) کے ہیں۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ایک جنتی شخص کے بارے میں ہے:

﴿اِنِّیْ ظَنَنْتُ اَنِّیْ مُلٰقٍ حِسَابِیَهْo﴾ (الحاقه 20:69)

''بے شک مجھے یقین تھا کہ میرا حساب پیش آنے والا ہے۔''

ظاہر ہے آخرت میں حساب کتاب ہونے پر یقین مطلوب ہے نہ کہ اس کا گمان، ورنہ ایمان مکمل نہیں ہوتا جو کہ ''خَاشِعِیْنَ'' کے لیے ضروری ہے۔

اس سلسلۂ کلام میں پہلے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی دعوت دی گئی۔ پھر اُن کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیا گیا اور اب ان کو یہ نصیحت کی گئی ہے کہ دین کی راہ پر چلتے ہوئے جو مشکلیں اور آزمائشیں آئیں تو ان کٹھن حالات سے عہدہ برا ہونے کے لیے صبر اور نماز سے مدد لینا۔

جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَo﴾ (البقره 153:2)

''اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد لو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

پھر صبر کا مشکل ہونا تو واضح تھا، نماز کے بارے میں خاص طور پر بتایا کہ یہ بڑا مشکل کام ہے۔ منافقوں، ریا کاروں اور آرام طلب انسانوں کے لیے نماز کی پابندی اور اسے با جماعت ادا کرنا آسان نہیں ہے۔ لیکن ساتھ ہی یہ

حقیقت بھی واضح فرما دی کہ خاشعین کے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے جو ایمان رکھتے ہیں، عاجزی کرتے ہیں، جن کو آخرت کی فکر رہتی ہے اور جن کو اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ وہ اس کے صلے میں اُن کو اپنے انعامات سے نوازے گا، اور جنت عطا فرمائے گا۔

یہ انسانی نفسیات ہے کہ اگر انسان کو کسی کام کے کرنے سے بڑے فائدے یا انعام کی توقع ہو تو وہ اس کے لیے ہر مشقت اٹھانے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ پھر محبت کا تو معاملہ ہی اور ہے جس میں ہر کلفت، راحت اور ہر تلخی، شیرینی محسوس ہوتی ہے۔ ع

از محبت تلخ ہا شیریں شود (مولانا روم رحمہ اللہ)

''محبت کی وجہ سے کڑوی چیزیں بھی میٹھی ہو جاتی ہیں۔''

ایک شاعر کہتا ہے:

آلامِ روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ملا اُسے غمِ جاناں بنا دیا

پھر اہل ایمان کو ہر چیز سے بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے:

﴿وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ٭﴾ (البقرہ 2:165)

''اور ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔''

وہ اللہ تعالیٰ، جو کہ ان کا محبوب ہے، کے حکموں کی پابندی میں بھی لذت و سرور محسوس کرتے ہیں۔ ایک حدیث میں نبی ﷺ نے فرمایا:

((...... وَقُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ)) (نسائی، رقم: 3392)

''اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے۔''

اسی طرح جہاد کے میدان میں غازیوں کو سرور حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ شاعرِ مشرق کہتا ہے:

سُرور جو حق و باطل کی جنگاہ میں ہے
تو حرب و ضرب سے بیگانہ ہو تو کیا کہیے!

ایک ''ذہین قبوری'' نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس آیت میں صبر اور نماز سے استعانت یعنی مدد مانگنے کا ذکر موجود ہے، اور صبر اور نماز غیر اللہ ہیں۔ لہٰذا غیر اللہ سے استعانت طلب کرنا بالکل جائز ہے اور یہ ﴿اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ کے خلاف نہیں ہے۔

ہمارے نزدیک یہ ایک مغالطہ (ILLUSION) ہے جو شرک اور بدعت کے جواز کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور یہ ٹھیک ٹھیک تفسیر بالرائے مذموم کے ذیل میں آتا ہے۔

جب سورۃ الفاتحہ میں واضح طور پر نص صریح موجود ہے کہ:

﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ۝﴾

’’ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اور صرف تجھی سے مدد مانگتے ہیں۔‘‘

تو جس طرح ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ﴾ کے بعد غیر اللہ کی عبادت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، اسی طرح ﴿اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ کے بعد غیر اللہ سے استعانت یعنی مدد مانگنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہتا۔

کیونکہ دونوں باتوں میں تاکید اور حصر ایک جیسا ہے۔ پھر اَلْمُسْتَعَانُ ’’جس سے مدد مانگی جائے۔‘‘ صرف اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ کوئی اور اللہ تعالیٰ کی اس صفت میں اس کا شریک نہیں ہوسکتا۔ (الانبیاء 112:21)

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ
عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٤٧﴾ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّ لَا
يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٨﴾
وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ
اَبْنَآءَكُمْ وَ يَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَ فِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿٤٩﴾
وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ
تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٠﴾ وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ
مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿٥١﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ
لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٢﴾ وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ
تَهْتَدُوْنَ ﴿٥٣﴾ وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ
بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ
خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ

الرَّحِيْمُ ﴿٥٤﴾ وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ
جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿٥٥﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿٥٦﴾ وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ
وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ؕ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ؕ
وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْۤا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿٥٧﴾ وَ اِذْ
قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا
وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ؕ
وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿٥٨﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ
قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا
كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿٥٩﴾ ع ع ۶ ۱۳

''اے بنی اسرائیل! میری نعمتیں یاد کرو جو میں نے تم پر کیں۔ خاص طور پر جو میں نے تمہیں دنیا والوں پر فضیلت دی تھی۔ اور اُس دن سے ڈرو جب کوئی جان کسی اور کے کام نہ آئے گی، نہ کسی کی سفارش مانی جائے گی، نہ کسی سے مال لے کر اسے چھوڑا جائے گا، اور نہ کہیں سے کوئی مدد پہنچ سکے گی۔

وہ وقت یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعون کے لوگوں سے نجات دلائی، جنہوں نے تمہیں سخت عذاب میں ڈال رکھا تھا۔ وہ تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ اور اس میں تمہارے رب کی طرف سے بڑی آزمائش تھی۔

یاد کرو جب ہم نے سمندر پھاڑ کر تمہیں پار کرایا اور بچا لیا، مگر تمہاری آنکھوں کے سامنے فرعون کی قوم کو غرق کر دیا۔ یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو چالیس (40) راتوں کے وعدے پر بلایا۔ پھر ان کے پیچھے تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا اور تم ظالم بنے۔ اس کے باوجود ہم نے تمہیں معاف کیا، تاکہ تم شکر کرو۔

اور یاد کرو جب ہم نے موسیٰ کو کتاب دی اور حق و باطل کا فرق کرنے والی چیز دی، تاکہ تم ہدایت پاؤ۔ یاد کرو

جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے لوگو! تم نے بچھڑے کی پوجا کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔ اب تم اپنے پیدا کرنے والے کے آگے توبہ کرو اور اپنے لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کرو۔ باری تعالیٰ نے تمہارے لیے یہی بہتر فیصلہ فرمایا ہے۔ پھر اللہ نے تمہاری توبہ قبول کی۔ بے شک وہی توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہے۔

اور جب تم نے کہا تھا: اے موسیٰ! جب تک ہم اللہ کو خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں، تمہاری بات کا یقین نہ کریں گے۔'' اس کے بعد دیکھتے ہی دیکھتے تم پر بجلی گری اور تم ہلاک ہو گئے۔ پھر تمہاری موت کے بعد ہم نے تمہیں اٹھایا، تاکہ تم شکر گزار بنو۔

ایک وقت وہ تھا جب ہم نے تمہارے اوپر بادلوں کا سایہ کیا۔ تمہارے لیے من وسلویٰ کا رزق اتارا۔ تاکہ ہماری عطا کی ہوئی پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔ مگر اس کے بعد انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا، خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

یاد کرو جب ہم نے حکم دیا کہ اس بستی میں داخل ہو جاؤ اور وہاں جیسے چاہو، خوب کھاؤ پیو۔ جب اس بستی کے دروازے میں داخل ہونے لگو تو تمہارے سر جھکے ہوئے ہوں اور زبانیں توبہ و استغفار کر رہی ہوں۔ اس پر ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور ٹھیک حکم بجا لانے والوں کو اپنے فضل و کرم سے نوازیں گے۔ مگر ان ظالموں نے ہمارے حکم کو بدل ڈالا، تو ہم نے ان کی نافرمانی کی وجہ سے ان پر آسمان سے عذاب نازل کیا۔'' (47 تا 59)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (47)

اَلْعَالَمِیْنَ:...... اس سے پہلے سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں ہم لکھ چکے ہیں کہ اس لفظ سے مراد ''کسی ایک زمانے کے لوگ'' بھی ہوتے ہیں۔ اس جگہ یہ لفظ انہی معنوں میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ایک خاص دور میں دنیا کی دوسری قوموں پر فضیلت دی گئی۔ ہر زمانے کے لوگوں پر ان کو فضیلت حاصل نہ تھی۔ ورنہ ہماری امت کے بارے میں یہ ارشاد نہ ہوتا کہ:

﴿ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ.... ﴾ (آل عمران 110:3)

''تم بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی رہنمائی) کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔''

اس ارشاد سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ امت مسلمہ کو دنیا کی تمام امتوں اور قوموں پر فضیلت حاصل ہے۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ان کی غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے دوبارہ خطاب کر کے فرمایا کہ تم لوگ میری نعمتوں اور میرے احسانات کو یاد کرو۔ ان کے حوالے سے جو ذمہ داریاں تم پر عائد ہوتی ہیں، ان کو پورا کرو۔ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ پھر فرمایا کہ میں نے تمہیں یہ خاص نعمت بھی عطا کی کہ ایک مخصوص دور میں وقت کی تمام قوموں پر تمہیں فضیلت دی۔ یہ گویا عام کے بعد خاص کو بیان کرنے کا اسلوب ہے۔

یہی بات دوسری جگہ یوں فرمائی گئی:

﴿وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ﴾ (الدخان 44:32)

''اور ہم نے اپنے علم کے مطابق ان (بنی اسرائیل) کو دنیا والوں پر ترجیح دی تھی۔''

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو کئی نعمتوں اور احسانات سے نوازا تھا۔ ان کی فضیلت کا ایک خاص پہلو یہ بھی تھا کہ ان میں کثرت سے انبیائے کرام بھیجے گئے، جن میں سے بعض بیک وقت نبی بھی تھے اور حکمران بھی۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام، داؤد علیہ السلام اور سلیمان علیہ السلام۔ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَ جَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا وَّ اٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ﴾ (المائدہ 5:20)

''اور یاد کرو جب علیہ السلام موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا: اے میری قوم! اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو، جو اس نے تمہارے اندر نبی پیدا کیے، تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو دنیا میں کسی کو نہیں دیا۔''

فرمایا کہ یہ فضیلت دراصل اللہ تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم تھا، تمہارا اپنا کوئی استحقاق یا کمال نہ تھا۔ اس کے علاوہ تمہیں ایسی نعمتیں دیں جو دوسری قوموں کو نہیں دی گئیں۔ اب تمہارا یہ فرضِ منصبی ہے کہ تم قرآن پر اور حضرت محمد ﷺ پر ایمان لاؤ، جن کی نبوت کی پیش گوئیاں خود تمہاری کتاب (توریت) میں موجود ہیں جس پر عمل کرنے کا اللہ تعالیٰ سے عہد بھی کر چکے ہو۔

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝۴۸﴾ (48)

اس آیت میں بنی اسرائیل کو خبردار کیا گیا ہے کہ تم لوگ کسی غلط فہمی میں نہ رہو کہ نبیوں سے نسبت اور ان کی سفارش تمہیں آخرت میں نجات دلا دے گی۔ بلکہ وہاں صرف سچا ایمان اور نیک اعمال کام آئیں گے۔ اُس دن کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ کفر کی حالت پر مرنے والوں کے لیے کوئی شفاعت نہ ہوگی۔ دوزخ کے عذاب سے بچاؤ کے لیے کسی سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا اور جہنم سے نجات دلانے والا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

البتہ صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ ہماری امت کے بہت سے گناہ گار مسلمانوں کے لیے نبی ﷺ شفاعت کریں گے، جسے اللہ تعالیٰ قبول فرمالے گا۔ (دیکھیے: صحیح بخاری، رقم: 7510۔ صحیح مسلم، رقم: 479۔ ابو داؤد، رقم: 4739۔ ترمذی، رقم: 2435۔ ابن ماجہ، رقم: 4310)

﴿وَ اِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِيْ ذٰلِكُمْ بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ۝۴۹﴾ (49)

آل:...... اس کے معنی خاندان، قوم یا پیروکار کے ہیں۔

فِرْعَوْنَ:…… یہ مصر کے بادشاہوں کا لقب تھا جیسے روم کے بادشاہ قیصر اور ایران کے بادشاہ کسریٰ کہلاتے تھے۔

یَسُوْمُوْنَ:…… یہ ''سوم'' سے ہے۔ سَامَ یَسُوْمُ کے معنیٰ ہیں، کسی پر بوجھ ڈالنا۔ اس جگہ اس سے یہ مراد ہے کہ فرعون کی قوم نے بنی اسرائیل پر ذلت ناک عذاب مسلط کر رکھا تھا۔

بَلَآءٌ کے معنیٰ آزمائش کے بھی ہیں اور نعمت و احسان کے بھی۔ بنی اسرائیل کے لیے آزمائش یہ تھی کہ وہ مصر میں فرعونیوں کے غلام تھے جو اُن پر ظلم و ستم کرتے تھے۔ ان کے بیٹوں کو ذبح کر دیتے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کے لیے زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ اور بنی اسرائیل کے لیے نعمت یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو غلامی کی ذلت اور ظلم و ستم سے رہائی عطا فرمائی جیسا کہ ''نَجَّیْنٰکُمْ'' سے ظاہر ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنا یہ احسان یاد دلایا ہے کہ تم لوگ مصر میں فرعونیوں کے تحت ذلت آمیز غلامانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ وہ تم پر ظلم و ستم ڈھاتے تھے۔ تم سب غلامی کی سخت آزمائش میں مبتلا تھے۔ وہ تمہارے بیٹوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے اور تمہاری عورتوں کو لونڈیوں کی حیثیت سے زندہ چھوڑ دیتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تم پر کتنا بڑا احسان کیا کہ تمہیں مصر کے فرعونوں کی غلامی سے نجات دلائی۔

بنی اسرائیل کے بیٹوں کو ذبح کیے جانے میں ان لوگوں کی بے بسی کی طرف اشارہ ہے اور عورتوں کو لونڈیاں بنائے جانے میں ان کی غیرت کو جھنجھوڑا گیا ہے۔

مصر کے فراعنہ نے بنی اسرائیل کی نسل کشی (GENOCIDE) کے لیے ایک سے زیادہ مرتبہ مہم چلائی تھی۔ اُس دور میں بھی جب موسیٰ علیہ السلام ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے اور اُس زمانے میں بھی جب وہ رسول بن کر فرعون کے پاس آئے اور جادوگروں سے مقابلے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ سورۂ الاعراف میں اسی دوسری مہم کا ذکر اس طرح آیا ہے:

﴿وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَ قَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَ یَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَ اِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ۝﴾

(الاعراف 127:7)

''اور فرعون سے اُس کی قوم کے سرداروں نے کہا'' کیا تم موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم کو یوں ہی چھوڑ دو گے کہ وہ ملک میں فساد پھیلائیں اور تمہیں اور تمہارے معبودوں کو ٹھکراتے رہیں۔'' فرعون نے کہا: ہم اُن کے بیٹوں کو چن چن کر قتل کریں گے، ان کی عورتوں کو زندہ رکھیں گے اور ہمیں اُن پر پُورا غلبہ حاصل ہے۔''

﴿وَ اِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَیْنٰكُمْ وَ اَغْرَقْنَاۤ اٰلَ فِرْعَوْنَ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ۝۵۰﴾ (50)

الفرق:…… اس کے اصل معنیٰ ''اَلْفَصْلُ بَیْنَ الشَّیْئَیْنِ'' کے ہیں، یعنی دو چیزوں کو ایک دوسرے سے الگ کر دینا۔ اس جگہ فرقنا البحر کے معنیٰ ہیں، ہم نے سمندر کو پھاڑ کر الگ الگ کر دیا۔

بِكُمْ:…… یہاں لَكُمْ (تمہارے لیے، تمہاری خاطر) کے معنیٰ میں آیا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ ﴾ (البقره 2:185)

''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے۔''

اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ان پر اپنے ایک احسان کا ذکر فرمایا ہے کہ ایک ایسے موقع پر جب تمہارے آگے بحرِ قلزم کی موجیں اور تمہارے پیچھے فرعون کی فوجیں تھیں اور تم ان کے درمیان میں سینڈوچ (SANDWITCH) بن کر نرغے میں آ گئے تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہاری حفاظت فرمائی۔ ہم نے سمندر کو پھاڑ کر تمہارے لیے بچ نکلنے کا راستہ بنا دیا اور تم نے آگے چل کر ساحل پر سے اپنے دشمن کے غرق ہونے کا عبرت ناک منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔

اللہ تعالیٰ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام نے سمندر پر اپنا عصا مارا جس سے سمندر پھٹ گیا اور اس میں بنی اسرائیل کے بارہ (12) قبائل کے لیے بارہ (12) الگ الگ راستے بن گئے۔ یہ سراسر معجزہ تھا جو اللہ تعالیٰ کے حکم سے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھوں رونما ہوا تھا۔ قرآن نے اس واقعے کو چھ (6) مقامات پر بیان کیا ہے۔ سورۂ الشعراء میں یہ واقعہ اس طرح بیان ہوا ہے:

﴿فَاَوْحَيْنَا اِلٰى مُوْسٰى اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْبَحْرَ ؕ فَانْفَلَقَ فَكَانَ كُلُّ فِرْقٍ كَالطَّوْدِ الْعَظِيْمِ ۝ وَاَزْلَفْنَا ثَمَّ الْاٰخَرِيْنَ ۝ وَاَنْجَيْنَا مُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗۤ اَجْمَعِيْنَ ۝﴾

(الشعراء 26:63-66)

''پھر ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ ''اپنا عصا سمندر پر مارو!'' اس طرح سمندر کا پانی پھٹ گیا اور اس کا ہر حصہ پہاڑی تودے کی طرح کھڑا ہو گیا۔ ہم نے دوسرے فریق کو بھی اس کے قریب پہنچا دیا۔ پھر ہم نے موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا مگر دوسرے فریق کو غرق کر دیا۔''

افسوس، ہمارے ہاں کے بعض لوگوں نے، جس میں سرسید مرحوم، قادیانی حضرات، منکرین حدیث (مثلاً غلام احمد پرویز) اور اہل نظم (فرقۂ فراہیہ)......شامل ہیں، قرآن مجید کے اس واضح اور صریح معجزے کا انکار کیا ہے اور سمندر کے مدوجزر (جوار بھاٹا RISE & EBB oF THE SEA) کو بنی اسرائیل کے بچ نکلنے اور فرعونیوں کے غرق ہونے کا سبب قرار دیا ہے۔

غور کیجیے، عقل کے دعوے اور نیچریت کی بنیاد پر اس یکسر معجزے کا انکار کرنے والوں نے یہ کتنی غیر معقول بات کہی ہے!

﴿وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۝ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾ (52,51)

وٰعَدْنَا:......اس کے معنی وَعَدْنَا (ہم نے وعدہ کیا) کے ہیں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مخاطب کر کے ان پر اپنے ایک اور احسان کا ذکر فرمایا ہے۔

اس میں پہلے اس وعدے کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو توریت دینے کے لیے کیا تھا۔

مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل کو ہدایت و رہنمائی کے لیے جب ایک کتاب کی ضرورت پڑی تو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے وعدہ کیا کہ وہ کوہِ طور پر چالیس (40) راتوں کے لیے قیام کریں تو ان کو توریت عطا کی جائے گی۔ مگر اصل میں یہ تیس (30) راتیں تھیں، جن میں دس (10) کا اضافہ کر کے چالیس (40) کر دیا گیا تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام مقررہ وقت سے پہلے ہی وہاں پہنچ گئے۔ ان کا ذوق وشوق دیکھ کر اللہ تعالیٰ نے ان کی مزید روحانی تربیت کے لیے دس (10) راتیں اور بڑھا دی تھیں، جیسا کہ سورۃ الاعراف میں ہے:

﴿وَ وٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّ اَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً﴾ (الاعراف 142:7)

”اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تیس (30) راتوں کا وعدہ کیا۔ پھر اس میں دس (10) راتوں کا اضافہ کیا۔ اس طرح موسیٰ کے رب کی مقرر کردہ مدت چالیس (40) راتوں میں پوری ہوئی۔“

لیکن بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کے کوہِ طور پر چلے جانے کے بعد ان کے پیٹھ پیچھے سونے کی دھات کے بنے ہوئے بچھڑے کی پوجا کی اور شرک کا گناہ کر کے اپنے اوپر ظلم کیا۔ (یہی مضمون آگے آیت 54 میں ذرا تفصیل سے آ رہا ہے۔) اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس شرک کے باوجود ان کو فوری طور پر عذاب میں نہیں پکڑا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے واپس آ جانے تک مہلت دی۔ پھر جب وہ تشریف لائے تو انہوں نے قوم کی معافی کے لیے توبہ اور کفارے کی ایک صورت نکالی تا کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے اس انعام و احسان کا شکر ادا کریں جس نے ان کے شرک کے باوجود ان سب پر عذابِ استیصال نہیں بھیجا۔

﴿وَ اِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ۝۵۳﴾ (53)

اَلْكِتَابُ:...... اس جگہ اس سے توریت مراد ہے۔ اسی پر مفسرین کا اجماع رہا ہے۔

اَلْفُرْقَانُ:...... اس کے اصل معنی حق اور باطل میں فرق کرنے والی چیز کے ہیں۔ لیکن اس جگہ اس سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں کئی قول ہیں۔

بعض نے اس کے واؤ کو تفسیریہ (یا عطف بیان) کے معنوں میں لے کر توریت کی صفت 'فرقان' مانی ہے اور توریت ہی کو فرقان قرار دیا ہے کہ وہ حق و باطل میں فرق کرتی تھی۔ بعض نے الفرقان سے وہ معجزات مراد لیے ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کو دیے گئے تھے جیسے عصا اور یدِ بیضا وغیرہ۔ مجاہد رحمہ اللہ کا یہی قول ہے۔ قرآن نے غزوۂ بدر کو ”یوم الفرقان“ کہا ہے کیونکہ اس سے کفر کا باطل ہونا اور اسلام کا حق ہونا ظاہر ہوا تھا۔ (الانفال 41:8)۔ خود قرآن کا ایک صفاتی نام 'الفرقان' بھی ہے جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۝﴾ (الفرقان 1:25)

”بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (محمد) پر قرآن نازل کیا تا کہ سارے جہان والوں کو خبردار کر

دے۔“

فرمایا کہ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے توریت نازل فرمائی تھی اور موسیٰ علیہ السلام کو معجزات بھی عطا کیے تھے۔ پھر توریت میں اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں واضح پیش گوئیاں تھیں جن کو دیکھ کر مدینے کے یہودی بھی قرآن مجید پر اور حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر ایمان لا کر ہدایت پا سکتے تھے۔

﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِىِٕكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِىِٕكُمْ ۭ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (54)

بِاتِّخَاذِكُمْ:...... میں ب سببیہ ہے۔

بَارِئٌ:...... یہ بَرَءَ سے اسم فاعل ہے۔

اَلْبَارِئُ:...... اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے جس کے معنی ہیں: مختلف قسموں اور شکلوں کی جاندار چیزیں پیدا کرنے والا۔

فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ:...... اس کا مطلب خودکشی کرنا نہیں ہے بلکہ ایک مذہب وملت کے لوگ آپس میں بھائی بھائی ہوتے ہیں اور بھائی اپنی جان کی طرح ہوتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۝﴾ (الحجرات 49:11)

”اور تم (مسلمان) ایک دوسرے کو طعنے نہ دو۔“

اَلتَّوَّابُ:...... یہ مبالغے کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں: بار بار توبہ قبول کرنے والا۔

بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ لوگ جنھوں نے بچھڑے کی پوجا نہیں کی، وہ اپنے ان رشتہ داروں اور دوستوں کو قتل کریں جو بچھڑے کی پوجا کر کے مشرک اور مرتد ہو گئے تھے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو اپنی ایک اور نعمت یاد دلائی ہے کہ یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ تم لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنا کر اور اس کی پوجا کر کے جو شرک کیا ہے، وہ اپنے اوپر بڑا ظلم کیا ہے۔ لہٰذا اب تم توبہ کرو اور معافی مانگو اُس اللہ سبحانہٗ سے جس نے ہر قسم اور شکل وصورت کی مخلوق بنائی ہے۔ تم نے اپنے خالق کی عبادت کی بجائے اس کی ایک مخلوق...... بچھڑے کی پوجا کی ہے۔ شرک واقعی بڑا ظلم ہے۔ سورۂ لقمان میں ہے:

﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ (لقمان 31:13)

”بے شک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔“

ایک مشرک نہ صرف اللہ تعالیٰ کی حق تلفی کرتا ہے بلکہ انسانیت کی تذلیل وتوہین کرتا ہے کہ اپنے سے کمتر اور حقیر شے کے آگے جھکتا ہے حالاں کہ وہ خود اشرف المخلوقات ہے۔

اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو توبہ کے علاوہ یہ حکم بھی دیا کہ جنہوں نے شرک نہیں کیا، وہ موحدین ان مشرکین و مرتدین کو جنہوں نے شرک اور ارتداد کا ارتکاب کیا ہے...... قتل کر دیں۔ ہر قبیلے والے اپنے قبیلے کے مجرموں کی گردنیں اُڑا دیں۔ ﴿فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ کا یہی مطلب ہے۔ بائیبل کا بیان ہے کہ اس دن تین ہزار (3000) افراد مارے گئے تھے۔ (کتاب خروج، باب 32، آیات 25-30)

اس سے معلوم ہوا کہ ہماری شریعت کی طرح بنی اسرائیل کی شریعت میں بھی مرتد کی سزا قتل تھی جو بچھڑے کی پوجا کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے دی گئی تھی۔ اس طرح ان لوگوں کے گناہ کے لیے یہ بھی اجتماعی توبہ کی صورت بن گئی، جنہوں نے اپنے سامنے کفر و شرک ہوتے دیکھ کر اسے نہی عن المنکر کے تحت روکا نہیں تھا۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ بار بار قبول فرمانے والا اور ان پر مہربان ہے۔ اسی نے اپنے بندوں کی بھلائی کی خاطر ان کو توبہ کے ذریعے گناہوں کی معافی کا طریقہ سکھایا ہے۔

﴿وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝﴾ (55)

یہ بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کے ایک اور انعام و احسان کا ذکر ہے جب اُن کے ستر (70) سرداروں کو ان کی موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا گیا۔

موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کے ہم کلام ہونے کے بارے میں بنی اسرائیل شک کی گمراہی میں مبتلا تھے۔ وہ یہ کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ واقعی موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرتا ہے تو ہم اسے خود اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں، تاکہ وہ ہم سے بھی کلام کرے۔ اس کے بعد ہمیں یقین ہوگا کہ اللہ تعالیٰ بھی موسیٰ علیہ السلام پر وحی بھیجتا اور ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔

بنی اسرائیل کے اس مطالبے کو پورا کرنے کے لیے ان کے ستر (70) منتخب سرداروں کو ساتھ لے کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہ طور پر پہنچ گئے۔ وہاں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی تجلی کو اپنے اوپر اس طرح ظاہر ہوتے دیکھا جیسے آسمانی بجلی گرتی ہے۔ اس کے نتیجے میں تمام سردار مر گئے۔ سورۃ الاعراف (7:155) میں یہ واقعہ تفصیل سے بیان ہوا ہے مگر وہاں صاعقہ یعنی آسمانی بجلی کے بجائے "رَجْفَةٌ" (زلزلے) کا ذکر آیا ہے۔ گویا آسمانی بجلی کے کڑکے سے پہاڑ پر زلزلہ آ گیا جس کی دہشت سے سارے سردار ہلاک ہو گئے۔

﴿ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝﴾ (56)

اس میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرمایا کہ ہم نے تمہارے سرداروں کو ان کی ہلاکت کے بعد دوبارہ زندہ کر دیا تاکہ تم ہمارے اس احسان کو یاد رکھو اور ہمارا شکر ادا کرو کہ اس طرح ہم نے تمہاری بے یقینی کا علاج کر دیا۔

سورۃ الاعراف (7:155) میں اس واقعے کو بیان کرتے وقت ان سرداروں کی موت کے لیے اَهْلَكْتَهُمْ "تو نے ان کو ہلاک کر دیا" اور تُهْلِكُنَا "تو ہمیں ہلاک کرتا ہے" کے الفاظ آئے ہیں، جن سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے

کہ وہ لوگ واقعی ہلاک ہو گئے تھے اور ان کو دوبارہ زندہ کیا گیا تھا۔ یہ اسی طرح کا معجزہ ہے جس طرح عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ کرتے تھے۔(المائدہ 110:5)

﴿وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَ مَا ظَلَمُوْنَا وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝﴾ (57)

اَلْمَنُّ:......اس کے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو اللہ تعالیٰ کسی کو نعمت کے طور پر دیتا ہے، اور جسے حاصل کرنے کے لیے کوئی محنت مشقت نہیں کرنی پڑتی، مگر اس جگہ اس سے وہ رزق مراد ہے جو بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں کھانے کو ملتا رہا۔ یہ ساگودانہ جیسی ایک سفید میٹھی چیز تھی جو صبح کے وقت شبنم کی طرح گرتی اور پالے کی طرح جم جاتی تھی۔ بنی اسرائیل اسے جلدی سے کھا لیتے، کیونکہ دھوپ تیز ہونے سے اس کے دانے سورج کی گرمی سے پگھل کر ختم ہو جاتے تھے۔

اَلسَّلْوٰى:...... یہ بٹیر کی قسم کا پرندہ تھا۔ شام کے وقت ان پرندوں کے جھنڈ کے جھنڈ کہیں سے آجاتے۔ بنی اسرائیل ان کو آسانی سے پکڑ کر ذبح کرتے اور ان کا گوشت کھاتے تھے۔

كُلُوْا ''تم کھاؤ'' سے پہلے قُلْنَا ''ہم نے کہا'' کا فعل محذوف ہے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی وہ نعمتیں یاد دلائی ہیں جو اس نے ان کو صحرائے سینا میں عطا کی تھیں۔ سخت دھوپ سے بچنے کے لیے ان پر بادلوں کا سایہ کیا گیا۔ بے آب و گیاہ صحرا میں کھانے کو من وسلویٰ کی غذائیں مہیا کیں، جس کا ذکر خود بائیبل کی کتاب خروج، باب 16، آیات 13-21 میں بھی موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس قوم کو بہت سی نعمتوں سے نوازا مگر انہوں نے ہر نعمت ملنے پر اس کی ناشکری کی، اور اطاعت کی بجائے نافرمانی اور سرکشی اختیار کی۔ ظاہر ہے وہ اپنی ان حرکتوں سے اللہ تعالیٰ کا کچھ نہ بگاڑ سکے، الٹا اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔

اس مقام پر پہلے مخاطب کا صیغہ تھا جسے آخر میں غائب کے صیغے میں بدل دیا گیا تاکہ بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ کی بیزاری ظاہر ہو جائے۔

﴿وَ اِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّ قُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَ سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (58)

اَلْقَرْيَةَ:...... (جمع اَلْقُرٰى)، یہ قری سے بنا ہے، جس کے معنی جمع کرنے کے ہیں۔ قریہ، رہائش کے لیے لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ یہ لفظ چھوٹی بستی، قصبے اور بڑے شہر سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس مقام پر اس سے مراد یا تو بیت المقدس ہے جیسا کہ جمہور مفسرین کی رائے ہے یا اُریحا نامی شہر ہے جہاں مصر سے آنے کے بعد بنی اسرائیل سب سے پہلے داخل ہوئے تھے۔

سُجَّدًا:...... یہ جمع ہے سَاجِدٌ کی، جو سجدہ سے بنا ہے، جس کے معنی سر جھکانے کے ہیں۔ یہ سر جھکانا معمولی اور تھوڑا سا بھی ہو سکتا ہے اور رکوع کے برابر بھی اور یہ نماز کے سجدے کی طرح بھی ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ مشہور جاہلی شاعر

عمرو بن کلثوم کے معلقے کا شعر ہے:

اِذَا بَلَغَ الْفِطَامُ لَنَا صَبِیًّا
تَخِرُّ لَهُ الْجَبَابِرَ سَاجِدِیْنَا

''جب ہمارے قبیلے کا کوئی بچہ دودھ چھڑانے کی مدت کو پہنچ جاتا ہے تو بڑے بڑے جبار اور سرکش اس کے آگے سجدے میں گر جاتے ہیں۔''

حِطَّةٌ:...... یہ حَطَّ کا مصدر ہے۔ اس کے معنی ہیں: توبہ، معافی، بخشش اور استغفار۔ یہ لفظ گویا غُفْرَانَكَ ''تیری بخشش ہو'' کے معنوں میں ہے۔

اَلْمُحْسِنِیْنَ:...... یہ اَلْمُحْسِنُ کی جمع ہے جو ''احسان'' سے اسم فاعل ہے۔ عربی زبان میں احسان سے مراد ایسا کام ہے جو عقل اور دین دونوں کے لحاظ سے عمدہ، نفیس اور اعلیٰ ہو۔ کسی اچھے اور نیک کام کو سلیقے، عمدگی اور خوش اسلوبی سے کرنے کو بھی ''احسان'' کہتے ہیں۔ یاد رہے کہ احسان کا لفظ اردو زبان میں بالکل مختلف معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو عربی زبان میں ہرگز مراد نہیں ہوتے۔ البتہ ایسی صورت میں جب اس کے ساتھ کوئی صلہ (PREPOSITION) لگا ہوا ہو جیسے ''اَحْسَنَ بِ'' یا ''اَحْسَنَ اِلٰی'' تو پھر اس میں اردو والے معنی مراد ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید کے درج ذیل مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ (یوسف 100:12۔ القصص 77:28)

مصر سے نکلنے اور صحرائے سینا میں چالیس (40) برس تک پریشان پھرنے کے بعد بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ وہ شام و فلسطین کے شہر...... بیت المقدس، یا اُرِیحا، یا شِطِّیم میں داخل ہوں۔ وہاں خوب سیر ہو کر مزے سے کھائیں پئیں۔ جب شہر کے دروازے میں سے گزریں تو مغرورانہ اور متکبرانہ انداز اختیار نہ کریں بلکہ عاجزی سے سر جھکائے ہوئے اور زبان سے توبہ و استغفار کہتے ہوئے گزریں۔ اگر بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے اس حکم کی پابندی کی تو اللہ تعالیٰ ان کے گناہ معاف کر دے گا اور ان کی نیکیوں میں اضافہ فرمائے گا۔

﴿فَبَدَّلَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا یَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾ (59)

رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ:......اس سے مراد ہے ''آسمانی عذاب۔''

لیکن توبہ اور معافی کے لیے بنی اسرائیل کو جو دعائیہ لفظ...... حِطَّةٌ...... سکھایا گیا تھا، انہوں نے مذاق اور نافرمانی کرتے ہوئے اس لفظ کو بگاڑ کر کسی اور غیر متعلق لفظ حِنْطَةٌ (گندم) ''یا حَبَّةٌ فِیْ شَعَرَةٍ'' میں بدل ڈالا اور وہ دروازے سے داخل ہوئے (یَزْحَفُوْنَ عَلٰی اَسْتَاهِهِمْ) اپنے سرین (چوتڑوں) کے بل رینگتے ہوئے۔

اس طرح اس بدبخت اور ظالم قوم نے اللہ تعالیٰ کی نعمت کی ناقدری اور ناشکری کی۔ اس کے نتیجے میں ان پر وبا کی صورت میں عذاب بھیجا گیا۔ جیسا کہ بائیبل کا بیان ہے، بنی اسرائیل کے چوبیس ہزار (24,000) افراد ہلاک ہو گئے۔

احادیث میں بھی اس واقعے کا ذکر آیا ہے۔(صحیح بخاری، رقم: 3403۔ صحیح مسلم، رقم: 7523)

وَ اِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا
وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۞۶۰ وَ اِذْ
قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ
لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ
بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ؕ
اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ
وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا
يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ
ع ۷ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۞۶۱

”اور یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی کی دعا کی۔ ہم نے حکم دیا کہ: اپنا عصا اس پتھر کی چٹان پر مارو۔“ عصا مارتے ہی بارہ (12) چشمے پھوٹ نکلے۔ ہر گروہ نے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی۔ ان سے کہا گیا اللہ کے دیے ہوئے رزق میں سے کھاؤ پیو، مگر زمین میں فساد نہ پھیلاؤ اور یاد کرو جب تم نے موسیٰ سے کہا تھا: ہم ایک ہی قسم کے کھانے پر ہرگز صبر نہیں کر سکتے۔ تو ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کر، وہ ہمیں زمینی پیداوار مہیا کرے: ساگ، ککڑی، لہسن، مسور اور پیاز۔“ موسیٰ نے جواب دیا: کیا تم بہتر چیز کے بدلے کمتر چیز لینا چاہتے ہو؟ اچھا، کسی بستی میں چلے جاؤ، وہاں تمہیں سب کچھ مل جائے گا جو تم مانگتے ہو۔ پھر بنی اسرائیل پر ذلت اور محتاجی مسلط کی گئی اور وہ اللہ کے غضب کے مستحق ہوئے، کیونکہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے اور اس کے نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے اور چونکہ انہوں نے نافرمانی کی تھی اور وہ حد سے بڑھ گئے تھے۔“ (60-61)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَ اِذِ اسْتَسْقٰی مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَ لَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝﴾ (60)

اِسْتَسْقٰی:...... یہ سَقْی سے باب استفعال ہے۔ اس کے معنی ہیں: پانی مانگا، بارش کے لیے دعا کی۔
حضور ﷺ کے چچا ابو طالب کے مشہور قصیدہ لامیہ (ل) کا شعر ہے جس میں انہوں نے نبی ﷺ کی یوں تعریف کی ہے:

وَ اَبْيَضُ ، يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ
ثِمَالُ الْيَتَامٰى ، عِصْمَةٌ لِّلْاَرَامِلِ

''وہ روشن چہرے والا، جس سے بارش کے لیے دعا کروائی جاتی ہے، جو یتیموں کا سرپرست اور بیواؤں کی خبر گیری کرنے والا ہے۔''

اسی سے نماز استسقاء ہے جو قحط سالی کے زمانے میں بارش کے لیے پڑھی جاتی ہے۔

اُنَاس:...... یہ ''انسان'' کی جمع ہے۔

تَعْثَوْا:...... یہ عثی سے ہے جس کے اصل معنی ''حد سے بڑھ جانے'' کے ہیں، لیکن اس جگہ یہ ''فساد پھیلانے'' کے معنوں میں آیا ہے۔

یہ صحرائے سینا ہی کا واقعہ ہے اور اس کا ذکر بائیبل کی کتاب گنتی باب 20 میں بھی آیا ہے۔

بنی اسرائیل کو صحرائے سینا کی سخت گرمی میں پانی کی شدید قلت پیدا ہو گئی، یہاں تک کہ اس کے لیے انہوں نے آپس میں جھگڑا شروع کر دیا۔ اس پر موسیٰ علیہ السلام نے ان کے لیے پانی کی دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا کہ وہ اپنا عصا ایک چٹان پر ماریں۔ جب انہوں نے ایسا کیا تو اس چٹان میں سے بارہ (12) چشمے پھوٹ نکلے۔ بنی اسرائیل کے بھی بارہ (12) قبیلے تھے۔ ہر قبیلے نے اپنے لیے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی۔ اس طرح ان کے درمیان پانی کے معاملے میں کسی جھگڑے کا امکان باقی نہ رہا۔ بعض لوگوں نے اپنی جہالت سے اس معجزے کا انکار کیا ہے حالاں کہ یہ چٹان آج بھی صحرائے سینا میں موجود ہے اور اس میں پانی کے شگاف پائے جاتے ہیں۔

اس سے پہلے بنی اسرائیل کو اسی صحرائے سینا میں من و سلویٰ کی قدرتی غذائیں حاصل ہو چکی تھی۔ اب ان کو وافر مقدار میں پانی بھی میسر آ گیا۔ یہی وجہ ہے کہ من و سلویٰ کی نعمت ملنے پر ان کو كُلُوْا 'کھاؤ'' کہا گیا تھا لیکن اب پانی فراہم ہو جانے پر اس کے ساتھ وَاشْرَبُوْا 'اور پیو'' کا اضافہ فرما دیا گیا۔ پھر ان کو تاکید کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا رزق خوب کھاؤ پیو، اس کا شکر ادا کرو اور اس کی اطاعت و فرماں برداری اختیار کرو۔ ایسا نہ ہو کہ اس کی نافرمانی کرتے ہوئے زمین میں فساد پھیلانے لگ جاؤ۔

﴿وَ اِذْ قُلْتُمْ يٰمُوْسٰى لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰى طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ قِثَّآئِهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ الَّذِيْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ ؕ اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ ۗ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝۶۱﴾ (61)

بَقْلِهَا: ...... 'بَقْلٌ' سے ہر قسم کی سبزی ترکاری اور ساگ مراد ہے۔ عربی زبان میں سبزی فروش کو 'بَقَّالٌ' کہا جاتا ہے۔ آج کل جنرل سٹور کو بَقَّالَةٌ کہتے ہیں۔

قِثَّآئِهَا: ...... قِثَّاءٌ کے معنی ککڑی اور کھیرے کے ہیں۔

فُوْمِهَا: ...... فُوْمٌ کے معنی عام طور پر گندم (گیہوں) کے لیے گئے ہیں۔ لیکن مفسرین کی ایک جماعت نے اس سے 'لہسن' بھی مراد لیا ہے اور مسور کی دال اور پیاز کے ساتھ یہی معنی زیادہ مناسبت رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں 'تھوم' کا لفظ شاید اسی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔

اَدْنٰى: ...... اس کے اصل معنی 'اَقْرَبُ' یعنی ''زیادہ قریب'' کے ہوتے ہیں، لیکن یہ کسی حقیر، معمولی اور گھٹیا چیز کے معنوں میں بھی آتا ہے اور اس جگہ یہی معنی مراد ہیں۔

اِهْبِطُوْا: ...... یہ 'هبوط' سے ہے جس کے اصل معنی ہیں: کسی چیز کا اوپر سے نیچے گرنا۔ لیکن یہ 'نزول' (اترنے) کے معنوں میں بھی آتا ہے اور اس صورت میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مسافر فلاں جگہ اترا، یا اس نے وہاں قیام کیا۔

مِصْرًا: ...... اس کے معنی مَدِيْنَةٌ یعنی شہر کے ہیں۔ اس سے مصر کا ملک مراد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ غیر منصرف ہوتا ہے اور اس پر تنوین نہیں آتی۔

مَسْكَنَةٌ: ...... اس کے معنی بے بسی، بے چارگی، محتاجی اور کم ہمتی کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو صحرائے سینا میں من و سلویٰ کی قدرتی غذائیں عطا فرمائی تھیں، مگر اس قوم نے ناشکری کی اور اس کے بجائے سبزی دال اور لہسن پیاز مانگتی رہی۔ ان سے کہا گیا کہ کیا تم اعلیٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ چیز لینا چاہتے ہو؟ تمہاری اخلاقی پستی کا یہ حال ہے کہ تم مصر کی سابقہ غلامانہ زندگی کی آسائشوں اور چٹخاروں کے لیے ترستے ہو اور اب آزادی کے ماحول کی معمولی زحمتیں گوارا نہیں کر سکتے اور جفاکشی کی مجاہدانہ اور آبرومندانہ زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اچھا، کسی قریبی شہر میں چلے جاؤ، وہاں تمہاری ساری فرمائشیں پوری ہو جائیں گی۔

پھر فرمایا کہ بنی اسرائیل کی ناشکری، سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے ان پر ذلت، محتاجی اور بے چارگی مسلط کر دی گئی۔ ان پر اللہ تعالیٰ کی لعنت اور پھٹکار پڑی کیونکہ وہ نبیوں کو ناحق قتل کرتے تھے۔

بنی اسرائیل نے اپنے جن انبیائے کرام کو قتل کیا، ان میں زکریا علیہ السلام اور ان کے بیٹے یحییٰ علیہ السلام شامل ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی انہوں نے اپنے دعوے کے مطابق سولی پر لٹکایا، اگرچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی حفاظت فرمائی اور ان کو آسمان پر اٹھا لیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ النَّصٰرٰى وَ الصّٰبِـِٕيْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

''بے شک مسلمانوں کی جماعت ہو، یہودی ہوں، عیسائی ہوں، صابی ہوں، جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں تو ایسے لوگوں کو نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔'' (62)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

اَلنَّصَارٰی: ...... یہ نَصْرَانِیٌّ کی جمع ہے۔ اس سے عیسائی مراد ہیں۔

مریم علیہا السلام، اپنے بیٹے عیسیٰ علیہ السلام کو، جب کہ وہ ابھی بارہ (12) برس کے تھے، بیت اللحم سے ناصرہ نامی بستی میں لے گئی تھیں۔ اس بستی کی نسبت سے مسیح علیہ السلام ناصری اور عیسائی لوگ نصاریٰ کہلائے۔

اَلصّٰبِـِٕيْنَ: ...... یہ اَلصَّابِیْ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے یہودیت اور نصرانیت چھوڑ کر فرشتوں اور ستاروں کی پوجا اختیار کر لی۔

الدکتور وھبہ زحیلی کی تفسیر الوجیز میں ہے کہ اس مذہب کے ماننے والوں کی ایک جماعت اب بھی عراق کے علاقے موصل کے قریب پائی جاتی ہے۔

اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ: ...... یہ قرآن مجید کا ایک اسلوب ہے کہ وہ صرف اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان کا ذکر کر کے پورا ایمان مراد لیتا ہے۔ اس کی وضاحت ہم اسی سورت کی آیت 8 کے ضمن میں کر چکے ہیں۔

اس پوری آیت کی نظیر سورۃ المائدہ میں موجود ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِـُٔوْنَ وَ النَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ٥﴾ (المائدہ 69:5)

''بے شک مسلمانوں کی جماعت ہو، یہودی ہوں، صابی ہوں اور عیسائی ہوں، جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لائیں اور نیک اعمال کریں تو انہیں نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

سورہ البقرہ کی مذکورہ آیت اپنے سیاق و سباق (CONTEXT) میں یہودیوں کے اس جھوٹے دعوے کی تردید کرتی ہے، جو یہ کہتے تھے کہ آخرت میں صرف وہی نجات پائیں گے اور دوسری کوئی قوم نجات نہیں پائے گی۔

فرمایا، آخرت کی نجات کا دارومدار کسی خاص قوم، جماعت یا مذہبی گروہ میں شامل ہونے پر نہیں ہے، خواہ وہ مسلمانوں کی جماعت ہو، یہودی ہوں، عیسائی ہوں یا صابی ہوں...... بلکہ نجات کا انحصار صرف سچے ایمان اور نیک اعمال پر ہے۔ اسی معیار کے حامل لوگ جنت میں جائیں گے، جہاں ان کو نہ مستقبل کا کوئی خوف خطرہ ہوگا اور نہ ماضی کا کوئی غم۔

اس آیت میں آج ان مسلمانوں کے لیے بھی بڑا سبق ہے جو یہ سمجھے بیٹھے ہیں، کہ ان کے اعمال خواہ کیسے ہی ہوں، آخرت میں ان کے لیے بہرحال معافی اور نجات ہے۔ فرمایا، آخرت میں کوئی نسبت کسی کے کام نہ آئے گی، صرف ایمان اور عمل صالح کام آئیں گے۔

نوح علیہ السلام کے بیٹے کو اپنے پیغمبر باپ کی نسبت عذاب سے نہ بچا سکی۔ لوط علیہ السلام کی بیوی کو اپنے شوہر کی نسبت نہ دنیا کے عذاب سے محفوظ رکھ سکی اور نہ آخرت میں دوزخ کے عذاب سے بچا سکے گی۔ صحیح بخاری اور سنن نسائی میں ہے کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی کہ:

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ (الشعراء 214:26)

''اور (اے نبی) آپ اپنے قریبی رشتہ داروں کو خبردار کردیں۔''

تو رسول اللہ ﷺ نے دوسروں کے علاوہ اپنی پھوپھی صفیہ رضی اللہ عنہا اور اپنی صاحبزادی فاطمہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا:

((يَا صَفِيَّةُ عَمَّةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ، لَا أُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا، وَيَا فَاطِمَةُ بِنْتَ مُحَمَّدٍ سَلِيْنِيْ مَا شِئْتِ مِنْ مَالِيْ، لَا أُغْنِيْ عَنْكِ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا))

(صحيح بخاری، رقم: 2753۔ سنن نسائی، رقم: 3677)

''اے صفیہ (رضی اللہ عنہا)، اے میری پھوپھی جان، میں اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔ اور اے میری بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا)! تم مجھ سے جو مال لینا چاہو، لے سکتی ہو، مگر میں اللہ تعالیٰ کے ہاں تمہارے کچھ بھی کام نہ آسکوں گا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ نبی ﷺ سے رشتہ داری کی نسبت بھی آخرت میں کسی کے کام نہ آسکے گی۔

اس آیت سے بعض لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ جو اہل کتاب (یہودی اور عیسائی) اپنی الہامی کتابوں کو مانتے اور ان کے مطابق عمل کرتے ہیں، ان کے لیے رسول اللہ ﷺ کی نبوت و رسالت پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، وہ اس کے بغیر بھی نجات پاسکیں گے۔

لیکن ان لوگوں کا یہ خیال کئی لحاظ سے صحیح نہیں ہے:

1۔ قرآن مجید کا یہ اسلوب ہم پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ وہ صرف اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانے کا ذکر کر

کے اس سے پورا اور کامل ایمان مراد لیتا ہے، جس میں فرشتوں، کتابوں اور نبیوں پر ایمان لانا بھی شامل ہوتا ہے اور اس جگہ "مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ" سے پورا ایمان مراد ہے جس میں تمام انبیاء و رسل پر ایمان لانا بھی شامل ہے۔

2۔ اس آیت میں ایمان کے اجزاء کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ آخرت میں نجات کا دارومدار کسی خاص قوم، جماعت یا مذہبی گروہ بندی پر نہیں ہے، جیسا کہ یہود نے سمجھ رکھا ہے بلکہ آخرت کی نجات کا انحصار صرف سچے ایمان اور نیک اعمال پر ہے۔

3۔ یہ درست ہے کہ قرآن مجید اپنے سے پہلی کتابوں کے آسمانی ہونے کی تصدیق کرتا ہے، مگر وہ ان کو محفوظ نہیں مانتا، بلکہ ان میں ردوبدل اور تحریف کا قائل ہے جس کے بعد وہ معتبر اور قابل اعتماد نہیں ہیں۔ (ملاحظہ ہوں البقرہ 79:2)

4۔ اللہ سبحانہٗ نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے ان کو قرآن پر ایمان لانے کی دعوت دی ہے اور ایمان نہ لانے کی صورت میں ان کو کافر قرار دیا ہے:

﴿یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَ اَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَ اِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ ○ وَ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَ لَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَ لَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا ۫ وَّ اِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ○﴾ (البقرہ 41,40:2)

"اے بنی اسرائیل! میری نعمتوں کو یاد کرو، جو میں نے تمہیں عطا کیں۔ اس عہد کو پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا تھا، میں اس عہد کو پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا تھا، اور صرف مجھ سے ڈرو۔ اور اس (قرآن) پر ایمان لاؤ جو میں نے اتارا ہے جو اس (توریت) کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے۔ ایسا نہ ہو کہ دوسروں سے پہلے تم کافر بن بیٹھو۔ یاد رکھو، دنیا کا حقیر مال لے کر میری آیتیں نہ بیچو اور مجھی سے ڈرو۔"

اب ظاہر ہے ان کے لیے قرآن پر ایمان لانا صرف اِسی صورت میں ممکن ہے، جب وہ حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت کا بھی اقرار کریں۔ ورنہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لائے بغیر وہ صرف قرآن مجید پر کیسے ایمان لا سکتے ہیں؟

اس سے واضح ہو گیا کہ اہل کتاب کی نجات کے لیے حضرت محمد ﷺ کی نبوت و رسالت پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

5۔ صحیح مسلم میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَالَّذِیْ نَفْسُ مُحَمَّدٍ بِیَدِهٖ، لَا یَسْمَعُ بِیْ اَحَدٌ مِّنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ، یَهُوْدِیٌّ وَلَا نَصْرَانِیٌّ، ثُمَّ یَمُوْتُ وَلَمْ یُؤْمِنْ بِالَّذِیْ اُرْسِلْتُ بِهٖ، اِلَّا كَانَ مِنْ اَصْحَابِ النَّارِ)) (صحیح مسلم، رقم: 386)

"قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے کہ اس امت کا کوئی شخص ایسا نہیں ہے، خواہ وہ

یہودی ہو، یا عیسائی، جو میری رسالت کی خبر سنے اور اس پیغام کو جو میں لایا ہوں، نہ مانے، اور پھر دوزخیوں میں شامل نہ ہو۔''

مختصر یہ کہ حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بعد ہر شخص کی نجات پانے کے لیے یہ ضروری ہو گیا ہے کہ وہ آپ پر بھی ایمان لائے۔

البتہ اس اصول اور ضابطے سے، جیسا کہ اوپر والی حدیث میں اشارہ ہے، صرف وہ لوگ مستثنیٰ ہو سکتے ہیں جن تک حضور ﷺ کی دعوت نہ پہنچی ہو۔ ان کے انجام کا فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ جیسے چاہے گا، خود فرمائے گا، کسی اور کو اس بارے میں کسی فیصلے کا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْ لَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ رَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ ﴿۶۴﴾ وَ لَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِی السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِیْنَ ﴿۶۵﴾ ۚ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۶۶﴾

''اور یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا اور اُس وقت طور پہاڑ کو تمہارے اوپر کھڑا کر دیا، کہ جو کتاب ہم نے تمہیں دی، اسے مضبوطی سے پکڑو اور جو کچھ اس میں بیان کیا گیا ہے، اسے اچھی طرح یاد رکھو، تا کہ عذاب سے بچ جاؤ۔ مگر اس کے بعد تم اس عہد سے پھر گئے۔ پھر اگر اللہ اپنا فضل نہ فرماتا تو تم ہلاک ہو چکے ہوتے۔

اور تمہیں اپنے ان لوگوں کا قصہ یاد ہے، جنہوں نے ہفتے کے دن کے بارے میں زیادتی کی۔ ہم نے ان سے کہا: ''تم ذلیل بندر بن جاؤ۔'' ہم نے اس واقعے کو ان لوگوں کے لیے جو اس وقت موجود تھے، اور ان کے لیے جو بعد میں آئے، عبرت کا نمونہ بنا دیا۔ اور اللہ سے ڈرنے والوں کے لیے اس میں نصیحت رکھ دی۔'' (63-66)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اذْكُرُوْا مَا فِیْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾﴾ (63)

مِيْثَاقَكُمْ:...... میثاق، وثق سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں: پکا وعدہ، پختہ عہد، معاہدہ۔ دین و شریعت بھی رب اور بندے کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے، جسے میثاق بھی کہا جاتا ہے۔

اَلطُّوْرَ:...... اس سے وہ پہاڑ مراد ہے جس پر موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ ہم کلام ہوا تھا۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے جس میثاق اور معاہدے کا ذکر ہے، اس کے بارے میں قرآن مجید نے دوسری جگہ وضاحت کر دی ہے کہ اس سے مراد توریت کے احکام کی پابندی تھی۔

﴿اَ لَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَ دَرَسُوْا مَا فِيْهِ ؕ وَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ٥ وَ الَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ ؕ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ٥﴾ (الاعراف 170,169:7)

''کیا ان (بنی اسرائیل) سے کتاب میں یہ عہد نہیں لیا گیا کہ وہ حق کے سوا اللہ کی طرف کوئی بات منسوب نہیں کریں گے؟ کیا جو کچھ کتاب میں لکھا ہے، وہ اسے پڑھ نہیں چکے؟ یہ کہ پرہیز گاروں کے لیے آخرت کا گھر بہتر ہے۔ کیا تم نہیں سمجھتے؟ جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں تو ایسے نیک لوگوں کا اجر ہم ضائع نہیں کرتے۔''

بنی اسرائیل کے نمائندہ سرداروں سے دامنِ کوہ میں یہ عہد لیا گیا تھا کہ وہ توریت کے احکام کی پابندی کریں گے، پھر عہد لینے کے بعد ان کے اوپر طور پہاڑ کو بلند کر دیا گیا، جس کی تشریح سورۂ الاعراف میں اس طرح کی گئی ہے۔

﴿وَ اِذْ نَتَقْنَا الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَاَنَّهٗ ظُلَّةٌ وَّ ظَنُّوْۤا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۚ﴾ (الاعراف 171:7)

''اور یاد کرو جب ہم نے ان (بنی اسرائیل) کے اوپر پہاڑ کو اٹھایا گویا وہ سائبان ہے۔ انہوں نے سمجھا، وہ اُن پر آن پڑے گا۔''

نَتَقْنَا الْجَبَلَ کے معنی ہیں کہ ہم نے پہاڑ پر زلزلہ سا طاری کر دیا۔ جس کے ہلنے کے باعث اس کے دامن میں کھڑے لوگوں نے یہ سمجھا کہ یہ پہاڑ بھی ان پر گر پڑے گا۔

بنی اسرائیل سے توریت کی پابندی کا عہد لینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور جلال ظاہر کیا، کہ تم لوگ جس ہستی سے معاہدہ کر رہے ہو، وہ کوئی کمزور اور بے بس نہیں ہے بلکہ وہ قادرِ مطلق ہے۔ تم اگر توریت کے احکام کے پابند رہو گے تو وہ تمہیں دنیا اور آخرت کی نعمتیں عطا فرمائے گا اور اگر تم نے اس کے احکام کی خلاف ورزی کی تو وہ تم پر اپنا قہر و غضب نازل کرے گا اور تم اس کے عذاب سے بچ نہیں سکو گے۔

بعض لوگوں کو اس مقام پر یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے سروں پر کوہِ طور لٹکا کر ان سے یہ میثاق زبردستی لیا تھا۔ لیکن یہ چیز اللہ تعالیٰ کی سنت اور دینِ اسلام کی روح (SPIRIT) کے خلاف ہے۔ معاہدہ وہی درست (VALID) مانا جاتا ہے جو فریقین کی باہمی رضا مندی سے ہو۔ یہ معاہدہ بھی آزاد مرضی سے اختیاری طور پر ہوا

تھا۔ معاہدہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے پہاڑ پر زلزلہ طاری کر کے اپنی قدرت کی ایک نشانی دکھائی تھی، جیسا کہ تفسیر مراغی میں اسی جگہ پر ہے:

((وَكَانَتْ هٰذِهِ الْآيَةُ بَعْدَ اَخْذِ الْمِيْثَاقِ لِكَيْ يَاْخُذُوْا مَا اُوْتُوْهُ مِنَ الْكِتَابِ بِقُوَّةٍ وَّاجْتِهَادٍ......))

''کہ اللہ تعالیٰ نے معاہدے کے بعد اپنی قدرت کی یہ نشانی دکھائی، تاکہ وہ لوگ کتابِ الٰہی کے احکام پر مضبوطی سے قائم رہیں اور سرگرمی سے عمل کریں۔''

﴿ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝﴾ (64)

لیکن بنی اسرائیل نے توریت کی پابندی کے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔ اس طرح انہوں نے اپنی سرکشیوں اور نافرمانیوں میں ایک اور اضافہ کر لیا۔

چونکہ مدینے کے یہود اپنے آباء و اجداد کے حالات و واقعات پر فخر کرتے تھے، اس لیے قرآن نے ان کو خطاب کر کے یہ بات کہی ہے۔

پھر فرمایا کہ تم لوگوں کے کرتوت ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نیست و نابود کر دیتا مگر اس نے تمہیں مہلت دے رکھی ہے اور اب حضرت محمد ﷺ کی بعثت اور قرآن کے ذریعے تمہیں آخری موقع فراہم کر دیا ہے کہ تم اپنی سرکشی اور نافرمانی کی عادت چھوڑ کر سچا ایمان لاؤ اور اطاعت و فرماں برداری کی زندگی اختیار کر لو۔

﴿وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝ۚ﴾ (65)

اَلسَّبْتِ: ...... اس کے معنی ہیں: ہفتے کا دن (SATURDAY)۔ بنی اسرائیل کے لیے یہ دن مقدس تھا اور عبادت کے لیے مخصوص تھا۔ اس میں وہ کاروبار، شکار، یا کوئی دنیوی کام نہیں کر سکتے تھے۔ مگر اس سرپھری قوم نے اس دن کے تقدس کا کوئی لحاظ نہ کیا، اس بارے میں حکم کی خلاف ورزی کی اور اس دن کی بے حرمتی کی۔

قِرَدَةً: ...... یہ قِرْدٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: بندر۔

خٰسِـِٕيْنَ: ...... یہ خَاسِئٌ کی جمع ہے جس کے معنی ذلیل اور حقیر کے ہیں۔

اس آیت میں مدینے کے یہود کو ان کے باپ دادا کی سرکشی اور نافرمانی کا ایک اور واقعہ یاد دلایا گیا ہے۔ یہ واقعہ بحرِ احمر (RED SEA) کے پاس عقبہ کے علاقے میں ایلات نامی ساحلی بستی میں پیش آیا تھا، جہاں بنی اسرائیل کے لوگ آباد تھے۔ یہ لوگ سبت یعنی ہفتے کے دن کی بے حرمتی کرتے ہوئے اور اس کے تقدس کو پامال کرتے ہوئے مچھلیوں کا شکار کر لیتے تھے جو کہ ان کے لیے اس دن منع تھا۔ اس جگہ یہ واقعہ مختصر بیان ہوا ہے۔

مگر سورۃ الاعراف میں اسے ذرا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے:

﴿وَسْئَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِيْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ م اِذْ يَعْدُوْنَ فِي السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّ يَوْمَ لَا يَسْبِتُوْنَ لا لَا تَاْتِيْهِمْ ج كَذٰلِكَ ج نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ٥ وَ اِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا لا نِ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ط قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ٥ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوْٓءِ وَ اَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍ م بَئِيْسٍ م بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ٥ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِئِيْنَ٥﴾

(الاعراف 166,163:7)

''اور (اے نبی) ان (بنی اسرائیل) سے اس بستی کا حال پوچھیں جو سمندر کے کنارے آباد تھی۔ جہاں کے لوگوں نے سبت یعنی ہفتے کے دن کی خلاف ورزی کی، جب ہفتے کا دن ہوتا تو مچھلیاں پانی کے اوپر کثرت سے آجاتیں۔ اور جب ہفتہ نہ ہوتا تو نہ آتیں۔ اس طرح ہم نے ان کی نافرمانیوں کی وجہ سے ان کو آزمائش میں ڈالا۔

یاد کرو، اس بستی کے ایک گروہ نے بعض لوگوں سے کہا: ''تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو، جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے، یا انہیں سخت عذاب دینے والا ہے۔'' انہوں نے جواب دیا: ''اس لیے تاکہ تمہارے رب کے سامنے عذر پیش کر سکیں (کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا) اور شاید وہ لوگ ڈریں۔ پھر جب انہوں نے وہ ساری نصیحتیں بھلا دیں جو ان کو کی گئی تھیں تو ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے مگر ظالموں کو ان کی نافرمانی کی وجہ سے سخت عذاب میں پکڑ لیا۔ پھر جب وہ اس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہو گئے جس سے ان کو روکا گیا تو ہم نے انہیں حکم دیا کہ ''تم ذلیل بندر بن جاؤ۔''

جمہور مفسرین کی رائے میں ان لوگوں کی شکلیں مسخ ہو گئی تھیں۔ وہ واقعی بندر بنا دیے گئے تھے اور تین دن کے اندر وہ بھوکے پیاسے مر گئے تھے۔ لیکن مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ان کی شکلیں نہیں بدلی تھیں، بلکہ ان کے دل و دماغ بندروں جیسے ہو گئے تھے اور وہ بندروں جیسی حرکات کرتے تھے، جیسا کہ بعض اہل کتاب یہودیوں کے بارے میں ہے کہ ان کی مثال ایسے گدھے کی سی ہے، جس پر کتابیں لاد دی گئی ہوں اور وہ ان کی حقیقت سے بے خبر ہو۔

﴿مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا﴾ (الجمعه 5:62)

''جن لوگوں کو تورات کا حامل بنایا گیا اور انہوں نے اپنی ذمہ داری پوری نہ کی، تو ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے جو کتابوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔''

قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ان کے جوانوں کو بندر اور بوڑھوں کو خنزیر بنا دیا گیا جیسا کہ سورۃ المائدہ میں اس

طرف اشارہ ملتا ہے۔

﴿قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَ غَضِبَ عَلَيْهِ وَ جَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَ الْخَنَازِيْرَ وَ عَبَدَ الطَّاغُوْتَ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّ اَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ﴾ (المائدہ 5:60)

''کہہ دیجیے! کیا میں ایسے لوگ بتاؤں جو اللہ کے ہاں برے انجام سے دوچار ہوں گے؟ وہ جن پر اللہ نے لعنت کی، جن پر اپنا غضب نازل کیا، جن میں سے بندر اور سؤر بنا دیے اور جنھوں نے شیطان کی پوجا کی۔ یہی لوگ ہیں جو درجے کے لحاظ سے بدتر ہیں اور سیدھی راہ سے بہت بھٹکے ہوئے ہیں۔''

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں اسی قول کو ترجیح دی ہے۔

﴿فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَ مَا خَلْفَهَا وَ مَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (66)

نَكَالًا:...... نکال سے مراد ایسی سزا ہے جس سے دوسروں کو بھی عبرت ہو۔

اللہ تعالیٰ نے چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا کو بھی نکال (عبرت ناک سزا) سے تعبیر فرمایا ہے:

﴿وَ السَّارِقُ وَ السَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ (المائدہ 5:38)

''اور چور مرد ہو یا عورت ہو، دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یہی ان کی کمائی کا بدلہ اور اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا ہے۔''

مَوْعِظَةً:...... وعظ سے ہے۔ اس کے معنی ایسی نصیحت کے ہوتے ہیں، جو خیر خواہی سے کی جائے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے اس واقعے کو ان کے اپنے زمانے کے لیے اور قیامت تک کے لیے ایک عبرت ناک واقعہ بنا دیا کہ جو احکامِ الٰہی کو توڑے گا اور اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرے گا، اس کا ایسا انجام بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اُن لوگوں کے لیے، جو تقوے کی زندگی گزارنا چاہیں، اس واقعے میں بڑی نصیحت موجود ہے۔

وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ؕ
قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝٦٧
قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا
بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّ لَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝٦٨

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۚ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا
بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِينَ ﴿٦٩﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا
رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۖ وَإِنَّآ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ
لَمُهْتَدُونَ ﴿٧٠﴾ قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ تُثِيرُ الْأَرْضَ
وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيهَا ۚ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۚ
فَذَبَحُوهَا وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾ ع وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۚ ع ۸
وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ﴿٧٢﴾ ج فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ
كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٧٣﴾

"اور یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا: "اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔" انہوں نے کہا: کیا ہم سے مذاق کرتے ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: "میں اس بات سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں کہ ایسا نادان بنوں۔" وہ کہنے لگے: تم اپنے رب سے پوچھو، وہ ہمیں بتائے کہ گائے کیسی ہو؟" موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ فرماتا ہے، وہ گائے نہ بوڑھی ہو اور نہ نوجوان بلکہ درمیانی عمر کی ہو۔ اب تم اس حکم پر جلد عمل کرو۔" وہ کہنے لگے: تم اپنے رب سے معلوم کرو، وہ ہمیں واضح طور پر بتائے، اس گائے کا رنگ کیسا ہو؟ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ فرماتا ہے، وہ گہرے زرد رنگ کی ہو، جو دیکھنے والوں کو اچھی معلوم ہو۔" پھر وہ کہنے لگے: تم اپنے رب سے درخواست کرو، وہ ہمیں صاف طور پر بتائے، وہ گائے کیسی ہو؟ کیونکہ گائے کے بارے میں ہم شبے میں پڑ گئے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو جلد ہی اس گائے کا پتہ چلا لیں گے۔" موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اللہ فرماتا ہے، وہ گائے ایسی ہو جس سے کوئی کام نہ لیا جاتا ہو۔ وہ زمین کو جوتنے والی اور کھیتوں کو پانی دینے والی نہ ہو۔ وہ صحیح سالم ہو، اس میں کوئی داغ نہ ہو۔" وہ بولے: اب تم نے ٹھیک بات کہی۔" پھر انہوں نے وہ گائے ذبح تو کر دی، مگر وہ یہ کام کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

اور یاد کرو جب تم نے ایک آدمی قتل کر دیا۔ پھر ایک دوسرے پر اس کا الزام لگاتے تھے۔ حالاں کہ اللہ اس بات کو ظاہر کرنا چاہتا تھا جسے تم چھپانا چاہتے تھے۔ اس پر ہم نے حکم دیا کہ اسی گائے کے گوشت کا ایک ٹکڑا مردہ آدمی کی لاش پر مارو، وہ زندہ ہو جائے گا۔ اللہ اس طرح مردہ انسانوں کو زندہ کرے گا، اور تمہیں وہ اپنی نشانیاں دکھاتا

ہے تاکہ تم سمجھو۔'' (73-67)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَ اِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖٓ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً ؕ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ ۝﴾ (67)

بَقَرَۃٌ:...... یہ اسم جنس ہے۔اس سے گائے بھی مراد ہو سکتی ہے اور بیل بھی۔ کیونکہ آگے چل کر آیت 70 میں اسے اَلْبَقَرَ بھی کہا گیا ہے۔ ﴿اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَیْنَا﴾ اور یہ بھی اسم جنس ہے جیسا کہ سورۂ الانعام (144:6) میں ﴿وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَیْنِ﴾ ''اور بیل گائے کا جوڑا'' آیا ہے۔ ویسے عربی زبان میں بیل کے لیے الگ سے لفظ ثَوْرٌ بھی موجود ہے۔ مکہ مکرمہ کے ایک پہاڑ کو 'جبل ثور' کہتے ہیں کیونکہ وہ دور سے بیل کی پیٹھ کی طرح نظر آتا ہے۔

سَبْت یعنی ہفتے کے دن کی بے حرمتی کے بعد بنی اسرائیل کی نافرمانی اور حیلہ بازی کا یہ دوسرا واقعہ ہے۔ اس میں ضروری نہیں کہ واقعات کی زمانی ترتیب (CHRONOLOGICAL ORDER) ہو۔ قرآن مجید عام طور پر اس ترتیب کا لحاظ نہیں رکھتا کیونکہ وہ بنیادی طور پر تاریخ (HISTORY) کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہدایت کی کتاب ہے، اور اس کا مقصد وعظ و نصیحت ہے جس کے لیے یہ ترتیب ضروری نہیں ہوتی۔

کہا جاتا ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک امیر بوڑھا تھا، جس کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس کی وراثت کے لالچ میں اس کے چچازاد بھائی نے اسے قتل کر دیا اور لاش کسی اور کے گھر کے پاس ڈال دی۔ پھر اُن لوگوں پر قتل کا الزام لگا کر ان سے دیت کا مطالبہ کر دیا۔ جب یہ مقدمہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے پیش ہوا تو آپ نے لوگوں کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اس حکم میں دو مقاصد تھے، ایک یہ کہ اس کے ذریعے قاتل کا سراغ لگایا جانا تھا اور دوسرے اس طرح بنی اسرائیل کے دلوں سے گائے کا تقدس ختم کرنا تھا، جو مصر کی غلامی کے زمانے میں ان میں پیدا ہو چکا تھا، کیونکہ وہاں گائے کی پوجا ہوتی تھی۔ گائے کے اسی تقدس اور تعظیم کی وجہ سے اس سے پہلے بنی اسرائیل بچھڑے کی پوجا بھی کر چکے تھے۔ چونکہ یہ لوگ شریعت کے احکام کی نافرمانی اور اُن میں حیلہ بازی کے عادی تھے، اس لیے انہوں نے گائے ذبح کرنے کے حکم پر بھی ٹال مٹول شروع کر دی۔ لیکن آخر میں مجبور ہو کر بے دلی کے ساتھ اس حکم پر عمل کر لیا۔

اس آیت میں جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تو بنی اسرائیل کہنے لگے کہ کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں۔ ہم نے آپ سے قاتل کا سراغ لگانے کی درخواست کی ہے اور آپ ہمیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیتے ہیں! اس پر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

''میں اس بات سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہوں کہ شریعت کے معاملے میں تم سے ہنسی مذاق کروں اور نادان بنوں۔ میں تمہیں اللہ سبحانہٗ کا ایک حکم سنا رہا ہوں، کوئی مذاق نہیں کر رہا ہوں۔''

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ؕ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ؕ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ۝﴾ (68)

فَارِضٌ:...... ایسی بوڑھی جو بچے دینے کے قابل نہ رہی ہو۔

بِكْرٌ:...... اتنی چھوٹی عمر کی جس نے اب تک کوئی بچہ نہ جنا ہو۔

عَوَانٌ:...... درمیانی عمر کی جس نے ایک یا دو بچے جنے ہوں۔ اصل میں پوری عبارت یوں ہے:

﴿عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ وَهٰذَا﴾ کہ فَارِضٌ اور بِكْرٌ دونوں کے درمیان کی عمر والی ہو۔

بنی اسرائیل کو کوئی سی مناسب گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا، مگر انہوں نے ٹال مٹول کے لیے سوالات کا سلسلہ شروع کر دیا۔ کہنے لگے کہ اے موسیٰ! اپنے رب سے پوچھ کر ہمیں بتا کہ وہ گائے کیسی ہو؟ جواب دیا گیا کہ اوسط عمر کی ہو، نہ بوڑھی ہو اور نہ بچھیا۔ پھر فرمایا کہ حکم کی تعمیل کرو، تاکہ قاتل کا پتہ چلایا جائے اور غیر ضروری سوال نہ کرو۔ شریعت کے حکم سے بچنے کے لیے حیلے بازی نہ کرو۔ ورنہ دین کی آسانیوں میں تنگی پیدا کر لو گے۔

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ؕ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ۝﴾ (69)

فَاقِعٌ لَّوْنُهَا:...... یہ صَفْرَاءُ (زرد رنگ والی) کی تاکید کے لیے ہے، مراد یہ ہے کہ وہ گہرے شوخ زرد رنگ کی گائے ہے۔

گائے کے بارے میں یہ بنی اسرائیل کا دوسرا سوال تھا کہ بتایا جائے کہ اس کا رنگ کیسا ہو؟ فرمایا گیا کہ وہ گہرے شوخ زرد رنگ والی خوبصورت گائے ہو جو دیکھنے والوں کو خوش نما لگتی ہو۔ اس جواب پر بھی جب بنی اسرائیل کی تسلی نہ ہوئی تو انہوں نے ایک اور سوال کر دیا:

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ؕ وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝﴾ (70)

گائے سے متعلق بنی اسرائیل کا یہ تیسرا سوال ہے کہ ہمیں یہ معاملہ ابھی تک واضح نہیں ہو سکا کہ مطلوبہ گائے کون سی شکل وصورت کی ہے۔ اس کے بارے میں مزید وضاحت کر دی جائے تو کوئی راستہ نکل آئے گا۔ اس پر اُن کو جواب میں فرمایا گیا کہ:

﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ؕ قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ؕ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝﴾ (71)

ذَلُوْلٌ:...... یہ بَقَرَةٌ کی صفت آئی ہے کہ وہ محنت ومشقت کے کام نہ کرتی ہو۔

اس سے زمین میں ہل چلانے یا کھیتوں کو پانی دینے کا کام نہ لیا جاتا ہو۔

مُسَلَّمَةٌ:......وہ صحیح سالم ہو۔اس میں کوئی جسمانی عیب نہ ہو۔اس کا ایک ہی زرد رنگ ہو۔

لَا شِيَةَ فِيهَا:......یعنی اس کے رنگ میں کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہو۔

وہ سر سے پاؤں تک زرد رنگ کی ہو۔اس میں کسی اور رنگ کا کوئی داغ نہ ہو۔

بِالْحَقِّ:......حق کا لفظ قرآن مجید میں کئی معنوں میں آیا ہے۔اس جگہ اس سے مراد ہے:"بالکل واضح اور ٹھیک بات۔"

یہ بنی اسرائیل کے تیسرے سوال کا جواب ہے کہ وہ گائے ایسی ہو جس سے زمین میں ہل چلانے یا کھیتوں کو پانی دینے کی مشقت نہ لی جاتی ہو۔وہ صحیح سالم ہو، ہر قسم کے جسمانی عیب سے پاک ہو۔اس کا رنگ گہرا زرد اور شوخ ہو، جس میں کسی اور رنگ کی آمیزش یا داغ نہ ہو۔

یہ جواب سن کر جب بنی اسرائیل کے لیے کسی اور سوال کی گنجائش باقی نہ رہی اور اس حکم کی تعمیل سے بچنے کا کوئی حیلہ نہ رہا تو انہوں نے نہ چاہتے ہوئے، بے دلی کے ساتھ وہ گائے ذبح کر دی۔

﴿وَ اِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ؕ وَ اللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ۚ﴾ (72)

اِدّٰرَءْتُمْ:......اصل میں یہ تَدَارَءْتُمْ تھا۔ادغام کی وجہ سے "تا" کو "دال" میں مدغم کر دیا گیا۔پھر ساکن 'دال' کو پڑھنے کے لیے اس کے شروع میں اِ (ہمزہ الوصل) لگا دیا گیا۔اس پر "فا" داخل ہونے سے اسے پھر ساکن کر دیا گیا اور یہ فَادّٰرَءْتُمْ ہو گیا جس کا مطلب ہے: تَدَافَعْتُمْ وَتَخَاصَمْتُمْ کہ تم لوگ اپنے اوپر سے الزام کو ہٹاتے، دور کرتے اور جھگڑا کر کے دوسروں کے سر تھوپ دیتے تھے۔اس کا مصدر "دِرْءٌ" ہے جس کے معنی "دَفْعٌ" (ہٹانا، دور کرنا) کے ہیں۔

اس آیت میں بھی مدینے کے یہود سے خطاب ہے کہ وہ واقعہ یاد کرو جب تمہاری قوم میں ایک شخص قتل ہو گیا تھا اور قاتل کا پتہ نہیں چلتا تھا۔تم ایک دوسرے پر قتل کا الزام دھرتے تھے، اور آپس میں جھگڑتے تھے۔پھر تم لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس یہ مقدمہ لے کر آئے اور انہوں نے تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا۔

آیت کا یہ مضمون، بعض مفسرین کے نزدیک جیسا کہ تفسیر مراغی میں اس مقام پر ہے: ((ھٰذا مؤخر لفظا مقدم معنىً)) یعنی یہ لفظی اعتبار سے اگرچہ بعد میں آیا ہے مگر معنوی طور پر یہ اس سے پہلے کا ہے جہاں سے گائے ذبح کرنے کا حکم شروع ہوا ہے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے ایک قدیم واقعے کو مدینے کے یہود کا فعل اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے آباء و اجداد کے تمام حالات و واقعات کو اپنے حالات و واقعات ظاہر (OWN) کرتے اور ان پر فخر کا اظہار کرتے تھے۔

پھر فرمایا کہ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر تمہارے وہ لوگ جو قاتل کے بارے میں جانتے تھے، اس کے بارے میں گواہی چھپاتے تھے، تاکہ اصل قاتل کا پتہ نہ چلے، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنا معجزہ دکھا کر قاتل کا سراغ لگا لیا۔

﴿فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَ يُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ

تَعْقِلُوْنَ ﴿73﴾

پھر جب بنی اسرائیل نے ٹال مٹول کے بعد مجبور ہو کر گائے ذبح کر دی تو حکم ہوا کہ اس گائے کے گوشت کا کوئی ٹکڑا مقتول کی لاش پر مارو۔ جب ایسا کیا گیا تو مقتول عارضی طور پر زندہ ہو گیا اور اس نے اپنے قاتل کی نشان دہی کر دی۔ اس طرح ایک پیچیدہ جھگڑے کا صاف فیصلہ ہو گیا اور قاتل پکڑا گیا اور اسے قصاص میں قتل کر دیا گیا۔ اس پر فرمایا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اس مقتول کو زندہ کر دکھایا ہے، اسی طرح وہ قیامت کے دن مردوں کو زندہ کر دے گا۔ وہ دنیا میں تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے، تاکہ تم عقل سے کام لو۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت کی پیروی کرو، اس کی نافرمانی نہ کرو۔ خواہش پرستی کی جگہ خدا پرستی اختیار کرو۔

بنی اسرائیل کی گائے کے اس واقعے میں کئی سبق اور حکمتیں ہیں، مثلاً:

1۔ دین کے بارے میں غیر ضروری اور فضول سوالات کرنے کی ممانعت ہے، کیونکہ ان کی وجہ سے شرعی احکام میں آسانی کی بجائے سختی اور تنگی پیدا ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں اہل ایمان کو اس حرکت سے روکا گیا ہے۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ﴾ (المائدہ 5:101)

''اے ایمان والو! ایسی چیزوں کے بارے میں سوال نہ کرو جو تمہیں بتائی جائیں تو تمہیں بری لگیں۔''

صحیحین کی ایک حدیث میں بھی فضول سوالات اور کثرت سوال سے منع کیا گیا ہے۔ مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّهَاتِ ، وَوَاْدَ الْبَنَاتِ ، وَمَنْعَ وَهَاتِ ، وَكَرِهَ لَكُمْ قِيْلَ وَقَالَ ، وَكَثْرَةَ السُّؤَالَ ، وَاِضَاعَةَ الْمَالِ))

(صحیح بخاری، رقم: 5975۔ صحیح مسلم، رقم: 4483۔ دارمی، رقم: 2751)

''بے شک اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا، ماؤں کی نافرمانی کرنے کو، بیٹیوں کو زندہ درگور کرنے کو، اور بے جا مانگنے کو۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ناپسند فرمایا، فضول باتوں کو، فضول سوالات کرنے کو اور مال ضائع کرنے کو۔''

صحیح مسلم کی ایک اور حدیث میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((هَلَكَ الْمُتَنَطِّعُوْنَ ، قَالَهَا ثَلَاثًا)) (صحیح مسلم، رقم: 6784)

''ہلاک ہو گئے، اپنی باتوں میں مبالغہ آرائی کرنے والے! یہ بات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ دہرائی۔''

مُتَنَطِّعُوْنَ کا لفظ تَنَطُّعٌ سے ہے، جس کے معنی میں گفتگو اور کلام میں تکلف اور تصنع برتنا، مبالغہ آرائی کرنا، فضول اور بے فائدہ باتیں کرنا، لوگوں کو ہنسانے یا ان پر رعب جمانے کے لیے میراثیوں کی طرح باتیں کرنا، دوسروں کی خوشامد

کرنا، ہر بات میں مین میکھ نکالنا اور بال کی کھال اتارنا، سب شامل ہیں۔ ان ساری چیزوں میں پڑنے والوں کو ہلاکت میں پڑنے والے قرار دیا گیا ہے اور وہ آخرت میں گھاٹے میں رہیں گے۔

فضول سوال کرنے کا ایک واقعہ صحیح مسلم میں بھی آیا ہے۔

سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں ایک خطبہ دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

((یَاأَیُّھَا النَّاسُ! قَدْ فُرِضَ عَلَیْکُمُ الْحَجُّ فَحُجُّوْا۔ فَقَالَ رَجُلٌ: أَ کُلَّ عَامٍ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ فَسَکَتَ حَتّٰی قَالَھَا ثَلَاثًا۔ فَقَالَ: لَوْ قُلْتُ: نَعَمْ، لَوَجَبَتْ وَلَمَا اسْتَطَعْتُمْ: ثُمَّ قَالَ: ذَرُوْنِیْ مَا تَرَکْتُکُمْ، فَإِنَّمَا ھَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِکَثْرَۃِ سُؤَالِھِمْ، وَاخْتِلَافِھِمْ عَلٰی اَنْبِیَآءِھِمْ، فَإِذَا اَمَرْتُکُمْ بِشَیْءٍ فَأْتُوْا مِنْہُ مَا اسْتَطَعْتُمْ، وَإِذَا نَھَیْتُکُمْ عَنْ شَیْءٍ فَدَعُوْہُ))

(صحیح مسلم، رقم: 3257۔ نسائی، رقم: 2619۔ ابو داؤد، رقم: 1721)

''اے لوگو! تم پر حج فرض کر دیا گیا ہے، لہٰذا تم حج کیا کرو۔ یہ سن کر ایک آدمی بولا: یا رسول اللہ! کیا ہر سال حج کرنا ہے؟ اس پر آپ ﷺ خاموش رہے۔ اس آدمی نے تین بار اپنا سوال دہرایا۔ مگر آپ ﷺ تینوں مرتبہ خاموش رہے۔ پھر فرمایا: اگر میں ''ہاں'' کہہ دیتا تو پھر ہر سال حج لازم ہو جاتا اور پھر تم سے یہ نہ ہو سکتا۔ اس کے بعد فرمایا: جب میں کوئی بات نہیں بتاتا تو اس کے بارے میں سوال نہ کرو۔ تم سے پہلے لوگ صرف اس لیے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے نبیوں سے بہت سوالات کیے اور پھر اختلافات کر کے احکام کی پابندی نہ کی، لہٰذا جب میں تمہیں کسی چیز سے روک دوں تو اس سے بچو، اور جب کسی کام کا حکم دوں تو جتنا ہو سکے، اس پر عمل کرو۔''

نسائی کی روایت میں اور دوسری کتب حدیث میں سوال کرنے والے شخص کا نام ''اَقرع بن حابس'' آیا ہے۔

دراصل دین نام ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی کامل اور غیر مشروط اطاعت کا، اپنی خواہش کو اللہ کی مرضی کے تابع کر دینے کا، یہ جذبہ نہ ہو تو دین داری کی روح باقی نہیں رہتی۔ اس لیے دین کے معاملے میں غیر ضروری اور فضول سوالات کرنے سے منع کیا گیا ہے، کیونکہ ان سے شریعت میں سختی اور تنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ البتہ ضروری سوالات جو دین کو سمجھنے کے لیے کیے جائیں، ان کی اجازت ہے۔

2۔ بنی اسرائیل کو کوئی اور جانور کے بجائے صرف گائے ذبح کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا، کیونکہ وہ مصر کی غلامی کے اثر سے اس کے تقدس وعظمت کے قائل تھے، کیونکہ وہاں گائے کی پوجا ہوتی تھی۔ چنانچہ مصر سے نکلنے کے بعد انہوں نے بچھڑے کی پوجا بھی کی اور اسے اپنا معبود بنایا۔ لہٰذا ان کے دلوں سے گائے کی تقدیس وتعظیم دور کرنے کے لیے اسے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس طرح ایک کام سے دو مقاصد حاصل ہو گئے۔ ایک گائے کا تقدس ختم کرنا، دوسرے اس کے ذریعے قاتل کا پتہ چلانا۔

3۔ اس واقعے سے بنی اسرائیل کی وہ ذہنیت سامنے آ جاتی ہے جو اللہ کی شریعت کے بارے میں اور اپنے نبیوں کے بارے میں وہ رکھتے تھے...... کہ ان کا مذاق اڑایا جائے، شرعی احکام پر عمل کرنے سے بچنے کی راہیں تلاش کی جائیں، مختلف حیلوں بہانوں سے شریعت کے احکام کی پابندی نہ کی جائے اور اطاعت کی بجائے نافرمانی اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر گزاری کی بجائے ناشکری کا رویہ اختیار کیا جائے۔

ظاہر ہے قرآن نے بنی اسرائیل کا یہ واقعہ مسلمانوں کو لوری دینے کے لیے نہیں سنایا۔ بلکہ ان کے لیے اس میں بڑا سبق ہے کہ وہ بھی ہر معاملے میں اللہ اور رسول ﷺ کی بے چون و چرا اطاعت کریں۔ طرح طرح کی حیلے بازیوں سے شریعت کے احکام کا مذاق نہ اڑائیں اور ان پر عمل کرنے سے بچنے کے بہانے نہ بنائیں اور غیر ضروری اور فضول سوالات نہ کریں۔ دین کے بارے میں فضول کج بحثیاں اور مین میکھ نہ نکالیں۔

افسوس آج ہمارے ہاں دین کے متعلق ایسے ایسے غیر ضروری اور فضول سوالات پیدا کر لیے گئے ہیں اور ان پر بحث برائے بحث کی جا رہی ہے کہ اصل دین کی روح مردہ ہو گئی ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ جھوٹ بولنے پر قادر ہے، کیا نبی ﷺ نور ہیں یا بشر، وہ حاضر و ناضر ہیں کہ نہیں ہیں، وہ اپنی قبر مبارک میں زندہ ہیں یا زندہ نہیں ہیں، مردے سنتے ہیں یا نہیں سنتے ہیں، کیا ان جیسے سوالات اٹھانے والے اور ان پر بحث و مناظرے کرنے والے دین کی خدمت کر رہے ہیں یا اپنی اس یہودی ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے ہیں جس کی قرآن نے مذمت فرمائی ہے؟

4۔ اس قصے کے پہلے حصے میں قاری کے لیے ایک تجسس ہے کہ گائے ذبح کرنے کا حکم کیوں دیا گیا۔ پھر دوسرے حصے میں اس کا اصل مقصد بتایا گیا کہ اس سے قاتل کا پتہ چلانا مقصود تھا۔ اس طرح اس قصے کے شروع سے آخر تک قاری کا تجسس برقرار رکھا گیا ہے اور قصے میں اس کی دلچسپی برابر قائم رکھی گئی ہے۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۷۴

”پھر اس کے بعد تمہارے دل پتھروں کی طرح سخت ہو گئے“ بلکہ ان سے بھی زیادہ سخت! کیونکہ بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں، جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں۔ بعض جب پھٹ جاتے ہیں تو ان سے پانی نکل آتا ہے، اور بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں جو اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں۔“ (74)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً:...... یہ اسی طرح کا اسلوب بیان ہے۔ جیسے سورۂ النحل16:77 میں قیامت کے بارے میں ہے: ﴿ كَلَمْحِ الْبَصَرِ اَوْ هُوَ اَقْرَبُ ﴾ ''جیسے آنکھ جھپکنا یا اس سے بھی جلد''۔ یہ اسلوب جیسا کہ زرکشی رحمہ اللہ نے البرھان میں لکھا ہے ((الخطاب بالشئی عن اعتقاد المخاطب دون ما فی نفس الامر)) کہلاتا ہے، یعنی جس میں کوئی چیز اصل حقیقت کی بجائے مخاطب کے ذہن کے مطابق تشبیہ کے ذریعے بیان کر دی جاتی ہے کہ وہ اسے ایک طرح سمجھ لے یا دوسری طرح سمجھ لے۔

خَشْيَةِ اللّٰهِ:...... (اللہ کے خوف سے) پتھروں کے لیے مجازی طور پر فرمایا، حقیقت میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت مراد ہے، کہ وہ اللہ سبحانہٗ کے قانون کے مطابق حرکت کرتے ہیں۔ اس کے برخلاف گناہوں کی وجہ سے سخت ہو جانے والے انسانی دل اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل نہیں کرتے اور اس کی اطاعت سے نکل جاتے ہیں۔

فرمایا......! بنی اسرائیل نے جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بڑی واضح نشانیوں، نعمتوں اور معجزوں کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا...... جیسے سمندر کا پھٹ جانا اور اس میں راستے بن جانا، صحرائے سینا کی گرمی میں بادلوں کا سایہ افگن ہونا، من وسلویٰ کی قدرتی غذا کا فراہم ہونا، پتھر کی چٹان سے بارہ چشموں کا بہہ نکلنا، پہاڑ کا سروں پر معلق ہو جانا، سبت کی بے حرمتی کرنے والوں کا بندروں جیسا بن جانا، مردہ مقتول کا دوبارہ زندہ ہونا...... ان سب عجائبات کو دیکھنے کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ ان لوگوں کے دل اللہ تعالیٰ کی شکر گزاری اور فرماں برداری کے لیے نرم ہو کر جھک جاتے۔ مگر ان پر الٹا یہ اثر ہوا کہ ان کی عہد شکنی، سرکشی، نافرمانی اور ناشکری میں مزید اضافہ ہوتا گیا اور اس کے سبب ان کے دل پتھروں اور چٹانوں سے زیادہ سخت ہو گئے۔

فرمایا، بعض پتھر تو ایسے ہوتے ہیں جن سے نہریں پھوٹ نکلتی ہیں، جس سے انسانوں کو بہت فائدہ پہنچتا ہے۔ بعض جب پھٹ جاتے ہیں تو ان سے بھی پانی بہہ نکلتا ہے جس سے فائدہ اٹھایا جاتا ہے اور بعض تو اللہ کے خوف اور اس کے قانون کے تحت پہاڑ کی بلندی سے گر پڑتے ہیں اور اپنی حساسیت (SENSITIVITY) ظاہر کر دیتے ہیں مگر بنی اسرائیل کے دل ایسے بے حس اور اپنی فطری صلاحیت سے عاری ہو چکے ہیں کہ وہ لوگ مردہ ضمیری کے چلتے پھرتے لاشے بن کر رہ گئے۔ دل سخت ہونے کے بارے میں قرآن مجید کی یہ تشبیہ نہایت عمدہ ہے۔ عربی زبان میں بھی اردو زبان کی طرح پتھر دل ہونے، یا سنگ دل ہو جانے کی تشبیہ موجود ہے۔ ایک عربی مصرع ہے۔ ع

وَقَلْبُهٗ كَالْحَجَرِ الْقَاسِيْ

''اور اس کا دل پتھر کی طرح سخت ہے۔''

لیکن قرآن مجید نے اس تشبیہ کو جس طرح استعمال کیا ہے وہ بلاغت کا معجزہ ہے۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ یُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِیْقٌ مِّنْهُمْ یَسْمَعُوْنَ
كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ یُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ یَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾
وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی
بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ
رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَ لَا یَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ
وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾ وَ مِنْهُمْ اُمِّیُّوْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِیَّ
الربع وَ اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ یَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ
بِاَیْدِیْهِمْ ۗ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا ؕ
فَوَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ وَ وَیْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا یَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَ قَالُوْا
لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّاۤ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ
عَهْدًا فَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا
تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾ بَلٰی مَنْ كَسَبَ سَیِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ
اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا
ع ۹ ۱۱ ۹ الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾ ع

’’(اے مسلمانو!) کیا تم امید رکھتے ہو کہ وہ (یہودی) تمہارے کہنے سے ایمان لے آئیں گے؟ حالاں کہ ان کا ایک گروہ جب اللہ کا کلام سنتا تو اسے سمجھنے کے بعد جان بوجھ کر بدل دیتا ہے۔ یہ لوگ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں۔ تو کہتے ہیں: ’’ہم بھی ایمان لائے ہیں۔‘‘ لیکن جب آپس میں ملتے ہیں تو کہتے ہیں: کیا تم ان (مسلمانوں) کے سامنے وہ باتیں ظاہر کرتے ہو جو اللہ نے تمہیں بتائی ہیں، تاکہ وہ کل کو تمہارے رب کے پاس

تمہارے خلاف بحث کریں؟ کیا تم نہیں سمجھتے؟ کیا ان لوگوں کو معلوم نہیں کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے جو یہ چھپاتے اور ظاہر کرتے ہیں۔

اور ان میں ایسے ان پڑھ ہیں جو کتاب الٰہی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ ان کے پاس خوش فہمیوں اور وہم و گمان کے سوا کچھ نہیں۔ پس خرابی ہے، ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں، اور کہتے ہیں ''یہ اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔'' تاکہ اس طرح وہ دنیا کا حقیر مال حاصل کرلیں۔ پس خرابی ہے ان کے لیے اس تحریر کی وجہ سے جو ان کے ہاتھوں نے لکھی! اور ان کے لیے خرابی ہے، ان کی اس کمائی سے جو وہ کماتے ہیں!

اور وہ کہتے ہیں: ''ہمیں دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ اگر دوزخ میں ڈالے گئے تو صرف چند دنوں کے لیے ڈالے جائیں گے۔ (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ ان سے کہیں: کیا تم نے اللہ سے کوئی وعدہ لے رکھا ہے، جس کی وہ خلاف ورزی نہیں کرے گا، یا تم اللہ کے بارے میں ایسی بات کہتے ہو جو تم نہیں جانتے۔ بات یہ ہے کہ جس نے کوئی برائی کی اور اس کے گناہ نے اس کو برباد کیا تو ایسے لوگ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے، وہ جنتی ہیں اور ہمیشہ جنت میں رہیں گے۔'' (75-82)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿ اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (75)

یہ درمیان میں مسلمانوں سے خطاب کیا گیا ہے کہ یہودیوں کے بارے میں زیادہ توقع نہ رکھو کہ وہ ایمان قبول کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں گے۔ ان کے علماء کی حالت یہ ہے کہ وہ جان بوجھ کر توریت کی لفظی اور معنوی تحریف کرتے اور اس کے احکام میں ردو بدل کر دیتے ہیں، ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ ان کی اپنی قوم کا ایک نبی (موسیٰ علیہ السلام) ان کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیتا ہے تو وہ اس پر عمل نہیں کرنا چاہتے بلکہ مختلف حیلوں بہانوں سے ٹال مٹول کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی شریعت کے احکام کی اطاعت کرنے کی بجائے سرکشی اور نافرمانی اختیار کرتے ہیں۔

اس آیت میں حضرت محمد ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کو تسلی دی گئی ہے کہ یہودیوں کے ایمان نہ لانے پر غمگین نہ ہوں۔ یہ قوم اپنے خاندان کے انبیاء کی نافرمانی کرتی رہی ہے اور اپنی مذہبی کتاب کے احکام کی پابندی نہیں کرتی اور اس کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا لیتی ہے تو وہ کسی اور قوم و خاندان کے نبی ﷺ اور قرآن مجید پر کیسے ایمان لائے گی؟

﴿ وَ اِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ ﴾ (76)

اس سے ملتا جلتا مضمون آیات 8 تا 16 میں بھی گذر چکا ہے۔ یہودی منافقین جب مسلمانوں سے ملتے تو کہتے ہم بھی ایمان والے ہیں، اور اس طرح وہ سادہ لوح مسلمانوں کو دھوکا دیتے۔ نیت یہ ہوتی کہ ہم اپنی کتابوں اور اپنے نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں، اس لیے ہم بھی ایمان والے ہیں۔ پھر ایسا بھی ہوتا کہ کبھی ان کے منہ سے یہ بات نکل جاتی کہ ہاں، ہماری کتابوں اور صحیفوں میں بھی ایک نبی کے آنے اور اس پر اللہ کا کلام نازل ہونے کی پیش گوئیاں موجود ہیں۔

پھر جب یہ منافق یہود اپنے غیر منافق یہودیوں سے ملتے تو وہ ان پر خوب برستے، ان کو ڈانٹتے اور ان کا سخت محاسبہ کرتے کہ تم لوگ کیوں مسلمانوں کو وہ باتیں بتا دیتے ہو، جو ان کے حق میں جاتی ہیں۔ وہ کل قیامت کے دن یہی باتیں ہمارے خلاف حجت و دلیل بنا کر پیش کر دیں گے۔ اس لیے مسلمانوں کو ایسی باتیں نہ بتایا کرو۔ تم اپنے دشمن کو دلائل کا ہتھیار فراہم کر کے اپنی بے عقلی کا ثبوت کیوں دیتے ہو؟

﴿ اَوَ لَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَ مَا يُعْلِنُوْنَ ۝﴾ (77)

اس آیت میں ملامت کرنے والے یہودیوں کے کفر، جھوٹ اور منافقت اور فریب کاری کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری ان سب حرکتوں کا پورا علم ہے، وہ تم سے تمہارے سارے اعمال کا حساب لے گا۔ تم اس سے اپنی کوئی بات چھپا نہ سکو گے۔

﴿وَ مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّاۤ اَمَانِيَّ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ۝﴾ (78)

اُمِّيُّوْنَ: ...... یہ اُمّیؔ کی جمع ہے جس کے معنی ایسے شخص کے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہ جانتا ہو۔ آیت میں اس لفظ سے یہودیوں کے اَن پڑھ عوام مراد ہیں۔

اَمَانِيَّ: ...... یہ اُمْنِيَّةؔ کی جمع ہے، جس کے معنی تمنا، آرزو، خواہش اور خام خیالی کے ہیں۔

فرمایا کہ یہود کے اَن پڑھ عوام کی حالت یہ ہے کہ وہ نہ تو لکھنا پڑھنا جانتے ہیں اور نہ اپنی کتاب توریت کی اصل تعلیم سے واقف ہیں۔ ان کے دنیا پرست علماء ان کو غلط مذہبی تعلیم دیتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کی کتاب محض چند خواہشات کا مجموعہ بن گئی ہے۔ دین و شریعت کے احکام کی پابندی ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ اخلاق بگڑ چکے ہیں۔ غلط عقائد اور جھوٹے دعووں کی بھرمار ہے۔ دین کا صحیح علم غائب ہے اور وہ توہمات (SUPERSTITIOUS) میں مبتلا ہیں۔ اس پر فخر و غرور ہے کہ وہ نبیوں کی اولاد ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بیٹے اور چہیتے ہیں۔ آخرت کی جنت صرف ان کے لیے بنائی گئی ہے اور دوزخ کا عذاب صرف دوسری قومیں بھگتیں گی۔

افسوس آج مسلمانوں کا حال بھی ان سے زیادہ مختلف نہیں ہے بلکہ انہی جیسا ہے۔

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝﴾ (79)

فرمایا، یہودی علما (احبار اور فریسیوں) کے لیے دوہری ہلاکت و بربادی اور دوہرا عذاب ہے جو خود اپنے ہاتھوں

سے من گھڑت فتوے اور احکام لکھتے، مگر یہ ظاہر کرتے ہیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ تاکہ اس طرح وہ اللہ کی کتاب میں تحریف کرکے اس کے بدلے میں دنیا کا حقیر مفاد حاصل کریں۔

ہماری امت کے فتویٰ فروش اور شریعت کے احکام کی غلط تاویلیں کرنے والے ''ابوالفضل اور فیضی'' بھی علمائے یہود سے پیچھے نہیں رہے بلکہ دو قدم آگے ہیں۔

﴿وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰﴾ (80)

یہ یہودیوں کی جھوٹی آرزوؤں اور خام خیالیوں کی ایک مثال ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ ان کے اعمال...... خواہ کچھ بھی ہوں مگر چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اور چہیتی قوم ہیں۔ قوم کی یہی نسبت ان کو دوزخ سے بچا کر جنت میں لے جائے گی۔ اگر کچھ سزا ہو بھی گئی تو جتنا عرصہ ہمارے بڑوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی، اتنے دنوں کی سزا ہوگی۔ اس پر فرمایا گیا کہ کیا تمہارے ساتھ اللہ تعالیٰ کا کوئی معاہدہ ہو چکا ہے کہ وہ تمہارے گناہوں پر تمہیں عذاب نہیں دے گا۔ یا پھر اللہ کے بارے میں تم یونہی جاہلانہ باتیں کرتے ہو اور جھوٹے دعوے کرتے ہو۔

ایمان اور عمل صالح کی بجائے ''نسبتوں'' سے اُخروی نجات کا یہ یہودیانہ تصور، افسوس، آج مسلمانوں میں بھی کثرت سے پایا جاتا ہے۔

﴿بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓــــَٔتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۱
وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۲﴾

(82-81)

بَلٰى:...... یہ لفظ ''ایجاب للنفی'' کے لیے آتا ہے۔ اپنے سے پہلی بات کی نفی کرکے اس کے خلاف بات کا اثبات کرتا ہے۔ گویا بات وہ نہیں جو تم نے کہی ہے بلکہ اصل بات یوں ہے کہ......

فرمایا، آخرت میں نجات کا دارومدار کسی نسلی یا گروہی نسبت پر نہیں ہے جیسا کہ یہود نے سمجھ رکھا ہے بلکہ جو لوگ بھی کفر و شرک اور کبیرہ گناہوں کی زندگی گزاریں گے اور توبہ کیے بغیر مر جائیں گے، وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اور جو ایمان اور عمل صالح اختیار کریں گے، وہ جنت میں جائیں گے اور وہاں ہمیشہ رہیں گے۔

اسی سے ملتا جلتا مضمون آیت 62 میں بھی بیان ہو چکا ہے۔ تفصیل جاننے کے لیے اسے دیکھ لیا جائے۔

قرآن مجید میں تقابل کا یہ اسلوب عام ہے کہ جہاں دوزخ والوں کا ذکر آتا ہے، وہاں جنت والوں کا بھی تذکرہ ہوتا ہے یا اس کے برعکس۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۣ
وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ
وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ
تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾ وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ
لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ
اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ
وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ ۡ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ ۭ وَ اِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ
اِخْرَاجُهُمْ ۭ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا
جَزَاۗءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ
الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۸۵﴾ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۡ فَلَا
يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۧ ﴿۸۶﴾ ع ۱۰

”اور یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنا، رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنا، یتیموں اور مسکینوں سے ہمدردی کرنا، لوگوں سے اچھی بات کرنا، نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا، مگر تھوڑے لوگوں کے سوا تم سب اس عہد سے پھر گئے اور تم پھر جانے والے لوگ ہو۔

یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ بہانا اور اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے بے گھر نہ کرنا۔ تم نے اس عہد کا اقرار کیا اور تم خود اس کے گواہ رہے۔ مگر پھر یہ تمہی ہو جو اپنوں کو قتل کرتے ہو، اپنے لوگوں کو گھروں

سے جلا وطن کرتے ہو۔ ان کے مقابلے میں دشمن کی مدد کرتے ہو، گناہ اور ظلم کرنے کے لیے۔ لیکن جب وہ تمہارے پاس قیدی بن کر آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے ہو۔ حالاں کہ ان کو ان کے گھروں سے نکالنا ہی تمہارے لیے حرام تھا۔ کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصے کو مانتے اور دوسرے کا انکار کرتے ہو؟ تم میں سے جو لوگ ایسا کریں، ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ وہ دنیا کی زندگی میں ذلیل وخوار ہوں اور قیامت کے دن انہیں سخت عذاب میں ڈالا جائے۔ اور اللہ اس سے بے خبر نہیں جو تم کرتے ہو۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا خریدی۔ پھر نہ تو ان کے عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ انہیں کہیں سے مدد مل سکے گی۔" (83-86)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ ۟ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ۝﴾ (83)

لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ:...... کے معنی ہیں: لَا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ "تم اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔"

قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا:...... اس کے معنی ہیں: لوگوں سے اچھی بات کہنا۔

مصر کی غلامی سے نکلنے کے بعد یہ عہد بنی اسرائیل کے ابتدائی زمانے میں ان سے لیا گیا تھا جسے بعد میں بھی ان کے انبیائے کرام اُن کو یاد دلاتے رہے، مگر قوم کی اکثریت اس عہد کو مسلسل توڑتی رہی، یہاں تک کہ عہد شکنی ان کے قومی مزاج کا حصہ بن گئی۔

اس عہد میں سب سے پہلے صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے کا حکم ہے۔ یہ مضمون قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر آیا ہے، جیسے ارشاد ہوا:

﴿وَ اعْبُدُوا اللّٰهَ وَ لَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (النساء 4:36)

"اور تم اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اُس کا شریک نہ بناؤ، اور اپنے والدین سے اچھا سلوک کرو۔"

دوسری جگہ فرمایا:

﴿وَ قَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا﴾ (بنی اسرائیل 17:23)

"اور تیرے رب نے حکم جاری کر دیا کہ تم اس کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو، اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔"

مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے اور کسی اور کو معبود نہ بنایا جائے۔ یہ اللہ کا حق ہے اور انسان پر

سب سے پہلا یہی حق ہے، اس کے بعد والدین سے حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ والدین کا حق اللہ تعالیٰ کے حق کے بعد اور باقی سب کے حقوق سے پہلے ہے۔ کیونکہ وہ انسان کی پرورش کرتے ہیں۔ والدین کے بعد رشتہ داروں کا حق ہے کہ ان سے اچھا سلوک کیا جائے ان کی خدمت اور مالی امداد کی جائے۔

رشتہ داروں کے حق کے بعد یتیموں کا حق بیان کیا گیا اور ان کو مسکینوں پر ترجیح دی گئی کیونکہ مسکین اپنی ضروریات کے لیے کچھ نہ کچھ دوڑ دھوپ کر سکتا ہے جب کہ یتیم اپنی کم عمری کی وجہ سے زیادہ ہمدردی اور تعاون کا محتاج ہے۔

اس کے بعد باقی تمام امت کے لیے لوگوں سے اچھی بات کہنے کا حکم ہوا جو ایک ایسا عمومی حکم ہے جس میں نیکی اور بھلائی کی بات کرنا، سچ بولنا، جھوٹ نہ بولنا، بااخلاق گفتگو کرنا، بات کرتے وقت شریفانہ لہجہ اختیار کرنا، سیدھے منہ سے بات کرنا جس میں تکبر اور غرور نہ ہو، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا یعنی نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا، سب شامل ہیں۔

اس کے بعد نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے، جو دین کے بنیادی ارکان ہیں اور شریعت کے تمام احکام کے لیے نمائندہ عبادات ہیں۔ جو ان دو حکموں کی پابندی کرے گا، وہ باقی دین کے احکام کی پابندی بھی کرے گا۔ پھر اس میں نکتہ ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کے یہ دونوں حقوق ادا کرے گا، اسی سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کے حقوق بھی ادا کرے گا۔ اسی طرح جو ان دو حقوق اللہ میں کوتاہی کرے گا، وہ حقوق العباد میں بدرجۂ اولیٰ کوتاہی کا مرتکب ہو گا۔

لیکن بنی اسرائیل کی اکثریت نے اللہ تعالیٰ سے کیے ہوئے اس عہد کی بھی پابندی نہیں کی اور وہ عہد شکن مشہور ہو گئے۔ یہی رویہ انہوں نے نبی ﷺ کے ساتھ اختیار کیا اور آخر اپنے انجام کو پہنچے۔

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ﴾ (84)

اس آیت میں بھی مدینے کے یہود کو مخاطب کر کے ان کے باپ دادا کا ایک عہد، جس کا ذکر توریت میں بھی ہے، یاد دلایا گیا ہے، کیونکہ یہ لوگ اپنے آباء واجداد کی روایات پر فخر کا اظہار کرتے تھے اور ان کے کاموں کو اپنے کارنامے شمار کرتے تھے۔

فرمایا، اللہ تعالیٰ نے تم سے یہ عہد لیا تھا کہ تم ایک دوسرے کا خون نہیں بہاؤ گے اور ظلم و زبردستی سے ایک دوسرے کو ان کے گھروں سے نہیں نکالو گے۔ اس عہد کو پورا کرنے کا تم نے خود اقرار بھی کیا تھا۔ اس کے تم گواہ بھی ہو اور اس کو توریت میں پڑھتے بھی رہتے ہو۔ اس لیے تم پر اس عہد کی پابندی لازم تھی۔

﴿ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ

أَفَتُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ الْكِتَٰبِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَن يَفْعَلُ ذَٰلِكَ مِنكُمْ إِلَّا خِزْىٌ فِى الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۖ وَيَوْمَ الْقِيَٰمَةِ يُرَدُّونَ إِلَىٰٓ أَشَدِّ الْعَذَابِ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ۝﴾ (85)

اُسٰرٰی:...... یہ جمع ہے اَسِیْرٌ کی جس کے معنی ''قیدی'' کے ہیں۔ اس کی ایک اور جمع اَسْرٰی بھی آتی ہے جیسا کہ سورہ الانفال 8:67،70 میں دو دفعہ آئی ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہے جیسے قَتِیْلٌ کی جمع قَتْلٰی آتی ہے۔

لیکن بنی اسرائیل نے اپنے دورِ زوال میں حسبِ عادت توریت کے اس عہد کو بھی توڑا۔ ان کے مختلف فرقے ایک دوسرے کو قتل بھی کر دیتے تھے اور گھروں سے جلاوطن بھی کر دیتے تھے۔ یہی حال مدینے کے تین یہودی قبائل کا تھا، جہاں مشرکین کے دو قبیلوں اوس اور خزرج کے درمیان پشتینی لڑائیاں ہوتی تھیں تو یہ تینوں یہودی قبائل بنو قریظہ، بنو نضیر اور بنو قینقاع میں سے کچھ اوس کے ساتھ اور کچھ خزرج کے ساتھ حلیف بن کر جنگوں میں حصہ لیتے۔ اپنے یہودی بھائیوں کو قتل کرتے، اور ان کو گھروں سے بے گھر کرتے تھے۔ پھر جب وہ قیدی بن جاتے تو قومی ہمدردی کے تحت اور توریت کے ایک حکم پر عمل کرتے ہوئے، اپنی دین داری ظاہر کرتے اور فدیہ دے کر ان کو چھڑا لیتے۔ قرآن نے یہودیوں کی ایسی منافقانہ ذہنیت کو بے نقاب کیا ہے کہ وہ توریت کے ایک حصے کو مانتے، اس پر عمل کرتے اور کہتے کہ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھڑانا بڑے ثواب کا کام ہے۔ مگر توریت میں جو یہ حکم دیا گیا کہ ایک دوسرے کو ناحق قتل نہ کرنا اور زبردستی جلاوطن نہ کرنا تو وہ توریت کے اس حصے کی خلاف ورزی کرتے تھے۔

فرمایا، دین کے ساتھ یہ منافقانہ رویہ کہ شریعت کے جس حکم کو اپنی خواہش نفس کے خلاف دیکھا، اسے چھوڑ دیا جائے اور جسے اس کے مطابق دیکھا، اسے اختیار کیا جائے، تو یہ بات اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ وہ ایسے منافقوں کو دنیا میں بھی ذلیل و رُسوا کرے گا اور آخرت میں دوزخ کے بڑے سخت عذاب کی طرف دھکیل دے گا۔

یہودیوں کی اس تاریخ کے آئینے میں آج کی مسلمان ریاستوں اور گروہوں کو اپنی صورت دیکھ لینی چاہیے جو دنیا کے حقیر مفاد کی خاطر اپنے کلمہ گو بھائیوں کے قتل عام میں بالواسطہ اور بلاواسطہ شریک ہو جاتے ہیں اور قرآن کے بعض حکموں کو مانتے اور بعض کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ آج ﴿خِزْىٌ فِى الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا﴾ (دنیا کی زندگی میں ذلت و رسوائی) کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔

﴿أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَوٰةَ الدُّنْيَا بِالْءَاخِرَةِ ۖ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنصَرُونَ ۝﴾ (86)

اِشْتَرَوْا:...... یہ لفظ اس مقام پر جیسا کہ قتادہ رحمہ اللہ کا قول ہے ترجیح دینے کے معنوں میں ہے۔ اکثر مفسرین نے بھی اسی مفہوم کو اختیار کیا ہے۔

فرمایا، کہ اس طرح کے لوگوں کو جو عہد شکنی اور کفر و منافقت کی رَوشِ اختیار کر لیں اور اپنے طرزِ عمل سے دنیا کی ادنیٰ

اور عارضی زندگی کو آخرت کی اعلیٰ اور ابدی زندگی پر ترجیح دے ڈالیں تو مرنے کے بعد وہ ایسے عذاب سے دوچار ہوں گے جو دائمی اور مستقل ہوگا۔ اس عذاب میں کسی وقت کوئی کمی یا وقفہ نہ ہوگا۔ ان کو وہاں کہیں سے ایسی مدد بھی نہ مل سکے گی، جس کے ذریعے وہ عذاب سے چھٹکارا پاسکیں۔

☆......☆......☆

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ٘ وَ اٰتَیْنَا
عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِؕ اَفَكُلَّمَا
جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْۚ فَفَرِیْقًا
كَذَّبْتُمْ٘ وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾ وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ
اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِیْلًا مَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ
مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ یَسْتَفْتِحُوْنَ
عَلَى الَّذِیْنَ كَفَرُوْاۖۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ٘ فَلَعْنَةُ
اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِیْنَ ﴿۸۹﴾ بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ یَّكْفُرُوْا بِمَاۤ
اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْیًا اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ
عِبَادِهٖۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍؕ وَ لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۹۰﴾
وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ
عَلَیْنَا وَ یَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗۗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْؕ
قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِیَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۹۱﴾
وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ

وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾ وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ
الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ
عَصَيْنَا ۗ وَ اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا
يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾ قُلْ اِنْ كَانَتْ
لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا
الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَ لَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ
النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۛۚ وَ مِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۛۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ
اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَ مَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَ اللّٰهُ
بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾ ع ۱۰

”اور بے شک ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی۔ اس کے بعد ہم نے پے در پے رسول بھیجے۔ اور عیسیٰ ابن مریم کو کھلے معجزے دیے۔ اور روحِ پاک جبریل کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔ لیکن جب بھی کوئی پیغمبر ایسا حکم لے کر آیا جو تمہاری خواہشِ نفس کے خلاف ہوتا، تم اسے ٹھکرا دیتے۔ پھر تم بعض رسولوں کو جھٹلاتے اور بعض کو قتل کر ڈالتے تھے۔

اور وہ (یہود) کہتے ہیں: ”ہمارے دل محفوظ ہیں۔“ حالاں کہ اللہ نے ان کے کفر کی وجہ سے ان پر لعنت کر دی۔ اس لیے وہ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

اور جب ان لوگوں کے پاس اللہ کی طرف سے وہ کتاب آ گئی جو اس کتاب کو سچا کرنے والی ہے، جو ان کے ہاں پہلے سے موجود تھی، اور جب کہ وہ اس نئی کتاب کے نازل ہونے سے پہلے تک دعائیں مانگا کرتے تھے کہ (آخری نبی کی بعثت کے ذریعے سے) انہیں کافروں کے مقابلے میں فتح نصیب ہو۔ مگر جب وہ چیز سامنے آ گئی جس کا انہیں انتظار تھا تو اسے اچھی طرح پہچان لینے کے بعد ماننے سے انکار کر دیا۔ ایسے کافروں پر اللہ کی لعنت

ہے۔ ان لوگوں نے ایک بری چیز حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ اور یہ تو اس چیز کا انکار کر رہے ہیں، جسے اللہ نے نازل کیا ہے اور ان کا یہ انکار محض اس ضد کی وجہ سے ہے کہ، کیوں اللہ نے اپنے بندوں میں سے ایک خاص بندے پر اپنا فضل کیا۔ ایسے لوگوں پر اللہ کا غضب ہی غضب ہے۔ اور ان کافروں کو ذلیل کرنے والا عذاب دیا جائے گا۔

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ ''اللہ نے جو کتاب نازل کی ہے، اس پر ایمان لاؤ۔'' اور وہ اس کتاب کو نہیں مانتے۔ حالاں کہ یہ کتاب برحق ہے اور ان کی اپنی کتاب کی پیش گوئی کو سچ کر دکھانے والی ہے۔ (اے نبی ﷺ!) آپ ﷺ ان سے پوچھیں ''اگر تم واقعی ایمان والے ہو تو اس سے پہلے اللہ کے پیغمبروں کو کیوں قتل کرتے رہے؟'' اور موسیٰ تو تمہارے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے، مگر تم نے ان کے پیٹھ پیچھے بچھڑے کو معبود بنا لیا۔ اور تم ہو ہی ظالم! اور یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد لیا تھا اور اس وقت طور پہاڑ کو تمہارے اوپر کھڑا کر دیا۔ (عہد یہ تھا) کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں، اسے مضبوطی سے پکڑو، غور سے سنو اور اس پر عمل کرو۔ تمہارا جواب یہ تھا کہ ہم نے سن لیا مگر مانیں گے نہیں۔ اصل میں ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت وعقیدت پیدا کر دی گئی۔ (اے نبی ﷺ) آپ ان لوگوں سے کہیں ''اگر تم واقعی ایمان والے ہو تو یہ کیسا ایمان ہے جو تمہیں برائی سکھاتا ہے۔

(اے نبی ﷺ!) آپ ان سے کہیں ''اگر اللہ کے ہاں آخرت کے گھر کی ساری نعمتیں صرف تمہارے ہی لیے ہیں تو تمہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے موت کی تمنا کرنی چاہیے، اگر تم سچے ہو۔ مگر یہ لوگ اپنے برے کرتوتوں کی وجہ سے کبھی موت کی آرزو نہ کریں گے۔ اللہ ایسے ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ (اے نبی ﷺ) یہ یہودی تو مشرکوں سے بھی بڑھ کر دنیا پرست ہیں۔ ان میں ہر ایک یہ چاہتا ہے کہ وہ ہزار برس جیئے۔ حالاں کہ اتنی طویل مدت جینا بھی اسے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔ اور اللہ دیکھ رہا ہے جو کچھ وہ کر رہے ہیں۔'' (87-96)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

قَفَّيْنَا:......اس کا مادہ (ROOT) ق ف و ہے۔ (و) بدل گیا ہے (ی) سے۔ اس کے معنی ہیں، کسی کے پیچھے آنا اور (بِ) سے تعدیہ ہو کر اس کے معنی ''کسی کے پیچھے لانے'' کے ہو جائیں گے۔ اس جگہ مطلب یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد لگاتار بہت سے رسول بھیجے۔ جیسا کہ سورۂ المومنون میں ہے کہ:

﴿ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرٰی﴾ (المومنون 44;23)

''پھر ہم نے لگاتار اپنے رسول بھیجے۔''

عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ:......عربی زبان کا عیسیٰ، عبرانی میں یشوع اور سریانی میں یسوع تھا اور انگلش میں JESUS

ہے۔قرآن مجید نے اکثر مقامات پر عیسیٰ (عَلَیْہِ السَّلَام) کے ذکر کے ساتھ ان کی کنیت ابن مریم کا اضافہ کیا ہے، تاکہ ان کے ابن اللہ (اللہ کا بیٹا) ہونے کے غلط نظریے کی تردید ہو جائے۔

اَلْبَیِّنٰتِ:...... اس کے معنی ''کھلی نشانیاں''، ''واضح دلائل''، ''احکام'' اور ''معجزات'' کے آتے ہیں۔ اس مقام پر اس سے مراد وہ معجزات ہیں جو عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کو دیے گئے جیسے مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ۔

اَیَّدْنٰہُ:......اس کے معنی قَوَّیْنَاہُ کے ہیں کہ ہم نے اس کو قوت دی، طاقت بخشی۔

رُوْحُ الْقُدُسِ:...... اس کے معنی پاک روح (THE HOLY GHOST) کے ہیں اور اس سے مراد جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام ہیں۔قرآن نے ان کو اَلرُّوْحُ الْاَمِیْنَ (امانت دار روح) بھی کہا ہے۔

﴿وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ ۝ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ۝﴾ (الشعراء 192:4 تا 194)

''اور (اے نبی ﷺ!) بے شک یہ رب العالمین کا نازل کیا ہوا کلام ہے۔اسے جبریل امین عَلَیْہِ السَّلَام لے کر اُترے ہیں۔ یہ قرآن آپ ﷺ کے دل پر نازل ہوا تا کہ آپ ﷺ خبردار کرنے والے بنیں۔''

اِشْتَرَوْا:......اس جگہ اس کے معنی شَرَوْا یا بَاعُوْا کے ہیں کہ انہوں نے بیچا۔

اِشْتِرَاءٌ کے معنی خریدنے کے بھی ہیں اور بیچنے کے بھی۔ یہ اضداد میں سے ہے۔ ہر سودے میں ایک فریق جو چیز خرید رہا ہوتا ہے، وہی چیز دوسرا فریق بیچ رہا ہوتا ہے۔اس لیے اس معاملے اور لین دین کو اِشْتِرَاءٌ (خریدنا، بیچنا) کہا جاتا ہے کہ یہ خریدنا بھی ہے اور بیچنا بھی۔

بَغْیًا:...... یہ بَغْی سے ہے جس کے اصل معنی فَسَدَ یعنی بگڑنے کے ہیں۔ فَسَدَ الْجُرْحُ کے معنی ہیں زخم بگڑ گیا، زخم خراب ہو گیا۔ پھر اس لفظ کا استعمال ایسی چیز کے لیے ہونے لگا جو اپنی حد سے نکل جائے۔ بغاوت بھی اسی سے ہے جو قانون کے دائرے سے باہر نکلنے کی حالت ہے۔اس جگہ اس سے مراد حسد ہے۔

وَرَاءَ:......اس کے معنی ''پیچھے'' اور ''آگے'' دونوں کے آتے ہیں۔اس لیے اسے اضداد میں بھی شمار کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ اَضداد میں سے نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز جو نظروں سے اوجھل اور باہر ہٹ کر ہو، اس کے لیے یہ لفظ آتا ہے، خواہ وہ چیز آگے ہو یا پیچھے ہو، یا کہیں بھی ہو۔ انگلش میں (BEYOND) کا لفظ قریب قریب اس کا ہم معنی ہے۔

اس جگہ یہ ''سوا'' یا ''سوائے'' کے معنوں میں آیا ہے۔ یہود کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ اپنی کتاب توریت کے سوا کسی اور کتاب کو الہامی نہیں مانتے۔

اَلْعِجْلَ:......اس سے پہلے حُبَّ (محبت) کا لفظ محذوف ہے۔ مراد یہ ہے کہ جس بچھڑے کو بنی اسرائیل نے اپنا معبود بنا کر پوجا تھا اس کی محبت ان کے دلوں میں رَچ بس گئی تھی۔

اَلدَّارُ الْاٰخِرَۃُ:......اس سے آخرت کی زندگی کا ثواب اور وہاں کی نعمتیں مراد ہیں۔

خَالِصَةً:......اس کے معنی ہیں: مخصوص

تَمَنَّوُا الْمَوْتَ:......اس کا مطلب ہے کہ اپنے دلوں میں موت کی آرزو اور اس کا شوق پیدا کرو۔ دنیا پرستی چھوڑ کر آخرت کی فکر کرو۔ یہود ایک طرف جنت کو اپنے لیے مخصوص سمجھتے اور دوسری طرف موت سے بھاگتے اور دنیا میں طویل عمر پانے کے لیے ترستے تھے۔ سورۃ الجمعہ میں ہے:

﴿قُلْ اِنَّ الْمَوْتَ الَّذِيْ تَفِرُّوْنَ مِنْهُ فَاِنَّهٗ مُلٰقِيْكُمْ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (الجمعہ 8:62)

''(اے نبی ﷺ) آپ کہہ دیجیے ''جس موت سے تم بھاگتے ہو۔ وہ تمہیں آ کر رہے گی۔ پھر تم اللہ کے سامنے پیش کیے جاؤ گے، جو ہر چھپی اور ظاہر چیز کو جانتا ہے۔'' پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے۔''

بِمُزَحْزِحِهٖ:...... یہ زَحْزَحَ سے اسم فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ طویل عمر کا جینا بھی ان کو عذاب سے نجات نہیں دلا سکے گا۔ (8:62)

﴿وَ لَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ١ؗ وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ١ؕ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ١ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ١ٞ وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ۝۸۷﴾ (87)

مدینے کے یہود کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ دیکھو، آج محمد ﷺ پر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک کتاب (قرآن) نازل ہوئی ہے، جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی ایک کتاب (توریت) نازل ہوئی تھی۔ تم اللہ تعالیٰ کے ایک نبی (موسیٰ علیہ السلام) پر کتاب نازل ہونے کو نہ صرف مانتے ہو بلکہ اس پر فخر و غرور بھی کرتے ہو، مگر اس کے ایک اور نبی (حضرت محمد ﷺ) پر کتاب (قرآن) نازل ہونے کو کیوں نہیں مانتے اور اس کی کیوں تکذیب و مخالفت کرتے ہو۔

پھر فرمایا کہ انسانوں کی غفلت اور کوتاہی کا حال یہ ہے کہ وہ کچھ عرصہ بعد دین و شریعت کو نہ صرف بھلا بیٹھتے ہیں بلکہ اپنی خواہشاتِ نفس سے اس میں ردو بدل اور ترمیم و تنسیخ بھی کر ڈالتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں وہ گمراہ ہوتے اور ان کے دل سخت ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اللہ تعالیٰ اپنے دین کی حفاظت اور بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ایک نبی کے بعد کوئی دوسرا نبی بھیجتا رہا ہے اور ہر نئی بعثت میں زیادہ طویل وقفہ نہیں کرتا رہا۔ یہی بات قرآن مجید میں دوسرے مقام پر اس طرح بیان ہوئی ہے۔

﴿اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ١ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ١ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ﴾ (الحدید 16:57)

''کیا ایمان والوں کے لیے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی نصیحت کے آگے جھک جائیں اور اس حق

کے آگے جو نازل ہو چکا ہے؟ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی۔ پھر ان پر لمبی مدت گزر گئی، تو ان کے دل سخت ہو گئے۔ ان میں سے اکثر نافرمان ہیں۔''

بنی اسرائیل میں پے در پے نبی بھیجے گئے، مگر انہوں نے اپنی خواہش پرستی اور تکبر و غرور سے ان کو نہ صرف جھٹلایا بلکہ ان میں سے بعض کو قتل بھی کر دیا، جیسے زکریا علیہ السلام اور یحییٰ علیہ السلام۔ پھر آخر میں ان کی طرف عیسیٰ علیہ السلام کو ایسے کھلے معجزے دے کر بھیجا گیا، جن کی صداقت سے کوئی معقول آدمی انکار نہیں کر سکتا تھا۔ مگر یہود نے نہ صرف مسیح علیہ السلام کی نبوت اور ان کے معجزات کا انکار کیا بلکہ اپنے خیال کے مطابق ان کو سولی پر بھی چڑھا دیا۔

قرآن نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں کئی مقامات پر فرمایا ہے کہ ان کو روح القدس جبرئیل علیہ السلام کی تائید حاصل تھی۔ جیسے اسی سورۂ البقرہ میں ہے:

﴿وَ اٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَ اَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ﴾ (البقرہ 253:2)

''اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہما السلام کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔''

اسی طرح سورۂ المائدہ (110:5) میں بھی یہی مضمون موجود ہے۔

جب کہ واقعہ یہ ہے کہ ہر نبی کو جبرئیل علیہ السلام کی تائید حاصل ہوتی ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ مسیح علیہ السلام کے حوالے سے اس تائید کا ذکر یہودیوں کے اس غلط الزام اور جھوٹے دعوے کی تردید کے لیے آیا ہے جو یہ کہتے تھے کہ عیسیٰ علیہ السلام جو معجزے دکھاتے ہیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یا جبرئیل علیہ السلام کی تائید سے نہیں دکھاتے بلکہ جن بھوتوں اور بدروحوں کے سردار بعلزبول کی مدد سے دکھاتے ہیں۔ (ملاحظہ ہو متی باب 12)

اس مقام پر نبی ﷺ کے لیے تسلی اور اطمینان کا پہلو بھی ہے کہ آج اگر مدینے کے یہود آپ ﷺ کی نبوت پر ایمان نہیں لا رہے تو اس میں کوئی تعجب اور حیرانی کی بات نہیں۔ یہ قوم ایسی ہے جو ہمیشہ سے اپنے انبیاء کرام کو جھٹلاتی رہی ہے اور ان کی جان کی دشمن رہی ہے۔ اس کے ہاتھوں بہت سے نبی اور رسول شہید ہو چکے ہیں۔

بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا۔ مگر ان لوگوں کا یہ دعویٰ قرآن مجید کے نصوص اور واضح احکام کے خلاف ہے۔ کیونکہ جس طرح بہت سے انبیائے کرام کو بدبخت لوگوں نے شہید کیا۔ اسی طرح بعض رسولوں کو بھی شہید کیا گیا۔ مثال کے طور پر:

1۔ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ دوسرے رسولوں کی طرح حضرت محمد ﷺ کے لیے بھی وفات پانے یا قتل ہو جانے کی دونوں صورتوں کا امکان موجود ہے۔ گویا آپ ﷺ کو طبعی موت بھی آ سکتی ہے اور آپ ﷺ مقتول بھی ہو سکتے ہیں۔

﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ اَفَا۟ئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ

عَلٰٓی اَعْقَابِکُمْ ؕ وَمَنْ یَّنْقَلِبْ عَلٰی عَقِبَیْہِ فَلَنْ یَّضُرَّ اللّٰہَ شَیْئًا ؕ﴾ (آل عمران 144:3)

''اور محمد تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے اور بھی رسول گزر چکے ہیں۔ پس اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل ہو جائیں تو کیا تم الٹے پاؤں واپس چلے جاؤ گے اور جو کوئی بھی الٹے پاؤں واپس چلا جائے گا، وہ اللہ کا کچھ بھی نقصان نہ کرے گا۔''

2۔ اسی طرح مزید ارشاد ہوا کہ:

﴿اَلَّذِیْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰہَ عَھِدَ اِلَیْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰی یَاْتِیَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْکُلُہُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَکُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِیْ بِالْبَیِّنٰتِ وَ بِالَّذِیْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْھُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ o﴾ (آل عمران 183:3)

''یہ لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا تھا کہ ہم کسی رسول پر ایمان نہ لائیں جب تک وہ ہمارے سامنے ایسی قربانی پیش نہ کرے جسے آگ کھا جائے۔ آپ ﷺ کہہ دیجئے کہ مجھ سے پہلے تمہارے پاس کئی رسول آئے، نشانیاں لے کر اور اس چیز کے ساتھ جسے تم کہہ رہے ہو۔ پھر تم نے ان کو قتل کیوں کیا؟ اگر تم سچے ہو؟''

اس آیت سے واضح طور پر معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کے ہاتھوں کئی رسول قتل ہوئے تھے۔

3۔ سورۂ مائدہ میں ارشاد ہوا کہ:

﴿لَقَدْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَ اَرْسَلْنَآ اِلَیْھِمْ رُسُلًا ؕ کُلَّمَا جَآءَھُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَھْوٰٓی اَنْفُسُھُمْ ۙ فَرِیْقًا کَذَّبُوْا وَفَرِیْقًا یَّقْتُلُوْنَ o﴾ (المائدہ 70:5)

''بے شک ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور ان کے پاس کئی رسول بھیجے۔ جب کبھی کوئی رسول ان کے پاس وہ چیز لایا جو ان کو پسند نہ آئی تو بعض کو وہ جھٹلاتے اور بعض کو قتل کر ڈالتے تھے۔''

اس آیت سے بھی صریح طور پر معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل نے اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے کئی رسولوں کو قتل کیا تھا۔

اس مقام پر بنی اسرائیل کے بارے میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ عہد کر رکھا تھا کہ وہ کسی ایسے رسول پر ایمان نہ لائیں جو ان کے سامنے نیاز یا قربانی کو آسمانی آگ سے نہ جلا دکھائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس دعوے کا یہ جواب دیا ہے کہ اے نبی ﷺ! آپ ﷺ ان سے کہہ دیں کہ اگر یہی بات ہے تو جو رسول اور پیغمبر ان کے پاس دلائل اور مذکورہ معجزہ بھی لاتے رہے، ان کی انہوں نے تکذیب کیوں کی تھی اور ان میں سے بعض کو قتل کیوں کیا تھا؟

قرآن مجید کے یہ واضح نصوص ہیں، جن سے صریح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نبیوں کی طرح رسول بھی بعض اوقات اپنے قوم کے ہاتھوں قتل ہوئے ہیں۔ بالخصوص بنی اسرائیل کے بارے میں ارشاد ہوا کہ انہوں نے بہت

سے رسولوں کو نہ صرف جھٹلایا تھا بلکہ ان کو قتل کر بھی ڈالا تھا۔

مذکورہ دلائل و براہین کے بعد یہ دعویٰ کرنے کی کیا گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ قانون الٰہی یہی رہا ہے کہ کبھی کوئی رسول کسی قوم کے ہاتھوں قتل نہیں ہوا؟

اصل میں زمانۂ حال کے بعض لوگوں کو جن آیات کی بنا پر غلط فہمی لاحق ہوئی کہ کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوسکتا وہ درج ذیل آیات ہیں:

1۔ ﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌo﴾ (المجادلہ 21:58)

''اللہ نے لکھ دیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے، بے شک اللہ قوت والا غالب ہے۔''

2۔ ﴿وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَo اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَo﴾

(الصافات 172,171:37)

''اور ہم اپنے بھیجے ہوئے بندوں (رسولوں) سے پہلے ہی وعدہ کر چکے ہیں کہ بے شک انہیں ہماری مدد حاصل ہوگی، اور ہمارا لشکر ہی غالب رہے گا۔''

لیکن ان آیات کی تشریح میں مفسرین حضرات نے اپنی اپنی تفاسیر مثلاً الکشاف، قرطبی، ابن کثیر، روح المعانی اور فتح القدیر وغیرہ میں واضح طور پر لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ دلیل و حجت کے موقع پر رسول ہمیشہ غالب رہتا ہے اور میدانِ جنگ میں مقابلے کے وقت بھی غالب رہتا ہے، مغلوب نہیں ہوتا۔ ان آیات سے یہ معنی نکالنا درست نہیں کہ وہ عام حالات میں بھی قتل نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ ایسا دعویٰ خود قرآن مجید کے دوسرے واضح احکام اور نصوص کے خلاف ہے، جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

﴿وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝۸۸﴾ (88)

اس سے پہلی آیت میں خطاب حاضر کے انداز میں تھا جو اب غائب کے طریقے پر ہو گیا ہے۔ اس میں یہود کی تحقیر کا پہلو ہے کہ وہ ایسے گئے گزرے تھے جو خطاب کے قابل نہیں۔

غُلْفٌ غلاف کی جمع ہے۔ یہود کا یہ کہنا کہ ''ہمارے دل غلافوں میں بند اور محفوظ ہیں۔'' ان کے غرور و تکبر کو ظاہر کرتا ہے۔ جس کا مطلب وہ یہ لیتے تھے کہ وہ اپنے خاندانی اور نسلی دین میں پکے، ثابت قدم اور اس پر سختی سے کاربند ہیں۔ باہر کی کوئی بات ان کے دلوں میں داخل نہیں ہوسکتی جو ان کے عقیدوں کو بدل سکے۔ اس لیے قرآن اور نبی ﷺ کی دعوت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوسکتا۔ اس بات میں ان کا گھمنڈ بھی شامل تھا کہ صرف ان کا دین ہی سچا دین ہے اور باقی ساری دنیا گمراہ ہے۔ قرآن نے ان کے اور عیسائیوں کے اسی دعوے کے بارے میں فرمایا:

﴿وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ﴾ (البقرہ 135:2)

''اور وہ کہتے ہیں ہدایت چاہیے تو یہودی یا عیسائی ہو جاؤ۔''

لیکن اصل میں یہود کی اپنی اندھی تقلید کے جمود کا یہ اثر تھا کہ وہ ایک ایسی دینداری پر فخر کا اظہار کرتے تھے جو سچے ایمان اور عمل صالح سے خالی تھی۔ جو دوسروں کی بات سننا بھی گوارا نہیں کر سکتی تھی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان لوگوں پر ان کے کفر کی لعنت اور پھٹکار پڑی ہوئی ہے اور وہ اس قسم کا دعویٰ کرتے ہیں جب کہ اسلام قبول کرنے سے انکاری ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں میں سے بہت کم لوگ ایمان لائے۔

﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۫ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (89)

اس جگہ 'کتاب' سے مراد قرآن مجید ہے، جو ان پیش گوئیوں کو سچا ثابت کرتا ہے جو یہودیوں کے ہاں توریت اور دوسرے صحیفوں میں نبی ﷺ اور قرآن کے بارے میں تھیں، اور جو حضور ﷺ کی بعثت اور قرآن مجید کے نزول کے بعد پوری ہوگئیں۔ (لفظ مُصَدِّق کی تشریح اس سے پہلے آیت 40 میں گزر چکی ہے۔)

یہود ان پیش گوئیوں کے پورا ہونے کے منتظر تھے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ آنے والے نبی کی بعثت سے ان کا زوال عروج میں بدل جائے گا اور وہ اپنے دشمنوں پر فتح پالیں گے۔ اس کے لیے وہ اللہ تعالیٰ سے فتح کی دعائیں بھی مانگا کرتے تھے۔

مگر جب ان کی آنکھوں کے سامنے وہ ساری پیش گوئیاں پوری ہوچکیں جو قرآن اور نبی ﷺ سے متعلق تھیں تو یہود نے جان بوجھ کر محض حسد اور خاندانی تعصب سے حضور ﷺ اور قرآن مجید کا انکار کر دیا۔ اس طرح انہوں نے اپنے لیے ہدایت ونجات کا آخری، قیمتی اور سنہری موقع اپنے ہاتھ سے گنوا دیا۔

﴿بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝﴾ (90)

فرمایا کہ یہود نے اپنے لیے ایمان اور نجات کی راہ اپنانے کی بجائے حسد اور تعصب کا رویہ اختیار کیا۔ ان کو یہ دکھ تھا کہ کیوں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو چھوڑ کر عربوں کے بنی اسماعیل سے اپنا آخری رسول مبعوث فرمایا۔ حالاں کہ یہ صرف اللہ تعالیٰ کا اختیار ہے کہ وہ جس قوم اور خاندان سے چاہے کوئی رسول بھیجے۔ یہود نے حسد اور تکبر سے حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت کا انکار کر کے کفر کا ارتکاب کیا، جس کے نتیجے میں وہ دنیا میں اللہ تعالیٰ کے مغضوب ٹھہرے اور آخرت میں جہنم کے ذلیل کرنے والے عذاب سے دوچار ہوں گے۔

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ؕ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ (91)

جب یہود کو ایمان لانے کی دعوت دی جاتی تو وہ کہتے ''ہم بھی ایمان والے ہیں۔ (البقرہ 8:2)۔ صرف اپنی مذہبی کتاب توریت کو مانتے ہیں۔ اس کے سوا کسی اور کتاب کو نہ الہامی مانتے ہیں اور نہ اس پر ایمان لانا ضروری سمجھتے ہیں۔'' اس طرح وہ قرآن کا انکار کر کے کافر ہو جاتے تھے۔

فرمایا، اگر یہود کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ توریت کے ماننے والے ہیں تو اپنے ان نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے ہیں جو توریت پر عمل کرنے کی تاکید کرتے تھے، جیسے زکریا عَلَیْہِ السَّلَام اور یحییٰ عَلَیْہِ السَّلَام۔ یاد رہے اس جگہ تَقْتُلُوْنَ کے معنی قَتَلْتُمْ (تم نے قتل کیا) کے ہیں۔

﴿وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾﴾ (92)

اس سے پہلی آیت میں یہود کی جھوٹی دینداری کا ذکر کیا گیا۔ اب ان کی خدا پرستی کا پول کھولا گیا ہے کہ انہوں نے موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے ہاتھوں کھلے معجزات دیکھنے کے باوجود اپنے رب کی عبادت کرنے کی بجائے بچھڑے کی پوجا کر کے شرک کا ارتکاب کیا تھا۔ گویا ان یہودیوں کا حال یہ ہے کہ نہ تو اللہ تعالیٰ کی کسی کتاب پر ان کا کبھی سچا ایمان تھا اور نہ انبیائے کرام پر۔ یہ اپنی دینداری اور ایمان کے دعوے میں بالکل جھوٹے ہیں۔

﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَاۤ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْا ؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا ۗ وَ اُشْرِبُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ؕ قُلْ بِئْسَمَا يَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِيْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۳﴾﴾ (93)

اس آیت کے ابتدائی حصے کا مضمون اس سے پہلے آیت 63 میں تفصیل سے گزر چکا ہے۔

اس جگہ سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا (ہم نے سنا اور ہم نے نافرمانی کی۔) میں عَصَيْنَا (ہم نے نافرمانی کی) کا لفظ یہود نے اپنی زبان سے ادا نہیں کیا تھا، بلکہ بعد میں ان کا طرز عمل ایسا تھا جو زبان حال سے گویا عَصَيْنَا ''ہم نے نافرمانی کی'' کہہ رہا تھا۔ دوسری زبانوں کی طرح عربی زبان میں بھی یہ اسلوب موجود ہے جس میں کسی حالت یا کیفیت کو زبان کی بات یا گفتگو سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دَقَّاتُ قَلْبِ الْمَرْءِ قَائِلَةٌ لَهٗ
اِنَّ الْحَيَاةَ دَقَائِقَ وَ ثَوَانِيْ

''ان کے دل کی دھڑکنیں کہتی ہیں کہ زندگی منٹوں اور سیکنڈوں کا نام ہے۔''

اسی طرح اردو کا ایک شاعر کہتا ہے:

ابھی اس راہ سے گزرا ہے کوئی
کہے دیتی ہے شوخی نقشِ پا کی

پھر فرمایا کہ یہود کے کفر و شرک کے نتیجے میں ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت اس طرح رچ بس گئی جیسے پانی کسی جگہ جذب ہو جاتا ہے۔

آخر میں مدینے کے یہود سے فرمایا گیا کہ تمہارا یہ کیسا ایمان ہے اور کیسی دینداری ہے کہ تمہارے اسلاف اپنے نبیوں کو قتل کرتے رہے۔ انہوں نے توریت کے احکام کی خلاف ورزی کی۔ وہ ایک اللہ کی عبادت کرنے کی بجائے بچھڑے کو معبود بنا کر اس کی پوجا کرتے رہے۔ تم آج بھی ان کے ان غلط کاموں پر فخر و مباہات کا اظہار کرتے ہو اور انہی کی روشِ اختیار کیے ہوئے ہو۔

﴿قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (94)

یہود کا دعویٰ تھا کہ آخرت کے گھر جنت کی ساری نعمتیں صرف ان کے لیے مخصوص ہیں۔ صرف وہی جنت میں جائیں گے، باقی ساری دنیا جہنم میں جائے گی۔ قرآن نے ان کے اس دعوے کو جھوٹا قرار دیا اور چیلنج کیا کہ اگر وہ واقعی جنتی ہیں تو پھر ان کو دنیا کی زندگی سے زیادہ آخرت کی زندگی سے پیار ہونا چاہیے۔ ان کے دلوں میں موت کی آرزو اور شوق ہونا چاہیے تاکہ وہ جلد از جلد جنت میں پہنچ کر دائمی عیش کی زندگی بسر کریں۔

جس شخص کو یہ یقین ہو کہ مرنے کے بعد اسے جنت ملے گی تو قدرتی طور پر وہ موت سے نہیں ڈرے گا بلکہ اس کی آرزو کرے گا۔ بعض سلف صالحین سے ثابت ہے کہ وہ جنت کی طلب اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کے شوق میں موت کی تمنا کیا کرتے تھے۔ ایسا کرنا شریعت کے ہرگز خلاف نہیں ہے۔ البتہ کسی بیماری یا پریشانی سے تنگ آ کر موت کی تمنا کرنا شریعت کے خلاف اور ناجائز ہے۔ جیسا کہ ایک متفق علیہ حدیث ہے:

((عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَا يَتَمَنَّيَنَّ اَحَدُكُمُ الْمَوْتَ مِنْ ضُرٍّ اَصَابَهُ، فَاِنْ كَانَ لَا بُدَّ فَاعِلًا فَلْيَقُلْ: اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِيْ مَا كَانَتِ الْحَيَاةُ خَيْرًا لِّيْ، وَتَوَفَّنِيْ اِذَا كَانَتِ الْوَفَاةُ خَيْرًا لِّيْ)) (صحیح بخاری، رقم: 5671۔ صحیح مسلم، رقم: 6814۔ ترمذی، رقم: 970۔ ابو داؤد، رقم: 3108۔ نسائی، رقم: 1821)

''سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص کسی تکلیف کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کرے۔ اگر ایسا ناگزیر ہو جائے تو پھر یہ دعا کرنی چاہیے: اے اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھ جب تک میرا زندہ رہنا میرے لیے بہتر ہے، اور مجھے دنیا سے اٹھا لے اگر وفات میرے لیے بہتر ہے۔''

﴿وَ لَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ بِالظّٰلِمِیْنَ ۝۹۵﴾ (95)

فرمایا، یہ یہود اپنے کفر اور اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے کبھی موت کی تمنا نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ مرنے کے بعد ان کے لیے عذاب کا شکنجہ تیار ہے۔ اس لیے وہ موت سے خائف رہتے اور اس سے دور بھاگتے ہیں۔ (الجمعه 8:62)۔ مگر بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔ دنیا کے یہ پجاری کب تک جئیں گے، آخر ایک دن ان کو مرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی ان کے کفر اور برے اعمال کو خوب جانتا ہے اور وہ ان کو سخت سزا دے گا۔

﴿وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰی حَیٰوةٍ ۛۚ وَ مِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا ۛۚ یَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ یُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَ مَا هُوَ بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ یُّعَمَّرَ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ ۝۹۶﴾ (96)

اس مقام پر یہود کی تضاد بیانی اور ان کے جھوٹے دعوؤں کی قلعی کھول دی گئی ہے کہ یہ لوگ ایک طرف بڑے دیندار اور اللہ تعالیٰ کے چہیتے ہونے اور جنتی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور اپنے سوا کسی کے لیے نجات کو تسلیم نہیں کرتے مگر دوسری طرف ان کا حال یہ ہے کہ یہ ان مشرکین سے، جو صرف دنیا کو مانتے ہیں اور آخرت کے منکر ہیں، بڑھ کر دنیا پرست واقع ہوئے ہیں۔ ہر یہودی کی خواہش ہے کہ وہ ہزار برس تک جیے۔ حالاں کہ زیادہ طویل عمر پانا اسے آخرت کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔

یاد رہے کہ ہزار برس جینے کا روز مرہ طویل عمر کے لیے استعارہ ہے جو عربی زبان کے علاوہ فارسی اور اردو زبان میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان یہود کے تمام اعمال کو دیکھ رہا ہے اور ان کے مطابق ان کو بدلہ دے گا۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَ هُدًی وَّ بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۹۷ مَنْ
كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِیْلَ وَ مِیْكٰلَ فَاِنَّ
اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِیْنَ ۝۹۸ وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۢ بَیِّنٰتٍ ۚ وَ مَا
یَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝۹۹ اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِیْقٌ
مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ۝۱۰۰ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ

عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ وَاتَّبَعُوْا
مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ
وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ
عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ؕ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ
حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا
يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ
اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ
وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۛؕ
وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ
اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع ۱۲ ۷ ۱۲

”(اے نبی ﷺ) کہہ دیجیے جو جبرائیل علیہ السلام کا دشمن ہے، وہ جان لے کہ جبرائیل علیہ السلام وہ ہے جس نے اللہ کے حکم سے آپ کے دل پر ایسا کلام نازل کیا ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی پیش گوئی کو سچ کر دکھانے والا ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت اور خوشخبری ہے۔

جو کوئی دشمن ہو اللہ کا، اس کے فرشتوں کا، اس کے رسولوں کا، جبرئیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام کا، تو اللہ بھی ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ اور (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ ﷺ پر بڑی واضح نشانیاں اتاری ہیں اور ان کا انکار وہی کر سکتے ہیں جو بڑے نافرمان ہوں۔

(بنی اسرائیل کا حال یہ ہے کہ) جب کوئی عہد کرتے ہیں تو ان کا ایک گروہ اسے توڑ پھینکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب ان کے پاس اللہ کی طرف سے وہ رسول آ گیا جو ان کی اپنی

کتاب کو سچا کرنے والا تھا، تو اہل کتاب کے ایک گروہ نے کتاب الٰہی کو اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک دیا، گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں۔

اور وہ اس چیز کے پیچھے پڑ گئے جو سلیمان علیہ السلام کی سلطنت میں شیطان پڑھتے تھے۔ سلیمان علیہ السلام نے ہر گز کفر نہیں کیا، کفر تو ان شیطانوں نے کیا جو لوگوں کو جادو سکھاتے تھے۔ اور وہ اس چیز کے پیچھے بھی پڑ گئے جو بابل شہر میں دو فرشتوں ...... ہاروت اور ماروت ...... پر اتاری گئی۔ حالاں کہ وہ فرشتے اس وقت تک کسی کو کچھ نہ بتاتے جب تک یہ نہ کہہ دیتے: دیکھو، ہم تمہاری آزمائش کے لیے آئے ہیں، اس لیے تم کافر نہ بنو'' لیکن وہ ان سے ایسا عمل سیکھتے، جس کے ذریعے میاں بیوی میں جدائی ڈال سکیں۔ حالاں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تھے۔ مگر وہ ایسی چیزیں سیکھتے جو ان کے لیے فائدہ مند ہونے کی بجائے نقصان دہ تھیں۔ وہ یہ بھی اچھی طرح جانتے تھے کہ جو کوئی اس چیز کا خریدار بنے گا اسے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

کیسی بری چیز ہے جس کے بدلے میں انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ کاش وہ سمجھتے! اگر وہ ایمان والے ہوتے اور اللہ سے ڈرتے تو انہیں اللہ کی طرف سے ثواب ملتا، جو ان کے حق میں بہتر تھا۔ کاش وہ جانتے۔'' (97-103)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ: ...... اس میں عَلٰی (پر) فِیْ (میں) کے معنوں میں ہے اور مُلْكُ سے پہلے عَهْدِ مضاف محذوف ہے۔ تقدیر کلام یہ ہے: ﴿فِیْ عَهْدِ سُلَیْمٰنَ﴾ ''سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی کے زمانے میں''۔

بِبَابِلَ: ...... اس میں ب کا حرف فِیْ کے معنوں میں ہے۔ یعنی فِیْ بَابِلَ ''بابل شہر میں''۔

﴿قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَ هُدًی وَّ بُشْرٰی لِلْمُؤْمِنِیْنَ ۝۹۷﴾ (97)

قرآن اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لانے کے لیے یہود جو حیلے بہانے کرتے تھے، ان میں سے ایک یہ تھا کہ وہ کہتے تھے: جبرئیل علیہ السلام جس نبی پر وحی لاتا ہے ہم اس نبی کو نہیں مانتے، کیونکہ جبرئیل علیہ السلام ہمارا دشمن ہے، اس کے ذریعے ہم پر عذاب اور مصیبتیں نازل ہوتی رہی ہیں۔ البتہ میکائیل علیہ السلام ہمارا خیر خواہ اور دوست ہے، جو ہمارے لیے بارش برساتا اور خوش حالی لاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے اس غلط اعتقاد کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص جبرئیل علیہ السلام کو اپنا دشمن سمجھتا ہے، اسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک معزز فرشتہ ہے، جس نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن مجید نازل کیا ہے جو پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، انسانوں کے لیے ہدایت کا پیغام ہے، اور اہل ایمان کو جنت کی خوشخبری دیتا ہے۔

اس میں یہود کو بتا دیا گیا کہ جبرئیل علیہ السلام سے دشمنی کا مطلب اس کی لائی ہوئی وحی سے دشمنی ہے جس کی زد صرف

قرآن پر نہیں پڑتی بلکہ خود ان کی اپنی توریت پر بھی پڑتی ہے، کیونکہ وہ بھی جبرئیل علیہ السلام ہی کی لائی ہوئی وحی ہے۔ اگر وہ قرآن کو اس لیے نہیں مانتے کہ وہ جبرئیل علیہ السلام کا نازل کیا ہوا ہے تو پھر توریت کو ماننے کا کیا جواز ہے، جب کہ وہ بھی جبرئیل علیہ السلام ہی کی نازل کی ہوئی ہے۔

اس آیت سے یہ بات بھی قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ پورے کا پورا قرآن حضرت جبرئیل علیہ السلام ہی کے ذریعے نازل ہوا ہے اور کوئی آیت یا سورت اس واسطے کے بغیر نازل نہیں ہوئی۔

﴿مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓىِٕكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (98)

فرمایا، جبریل علیہ السلام سے دشمنی کا مطلب میکائیل علیہ السلام سے بھی دشمنی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے فرشتوں سے دشمنی کے معنی ہیں، خود اللہ تعالیٰ سے دشمنی۔ پھر جو اللہ تعالیٰ کا دشمن ہو تو وہ کافر ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے کافروں کا دشمن ہے۔ ان کو وہ سخت سزا بھی دے گا۔

ایک حدیث قدسی ہے، اللہ فرماتا ہے:

((مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ)) (صحیح بخاری، رقم: 6502)

''جو شخص میرے کسی دوست سے دشمنی کرتا ہے، میں اس کے خلاف اعلانِ جنگ کرتا ہوں۔''

اصل بات یہ ہے کہ قرآن کی مخالفت کرنے کا مطلب تمام آسمانی کتابوں کی مخالفت کرنا ہے اور حضرت محمد ﷺ کی مخالفت کرنا، تمام نبیوں کی مخالفت کرنا ہے۔ گویا کسی ایک آسمانی کتاب کا انکار تمام آسمانی کتب کا انکار ہے اور کسی ایک نبی کا انکار تمام نبیوں کا انکار ہے اور یہ چیز کفر ہے۔

اس آیت میں فرشتوں کا ذکر کرنے کے بعد جبرئیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام کا الگ سے ذکر کرنا، ان کے شرف اور فضیلت کی وجہ سے ہے، اور یہ عام کے بعد خاص کے ذکر کا اسلوب ہے۔

﴿وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَيْكَ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ ۚ وَ مَا يَكْفُرُ بِهَاۤ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۝﴾ (99)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے آپ کی نبوت اور قرآن کی صداقت کی ایسی روشن نشانیاں اور دلیلیں نازل کر دی ہیں، جن کا کوئی معقول آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ البتہ ان کا انکار وہ لوگ کر سکتے ہیں، جو یہود کی طرح کے عادی نافرمان، عہد شکن، ہٹ دھرم اور حسد کے مارے ہوئے ہوں اور گمراہی کو ہدایت پر ترجیح دیتے ہوں۔

﴿اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝﴾ (100)

فرمایا، ان یہودیوں کا تو یہ حال رہا ہے کہ جب کبھی انہوں نے اللہ تعالیٰ سے یا اس کے بندوں سے کوئی عہد کیا ہے، تو اُن میں سے کسی نہ کسی گروہ نے ہمیشہ اسے توڑ پھینکا ہے۔ وہ اب بھی نبی ﷺ سے کوئی معاہدہ کریں گے تو اس

کی ضرور خلاف ورزی کریں گے۔ ان کے کسی ایک گروہ کی بات نہیں، ان کی اکثریت پہلے بھی ایمان سے خالی تھی اور اب بھی آخری نبی ﷺ پر ایمان نہیں لائے گی۔

قرآن مجید کی یہ پیش گوئی بالکل درست ثابت ہوئی۔ نہ صرف حضور ﷺ کی حیات مبارکہ میں یہودیوں نے مسلسل عہد شکنیاں کیں اور ان میں سے بہت کم لوگ ایمان لائے، بلکہ بعد کے زمانے میں بھی اور آج تک ان کی اکثریت عہد شکن، سازشی اور ایمان سے محروم ہے۔

﴿وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾﴾ (101)

اس آیت میں رَسُوْلٌ سے مراد حضرت محمد ﷺ ہیں۔

اب یہود کی عہد شکنی اور نافرمانی کی ایک واضح مثال دی گئی ہے، کہ جب ان کے پاس اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا ایک عظیم الشان رسول ﷺ تشریف لایا، جو ان کی توریت کی پیش گوئیوں کے بالکل مطابق آیا اور جس کے بارے میں پہلے سے بتائی گئی تمام نشانیاں پوری ہوگئیں تو یہودی علماء نے توریت کے اس حصے کو جس میں آخری نبی ﷺ کے تمام اوصاف بیان ہوئے تھے، اس طرح پیٹھ پیچھے پھینک دیا گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں۔ ظاہر ہے کتاب الٰہی کے کسی ایک حصے کا انکار پوری کتاب کا انکار ہے۔ اس طرح یہود نے حسد اور تعصب کے تحت گویا پوری توریت کو پس پشت ڈال دیا اور اس کی تعلیمات سے انحراف کیا۔ حالاں کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے اس کی پابندی کرنے کا عہد کر رکھا تھا اور اسی توریت پر فخر کر کے وہ اہل کتاب کہلاتے تھے۔

﴿وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَ مَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَ مَاۤ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَ مَارُوْتَ ؕ وَ مَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَاۤ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ ؕ وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ۫ وَ لَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠٢﴾﴾ (102)

جب یہود نے کتابِ الٰہی (توریت) پر عمل کرنا چھوڑا تو وہ جادو ٹونے اور سفلی علوم کے پیچھے لگ گئے، جن کو اُن سے پہلے بعض شریر انسانوں اور برے جنات نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہدِ حکومت میں رواج دیا تھا۔ پھر اس جادو ٹونے کو ''مقدس'' بنانے کے لیے اسے سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کر دیا کہ ان کے سارے معجزے دراصل جادو ٹونے کے زور پر ظاہر ہوتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کے اس جھوٹے الزام کی تردید فرمائی کہ جادوگری کے کفر کا ارتکاب

سلیمان علیہ السلام نے نہیں کیا تھا، بلکہ ان کے زمانے کے بعض شریر انسان اور برے جنات یہ کافرانہ کام کرتے تھے۔

یہود میں جب اخلاقی پستی اور بدعملی پھیل گئی تو وہ اپنے کبیرہ گناہوں کو انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کرنے لگے، تاکہ ان کے اپنے گناہوں پر پردہ پڑا رہے اور کوئی گناہ گناہ نہ رہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے جادوٹونے کو اختیار کرلیا تو اسے انہوں نے سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب کیا اور ان کو جادوگر ٹھہرایا۔

پھر اللہ تعالیٰ نے یہود کے کتاب الٰہی سے انحراف اور جادوگری میں انہماک کی وجہ سے ان کی آزمائش کے لیے دو فرشتوں ہاروت اور ماروت کو بابل شہر (عراق) میں بھیج دیا۔ یہ بنی اسرائیل کی قید اور اسیری کا زمانہ تھا۔ وہ فرشتے خود جادوٹونا نہیں کرتے تھے بلکہ لوگوں کو جادو کی حقیقت بتاتے تھے کہ یہ اس طرح کا عمل ہوتا ہے، تاکہ معجزے اور جادو کا فرق نمایاں ہو جائے اور لوگ جادو کو نبیوں کا علم نہ سمجھ بیٹھیں۔

ہاروت اور ماروت کے بارے میں ہمارے ہاں ایک جھوٹا اور بیہودہ قسم کا قصہ مشہور ہے جو اسرائیلیات کی خرافات میں سے ہے۔

یہود کی اخلاقی پستی کا یہ حال تھا کہ وہ جادوٹونا سیکھ کر اس سے میاں بیوی میں جدائی ڈالنے کا کام لیتے اور اس طرح بدمعاشی اور بے حیائی کو فروغ دیتے۔ ظاہر ہے، اللہ تعالیٰ کی مشیت کے بغیر کوئی مادی یا روحانی عمل موثر نہیں ہو سکتا۔ اللہ سبحانہٗ کی رضا صرف نیکی کے کاموں میں ہوتی ہے، برے کاموں میں نہیں ہوتی۔

پھر یہود اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ جادوٹونے کرنے والوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس کے باوجود وہ اپنی اس حرکت سے باز نہیں آتے تھے۔ انہوں نے کتاب الٰہی کی ہدایت پر جادوگری کی گمراہی کو ترجیح دی اور اپنے برے انجام سے آنکھیں بند کرلیں۔

آج کے مسلم معاشرے میں بھی جادوٹونے کا رواج بہت زور پکڑ چکا ہے۔ اس کا سبب بھی قرآن سے دوری اور مہجوری ہے۔ جب کوئی قوم کتاب اللہ سے دور ہوگی تو وہ شیطانی اور سفلی علوم کے پیچھے ہی چلے گی۔

اس آیت کے حوالے سے چند امور قابل غور ہیں۔

1۔ جادو کا اثر ہوتا ہے مگر جادو کرنا کفر ہے۔

2۔ جادوگر کافر ہوتا ہے اور اسلامی شریعت میں اس کی سزا قتل ہے۔

3۔ کتاب اللہ سے دوری کے نتیجے میں لوگوں کے اندر جادوٹونے اور سفلی علوم کا رواج ہو جاتا ہے۔

4۔ ہر معاملے میں نفع ونقصان کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اس کی مشیّت کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔

5۔ ہر کام اللہ تعالیٰ کی مشیّت سے ہوتا ہے، مگر یہ ضروری نہیں کہ اس میں اس کی رضا بھی شامل ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور اس کی رضا دو الگ الگ چیزیں ہیں۔

6۔ آخرت کی کامیابی کے لیے کتاب اللہ کی پیروی ضروری ہے۔

﴿وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾﴾ (103)

فرمایا، اگر یہود جادو ٹونے اور سفلی علوم میں پڑنے کی بجائے کتاب الٰہی کا صحیح علم حاصل کرتے اور اس کی پیروی کرتے تو ان کو اس میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی ساری نشانیاں مل جاتیں، جس کے بعد وہ نبی ﷺ پر ایمان لاتے اور تقوے کی زندگی اختیار کر لیتے تو آخرت میں ان کو اس کا بہترین اجر جنت کی نعمتوں کی صورت میں ملتا۔ کیونکہ صحیح علم کا نتیجہ صحیح عمل کی صورت میں نکلتا ہے۔ جب کتاب اللہ پر ان کا عمل درست نہیں ہے تو لامحالہ ان کا علم بھی ناقص ٹھہرا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ؕ
وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ
يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾ مَا نَنْسَخْ
مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَاۤ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ
عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ
وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ
تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ
مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ
كَثِيْرٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ۚۖ
حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ
فَاعْفُوْا وَ اصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ
قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ

مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَ
قَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ تِلْكَ
اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰی ۗ مَنْ
اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ
ع ۱۳ ۹ ۱۲ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰی عَلٰی
شَيْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰی لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰی شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ
كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

"اے ایمان والو! (نبی ﷺ کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے) رَاعِنَا نہ کہا کرو بلکہ اُنْظُرْنَا کہا کرو، اور اُن کی بات غور سے سنا کرو۔ اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ (حقیقت یہ ہے کہ) کافر خواہ اہل کتاب میں سے ہوں، یا مشرکوں میں سے، کبھی نہیں چاہتے کہ تم مسلمانوں پر تمہارے رب کی طرف سے کوئی بھلائی نازل ہو۔ لیکن اللہ جسے چاہتا ہے، اپنی رحمت سے نوازنے کے لیے چن لیتا ہے۔ اللہ بڑے فضل والا ہے۔

جس آیت کو ہم منسوخ کرتے ہیں یا اسے نظر انداز کراتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی اور آیت لے آتے ہیں، کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تم نہیں جانتے، اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی ہے اور تمہارے لیے اللہ کے سوا نہ کوئی حمایتی ہے اور نہ کوئی مددگار۔

(مسلمانو) کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اسی طرح کے (الٹے سیدھے) سوالات کرو، جس طرح اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے کیے گئے؟ جو شخص ایمان کی بجائے کفر اختیار کرتا ہے، وہ سیدھی راہ سے بھٹک جاتا ہے۔ (اے مسلمانو) حق بات واضح ہونے کے باوجود بہت سے اہل کتاب محض حسد کی وجہ سے یہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح تمہیں بھی کافر بنا دیں۔ مگر تم انہیں معاف کر دو، اور ان سے درگزر کرو، یہاں تک کہ اس بارے میں اللہ کا کوئی اور حکم آ جائے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور نماز قائم کرو، زکوٰۃ ادا کرو اور تم اپنے لیے جو بھلائی آگے بھیجو گے، اس کا اجر اللہ کے ہاں ضرور پاؤ گے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔

اہل کتاب کہتے ہیں، جنت میں صرف یہودی جائیں گے یا عیسائی جائیں گے۔ یہ ان کی آرزوئیں ہیں۔ (اے نبی ﷺ) آپ ان سے کہہ دیجیے: ''اگر تم سچے ہو تو اپنے دعوے کی دلیل پیش کرو۔'' حقیقت یہ ہے کہ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا، اور نیک بھی ہو تو وہ اپنے رب کے ہاں ضرور اجر پائے گا۔ ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

یہودی کہتے ہیں، عیسائیوں کا مذہب غلط ہے اور عیسائی کہتے ہیں، یہودیوں کا مذہب غلط ہے، حالاں کہ دونوں آسمانی کتاب پڑھتے ہیں۔ یہی بات وہ لوگ بھی کہتے ہیں، جن کے پاس علم نہیں۔ اللہ قیامت کے دن اس بات کا فیصلہ فرمائے گا، جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں۔''(104-113)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

رَاعِنَا:...... یہ رَاعِ اور نَا کا مجموعہ ہے۔ مُرَاعَاۃٌ (باب مفاعلہ) سے فعل امر حاضر واحد کا صیغہ ہے۔ اس کا حرف علت (ی) حذف ہو گیا ہے۔ اس کے معنی ہیں: ہماری رعایت کیجیے، ہمارا لحاظ کیجیے، ہماری طرف متوجہ ہو جایئے۔

اُنْظُرْنَا:...... یہ اُنْظُرْ اور نَا کا مرکب ہے۔ نَظَرَ سے فعل امر حاضر واحد کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی دیکھنے، دھیان کرنے اور مہلت دینے کے ہیں۔

یاد رہے کہ رَاعِنَا اور اُنْظُرْنَا کے الفاظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے باہم مترادف ہیں اور ان کا ایک ہی مطلب ہے کہ ہماری طرف متوجہ ہو کر بات کریں، تاکہ ہم آسانی سے اسے سن سکیں اور سمجھ سکیں، یا بات کو دوبارہ دہرایا جائے۔

نَنْسَخْ:...... یہ نسخ سے ہے جس کے معنی زائل کرنے، ہٹانے اور مٹانے کے ہیں۔

جیسا کہ سورۂ الحج میں آیا ہے:

﴿فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ ط وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ o﴾ (الحج 52:22)

''پھر اللہ اس چیز کو مٹا دیتا ہے، جو شیطان وسوسہ ڈالتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو مستحکم کر دیتا ہے، اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔''

نُنْسِهَا:...... یہ نَسِیَ سے باب افعال اَنْسٰی یُنْسِیْ اِنْسَاءٌ ہے جس کے معنی ہیں: ''کسی کے حافظے سے کوئی بات بھلا دینا یا فراموش کرا دینا۔''

سَوَاءَ السَّبِيْلِ:...... (راستے کا درمیانی حصہ) اس سے مراد سیدھا راستہ ہے۔ سورۂ الدخان میں ہے کہ ﴿خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَاءِ الْجَحِيْمِ o﴾ (47:44) ''اے فرشتو! اس (گناہ گار) کو پکڑو اور گھسیٹ کر دوزخ کے درمیان میں لے جاؤ۔'' سَبِيْلٌ راستے کو کہتے ہیں۔

اَلْاَمَانِيْ:...... یہ اُمْنِيَّةٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ایسی تمنا اور آرزو کے ہیں جو کبھی پوری نہ ہو سکے۔ اس لیے عربی

زبان میں یہ لفظ ''خام خیالی، غلط فہمی، خیالی پلاؤ پکانا، گمراہی اور خوابوں کی دنیا میں رہنے'' کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔لیکن تَمَنّٰی کے معنی پڑھنے کے بھی آتے ہیں اور اُمْنِیَّۃٌ پڑھی گئی یا سنائی گئی چیز کو بھی کہتے ہیں، جیسا کہ سورۂ الحج میں آیا ہے۔

﴿وَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّ لَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ ۚ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾ (الحج 52:22)

''اور (اے نبی ﷺ) ہم نے آپ ﷺ سے پہلے جو بھی رسول اور نبی بھیجا اور اس نے پیغامِ حق سنایا تو شیطان نے اس میں کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈالا۔ پھر اللہ نے شیطان کے ڈالے ہوئے وسوسے کو ختم کر دیا اور اپنی آیتوں کو مستحکم کر دیا۔ اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔''

اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ:...... (جو لوگ علم نہیں رکھتے) اس سے مراد عرب کے مشرکین ہیں، جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب تھی اور نہ وہ وحی کا علم رکھتے تھے۔

قرآن مجید نے ان کو اہل کتاب کے مقابل میں اُمِّيّٖنَ بھی کہا ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ﴾ (الجمعه 2:62)

''وہی (اللہ) ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں میں اُنہی میں سے ایک رسول بھیجا۔''

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا وَ اسْمَعُوْا ۭ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝١٠٤﴾ (104)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کو نبی ﷺ کی مجلس میں ''رَاعِنَا'' کا لفظ کہنے سے منع فرمایا ہے۔ اس ممانعت کا سبب دراصل یہودی منافقین کی ایک خفیہ شرارت تھی، وہ جب حضور ﷺ کی مجلس میں آتے تو 'رَاعِنَا' کے لفظ کو زبان سے توڑ مروڑ کر کبھی 'رَاعِيْنَا' (ہمارا چرواہا) بنا دیتے اور کبھی رَاعِيْنُوْ کہتے، جس کے معنی عبرانی زبان میں ''شریر'' کے ہیں۔ اس طرح وہ نبی ﷺ کی شان میں بے ادبی، گستاخی اور توہین کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو حکم دیا کہ وہ ایسے موقع پر رَاعِنَا کی جگہ اُنْظُرْنَا کہا کریں تاکہ بے ادبی کا کوئی پہلو باقی نہ رہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کسی لفظ میں برے معنوں کا استعمال یا امکان ہو تو ایسے لفظ کے استعمال سے بچنا چاہیے۔

پھر فرمایا کہ اِسْمَعُوْا یعنی بات کو غور سے سنا کرو، تاکہ نبی ﷺ کو دوبارہ متوجہ کرنے یا بات دہرانے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ قرآن مجید کو اور نبی ﷺ کے فرمان کو غور سے سننا واجب اور ضروری ہے۔

آخر میں فرمایا کہ کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ اس جگہ یہودی منافقین کو کافر کہا گیا ہے، کیونکہ نبی ﷺ کی شان میں گستاخی یا توہینِ رسالت کرنا کفر اور حرام ہے اور ایسا کرنے والے کافر ہیں، جن کے لیے آخرت میں دوزخ کا عذاب ہے۔

﴿مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝﴾ (105)

فرمایا، یہودی کفار اور مشرکین دونوں یہ نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کسی خیر، بھلائی یا نعمت سے نوازے۔ (آج چودہ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان کی یہ روش نہیں بدلی)۔ ان دونوں گروہوں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف شدید بغض اور حسد تھا۔ ان کو یہ بات کھائے جا رہی تھی کہ کیوں مسلمانوں کو قرآن جیسی عظیم نعمت عطا ہوئی ہے؟ کیوں ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک رسول ﷺ مبعوث فرمایا ہے؟ کیوں ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے؟ کیوں ان کی طاقت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے؟ کیوں دین اور دنیا کے معاملات پر ہماری گرفت دن بدن کمزور پڑ رہی ہے اور ہماری اجارہ داریاں آہستہ آہستہ ختم ہو رہی ہیں۔

لیکن ان حاسدین کو اتنا شعور نہیں تھا کہ اس طرح اصل میں وہ اللہ تعالیٰ پر اعتراض کر رہے ہیں کہ کیوں اس نے مسلمانوں کو اپنے فضل و رحمت کے لیے چن لیا؟ حالاں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی کمی نہیں۔ اس کی رحمت بڑی وسیع اور بے پایاں ہے۔ وہ اپنی مرضی سے جس کو چاہتا ہے خیر و برکت عطا فرماتا اور اپنی نعمتوں سے مالا مال کر دیتا ہے اور اس کو حاسدوں کے حسد کی کوئی پروا نہیں ہوتی۔

﴿مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝﴾ (106)

یہودی کہتے تھے، جب ان کے ہاں پہلے سے اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی شریعت اور کتاب موجود ہے، تو اللہ تعالیٰ کو کیا پڑی ہے کہ وہ کوئی اور شریعت یا کتاب بھیجے؟ ہم صرف اپنی شریعت اور کتاب کے پابند ہیں۔ اسی کے ماننے اور اسی کی پیروی میں اپنے لیے نجات سمجھتے ہیں۔ کسی اور شریعت یا کتاب کے نہ ہم پابند ہیں اور نہ اس کی پیروی میں نجات ہو سکتی ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کون کہہ سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف ایک ہی شریعت اور کتاب بھیج سکتا تھا اور کوئی دوسری شریعت یا کتاب بھیجنے پر قادر نہیں ہے؟ یقیناً وہ اس پر قادر ہے کہ پہلی کسی شریعت اور کتاب کی جگہ دوسری کوئی بہتر شریعت اور کتاب نازل فرما دے۔ یا اپنے بندوں کے فائدے اور ان کی مصلحت یا تربیت کی خاطر اپنے کسی حکم کو موقوف (SUSPEND) کر کے اس کی جگہ کوئی نیا حکم جاری کر دے۔ یا حالات کی تبدیلی کے سبب سے نئی شریعت نازل کر دے۔ یا طویل عرصہ گزر جانے کے باعث جب لوگ ایک شریعت کو یا اس کے کسی حصے کو بھلا بیٹھیں تو ان کے لیے وہی پہلی شریعت یا اس کی تجدید و اصلاح کر کے نئے احکام بھیج دے جو پہلے سے بہتر یا انہی جیسے ہوں۔ بے شک اللہ تعالیٰ یہ سب کچھ کر سکتا ہے، کیونکہ اس کے قانون میں تکمیل اور ارتقاء ہوتا ہے، تنزل اور جمود نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ خود ہماری شریعت میں بھی نسخ واقع ہوا ہے۔ جیسے بیوہ کی آسانی کے لیے اس کی عدت ایک سال سے کم کر کے چار ماہ دس دن کر دی گئی۔ پہلے یہ حکم تھا کہ:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ﴾ (البقرہ 2:240)

''اور تم میں سے جو لوگ مرنے کے قریب ہوں اور اُن کی بیویاں ہوں تو وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک اُن کو گھر میں رکھ کر خرچ دیا جائے۔''

پھر دوسرا یہ حکم آ گیا جس نے پہلے حکم کو منسوخ کر دیا کہ:

﴿وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ عَشْرًا﴾

(البقرہ 2:234)

''تم میں سے جو لوگ مر جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو ان بیواؤں کو چار مہینے دس دن کی عدت گزارنی چاہیے۔''

یا جیسے مسلمانوں کے لیے بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ (البقرہ 2:142، 149، 150)

آیت کا آخری ٹکڑا پہلی بات کی دلیل کے طور پر ہے کہ لوگوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ جب اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، تو وہ اپنے بندوں کے مفاد میں بہتر سے بہتر شریعت لانے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے پر بھی قادر ہے۔

﴿اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ۝۱۰۷﴾ (107)

یہ دوسری دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے فائدے کے لیے اپنی نہ صرف بھیجی ہوئی شریعتوں میں تبدیلی کرتا رہا ہے، بلکہ ان کی ہدایت کے لیے نئی کتابیں بھی نازل کرتا رہا ہے اور نئے انبیاء و رسل بھی بھیجتا رہا ہے۔ وہ پوری کائنات کا مالک ہے۔ آسمان و زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ تمام مخلوقات اس کی محکوم اور تابع فرمان ہیں۔ سب کو اس کا ہر حکم سننا اور ماننا چاہیے۔

آخر میں مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ تم یہود کے اس اعتراض کی کوئی پروا نہ کرو، جو یہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی نئی شریعت نازل نہیں کر سکتا۔ جو یہ نہیں مانتے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، جو اس کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر اتارا گیا ہے۔ ان یہود کے مقابلے میں اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے، وہ تمہیں ان کے شر سے بچائے گا۔

﴿اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَ مَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝۱۰۸﴾ (108)

اس آیت میں عام مسلمانوں کو نصیحت کی گئی کہ وہ نبی ﷺ سے اس طرح کے فضول سوالات اور مطالبات نہ کریں، جیسے یہود نے موسیٰ علیہ السلام سے کیے تھے۔ مثال کے طور پر انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہمیں اللہ دکھا دو:

﴿اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً﴾ (النساء 4:153)

"ہمیں اللہ سامنے لاکر دکھا دے۔"

یا جب ان کو ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تو انہوں نے اس پر فضول سوالات کرنے شروع کر دیے۔ جیسا کہ سورۂ البقرہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔ (البقرہ 2: 67 تا 71)

مسلمانوں کو اس یہودی ذہنیت اور ان کے غلط رویے سے بچنے کی تاکید کی گئی اور ہدایت کی گئی کہ وہ اپنے رسول ﷺ سے بے جا سوالات نہ کیا کریں، بلکہ حضور ﷺ جس کام کے کرنے کا حکم دیں، وہ اسے کر لیا کریں اور جس بات سے روکیں، اس سے باز رہا کریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ حضور ﷺ سے فضول سوالات کر کے شریعت کے احکام میں سختی، تنگی اور پیچیدگی پیدا کرنے کا باعث بن جائیں۔

پھر ذرا تنبیہ کے انداز میں ان کو خبردار کیا گیا کہ ایمان کا تقاضا سمع و طاعت ہے۔ نبی ﷺ سے فضول سوالات کرنا اور تعمق فی الدین یعنی دین کے احکام میں مین میکھ اور غیر ضروری باریکیاں نکالنا ایمان کی راہ نہیں ہے، بلکہ ایسا کرنا کفر اور گمراہی ہے۔ اس لیے ان کو چاہیے کہ وہ ایمان کی راہ چھوڑ کر کفر اور گمراہی میں نہ بھٹکیں۔

اسی سے ملتی جلتی بات سورۂ المائدہ میں بھی فرمائی گئی:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَلَكُمْ تَسُؤْكُمْ ۚ وَ اِنْ تَسْئَلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَلَكُمْ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَنْهَا ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ﴾ (المائدہ 5:101،102)

"اے ایمان والو! ایسی باتوں کے متعلق سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار گزریں۔ اور اگر تم ان کے متعلق ایسے وقت میں جب قرآن نازل ہو رہا ہے، پوچھو گے تو وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔ اب تک جو کچھ ہوا، اسے اللہ نے معاف کر دیا۔ ویسے اللہ معاف کرنے والا تحمل والا ہے۔ ایسی باتیں تم سے پہلے ایک قوم نے پوچھی تھیں، پھر وہ ان کی وجہ سے کافر ہو گئے۔"

بعض روایات میں ہے کہ ہجرت کے بعد ابتدائی دور میں بعض مسلمانوں نے نبی ﷺ سے کچھ فضول قسم کے سوالات بھی کر ڈالے تھے۔ مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ کسی نے اپنی ولدیت کی تحقیق کے لیے بھی سوال کر دیا کہ میرا باپ کون ہے؟ حضور ﷺ نے اس کا جواب تو دیا تھا مگر اس شخص کے اس سوال کو سخت ناپسند فرمایا تھا۔

(صحیح بخاری، رقم: 7291)

اسی طرح ایک اور موقع پر حضور ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا کہ اے لوگو! تم پر حج فرض ہو گیا ہے...... اس پر کسی نے بات کاٹتے ہوئے سوال کیا کہ: کیا ہر سال حج فرض ہے؟ اس پر حضور ﷺ خاموش رہے۔ اس شخص نے تین بار یہی سوال کیا۔ مگر ہر بار حضور ﷺ نے خاموشی اختیار کیے رکھی۔ پھر کچھ وقفے کے بعد فرمایا:

"ایسے سوالات نہ کیا کرو۔ اگر میں اس وقت "ہاں" کہہ دیتا تو تم پر ہر سال حج کرنا فرض ہو جاتا اور پھر تمہارے

لیے مشقت اور تنگی ہوتی۔“ (صحیح مسلم، رقم: 3257۔ ابو داؤد، رقم: 1721۔ نسائی، رقم: 2617)

لیکن اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ دین کے بارے میں کوئی ضروری سوال نہ کیا جائے، کیونکہ دین کو سمجھنے سمجھانے کے لیے سوال کرنے کی اجازت ہے۔

﴿ وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنۢ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّنۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴾ (109)

یہ عام مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا کہ اکثر اہل کتاب اسی بھاگ دوڑ میں لگے ہوئے ہیں کہ وہ کسی طرح تمہیں اسلام سے ہٹا کر کفر کی طرف لے جائیں۔ آیت میں اگرچہ اہل کتاب کا ذکر ہے، مگر اس سے مراد یہود ہیں، جو مختلف حیلوں بہانوں سے مسلمانوں کو دین سے بدظن کرتے اور اسلام کے خلاف پروپیگنڈا کرتے تھے۔ وہ یہ بات خوب جانتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں، قرآن بھی اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور مسلمانوں کا دین، اسلام بھی سچا دین ہے۔ یہ سب باتیں ان کو اپنی کتابوں کی پیش گوئیوں سے اچھی طرح معلوم ہوگئی تھیں۔ مگر اس کے باوجود ان کو یہ حسد کھائے جا رہا تھا کہ کیوں مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ کے اتنے عظیم انعامات عطا ہو رہے ہیں اور خود وہ کیوں نبوت، اقتدار اور مذہبی امامت و پیشوائی کے منصب سے معزول کر دیے گئے ہیں۔

پھر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ یہود کی غلطیوں اور شرارتوں پر فی الحال عفو و درگزر سے کام لیں، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ ان کے بارے میں کوئی سخت حکم نازل کر دے۔ غور کیا جائے تو یہ عفو و درگزر مسلمانوں کی کمزوری کی علامت نہ تھی، کیونکہ عفو و درگزر وہی کرتا ہے جو طاقت ور ہو۔ اس لیے اس میں ان کی قوتِ ایمانی پائی جاتی ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ کی نصرت و حمایت حاصل ہے۔

آخر میں فرمایا، اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ چاہے کسی نافرمان قوم کو اس کی بداعمالیوں کی سزا دے کر دنیا میں ذلیل و رسوا کر دے اور دوسری طرف چاہے تو ایک عرب جیسی ان پڑھ قوم کو ان کے ایمان کی بدولت دنیا میں امامت و سیادت کے منصب پر فائز کر کے عزت و سرفرازی عطا فرما دے۔

بعد میں جب یہودیوں نے میثاقِ مدینہ کی خلاف ورزی کر کے بدعہدی کی اور وہ مسلمانوں کے دشمن مشرکینِ قریش کے ساتھ مل گئے تو پھر اللہ تعالیٰ کے حکم سے مدینے کے تینوں یہودی قبائل کے خلاف سخت کاروائی کی گئی۔ بنو قینقاع سے جنگ ہوئی۔ بنو قریظہ کے مردوں کو قتل کیا گیا اور بنو نضیر کو خیبر کی طرف جلاوطن کیا گیا۔ اس طرح اللہ سبحانہٗ نے مسلمانوں کو یہود پر غلبہ عطا فرمایا اور یہ حقیقت سب پر ظاہر ہوگئی کہ اللہ واقعی ہر چیز پر قادر ہے۔

﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَآتُوا الزَّكٰوةَ ۚ وَمَا تُقَدِّمُوا لِأَنفُسِكُم مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللّٰهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴾ (110)

ان حالات میں مسلمانوں کو نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کی خاص تاکید فرمائی گئی جو کہ بالترتیب بدنی اور مالی عبادات ہیں۔

دین اسلام میں نماز اور زکوٰۃ کی بڑی اہمیت ہے۔ ایمان لانے کے بعد سب سے زیادہ زور انہی دو پر دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں عام طور پر ان دونوں کا حکم ساتھ ساتھ آیا ہے۔ یہ اسلامی معاشرے کی بنیاد، اس کی پہچان اور پورے دین کے لیے علامت (SYMBOL) بھی ہیں۔ ان کے بغیر اسلامی معاشرے کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ نماز حقوق اللہ کا سب سے بڑا مظہر اور سب سے بڑی عبادت ہے۔ زکوٰۃ سے معاشرے میں خوشحالی آتی ہے۔ ان دونوں سے مسلمانوں میں اجتماعی قوت و شوکت پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کی تربیت اور ان کا تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ کی تائید اور نصرت حاصل ہوتی ہے۔ ان پر عمل کے نتیجے میں وہ دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو سکتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے چھوٹے بڑے تمام اعمال دیکھ رہا ہے اور ان کے مطابق تمہیں جزا و سزا دے گا۔ اس طرح اس میں ترغیب اور ترہیب دونوں کا پہلو بھی نمایاں ہو گیا۔

﴿وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝﴾ (111)

فرمایا گیا کہ ان کی غلط فہمیاں اور جھوٹی آرزوئیں ہیں جن کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔ کسی کے محض یہودی یا عیسائی ہونے سے اسے جنت نہیں ملے گی۔ اس کے لیے سچا ایمان اور عمل صالح ضروری ہے اور وہ ان دونوں سے محروم ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں کہ صرف وہی جنت میں جائیں گے تو اپنے دعوے کے حق میں دلیل پیش کریں۔ بغیر دلیل اور ثبوت کے کوئی دعویٰ کیسے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔

افسوس، یہود و نصاریٰ کی طرح آج مسلمانوں کے مختلف گروہ بھی یہی دعویٰ کرتے ہیں۔ ہر گروہ اپنے آپ کو ہدایت یافتہ اور ناجی (نجات پانے والا) سمجھتا اور دوسروں کو گمراہ اور جہنمی قرار دیتا ہے۔ فیا للعجب!

﴿بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝﴾ (112)

فرمایا، کسی مخصوص مذہبی گروہ میں شامل ہو جانے سے جنت نہیں ملے گی، خواہ وہ کوئی گروہ ہو۔ آخرت کی نجات اور جنت صرف اُن کے لیے ہے جو اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے آگے جھکاتے، ایمان لاتے اور نیک اعمال کرتے ہیں۔ یہی لوگ جنت میں جائیں گے، جہاں ان کو نہ کوئی خوف و خطر ہو گا اور نہ کوئی غم ہو گا۔

﴿وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝﴾ (113)

اب یہود و نصاریٰ کا دعویٰ الگ الگ کر کے بیان کیا گیا ہے کہ یہودی کہتے ہیں، عیسائیوں کا مذہب غلط ہے۔ اسی طرح عیسائی کہتے ہیں، یہودیوں کا مذہب غلط ہے۔ جبکہ دونوں اہل کتاب ہیں۔ دونوں اللہ تعالیٰ کی وہ کتابیں پڑھتے ہیں جو ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ اپنی کتابوں کی تعلیم کے برخلاف اس طرح کی باتیں کرتے ہیں۔

فرمایا، صرف ان دو مذہبی گروہوں کا یہ حال نہیں، یہی دعویٰ عرب کے وہ مشرکین بھی کرتے ہیں، جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وحی کا علم۔ مگر وہ بھی صرف اپنے مذہب بت پرستی ہی کو صحیح سمجھتے ہیں اور دوسروں کے مذہب کو غلط قرار دیتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ کس کا مذہب صحیح ہے اور کس کا غلط، اس کا فیصلہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت میں ہوگا۔

اس میں نبی ﷺ کے لیے تسلی اور اطمینان بھی ہے کہ آپ ﷺ کا کام صرف دعوت و تبلیغ ہے۔ کوئی ایمان لاتا ہے یا نہیں، اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔

افسوس، آج قرآن مجید کی موجودگی میں مسلمانوں کے مختلف مسالک نے بھی الگ الگ فرقوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا کر ''رجسٹر'' کرا لی ہے۔ اب ہر فرقہ دوسرے کو غلط، گمراہ، ضال و مضل اور کافر بھی کہتا ہے اور قرآن بھی پڑھتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان مذہبی اختلافات کا فیصلہ دنیا میں کیسے ہو؟ یہ تو آخرت ہی میں اللہ تعالیٰ فیصلہ کرے گا کہ کون حق پر تھا اور کون باطل پر؟ آج اگر ایک فرقہ ہی سچا ہے تو وہ کیوں سچا ہے، کیا دوسرے سچے نہیں ہو سکتے؟ اگر سب سچے ہیں تو کوئی بھی سچا نہیں، کیونکہ سب ایک دوسرے کو جھٹلا رہے ہیں۔ اگر سب جھوٹے ہیں تو پھر اللہ کا دین کہاں ہے؟ وہ کہیں تو ہونا چاہیے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى
فِيْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ
فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّلَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١١٤﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ
وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿١١٥﴾
وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿١١٦﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا
يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿١١٧﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا يُكَلِّمُنَا
اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ
تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿١١٨﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ
بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا ۙ وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿١١٩﴾
وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ
هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ لَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ
الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّ لَا نَصِيْرٍ ﴿١٢٠﴾ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ وقف منزل
يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓىِٕكَ
هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿١٢١﴾ ع ١٤ ٩ ١٤

"اور اُن سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ کی مسجدوں میں دوسروں کو اللہ کا نام لینے سے روکیں اور خانۂ خدا کو اجاڑنے کی کوشش کریں۔ اُن کا حال تو یہ ہونا چاہیے تھا کہ وہ مسجدوں میں ڈرتے ہوئے داخل ہوتے۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں بڑا عذاب ہے۔ مشرق اور مغرب اللہ کے لیے ہیں۔ تم جس طرف منہ کرو، ادھر اللہ موجود ہے۔ بے شک اللہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔

اہل کتاب کہتے ہیں، اللہ بھی اولاد رکھتا ہے، حالاں کہ وہ اس سے پاک ہے۔ بلکہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے۔ سب اس کے حکم کے تابع ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کو بغیر کسی نمونے کے پیدا کرنے والا ہے۔ وہ جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو بس یہ فرما دیتا ہے کہ "ہو جا" تو وہ ہو جاتا ہے۔

جو لوگ علم نہیں رکھتے، وہ کہتے ہیں: "اللہ ہم سے کیوں کلام نہیں کرتا، یا ہمارے پاس اس کی کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟" یہی بات وہ لوگ بھی کہتے تھے جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ ان سب کے دل ایک جیسے ہیں۔ البتہ جو لوگ یقین کرنے والے ہیں، ان کے لیے ہم نے بہت سی نشانیاں واضح کر دی ہیں۔ (اے نبی ﷺ) ہم نے

آپ ﷺ کو خوشخبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ جہاں تک دوزخیوں کا معاملہ ہے، آپ ﷺ ان کے بارے میں جوابدہ نہیں ہیں۔

یہودی اور عیسائی تو اس وقت تک تم سے راضی نہ ہوں گے، جب تک تم ان کا مذہب اختیار نہ کرلو۔ (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ (ان سے) کہیں: اللہ کی ہدایت ہی سچی ہدایت ہے۔ لیکن اگر تم اللہ کی طرف سے صحیح علم آجانے کے بعد بھی ان کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے، تو اللہ کے مقابلے میں تمہارا نہ کوئی حمایتی ہوگا اور نہ کوئی مددگار۔

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی، وہ اسے پڑھتے ہیں، جیسا کہ پڑھنے کا حق ہے، ایسے لوگ ہی اس پر ایمان رکھتے ہیں، مگر جو انکار کرتے ہیں، وہ گھاٹے میں رہیں گے۔" (114-121)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

مَسٰجِدَ اللّٰہِ:...... اس سے اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے بنائی گئی عبادت گاہیں اور معابد مراد ہیں۔

قٰنِتُوْنَ:...... یہ قَانِتٌ کی جمع ہے، جس کے معنی اطاعت گزار اور فرماں بردار کے ہیں۔

وَلَدًا:...... اس سے اولاد مراد ہے۔ یہ لفظ واحد، جمع، مذکر اور مونث بھی استعمال ہوتا ہے۔

بَدِیْعُ:...... یہ بَدُعَ (ک) سے فَعِیْلٌ کے وزن پر صفت مشبہ ہے اور مُبْدِعٌ (اِبْدَاعٌ سے اسم فاعل) کے معنوں میں ہے کہ وہ ذات جو ایسی چیز کو عدم سے وجود میں لاتی ہے، جس کی پہلے سے کوئی نظیر یا مثال موجود نہ ہو۔ یاد رہے کہ اَلْبَدِیْعُ اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔

اَلَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ:...... (جو لوگ علم نہیں رکھتے) اس کی وضاحت آیت 113 میں گزر چکی ہے۔

﴿ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰہِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَ سَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓىِٕكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآىِٕفِیْنَ ؕ۬ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّ لَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ۝ ﴾ (114)

فرمایا، ایسے لوگوں سے بڑھ کر اور کون ظالم ہوسکتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی عبادت گاہوں اور معبدوں سے دوسروں کو ذکر وعبادت سے روکیں اور ان کو ویران کرنے اور تباہ و برباد کرنے کے درپے ہوں۔

یہ اشارہ ان تینوں مذہبی گروہوں...... یہود، نصاریٰ اور مشرکین کی مذہبی تاریخ کی طرف ہے، جن کا ذکر پچھلی آیت 113 میں آچکا ہے۔

یہود ونصاریٰ کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کی عبادت گاہوں پر حملے کر کے ان کو ویران کرتے اور ڈھاتے رہے ہیں۔ بیت المقدس اور ہیکل سلیمانی کئی بار عیسائی بادشاہوں کے ہاتھوں تباہ ہوتے رہے۔

یمن کا عیسائی حکمران ابرہہ بھی خانہ کعبہ کو ڈھانے کے لیے ایک بہت بڑا لشکر، جس میں ہاتھی بھی شامل تھے، لے کر حملہ آور ہوا تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت سے اپنے گھر کی حفاظت فرمائی تھی، اور پرندوں کے ذریعے اس لشکر کو تباہ کر دیا تھا۔

مشرکین قریش بھی مسلمانوں کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھنے سے روکتے تھے۔ انہوں نے نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو عمرہ کرنے سے بھی روکا تھا۔ (الفتح 25:48)

یہ خدا کے ماننے والے مذہبی گروہوں کا حال رہا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت گاہوں اور معبدوں میں لوگوں کو اس کی عبادت کرنے سے روکتے تھے اور ان کو ویران کرنے اور برباد کرنے سے باز نہیں آتے تھے۔ اس کے باوجود ان کا دعویٰ یہی تھا کہ صرف وہی صحیح دین پر ہیں اور جنت انہی کے لیے مخصوص ہے۔

فرمایا، بھلا اس سے بڑا ظلم اور گناہ کس کا ہوسکتا ہے، جو خدا کے نام لیوا ہوں، مگر خدا کی عبادت گاہوں کو تاخت و تاراج کرتے ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جنگ کی حالت میں بھی دوسرے مذاہب کی عبادت گاہوں کو گرانے کی اجازت نہیں دی۔

اس آیت میں آج مسلمانوں کے لیے بھی عبرت ہے جو دوسرے مسلکوں کے لوگوں کو اپنی مساجد میں نماز پڑھنے سے روکتے ہیں۔ کبھی دنگا فساد کرتے ہوئے ایک دوسرے کی مسجدوں پر قابض ہوتے اور ان کی حرمت پامال کرتے ہیں۔

فرمایا، اللہ سبحانہٗ کی عبادت گاہوں سے دوسروں کو روکنے والوں کے لیے ضروری تو یہ تھا کہ وہ عاجزی اور انکساری کے ساتھ اللہ کے گھروں میں داخل ہوتے، دوسروں کو ڈرانے دھمکانے کی بجائے خود اللہ تعالیٰ سے ڈرتے۔ یا جب کبھی اہل حق کا وہاں پر غلبہ ہوتا تو ایسے لوگوں کو وہاں داخل ہونے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہاں جاتے ہوئے ان پر اہل حق کا خوف طاری ہوتا۔ ایسے ظالموں کو اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی ذلت و رسوائی سے دوچار کرے گا اور آخرت میں دوزخ کا بڑا عذاب دے گا۔

یاد رہے کہ وہ مشرکین قریش، جنہوں نے حضور ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کو عمرہ کرنے سے روکا تھا، فتح مکہ کے موقع پر ذلت و رسوائی میں مبتلا تھے۔

﴿وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾

(115)

یہود و نصاریٰ دونوں کا ایک ہی قبلہ تھا اور وہ بیت المقدس تھا۔ اس کے ایک حصے کی سمت عیسائی اور دوسرے حصے کے قبلے کی سمت یہودی رُخ کر کے عبادت کیا کرتے تھے۔ مگر دونوں ایک دوسرے کے قبلے کو غلط ٹھہراتے اور آپس میں جھگڑتے تھے۔ فرمایا، یہ جھگڑا فضول ہے۔ مشرق و مغرب یا شمال و جنوب سب اللہ کے ہیں۔ تم جس طرف رخ کرو، ہر طرف اللہ موجود ہے۔ اصل چیز کسی قبلے کا رخ نہیں ہے، بلکہ وہ عبادت ہے جو پورے اخلاص اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی

کے لیے کی جاتی ہے۔ اللہ کسی عبادت گاہ کی چار دیواری میں محدود نہیں بلکہ وہ بڑی وسعت والا ہے، اس کے احاطۂ قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

یہ آیت تحویل قبلہ سے پہلے مدینے میں نازل ہوئی تھی، جب یہود و نصاریٰ اور مسلمانوں کا قبلہ بیت المقدس تھا۔

مزید وضاحت ان شاء اللہ تحویل قبلہ والی آیات (البقرہ 150,149:2) میں آئے گی۔

﴿وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝﴾ (116)

یہ قرآن اور عربی زبان کا ایک اسلوب ہے، جس میں فعل ماضی کبھی زمانہ ماضی کے لیے نہیں آتا، بلکہ محض فعلیت (DOING) کے اظہار کے لیے آتا ہے۔ ایسی صورت میں زمانہ (TENSE) مراد نہیں ہوتا، بلکہ صرف فعل مراد ہوتا ہے۔ ﴿وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا﴾ کے قَالُوْا میں یہی اسلوب ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ ''اور ان کا کہنا ہے کہ اللہ بھی اولاد رکھتا ہے۔''

اس میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کے علاوہ عیسائیوں اور مشرکین عرب کو بھی شامل کر کے فرمایا ہے کہ وہ سب کہتے ہیں کہ اللہ کی بھی اولاد ہے۔

معلوم ہے کہ یہود حضرت عزیر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا بیٹا قرار دیتے تھے اور عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہا

﴿وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ عُزَيْرُ ِۨ ابْنُ اللّٰهِ وَ قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ﴾ (التوبۃ 30:0)

''یہودی کہتے ہیں عزیر علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے اور عیسائی کہتے ہیں مسیح علیہ السلام اللہ کا بیٹا ہے۔''

اور عرب مشرکین نے فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں بنا رکھا تھا جیسا کہ سورۂ النحل میں ہے:

﴿وَ يَجْعَلُوْنَ لِلّٰهِ الْبَنٰتِ سُبْحٰنَهٗ ۙ وَ لَهُمْ مَّا يَشْتَهُوْنَ﴾ (النحل 57:16)

''اور وہ (مشرکین) فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں حالاں کہ وہ اس سے پاک ہے۔ مگر خود اپنے لیے بیٹے پسند کرتے ہیں۔''

فرمایا، اللہ تعالیٰ اس سے پاک اور بے نیاز ہے کہ اس کی کوئی اولاد ہو۔ وہ سب کا خالق ہے اور کسی مخلوق کی طرح اولاد کا محتاج نہیں ہے۔ وہ ساری کائنات کا مالک ہے۔ عزیر علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور تمام ملائکہ، بلکہ ہر چیز اس کے حکم اور قانون کی پابند اور تابع فرمان ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی اولاد اپنے والدین کے مرتبے تک پہنچ جائے، مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی مخلوق، خواہ وہ کتنا ہی درجہ اور مرتبہ رکھتی ہو، کبھی خالق کے درجے اور مرتبے تک پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے سب عاجز بندوں اور غلاموں کی طرح ہیں۔ سورۂ مریم میں ہے:

﴿اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝﴾ (مریم 93:19)

''آسمانوں اور زمین میں کوئی ایسا نہیں جو خدائے رحمان کے آگے غلام بن کر کھڑا نہ ہو۔''

﴿بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ‌ؕ وَ اِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۝۱۱۷﴾ (117)

اس آیت میں بھی پچھلی آیت کے مضمون کو واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ وہ ہے جو آسمانوں اور زمین کو عدم سے وجود میں لایا ہے اور جس کی کوئی نظیر اور مثال پہلے سے موجود نہ تھی۔ اس لیے کوئی مخلوق اتنے بڑے خالق کی ہم جنس کیسے ہو سکتی ہے کہ ان میں باپ بیٹے کا رشتہ قائم ہو۔ اس کی قدرتِ کاملہ کا حال تو یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو پیدا کرنا چاہتا ہے، یا کوئی بھی کام کرنا چاہتا ہے تو بس اتنا کہہ دیتا ہے کہ ''ہو جا'' اور ''وہ'' ہو جاتا ہے۔'' گویا اس کے ارادے کے معاً بعد وہ مطلوبہ کام ہو جاتا ہے۔

یہ کُنۡ فَیَکُوۡنُ ''ہو جا، تو وہ ہو جاتا ہے۔'' ایک خدائی راز ہے۔ اس کی حقیقت اور کُنہ ہم نہیں جانتے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں سمجھانے کے لیے یہ تعبیر اور انداز اختیار فرمایا ہے۔

﴿وَ قَالَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ لَوۡ لَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوۡ تَاۡتِيۡنَاۤ اٰيَةٌ‌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِهِمۡ مِّثۡلَ قَوۡلِهِمۡ‌ؕ تَشَابَهَتۡ قُلُوۡبُهُمۡ‌ؕ قَدۡ بَيَّنَّا الۡاٰيٰتِ لِقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ۝۱۱۸﴾ (118)

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ کی توحید کا ذکر تھا اور شرک کی تردید تھی۔ اب یہ تین آیتیں (120,119,118) نبی ﷺ کی نبوت و رسالت کے حوالے سے ہیں اور ان لوگوں کے بارے میں ہیں جو آپ ﷺ کو نبی نہیں مانتے تھے۔

فرمایا، عرب کے مشرکین، جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ وحی کا علم رکھتے ہیں، یہ کہتے ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ ہم سے ہم کلام ہو کر کیوں نہیں بتا دیتا کہ میں نے حضرت محمد ﷺ کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ لہٰذا ان کو نبی مان لیا جائے۔ یا ہمارے پاس کوئی ایسی نشانی یا معجزہ آ جاتا کہ حضور ﷺ واقعی اللہ تعالیٰ کے نبی ہیں۔ ہم اپنے جیسے ایک انسان کے بارے میں یہ کیسے مان لیں کہ اسے اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر بھیجا ہے۔ اسے ہم پر کوئی فضیلت بھی حاصل نہیں۔ نہ وہ کوئی بڑا دولت مند ہے اور نہ مکے کا کوئی سردار ہے، آخر ہم کیسے اعتبار کر لیں کہ وہ اللہ کا رسول ہے؟

قرآن نے اُن کے بعض مطالبات کا یوں ذکر کیا ہے:

﴿وَ قَالُوۡا لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفۡجُرَ لَنَا مِنَ الۡاَرۡضِ يَنۡۢبُوۡعًا۝ اَوۡ تَكُوۡنَ لَكَ جَنَّةٌ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّعِنَبٍ فَتُفَجِّرَ الۡاَنۡهٰرَ خِلٰلَهَا تَفۡجِيۡرًا۝ اَوۡ تُسۡقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمۡتَ عَلَيۡنَا كِسَفًا اَوۡ تَاۡتِىَ بِاللّٰهِ وَ الۡمَلٰٓـئِكَةِ قَبِيۡلًا۝ اَوۡ يَكُوۡنَ لَكَ بَيۡتٌ مِّنۡ زُخۡرُفٍ اَوۡ تَرۡقٰى فِى السَّمَآءِ وَلَنۡ نُّؤۡمِنَ لِرُقِيِّكَ حَتّٰى تُنَزِّلَ عَلَيۡنَا كِتٰبًا نَّقۡرَؤُهٗ‌ ؕ قُلۡ سُبۡحَانَ رَبِّىۡ هَلۡ كُنۡتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوۡلًا۝﴾ (بنی اسرائیل 17:90تا93)

''اور انہوں (مشرکین) نے کہا: ہم اس وقت تک تمہاری بات کا یقین نہیں کریں گے، جب تک کہ تم ہمارے لیے زمین سے چشمہ جاری نہ کر دو۔ یا تمہاری پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایسا باغ پیدا ہو، جس میں تم نہریں جاری کر کے دکھا دو۔ یا تم اپنے دعوے کے مطابق آسمان ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہم پر گرا دو۔ یا

اللہ اور فرشتوں کو لا کر ہمارے سامنے کھڑا کر دو۔ یا تمہارے لیے سونے کا گھر بن جائے۔ یا تم آسمان پر چڑھ دکھاؤ۔ اور ہم تمہارے چڑھنے کو بھی نہیں مانیں گے، جب تک تم وہاں سے کوئی لکھی ہوئی کتاب ہم پر نہ اُتار دو، جسے ہم پڑھ کر دیکھیں۔'' آپ کہہ دیجیے: میں صرف ایک بشر ہوں اور اللہ کا رسول ہوں۔''

اور کبھی یہ کہتے ہیں:

﴿لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ﴾ (الفرقان 21:25)

''ہمارے پاس فرشتے کیوں نہیں آتے، یا ہمارا رب سامنے کیوں نہیں آتا جسے ہم دیکھ سکیں۔''

اس طرح حضور ﷺ کی نبوت کے انکار کے لیے مشرکین غرور وتکبر کے ساتھ کئی اور بھی عذر بہانے اور مطالبات پیش کرتے، جن کا ذکر قرآن مجید نے کئی مقامات پر کیا ہے۔

لیکن اگر وہ غور کرتے تو صرف قرآن بھی ان کے لے کافی معجزہ تھا۔ فرمایا، حق کو نہ ماننے اور ایمان نہ لانے کے لیے یہ عذر بہانے نئے نہیں ہیں۔ ان سے پہلے بھی بعض لوگ اپنے نبیوں کے بارے میں اسی طرح کے الٹے سیدھے سوالات اور مطالبات کرتے رہے ہیں۔ ان سب کی ذہنیت ایک جیسی ہے۔ ان سب کے ہاں ہٹ دھرمی، گمراہی، غرور و تکبر اور دین دشمنی مشترکہ (COMMON) ہے، اس لیے ان کی زبانوں پر ایک ہی جیسی فضولیات ہوتی ہیں۔

قرآن نے ان کے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ:

﴿اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ۝﴾ (الذاریات 53:51)

''کیا یہ ایک دوسرے کو اس کی وصیت کرتے چلے آئے ہیں؟ بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔''

آخر میں فرمایا، ہم نے ان لوگوں کے لیے جو یقین کرنا چاہیں، ایسی کھلی نشانیاں اور روشن دلیلیں مہیا کر دی ہیں، جن سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت محمد ﷺ واقعی اللہ تعالیٰ کے سچے نبی اور رسول ہیں۔

﴿اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّ لَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ۝﴾ (119)

اب اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا کہ مشرکین مانیں یا نہ مانیں، مگر حقیقت یہی ہے کہ ہم نے آپ ﷺ کو ایسا رسول بنا کر بھیجا ہے، جو ایمان لانے والوں کو جنت کی خوش خبری دیتا اور جھٹلانے والوں کو دوزخ کی آگ کے عذاب سے ڈراتا ہے۔ آپ ﷺ کی ذمہ داری صرف دعوت وتبلیغ کی ہے، ان لوگوں کے فضول سوالوں اور معجزوں کی فرمائشیں پوری کرنا، آپ ﷺ کے ذمے نہیں ہے۔ ہم نے آپ ﷺ کی نبوت پر یقین لانے والوں کے لیے بہت سی نشانیاں واضح کر دی ہیں اور نہ ماننے والے دوزخیوں کے بارے میں آپ ﷺ جواب دہ نہیں ہیں کہ وہ دوزخ میں کیوں جانے والے ہیں۔

﴿وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ لَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ

وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ (120)

اس سے پہلے ان مشرکین کا ذکر تھا جو حضور ﷺ کی نبوت سے انکاری تھے اور آپ ﷺ کو تنگ اور زچ کرنے کے لیے اُلٹے سیدھے سوالات اور مطالبات کرتے تھے۔

اب نبی ﷺ کو خطاب کر کے یہودی و نصاریٰ کے بارے میں آپ کو بتایا گیا کہ یہ لوگ آپ ﷺ سے کبھی راضی نہ ہوں گے، جب تک آپ ﷺ (خدانخواستہ) ان کا مذہب اختیار کر کے یہودی یا عیسائی نہ ہو جائیں۔ کیونکہ یہ لوگ محض اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں اور اپنے سوا کسی کو ہدایت پر نہیں سمجھتے۔ اس لیے جب آپ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے وحی کا علم عطا فرمایا ہے تو آپ ﷺ کا کام صرف وحی کی پیروی ہے، ان لوگوں کی خواہشون کی پیروی نہیں ہے۔ آپ ﷺ ان کو صاف صاف بتا دیں کہ اصل ہدایت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئی ہو اور وہ میرے پاس آ چکی۔ لہٰذا میں وحی کی ہدایت چھوڑ کر تمہاری خواہشوں کی گمراہی کے پیچھے نہیں چل سکتا۔ اگر خدانخواستہ میں بھی تمہاری ضلالت کو اختیار کر لوں تو مجھے بھی اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی حامی و ناصر نہیں ملے گا۔

یہ خطاب بظاہر نبی ﷺ سے ہے، مگر اصل میں وہ سب لوگ مخاطب ہیں، جو اللہ تعالیٰ کی وحی و ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش کی پیروی کرتے ہیں۔

یہ بھی قرآن مجید کی صداقت اور اس کے معجزہ ہونے کا ایک ثبوت ہے کہ آج بھی یہود و نصاریٰ کی قومیں مسلمانوں سے دوستی کرنے کے دعوے کے باوجود ان سے راضی نہیں ہوتیں بلکہ نت نئے مطالبے کرتے اور "DO MORE" کی فرمائشیں کرتے رہتے ہیں۔

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ﴾ (121)

اس آیت میں پہلے اُن اہل کتاب یہود کا ذکر ہے، جو اپنی کتاب توریت کو پڑھتے اور اس کے پڑھنے کا حق ادا کرتے تھے۔ گویا اسے غور سے پڑھتے، اس پر یقین رکھتے اور اس کے مطابق عمل کرتے تھے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ جب ان کے پاس قرآن اور نبی ﷺ کی دعوت پہنچے گی تو یہ لوگ ایمان لے آئیں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں، جو خواہش پرست نہیں ہیں، بلکہ حق پرست ہیں، جیسے عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ اور کعب الاحبار رضی اللہ عنہ وغیرہ، جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ مگر جو لوگ وحی کی ہدایت آ جانے کے بعد بھی جان بوجھ کر اس کا انکار کریں گے، تو وہ دنیا اور آخرت کی سعادتوں اور کامیابیوں سے محروم رہیں گے اور قیامت کے دن اللہ کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید کی تلاوت کا حق اس وقت تک ادا نہیں ہو سکتا جب تک اس کی آیات پر غور و تدبر نہ کیا جائے اور اس کے مطابق عمل نہ کیا جائے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا﴾ (محمد 24:47)

''کیا یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے، یا ان کے دلوں پر تالے لگے ہوئے ہیں؟''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (ص 38:29)

''یہ (قرآن) بابرکت کتاب ہے جو ہم نے آپ ﷺ کی طرف نازل کی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور عقل والے نصیحت حاصل کریں۔''

آج مسلمانوں کا قرآن مجید سے تعلق بھی محض تلاوت اور حفظ تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ اسے سمجھ کر پڑھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا مفقود ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں وہ زوال کا شکار ہو چکے ہیں۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا
عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ
بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۭ قَالَ
لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ
وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ
طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ
رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ
بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ
وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا
تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ
مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ

التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ
اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۲۹﴾ ع ۱۵ ۸ ۱۵

''اے بنی اسرائیل! میری نعمتیں یاد کرو، جو میں نے تمہیں عطا کیں۔ خاص طور پر جو میں نے تمہیں دنیا والوں پر فضیلت دی تھی۔ اُس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، نہ کسی سے معاوضہ لے کر چھوڑا جائے گا، نہ کوئی سفارش چلے گی اور نہ کہیں سے کوئی مدد مل سکے گی۔

یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا تو انہوں نے ان پر عمل کر دکھایا۔ اللہ نے فرمایا: ''میں تم کو سب لوگوں کو پیشوا بناؤں گا۔'' ابراہیم نے عرض کیا: ''کیا میری اولاد کو بھی؟'' ارشاد ہوا: ''میرا یہ وعدہ ان کے بارے میں نہیں جو ظالم ہوں گے۔'' ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کا مرکز اور امن کا مقام قرار دیا، اور حکم دیا کہ مقام ابراہیم کو بھی نماز پڑھنے کی جگہ بنا لو۔ ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام دونوں کو تاکید کی کہ وہ میرے گھر کو پاک صاف رکھیں، طواف کرنے والوں کے لیے، اعتکاف کرنے والوں کے لیے، رکوع کرنے والوں کے لیے اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔

اور ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی: ''اے میرے رب! اس جگہ کو امن کا شہر بنا دے! یہاں کے رہنے والوں میں سے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھیں، انہیں پھلوں کی روزی عطا فرما۔'' اللہ نے فرمایا: اگر کوئی کافر بھی یہاں رہے گا تو میں اسے بھی دنیا میں کچھ مدت کے لیے فائدہ اٹھانے دوں گا۔ پھر اسے بے بس کر کے دوزخ کی آگ کا عذاب دوں گا، جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔

اور یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام بیت اللہ کی دیواریں بنا رہے تھے اور کہتے تھے: ''اے ہمارے رب! ہماری اس خدمت کو قبول فرما بے شک تو ہی سننے والا جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! ہمیں اپنا سچا فرماں بردار بنا لے، ہماری نسل میں سے ایک فرماں بردار امت پیدا فرما، ہمیں عبادت کے طریقے بتا اور ہمیں معاف فرما، بے شک تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اے ہمارے رب! اس امت میں ایسا رسول بھیجنا، جو لوگوں کو تیری آیتیں سنائے، انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک کرے۔ بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔''(122-129)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اِبْتَلٰی:...... (ب ل و) یہ اِبْتِلاءٌ باب افتعال سے ہے، جس کے معنی ہیں: کسی شخص کو مشکل کام میں ڈال کر اس کی آزمائش کرنا، جانچنا اور امتحان لینا۔

کَلِمٰتٍ:...... یہ کلمہ کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ احکام ہیں جن کے کرنے کا حکم اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو دیا

تھا۔ یہ احکام چونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام کے ذریعے دیے تھے اس لیے ان کو کلمات کہا گیا ہے۔ جیسے عیسیٰ علیہ السلام کو کَلِمَۃُ اللّٰہِ (اللہ کا کلمہ) اس لیے کہا گیا (آل عمران 3:45،46،47) کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کلام کُنْ (ہو جا) سے پیدا ہوئے تھے۔

اَتَمَّهُنَّ: ...... یہ اِتْمَامٌ باب افعال سے ہے جس کے معنی ''پورا کرنے'' کے ہیں۔

اس جگہ سے مراد یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے ان احکام پر پورا عمل کر کے دکھا دیا، جن میں ان کی آزمائش کی گئی تھی اور تمام آزمائشوں اور امتحانوں میں پورے اترے اور کامیاب ہوئے۔ جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

﴿وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى﴾ (النجم 53:27)

''اور ابراہیم علیہ السلام جس نے اپنا کام پورا کر دیا۔''

اِمَامًا: ...... عربی زبان میں اس کے کئی معنی آتے ہیں۔ اس جگہ اس کے معنی ہیں: ''مثالی مذہبی رہنما یا پیشوا۔''

اَلْبَيْتَ: ...... اس سے بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ مراد ہے۔

مَثَابَةً: ...... یہ اصل میں مَثْوَبَةٌ تھا۔ اس کا مادہ (ROOT) ہے (ث و ب)۔ اس کے اصل معنی رجوع کرنے یا لوٹنے کی جگہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مرجع ایسا مرکز اور جو عبادت کے لیے لوگوں کے جمع ہونے کی جگہ ہو۔

اَمْنًا: ...... اس سے مراد مَاْمَنٌ یعنی امن کی جگہ ہے۔

مُصَلًّى: ...... نماز کی جگہ کو کہتے ہیں۔

اَلرُّكَّعِ: ...... یہ رَاكِعٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: رکوع کرنے والے۔

اَلسُّجُوْدِ: ...... یہ سَاجِدٌ کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں: سجدہ کرنے والے۔

ان دونوں کو بغیر واوٴ عاطفہ کے لانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اصل میں ایک ہی عبادت ہے اور وہ نماز ہے، جس میں رکوع بھی ہوتا ہے اور سجدہ بھی۔ اس طرح ان دونوں سے مراد ہے، نماز پڑھنے والے۔

مَقَامِ اِبْرٰهٖمَ: ...... اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ تعمیر کیا تھا اور جو آج کعبے کے دروازے کے سامنے ایک مضبوط اور خوبصورت جنگلے میں محفوظ ہے۔

اَلثَّمَرٰتِ: ...... یہ ثَمَرَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہر طرح کے کھانے کی چیزیں ہیں جو زمین سے اگتی ہیں۔ اس میں ہر قسم کے پھل، سبزیاں اور اناج شامل ہیں۔

اَضْطَرُّهٗ: ...... اس کا مادہ (ROOT) ض ر ر اور مصدر اِضْطِرَارٌ ہے جس کے معنی اِكْرَاهٌ یعنی ''مجبور کرنے'' کے ہیں۔

اَلْقَوَاعِدَ: ...... یہ ''اَلْقَاعِدَةُ'' کی جمع ہے، جس کے معنی کسی عمارت کی بنیاد کے ہیں۔

مَنَاسِكَنَا: ...... نسک کے اصل معنی دھونے اور پاک کرنے کے ہیں۔ اس سے مراد گناہوں سے پاک ہونا اور اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا ہوتا ہے۔ مَنَاسِكُ جمع ہے مَنْسَكٌ کی، جس کے معنی قربانی کے ہیں۔ نُسُكٌ یا مَنْسَكٌ سے چونکہ گناہ دُھلتے ہیں، بندہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے اور اسے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے، اس لیے یہ قربانی کو کہتے

ہیں جو قُربان کے معنی میں ہوتی ہے، کہ اس سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل ہوتا ہے۔

لیکن لفظ 'مناسک' کا زیادہ تر استعمال حج کی عبادت اور اس کے تمام افعال و اعمال کے لیے ہوتا ہے، جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ (البقرہ 200:2)

''پھر جب حج کے اعمال پورے کرلو، تو اللہ کو یاد کرو، جس طرح پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ اللہ کو یاد کرو۔''

اَلْكِتٰبَ:...... اس جگہ اس سے مراد قرآن مجید ہے۔ قانون مراد نہیں ہے۔

اَلْحِكْمَةَ:...... اس کے اصل معنی دانائی اور بصیرت کے ہیں۔ لیکن اس سے مراد دینی احکام کے اسرار و رموز اور شریعت کے مقاصد ہوتے ہیں۔

امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک اس جگہ الحکمۃ سے مراد حدیث و سنت ہے۔ بعض علماء اس سے ایسی بات مراد لیتے ہیں جو انسان کو نیکی کی طرف لے جاتی، یا اسے برائی سے روکتی ہے۔

يُزَكِّيْهِمْ:...... (ز ک و) یہ تزکیہ باب تفعیل سے ہے۔ اس کے اصل معنی نشوونما دینے، بڑھانے یا پاک کرنے کے ہیں۔ عام طور پر جسمانی اور مادی پاکیزگی کو طہارت کہتے ہیں اور باطنی اور روحانی پاکیزگی کو تزکیہ یا تزکیۂ نفس کہتے ہیں، جس میں شرک سمیت ہر قسم کے گناہوں کی آلودگی سے پاک کرنا مراد ہوتا ہے۔

﴿يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ اَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾﴾ (123,122)

ان دونوں آیتوں کی تفسیر، ان سے ملتے جلتے مضمون والی آیات 48,47 کے تحت گزر چکی ہے۔ وہاں دیکھ لی جائے۔

﴿وَ اِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾﴾ (124)

اس قصے کو بیان کرنے میں حکمت یہ ہے کہ اہل کتاب کے دونوں گروہوں ...... یہود اور نصاریٰ کو اس پر بڑا ناز اور غرور تھا کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔ نبوت و رسالت صرف بنی اسرائیل کا موروثی حق ہے۔ ان کے باہر کسی اور قوم میں کوئی نبی نہیں آسکتا۔ ان میں سے ہر ایک کا یہ دعویٰ تھا کہ صرف اسی کا مذہب صحیح ہے۔ اس کے پاس جو ہدایت ہے وہی صحیح ہدایت ہے۔ اس لیے آخرت میں نجات بھی صرف وہی پائے گا۔

ان دونوں گروہوں کے دعوؤں کا غیر معقول پہلو تو بالکل واضح ہے کہ جب دونوں کا دعویٰ ایک ہے اور دونوں ہی ابراہیمی دین پر ہیں، تو پھر ان میں اختلاف کیوں ہے۔ پھر دونوں کا مذہب الگ الگ کیوں ہو گیا ہے۔ پھر دونوں ایک

دوسرے کو گمراہ، ہدایت سے عاری اور نجات سے محروم کیوں سمجھتے ہیں۔

اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے قصے کا وہ حصہ بیان فرمایا ہے، جس میں نہ صرف اہل کتاب کے دونوں گروہوں ...... یہود اور نصاریٰ کے مذکورہ بالا غلط دعوؤں کی تردید ہو جاتی ہے، بلکہ اس میں حضرت محمد ﷺ کی دعوت اور نبوت کی پوری تائید موجود ہے۔ ان دونوں گروہوں سے کہہ دیا گیا ہے کہ تم اپنے سارے جھوٹے دعوے چھوڑ دو۔ تم دونوں اصلی ابراہیمی دین سے ہٹ چکے ہو۔ اصل دینِ ابراہیمی کے پیروکار اب نبی ﷺ اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والے لوگ ہیں۔ تم اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ پر اور آخری کتابِ الٰہی قرآن پر ایمان لاؤ۔ تمہارے لیے ہدایت اور نجات کی اب صرف یہی ایک راہ ہے، اسے اختیار کرو ورنہ کافر ہو جاؤ گے اور آخرت میں دوزخ کا ایندھن بنو گے۔

فرمایا، ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ یاد کرو، جب ان کو اللہ سبحانہٗ نے بعض آزمائشوں اور امتحانوں میں ڈالا تو وہ ان میں پورے اترے اور کامیاب ٹھہرے۔ ان کو شرک کے خلاف آواز اٹھانے پر اپنے وطن سے ہجرت کرنی پڑی۔ توحید کا کلمہ بلند کرنے پر ان کو نمرود بادشاہ نے آگ کے الاؤ میں ڈالا تو وہ اس میں بے دھڑک کُود گئے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم پر اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے بیٹے اسماعیل کو مکے کی بے آب و گیاہ وادی کی ویران جگہ پر اکیلا چھوڑ آئے۔ جب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو میری راہ میں قربان کر دو تو وہ اسے بھی ذبح کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔

ان کڑے امتحانوں اور زُہرہ گداز آزمائشوں میں کامیاب اور سرخرو ہونے کی بدولت اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو لوگوں کے لیے امام بنایا اور دنیا کی امامت و پیشوائیت کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔

یاد رہے! انسان پر آزمائشیں اور مصیبتیں دو اسباب سے آتی ہیں۔ ایک اس کے گناہوں کے باعث سزا کے طور پر، دوسرے اس کے درجات و مراتب کو بلند کرنے کے لیے۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کے نبی تھے اور اس لحاظ سے معصوم عن الخطا تھے، لہٰذا ان پر جو آزمائشیں اور مشکلات آئیں، وہ ان کے درجات و مراتب بلند کرنے کے لیے آئیں۔

جب ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی امامت و پیشوائی کا منصب عطا فرمایا، تو قدرتی طور پر ان کے دل میں اپنی اولاد کے لیے بھی اس منصب کی طلب پیدا ہوئی اور انہوں نے عرض کیا کہ کیا ان کی اولاد بھی اس منصب پر فائز ہو گی۔ فرمایا: تمہاری اولاد میں یہ منصب صرف ان کو حاصل ہو گا جو اس کے اہل اور مستحق ہوں گے۔ جو تیرے دین کے سچے پیروکار اور ملتِ ابراہیمی کے پابند ہوں گے۔ مگر جو ظالم، مشرک اور کافر ہوں گے، ان کو یہ منصب حاصل نہ ہو گا۔

یہ منصب بعد میں آپ کے بیٹوں، اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام کو حاصل ہوا۔ پھر بنو اسحاق اور بنی اسرائیل میں طویل عرصے تک قائم رہا۔ پھر جب وہ اس کے اہل نہ رہے تو اللہ تعالیٰ نے امامت و پیشوائی کا یہ منصب بنو اسماعیل میں سے حضرت محمد ﷺ اور آپ ﷺ کی امت مسلمہ کو عطا کر دیا جو اس امت میں قیامت تک موجود رہے گا۔

﴿ وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَ الْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ ﴾ (125)

اب مشرکینِ قریش کو، جو اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام کی نسل اور ملتِ ابراہیمی کا پیروکار سمجھتے تھے، خانہ کعبہ کی تاریخ اور اس کی تعمیر کا اصل مقصد بتایا جا رہا ہے کہ یاد کرو جب ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے عبادت کا مرکز و مرجع بنایا اور اسے دارالامن قرار دیا۔ مقامِ ابراہیم کے پاس بھی نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام دونوں کو اس عہد اور حکم کا پابند کیا کہ وہ ہمارے گھر خانہ کعبہ کو بتوں سمیت ہر قسم کی نجاست اور گندگی سے پاک صاف رکھیں، اُن لوگوں کی خاطر جو اس کا طواف کریں، وہاں اعتکاف کریں اور رکوع و سجود والی نمازیں پڑھیں۔

اس میں طواف کا ذکر سب سے پہلے کیا گیا، کیونکہ اس کی خاص اہمیت ہے۔ طواف بھی، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے، ایک قسم کی نماز ہی ہے، مگر اس میں مناسب بات چیت کرنے کی اجازت ہے۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلطَّوَافُ حَوْلَ الْبَيْتِ مِثْلُ الصَّلٰوةِ اِلَّا اَنَّكُمْ تَتَكَلَّمُوْنَ فِيْهِ، فَمَنْ تَكَلَّمَ فِيْهِ فَلَا يَتَكَلَّمُ اِلَّا بِخَيْرٍ .)) (ترمذی، رقم: 960۔ نسائی، رقم: 2922)

"بیت اللہ کا طواف بھی نماز جیسی چیز ہے۔ البتہ اس میں تم بات چیت کر لیتے ہو۔ پھر اس دوران جو شخص کوئی بات کرے تو اُسے چاہیے کہ مناسب اور بھلی بات کہے۔"

یہ طواف صرف خانہ کعبہ ہی کا ہوسکتا ہے۔ اور یہ عبادت دنیا میں اور کہیں نہیں ہوسکتی، اس لیے اسے مقدم کر کے بیان فرمایا گیا۔

﴿ وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ (126)

اب اس آیت میں وہ واقعہ یاد دلایا جا رہا ہے، جب ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ تعمیر کرنے کے بعد یہ دعا مانگی تھی کہ: "اے میرے رب! اس سرزمین کو امن کا گہوارہ بنا دے۔ اس میں رہنے والے اہل ایمان کو پھلوں، سبزیوں اور اناج کا رزق عطا فرما"...... اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: میں امن اور روزی کی نعمت تو اس جگہ رہنے والے تیری نسل کے کافروں کو بھی دوں گا، مگر اس دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد ان کو آخرت میں دوزخ کی آگ کے عذاب میں ڈالوں گا جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے دعا میں صرف اہل ایمان کے لیے روزی کی دعا اس لیے کی تھی کہ ان کا خیال تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے میری اولاد میں سے صرف اہل ایمان کے لیے امامت و پیشوائی کا منصب مخصوص کر رکھا ہے تو ہوسکتا ہے، میری نسل

کے ظالم، مشرک اور کافر لوگوں کے لیے اس جگہ کے امن اور یہاں کی بابرکت روزی میں بھی کوئی حصہ نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے ان کے حق میں دعا نہیں فرمائی۔

یاد رہے کہ مکے جیسی بے آب و گیاہ اور غیر ذی زرع وادی میں خانہ کعبہ کو آباد رکھنے اور وہاں حج اور دوسری عبادات کو پوری یکسوئی، دل جمعی اور اطمینان سے ادا کرنے کے لیے امن و امان کی حالت اور بافراغت روزی کی خاص ضرورت تھی، جس کے لیے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے دعا کی تھی۔

اللہ تعالیٰ نے اس ابراہیمی دعا کو قبول فرمایا اور ہزاروں سال سے خانہ کعبہ کو دارالامن قرار دے رکھا ہے اور وہاں کے رہنے والوں کو روزی کے بارے میں کبھی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ آج بھی وہاں دنیا بھر کے پھل، اناج اور دوسری ضروریاتِ زندگی وافر مقدار میں میسر ہوتی ہیں۔ حتّٰی کہ حج کے موسم میں جب وہاں لاکھوں افراد باہر سے آ موجود ہوتے ہیں، تو ان کے رزق اور دوسری آسائشوں میں کوئی کمی دیکھنے میں نہیں آتی۔ حالاں کہ وادئ مکہ میں نہ کھیت ہیں، نہ باغات، نہ وہاں فصلیں اگتی ہیں اور نہ کوئی پھل پیدا ہوتا ہے مگر اللہ تعالیٰ کی قدرت اور دعائے ابراہیمی کا اثر دیکھیے کہ وہاں انسانی ضروریات کی ہر چیز مہیا ہے۔ صرف زمزم کے پانی میں اتنی برکت اور اس کی اتنی فراوانی ہے کہ ایک ہی کنواں دنیا کی ساری مسلم برادری کو پانی فراہم کرتا ہے اور اس کے سوتے کبھی خشک نہیں ہوتے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰلِکَ۔

﴿ وَ اِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَ اِسْمٰعِيْلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۲۷ ﴾ (127)

فرمایا، یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام خانہ کعبہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے اور دیواریں تعمیر کر رہے تھے، تو اُن کے لبوں پر یہ دعا جاری تھی کہ اے ہمارے رب! ہماری اس خدمت کو قبول فرما، ہم تیرا گھر بنا رہے ہیں۔ بے شک تو دعائیں سنتا اور دلوں کا حال جانتا ہے۔

اس سے پہلی آیت (126) میں صرف ابراہیم علیہ السلام کی دعا کا ذکر تھا، اب اس دعا میں ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام بھی شامل ہو گئے ہیں، جو اپنے باپ کی دعا پر آمین کہتے جاتے تھے۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ نیکی کا کوئی حکم کرنے پر اس کی قبولیت کے لیے بھی دعا کرنی چاہیے۔ یہ سنت ابراہیمی ہے۔

﴿ رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝۱۲۸ ﴾ (128)

یہ بھی ابراہیم علیہ السلام اور ان کے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کی مشترکہ (COMMON) دعا تھی کہ: اے ہمارے رب! ہم دونوں کو اپنا سچا فرماں بردار بنا لے، تاکہ ہم تیرے حکم پر لبیک کہا کریں۔ ہم دونوں کی اولاد میں سے ایک ایسی امت (امت مسلمہ) پیدا فرما جو تیری صحیح فرماں بردار ہو۔ ہمیں عبادت کا درست طریقہ سکھا دے۔ حج سے متعلق سارے

ارکان و افعال سمجھا دے۔ ہماری توبہ قبول فرما، ہماری لغزشیں معاف فرما۔ ہماری طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہو۔ تو ہی بندوں کی توبہ قبول کرنے والا اور رحم و شفقت کرنے والا ہے۔

﴿ رَبَّنَا وَ ابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ١٢٩؁ ﴾ (129)

یہ ابراہیمی دعا کا آخری حصہ ہے کہ ہمارے رب! ہماری اولاد سے پیدا ہونے والی اس امت میں ایسا عظیم الشان رسول بھیجنا جو اُن کو تیری آیتیں اور تیرا کلام پڑھ کر سنائے، تیری کتاب (قرآن مجید) کی تعلیم دے، ان کو حکمت و بصیرت کی باتیں...... حدیث و سنت...... سکھائے اور ان کو کفر و شرک اور ہر قسم کے گناہوں سے پاک کرے۔ بے شک تو غالب اور زبردست قوت والا ہے کہ اپنی قدرت اور اختیار سے جو چاہے کرسکتا ہے۔ اور تو 'حکیم' ہے کہ جو کام بھی کرتا ہے وہ حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

اس طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا کو اللہ تعالیٰ کی ایسی صفات پر ختم کیا، جو ان کی معروضات کے مناسبِ حال تھیں۔

اس دعا میں جس عظیم الشان رسول کا ذکر ہے اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس مقام پر ان کے تین اہم فرائض اور ذمہ داریاں بیان ہوئی ہیں:

1۔ تلاوت آیات:

یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی آیات سنائیں، ان کو قدرتِ الٰہی کی نشانیاں بتائیں اور ان تک اللہ تعالیٰ کا کلام پہنچائیں۔

2۔ تعلیم کتاب وحکمت

یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی دوسری ذمہ داری کا ذکر ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کتاب اللہ کی تعلیم دیں۔ ان کو قرآن سکھائیں۔ اس کے احکام اور تعلیمات کی علمی و عملی تشریح فرمائیں۔ دین اور شریعت کی حکمت سمجھائیں اور ان میں روحانی بصیرت پیدا کریں جس کا دوسرا نام حدیث و سنت اور اسوۂ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

3۔ تزکیہ (تزکیۂ نفس)

یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تیسری پیغمبرانہ ذمہ داری کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا کام لوگوں کے اخلاق و عقائد کی اصلاح و درستی، ان کو کفر و شرک کی نجاست سے بچانا اور ان کو ہر قسم کے گناہوں سے پاک کرنا ہے، تاکہ وہ نیک، ہدایت یافتہ اور صالح افراد بن جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا قبول فرمائی اور بعد میں ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام، دونوں کی نسل سے اپنے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا اور امت مسلمہ برپا کردی

ہوئی پہلوئے آمنہ سے ہویدا
دعائے خلیلؑ و نویدِ مسیحا

ہمارے ہاں کے منکرین حدیث کو اس آیت کے مضامین پر غور کرنا چاہیے جو نبی ﷺ کو محض قرآن پہنچانے والا پیغمبر سمجھتے ہیں اور حدیث وسنت کو دین سے خارج قرار دیتے اور اجماع امت کا انکار کرتے ہیں۔

اسی طرح منکرین حدیث کی نئی قسم کے لوگوں کو بھی اس آیت اور اس جیسی اس کی نظیر آیات جیسے البقرہ 2:151۔ آل عمران 3:164۔ النساء 4:59۔ الجمعہ 62:2 پر فکر وتدبر کرنا چاہیے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ بس قرآن پہنچانے اور اس کی چند اصطلاحات جیسے صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج وعمرہ کی نشاندہی کرنے اور ان کی عملی شکل بنانے کے لیے بھیجے گئے تھے۔ اس کے سوا آپ ﷺ کا کوئی حکم نہ حجت ہے اور نہ دین کا حصہ، خواہ وہ صحیح احادیث سے ثابت کیوں نہ ہو اور خواہ اس پر اجماع امت کیوں نہ ہو چکا ہو۔

وَ مَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَ وَصّٰى بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

"ایسا کون ہے جو ابراہیمی دین کو ناپسند کرے؟ سوائے اُس کے جس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنا لیا ہو۔ ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چن لیا اور وہ آخرت میں نیک لوگوں میں سے ہوں گے۔

یاد کرو جب ان کے رب نے ان سے کہا: "فرماں برداری اختیار کرو۔" وہ پکار اٹھے۔" "میں رب العالمین کا فرماں بردار ہوں۔" پھر ابراہیم علیہ السلام نے اور ان کے بعد یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو یہی تاکید کی کہ "اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لیے اس دین کو چن لیا ہے۔ اس لیے مرتے دم تک اسلام پر قائم رہنا۔"

(اے بنی اسرائیل!) کیا تم اس وقت موجود تھے، جب یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت قریب آیا اور انہوں نے

اپنے بیٹوں سے پوچھا: ''میرے بعد کس کی عبادت کرو گے؟'' وہ بولے: ہم اس معبود کی عبادت کریں گے، جس کی عبادت آپ اور آپ کے بزرگ ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کرتے آئے ہیں۔ وہی سب کا ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔''

یہ ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ جو کچھ اس نے کمایا، اسے ملے گا، اور جو تم کماؤ گے، تمہیں ملے گا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ ان کے اعمال کیسے تھے؟''(134:130)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

يَرْغَبُ عَنْ:...... (وہ ناپسند کرتا ہے): رَغِبَ فِي الشَّيْءِ کے معنی ہیں، کسی چیز کی رغبت کرنا، اسے پسند کرنا۔ لیکن رَغِبَ عَنْ کے معنی ہیں کسی چیز کو ناپسند کرنا یا اُس سے نفرت کرنا۔

مِلَّةِ اِبْرٰهٖمَ:...... (ابراہیم کا دین): اس سے ابراہیمی دین مراد ہے، جو توحید کا دین ہے۔

سَفِهَ نَفْسَهٗ:...... اس کے معنی ہیں: اس نے اپنے آپ کو بے وقوف بنایا اور ذلیل و رسوا کیا۔ ((اَذَلَّهَا وَاحْتَقَرَهَا))

اِصْطَفَيْنَا:...... (ص ف ی) یہ اصل میں اِصْتَفَيْنَا تھا۔ 'صاد' کی وجہ سے تا بدل گیا ہے طا میں۔ اِصْطَفٰی کے اصل معنی ہیں: کسی چیز کا خالص اور بہتر حصہ لے لینا۔ لیکن اس سے مراد ہوتی ہے کوئی چیز چن لینا، منتخب کر لینا۔

اَلصّٰلِحِيْنَ:...... یہ اَلصَّالِحُ (نیک، تندرست) کی جمع ہے۔ اس کے معنی ہیں: نیک لوگ۔ کبھی اس سے مراد انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی پوری جماعت بھی ہوتی ہے۔ اس مقام پر یہ لفظ پوری جماعت کے لیے آیا ہے، جیسا کہ یوسف علیہ السلام کی دعا میں بھی اَلصّٰلِحِيْنَ سے مراد پوری جماعت ہے:

﴿رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۚ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۣ اَنْتَ وَلِيّٖ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ تَوَفَّنِيْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِيْ بِالصّٰلِحِيْنَ۝﴾

(یوسف 101:12)

''اے میرے رب! تو نے مجھے حکومت بخشی۔ باتوں کی تہہ تک پہنچنے کا علم عطا فرمایا۔ اے آسمانوں اور زمین کے بنانے والے! تو ہی میرا کارساز ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ میں جب مروں تو فرماں برداری کی حالت میں اور دوبارہ اٹھوں تو تیرے نیک بندوں کے ساتھ۔''

عام نیک لوگوں کے لیے صالحین کا لفظ اس آیت میں ہے کہ:

﴿اِنْ تَكُوْنُوْا صٰلِحِيْنَ فَاِنَّهٗ كَانَ لِلْاَوَّابِيْنَ غَفُوْرًا۝﴾ (بنی اسرائیل 25:17)

''اگر تم نیک ہو گے اور توبہ کرنے والے بنو گے تو اللہ معاف کرنے والا ہے۔''

اَسْلِمْ: ...... یہ اَسْلَمَ یُسْلِمُ اِسْلَامًا سے فعل امر ہے، جس کے معنی ہیں: ''جھک جا'' یا ''فرماں برداری اختیار کر۔''

وَصّٰی: ...... یہ توصیہ باب تفعیل سے ہے۔ اس کے معنی ہیں: وصیت کرنا، نصیحت کرنا۔ کسی کی خیر خواہی کرنا، کسی کام کی تاکید اور تلقین کرنا، خواہ یہ کام کوئی آدمی اپنی روزمرہ زندگی میں کرے، یا مرتے وقت کرے۔

اَلدِّیْنَ: ...... اس جگہ اس سے مراد دین اسلام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک تمام انبیائے کرام کا دین ہے، جیسا کہ فرمایا گیا۔

﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ﴾ (آل عمران 19:3)

''بے شک اللہ کے نزدیک سچا دین صرف اسلام ہے۔''

ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَ هُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ۝﴾ (آل عمران 85:3)

''اور جو شخص اسلام کے سوا کوئی اور دین اختیار کرتا ہے، اللہ اُس کے دین کو ہرگز قبول نہ کرے گا اور وہ شخص آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔''

شُهَدَآءُ: ...... یہ شاہد اور شہید کی جمع ہے، جس کے معنی حاضر اور گواہ کے ہیں۔

حَضَرَ... الْمَوْتُ: ...... موت کے حاضر ہونے کا مطلب ہے: موت کے آثار ظاہر ہونا یا کسی شخص کا قریب المرگ ہونا۔

﴿ وَ مَنْ یَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَقَدِ اصْطَفَیْنٰهُ فِی الدُّنْیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝۱۳۰﴾ (130)

فرمایا، آج یہود و نصاریٰ اور مشرکین قریش، سب کا دعویٰ ہے کہ وہ ملتِ ابراہیمی یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دین پر ہیں، لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ ان لوگوں نے اپنے آپ کو ملتِ ابراہیمی سے دور کر لیا ہے۔ وہ ابراہیم علیہ السلام کے عقیدۂ توحید کو یا تو فراموش کر چکے ہیں، یا اسے ناپسند کرتے ہیں۔ پھر یہ دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں کہ وہ ابراہیمی دین کے پیروکار ہیں۔ ابراہیمی دین تو ایسا ہے جس سے پھرنے والا اپنے آپ کو بے وقوف بناتا اور خود کو ذلیل و خوار کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو نبوت کے کام کے لیے چن لیا تھا۔ ان کو دنیا کی امامت و پیشوائیت کا مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ اللہ سبحانہٗ نے ان کو اپنا دوست ''خلیل اللہ'' قرار دیا تھا جیسا کہ سورۃ النساء میں ہے:

﴿وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا۝﴾ (النساء 125:4)

''اور اللہ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔''

وہ توحید پرست تھے، شرک سے بیزار تھے اور آخرت میں ان کا شمار اللہ کے نیک لوگوں کے زمرے میں ہوگا۔

﴿ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝۱۳۱﴾ (131)

فرمایا، ابراہیم علیہ السلام کے جذبۂ اطاعت گزاری کا حال یہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی فرماں برداری کا حکم دیا تو انہوں نے اس کے ہر حکم کی تعمیل کی۔ وہ اپنے رب العالمین کے سچے فرماں بردار اور اطاعت گزار تھے۔ ان کے دین کی پیروی کا دعویٰ کرنے والے یہود، نصاریٰ اور مشرکین قریش میں اللہ تعالیٰ کی وہ فرماں برداری اور اطاعت گزاری کہاں جو ابراہیم علیہ السلام میں تھی۔ بلکہ ان جھوٹے پیروکاروں کا دین کیا ہے؟ سرکشی، نافرمانی، گمراہی، شرک، کفر اور بت پرستی۔

﴿وَ وَصّٰی بِهَاۤ اِبْرٰهٖمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ ؕ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰی لَكُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؕ۝۱۳۲﴾ (132)

فرمایا، اہل کتاب کو جن نبیوں ...... ابراہیم علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام کی اولاد ہونے پر فخر و ناز ہے، ان کا مذہب نہ یہودیت تھا اور نہ نصرانیت۔ نہ وہ یہودی تھے اور نہ نصرانی بلکہ وہ دین توحید، اسلام کو ماننے والے تھے۔ وہ خود ساری عمر اس دین پر قائم رہے اور مرتے وقت انہوں نے اپنی اولاد کو بھی یہ وصیت فرمائی تھی کہ: تمہیں اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی دین کے مطابق گزارنا ہے اور جب تمہارا آخری وقت آ جائے تو تمہاری حالت یہ ہونی چاہیے کہ تم اسی دین کی پیروی کرنے والے اور اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار ہو۔

﴿اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ یَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِیْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۳﴾ (133)

اب اہل کتاب کو جھنجوڑ کر بتایا گیا کہ کیا یعقوب علیہ السلام نے تمہیں یہودیت یا نصرانیت کی تعلیم دی تھی؟ کیا تم اس موقع پر موجود تھے جب یعقوب علیہ السلام کی موت کا وقت قریب آیا اور انہوں نے اپنے بیٹوں کو پاس بلا کر ان سے پوچھا تھا کہ: میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟'' بیٹوں نے جواب دیا تھا: ہم اسی ایک معبود کی عبادت کریں گے جس کی عبادت آپ ساری عمر کرتے رہے اور جس کی عبادت آپ کے آباء واجداد...... ابراہیم، اسماعیل اور اسحاق علیہم السلام کرتے رہے۔ ہم کبھی شرک نہیں کریں گے۔

یاد رہے یہ وصیت آج بھی یہودی مذہبی لٹریچر میں موجود ہے۔

اس جگہ یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے اسماعیل علیہ السلام کو بھی یعقوب علیہ السلام کا باپ کہا ہے، حالاں کہ وہ ان کے چچا تھے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے: چچا بھی باپ کے برابر ہوتا ہے:

((عَمُّ الرَّجُلِ صِنْوُ اَبِیْهِ)) (صحیح مسلم، رقم: 2277۔ ترمذی، رقم: 3760)

''آدمی کا چچا اس کے باپ کے برابر ہے۔''

یاد رہے کہ ایک ہی جڑ سے نکلنے والے پودوں یا درختوں میں سے ہر ایک دوسرے کا صِنْوٌ کہلاتا ہے۔ (الرعد 4:13) اس کے علاوہ عرب کے لوگ چچا کو بھی باپ کہہ دیتے تھے۔

﴿ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾ ﴾ (134)

یہ اہل کتاب بالخصوص یہود سے فرمایا گیا کہ دیکھو، وہ نبیوں کی ایک جماعت تھی، جس میں ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام شامل تھے۔ وہ لوگ دنیا سے رخصت ہو چکے۔ ان کے اعمال کی جزا و سزا صرف ان کو ملے گی اور تمہیں اپنے اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔ آخرت میں ان کی کوئی نیکی، یا ان سے نسلی نسبت تمہارے کچھ کام نہ آ سکے گی۔

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ؕ وَ مَا
كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى
اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ
عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ٘ وَ
نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ
تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ ؕ
صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾
قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ
وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ ۙ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ
يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ
وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ
عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ
ع ۱۶ وَ لَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع

''اور وہ کہتے ہیں: ''ہدایت چاہیے تو یہودی یا عیسائی ہو جاؤ۔'' (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ کہیں: ''نہیں، بلکہ (ہدایت کے لیے) ابراہیم علیہ السلام کا دین اختیار کرو، جو اللہ کی طرف یکسو تھے، مشرک نہ تھے۔

(مسلمانو) تم کہو ''ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر جو ہماری طرف نازل ہوئی اور اس پر جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر نازل ہوا اور اس پر جو کچھ موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے عطا کیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی نبی کا انکار نہیں کرتے اور ہم اللہ کے فرماں بردار ہیں۔''

اگر یہ (اہل کتاب) بھی اسی طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو، پھر وہ بھی ہدایت پا گئے۔ لیکن اگر وہ منہ موڑیں تو پھر وہ ضد میں اڑے ہوئے ہیں۔ (اے نبی ﷺ) ان کے مقابلے میں اللہ آپ ﷺ کے لیے کافی ہے۔ جو ہر بات کو سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

(مسلمانو) تم (اہل کتاب) سے کہو: ہم نے اللہ (کے دین) کا رنگ قبول کر لیا۔ اور اللہ کے رنگ سے بہتر کس کا رنگ ہے؟ ہم اسی اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔'' (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ ان سے کہیں: کیا تم اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالاں کہ وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں۔ اور ہم ہر کام میں صرف اللہ کی رضا چاہتے ہیں۔

(اے اہل کتاب) کیا تم یہ کہتے ہو کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد، یہ سب یہودی یا عیسائی تھے؟ (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ ان سے کہیں: تم زیادہ جانتے ہو، یا اللہ زیادہ جانتا ہے؟'' اور اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اس کی گواہی کو چھپا دے، جو اللہ کی طرف سے اس کے پاس آئی ہو! اور (اے اہل کتاب) جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ اور وہ تو ایک جماعت تھی جو گزر چکی۔ جو کچھ اس نے کمایا، اسے ملے گا اور جو کچھ تم کماؤ گے تمہیں ملے گا۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ ان کے اعمال کیسے تھے؟'' (135-141)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

حَنِیْفًا: ...... اس کے اصل معنی ''مائل ہونے والا'' یا ''جھکنے والا'' کے ہیں۔ اس سے مراد وہ آدمی ہوتا ہے، جو ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف ایک اللہ کا ہو رہے۔

اَسْبَاطَ: ...... یہ سَبْطٌ کی جمع ہے۔ اس سے مراد یعقوب علیہ السلام کی وہ اولاد ہے جو بارہ (12) بیٹوں پر مشتمل تھی۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ: ...... (ہم ان میں سے کسی ایک کا بھی فرق نہیں کرتے)۔ گویا ہم نبیوں میں کوئی تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں۔ بلکہ ان میں سے کسی ایک کی نبوت کا بھی ہم انکار نہیں کرتے۔

قرآن نے اسی بات کو دوسری جگہ یوں بیان فرمایا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ یَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّ یُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًاۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابًا مُّهِیْنًا﴾ (النساء 151,150:4)

”بے شک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ رسولوں کو چھوڑ کر صرف اللہ کو مانیں اور کہتے ہیں: ”ہم بعض رسولوں کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے“ اور وہ چاہتے ہیں کہ کفر اور اسلام کے درمیان کوئی اور راہ نکالیں، ایسے لوگ پکے کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔“

یہ تفریق بین الرسل کیا ہے؟ یہ کہ بعض رسولوں اور نبیوں کو مانا جائے اور بعض کی نبوت و رسالت سے انکار کیا جائے اور یہ چیز کفر ہے۔ بلکہ کسی ایک نبی کا انکار بھی سب کا انکار ہے۔ رہا انبیاء و رسل کے درجات اور فضائل کا معاملہ تو ان میں بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ﴾ (البقرہ 253:2)

”ہم نے پیغمبروں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔“

شِقَاقٍ:...... یہ شِقٌّ سے ہے، جس کے معنی پہلو یا کروٹ کے ہیں۔ گویا، وہ لوگ جو ایک دوسرے سے پہلو تہی کرتے، منہ موڑتے اور ایک دوسرے سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے اور آپس میں ضد، نفرت اور دشمنی رکھتے ہیں۔

صِبْغَةَ اللّٰهِ:...... (اللہ کا رنگ)۔ اس سے اللہ تعالیٰ کا دین اسلام مراد ہے۔ صِبْغَةَ کے منصوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے کوئی لفظ محذوف ہے۔ ہم نے ترجمے میں اس حذف کو کھول دیا ہے۔

تُحَآجُّوْنَنَا:...... (تم ہم سے جھگڑتے ہو)۔ اس کا مادہ ح ج ج ہے۔ اس کا مصدر محاجّہ (باب مفاعلہ) ہے۔ جس کے معنی ہیں: حجت و دلیل کے ساتھ ایک دوسرے سے جھگڑنا اور بحث و مباحثہ کرنا۔

فِی اللّٰهِ:...... اس کے معنی ہیں، اللہ کے بارے میں۔ بعض لوگوں نے اس کا ترجمہ 'فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ' (اللہ کی راہ میں، اللہ کے واسطے، اللہ کی خاطر کیا ہے) جو عربیت کے خلاف ہے۔

مُخْلِصُوْنَ:...... یہ اخلاص سے اسم فاعل ہے۔ اس کے معنی ہیں، توحید کو ماننے والے، ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی چاہنے والے۔ اپنے ہر عمل کو خالص لِوَجْهِ اللہ کرنے والے۔

﴿وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝۱۳۵﴾ (135)

فرمایا، یہود کا دعویٰ ہے کہ صرف یہودیت ہی صحیح مذہب ہے اور اسی کو اختیار کرنے سے ہدایت ملتی ہے۔ اسی طرح نصاریٰ کا بھی دعویٰ ہے کہ صرف نصرانیت (عیسائیت) ہی صحیح مذہب ہے اور اسی کو اختیار کرنے سے ہدایت ملتی ہے۔ اللہ

تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کو خطاب کر کے ارشاد فرمایا کہ ان دونوں گروہوں سے کہہ دیجیے کہ ہم لوگ تو اُس ابراہیم علیہ السلام کے دین کو مانتے ہیں جو توحید پرست تھے، مشرک نہ تھے۔ تم دونوں گروہوں کو اِس سے انکار بھی نہیں کہ ابراہیم علیہ السلام کا دین ہی صحیح دین تھا اور وہ ہدایت پر تھے۔

اس آیت میں اہل کتاب کے دونوں گروہوں ...... یہود و نصاریٰ...... کے شرک پر تعریض اور چوٹ ہے۔ جو ابراہیمی دین کے پیروکار ہونے کا دعویٰ تو کرتے تھے، مگر حالت یہ تھی کہ ایک گروہ نے عزیر علیہ السلام کو اور دوسرے نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا بنا لیا تھا، اس وجہ سے ان دونوں نے شرک کا ارتکاب کیا تھا۔ جب کہ ابراہیم علیہ السلام شرک کے سخت مخالف اور سچے توحید پرست تھے، جنہوں نے بت شکنی کر کے شرک کے خلاف جہاد کیا تھا۔

فرمایا، اب ابراہیمی دین کے اصل پیروکار یہود و نصاریٰ نہیں ہیں، بلکہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والے لوگ ہیں۔

﴿قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَ مَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطِ وَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى وَ مَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝۱۳۶﴾ (136)

اس سے پہلے نبی ﷺ کو خطاب کر کے حکم دیا گیا کہ آپ ﷺ ان یہودیوں اور عیسائیوں کو بتا دیں کہ تم ابراہیمی دین پر نہیں ہو بلکہ ہم ابراہیمی دین پر ہیں۔

اب اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بھی اہل کتاب کو بتا دیں کہ دیکھو، ہم اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، ہماری طرف جو قرآن نازل ہوا ہے، ہمارا اس پر بھی ایمان ہے۔ ہم ان سب کتابوں، صحیفوں اور اس وحی کو برحق مانتے ہیں، جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد کی طرف بھیجی گئی اور اُس کو بھی جو وحی و ہدایت موسیٰ، عیسیٰ علیہما السلام اور دوسرے نبیوں کی طرف بھیجی گئی۔ ہم ان تمام انبیائے کرام کو مانتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے نبوت عطا فرمائی۔ ہم کسی ایک نبی کا بھی انکار نہیں کرتے اور ہم صرف اللہ تعالیٰ کے فرماں بردار ہیں۔

اس آیت میں بھی یہود و نصاریٰ پر تعریض ہے، جو اللہ تعالیٰ کے بعض نبیوں کو مانتے اور بعض کا انکار کرتے تھے۔

جیسا کہ یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کے نبی ہونے کا انکار کیا اور عیسائیوں نے حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو تسلیم نہیں کیا۔

﴿فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝۱۳۷ؕ﴾ (137)

یہ بھی اہل ایمان سے کہا گیا کہ تمہاری دعوت پر اگر یہ اہل کتاب بھی یہودیت اور عیسائیت چھوڑ کر اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان رکھتے ہو۔ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان لائیں، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں، کسی کو اللہ

کی اولاد نہ مانیں، اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام نبیوں اور رسولوں پر ایمان لائیں اور ان کے بتائے ہوئے سچے دین کی پیروی کریں تو پھر وہ ہدایت پا گئے اور آخرت میں نجات کے حق دار ہوں گے۔ لیکن اگر وہ اس طرح سے سچا ایمان نہ لائیں تو سمجھ لو، وہ تمہاری مخالفت اور دشمنی پر اَڑے ہوئے ہیں۔ پھر اُن کے مقابلے میں تمہارے لیے اللہ کافی ہے۔ وہی تمہارا حامی و ناصر ہے، جو ہر بات سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

بعد میں اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ یہودیوں کی چالوں اور مخالفتوں کے باوجود اللہ سبحانہٗ نے اپنے نبی ﷺ اور اہل ایمان کی مدد فرمائی۔ وہ یہودیوں اور عیسائیوں پر غالب آئے اور پورے جزیرۃ العرب میں اسلام کا بول بالا ہو گیا۔

اس آیت سے فقہائے اسلام اور اہل علم نے تعامل صحابہ اور اجماعِ امت کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے، جو بالکل درست ہے۔ کیونکہ اس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اہل کتاب کا صرف وہی ایمان معتبر سمجھا جائے گا جو وہ صحابہ کرام جیسا ایمان لائیں گے اور جسے اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت حاصل ہے۔

﴿صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّ نَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝١٣٨﴾ (138)

فرمایا، مسلمانوں کو کہہ دینا چاہیے کہ ہم نے اللہ کا رنگ یعنی اس کا دین اسلام قبول کر لیا ہے، جس سے بہتر کوئی دین نہیں ہو سکتا اور ہم صرف اسی ایک اللہ کی عبادت کرنے والے ہیں۔

اس میں صِبْغَةٌ (رنگ) کا لفظ یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک مذہبی رسم پر تعریض اور چوٹ ہے۔

یہودیوں میں یہ رسم تھی کہ جب کوئی شخص ان کا مذہب اختیار کرتا تو وہ اسے غسل دیا کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس طرح وہ شخص گناہوں سے بالکل پاک ہو جاتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنے نومولود بچوں کو بھی غسل دیا کرتے تھے۔

بعد میں عیسائیوں نے بھی اس رسم کو اختیار کر لیا کہ جو شخص عیسائیت میں داخل ہوتا، اسے گناہوں سے پاک کرنے کے لیے زرد رنگ ملے پانی سے غسل دیتے تھے۔ اس کے علاوہ بچوں کو بھی ان کی پیدائش کے بعد اسی رنگ دار پانی سے نہلا کر انہیں پکا عیسائی بناتے تھے۔ یہ رسم ان کے ہاں اصطباغ یا بپتسمہ (BAPTISM) کہلاتی تھی۔

﴿قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ۝١٣٩ۙ﴾ (139)

فرمایا، اے نبی ﷺ! آپ ﷺ ان اہل کتاب سے کہہ دیجیے کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کا معاملہ ہے، وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی رب ہے۔ ہم بھی اسی کے بندے ہیں اور تم بھی اسی کے بندے ہو۔ پھر یہ دعویٰ کیوں کرتے ہو کہ وہ اپنے کچھ بندوں کی طرف نبی اور رسول بھیج سکتا ہے اور کچھ کی طرف نہیں بھیج سکتا۔ پھر یہ جھگڑا ہمارے اور تمہارے درمیان نہیں رہتا، بلکہ تمہارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہو جاتا ہے۔ تم اللہ تعالیٰ سے پوچھو اور اس سے جھگڑا کرو کہ کیوں اس نے تمہارے دعوے کے برخلاف بنی اسرائیل کی بجائے بنی اسماعیل میں سے اپنا آخری نبی اور رسول مبعوث کیا ہے؟

اب اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن ہمیں ہمارے اعمال کا اور تمہیں تمہارے اعمال کا بدلہ دے گا۔ ہم تو عقیدۂ توحید پر قائم رہتے ہوئے اپنے تمام اعمال صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضا حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں، اس لیے ہم اللہ سبحانہٗ سے بہتر بدلے کی توقع رکھتے ہیں۔

﴿ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (140)

اہل کتاب کا دعویٰ تھا کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یعقوب علیہم السلام کی اولاد سب یہودی یا عیسائی تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ سے فرمایا کہ ان سے پوچھیں: کیا ان بزرگوں کے دین کے بارے میں تم لوگ زیادہ جانتے ہو یا اللہ زیادہ جانتا ہے کہ ان کا دین یہودیت یا عیسائیت تھی، یا کہ اسلام تھا؟ ان بزرگوں کے بہت بعد موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی، جن کی نسبت سے تم لوگوں نے یہودیت یا نصرانیت اختیار کر لی۔ اس لیے ان بزرگوں کا یہودیت یا عیسائیت سے کوئی واسطہ نہ تھا، بلکہ ان کا اپنا دین صرف اسلام تھا، جو اب حضرت محمد ﷺ اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والوں کا دین ہے۔

پھر فرمایا، یہ اہل کتاب کتنے بڑے ظالم ہیں، جن کے پاس توریت اور انجیل میں حضرت محمد ﷺ کی نبوت کی بشارتیں موجود ہیں، مگر وہ اس کھلی شہادت اور گواہی کو چھپاتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ اہل کتاب جو کتمانِ حق کے مرتکب ہیں، حق کو چھپاتے ہیں، اصل حقیقت پر پردہ ڈالتے ہیں، وہ لوگوں کو اُن پیش گوئیوں سے بے خبر رکھنا چاہتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کی بعثت کے بارے میں تھیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ ان کی ایسی حرکتوں اور شرارتوں سے ہرگز بے خبر نہیں ہے اور وہ ان کے جرائم پر ان کو سخت سزا دے گا۔

﴿ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ لَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَ لَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ ﴾ (141)

بالکل یہی آیت اور اس کی تفسیر اس سے پہلے آیت 134 کے تحت گزر چکی ہے، وہاں دیکھ لی جائے۔

سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِیْ كَانُوْا عَلَيْهَا ؕ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ؕ يَهْدِیْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِیْ كُنْتَ عَلَيْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۳﴾

''بے وقوف لوگ کہیں گے، مسلمان اپنے قبلے سے کیوں پھر گئے؟
(اے نبی ﷺ) آپ ﷺ ان سے کہہ دیں: مشرق اور مغرب اللہ کے ہیں۔ وہ جسے چاہتا ہے، سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔ (مسلمانو) ہم نے تمھیں افضل امت بنایا تاکہ تم دوسروں کے لیے دین حق کے گواہ بن جاؤ۔ اور یہ رسول تمہارے لیے دین حق کی گواہی دیں۔
پہلا قبلہ ہم نے اس لیے مقرر کیا تھا تاکہ یہ ظاہر کر دیں، کون رسول کی پیروی کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں پھر جاتا ہے؟ بے شک قبلے کی تبدیلی اللہ کے ہدایت یافتہ لوگوں کے سوا سب پر گراں گزری ہے۔ اور اللہ تمہارے ایمان یعنی نمازوں کو ضائع نہیں کرے گا۔ یقیناً اللہ اپنے بندوں پر شفقت کرنے والا مہربان ہے۔''(142-143)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

سُفَهَآءُ:...... یہ سَفِیْهٌ کی جمع ہے، جس کے معنی بے وقوف، نادان اور احمق کے ہیں۔

قِبْلَةٌ:...... یہ مُقَابَلَةٌ سے ہے، جیسے مُوَاجَهَةٌ سے وِجْهَةٌ (طرف، جانب، رخ) ہے۔ قبلہ کے اصل معنی ایسی حالت کے ہیں جب کوئی چیز کسی کے بالمقابل ہوتی ہے اور وہ دونوں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوتے ہیں۔ بعد میں اس لفظ کے معنی اس جانب یا طرف کے ہو گئے جدھر کوئی شخص نماز کے وقت منہ کرتا ہے۔

اُمَّةً وَّسَطًا:......وَسَطٌ بھی وَلَدٌ اور بَشَرٌ کی طرح واحد، جمع، مذکر اور مونث سب کے لیے آتا ہے۔ اس کے اصل معنی کسی چیز کے درمیانی حصے کے ہیں۔ یہیں سے اس میں ''بہترین'' کے معنی پیدا ہو گئے، کیونکہ عام طور پر کسی چیز کا درمیانی حصہ ہی بہترین ہوتا ہے۔ اس لیے وَسَطٌ، اَوْسَطُ اور وُسْطٰی کے معنی 'بہترین' کے ہیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں باغ والوں کے قصے میں ہے کہ:

﴿قَالَ اَوْسَطُهُمْ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ لَوْلَا تُسَبِّحُوْنَ﴾ (القلم 28:68)

''ان میں سے جو بہتر آدمی تھا، اس نے کہا: کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم لوگ اللہ (کا شکر اور اس) کی تسبیح کیوں نہیں کرتے؟''

صحیح بخاری میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((فَاِذَا سَاَلْتُمُ اللّٰهَ فَاسْئَلُوْهُ الْفِرْدَوْسَ فَاِنَّهٗ اَوْسَطُ الْجَنَّةِ وَاَعْلَى الْجَنَّةِ))

''جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگو، کیونکہ وہ بہترین اور اعلیٰ جنت ہے۔''

اس حدیث میں اَوْسَطُ کا لفظ بہترین کے معنوں میں ہے، درمیانی کے معنوں میں نہیں ہے۔

بعض حضرات نے اُمَّةً وَّسَطًا کا ترجمہ ''درمیانی امت'' یا ''بیچ کی امت'' کیا ہے، جو ہمارے نزدیک درست نہیں ہے، کیونکہ امت مسلمہ، جس کا اس مقام پر ذکر ہے، وہ کوئی درمیانی یا بیچ کی امت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ﷺ کی آخری امت ہے، جیسا کہ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ:

((نَحْنُ الْاٰخِرُوْنَ السَّابِقُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ......))

(صحیح بخاری، رقم: 876۔ صحیح مسلم، رقم: 1978)

''ہم آخری امت ہیں، لیکن قیامت کے دن سب سے آگے اور مقدم ہوں گے......''

لِنَعْلَمَ: ...... یہ عَلِمَ يَعْلَمُ سے ہے۔ اس کے کئی معنی ہیں جیسے: جاننا، متعین اور معلوم کر لینا، امتیاز کرنا اور ظاہر کرنا۔ اس جگہ سے ظاہر کرنے کے معنوں میں آیا ہے تا کہ یہ بات سب لوگوں پر ظاہر ہو جائے۔ ویسے اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کے مستقبل کے بارے میں اسی طرح علم ہوتا ہے جیسے اس کو اس کے ماضی کا علم ہوتا ہے۔

﴿سَيَقُوْلُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا﴾ (142)

رسول اللہ ﷺ ہجرت کے بعد مدینے میں سولہ یا سترہ مہینے تک بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم آ گیا۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے۔ (صحیح بخاری، رقم: 399,40۔ 4486، 4492 ، 7252)

قبلے کی اس تبدیلی پر منافقین، مشرکین اور بالخصوص یہودیوں نے اعتراض کیا تو اس کا یہ جواب دیا گیا کہ:

﴿قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (142)

فرمایا، بے وقوف لوگ قبلے کی تبدیلی پر اعتراض کریں گے مگر وہ یہ بات نہیں جانتے کہ مشرق ہو یا مغرب، ساری سمتیں اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ کسی ایک سمت کو کسی دوسرے سمت پر کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ اللہ سبحانہٗ جس سمت کی طرف چاہے، اپنے بندوں کو عبادت کے وقت رُخ کرنے کا حکم دے۔ اصل مقصود کوئی مخصوص سمت نہیں ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کے

حکم کی پیروی اور اطاعت مطلوب ہے۔ جو بے وقوف لوگ اللہ سبحانہٗ کے احکام پر اعتراض کرتے ہیں ان کو گمراہی کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس جو لوگ اللہ تعالیٰ کے حکموں پر چلتے ہیں، وہ ہدایت کی سیدھی راہ پر ہوتے ہیں۔

﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (143)

اب مسلمانوں سے فرمایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی خاص نعمتوں سے نوازنا چاہتا ہے۔ اسی لیے اس نے تم کو ایمان لانے اور اسلام کی سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق دی ہے۔ اس نے تمہیں "امتِ وسط" یعنی افضل اور بہترین امت ہونے کا شرف عطا کیا ہے، جیسا کہ فرمایا:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ﴾ (آل عمران 110:3)

"تم وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں کی رہنمائی کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔"

یہ انعامات دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے تم پر کچھ ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ اب تمہیں اس دنیا میں اپنے قول وفعل سے حق کی گواہی دینی ہے۔ تم آخری نبی ﷺ کی آخری امت ہو۔ تمہارا کام یہ ہے کہ تم دوسرے تمام انسانوں تک دینِ اسلام کی دعوت پہنچا دو۔ خود رسول اللہ ﷺ بھی اپنے قول وفعل سے شہادتِ حق کا فریضہ ادا فرمائیں گے۔ معلوم ہے، اسی فریضے کی ادائیگی کا اعلان حضور ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا کہ:

((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟ قَالُوْا: نَعَمْ)) (صحیح بخاری، رقم: 1741)

"کیا میں نے (اللہ کا پیغام تم تک) پہنچا دیا؟ وہ (صحابہ) بولے: جی ہاں۔"

دنیا میں شہادتِ حق کی ذمہ داری ادا کرنے کے بعد آخرت میں جب دوسرے انبیائے کرام کی امتیں یہ دعویٰ کریں گی کہ اُن تک نبیوں نے دین کی دعوت نہیں پہنچائی تھی تو نبی کریم ﷺ اور آپ ﷺ کی امت مسلمہ کی طرف سے اس بات کی شہادت دی جائے گی کہ واقعی انبیاء علیہم السلام نے اپنی اپنی امت کو دین کی دعوت پہنچائی تھی۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث موجود ہے۔ (صحیح بخاری، رقم: 3339، 4487، 7349)

﴿وَ مَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَاۤ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ ؕ وَ اِنْ كَانَتْ لَكَبِيْرَةً اِلَّا عَلَى الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ ؕ﴾ (143)

قبلے کی تبدیلی یا تحویلِ قبلہ دو بار ہوئی ہے:

پہلی بار ہجرت کے فوراً بعد مدینے میں جب خانہ کعبہ کی بجائے بیت المقدس کو قبلہ قرار دیا گیا۔ دوسری بار اس وقت جب اندازاً ڈیڑھ برس گزر جانے کے بعد بیت المقدس کی بجائے دوبارہ خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا۔ اس آیت میں اسی کا ذکر ہے۔

اس طرح پہلے اہلِ عرب مسلمانوں کی آزمائش ہوئی کہ ان کے لیے وطنی قبلے خانہ کعبہ کی بجائے بیت المقدس کو قبلہ

بنایا گیا۔ پھر اہل کتاب مسلمانوں کا امتحان لیا گیا اور ان کے خاندانی اور نسلی قبلے بیت المقدس کی بجائے خانہ کعبہ کو قبلہ قرار دیا گیا۔ ان آزمائشوں کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ کے سچے پیروکاروں کو وطنی اور نسلی تعصبات سے پاک کر دیا گیا جو کہ صحیح ہدایت کی راہ ہے۔

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ (143)

اب تحویل قبلہ کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ جو لوگ بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھتے رہے اور اس دوران میں دنیا سے رخصت ہو گئے، تو کیا ان کو ان نمازوں کا ثواب ملے گا جو بیت المقدس کی طرف رخ کر کے پڑھی گئیں؟ صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ تحویل قبلہ سے پہلے کئی آدمی فوت یا شہید ہو گئے تھے۔ ہم نہیں جانتے تھے کہ ان کے بارے میں کیا کہیں تو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں نازل فرما دیا کہ:

﴿ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُضِيْعَ اِيْمَانَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۝ ﴾ (صحیح بخاری، رقم: 4486)

اس کا مطلب یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ جو کہ شفقت کرنے والا اور رحم والا ہے، اُس کی طرف سے ایسے تمام لوگوں کو ان کی نمازوں کا اجر ملے گا۔ گویا اس جگہ نماز کو ایمان قرار دیا گیا ہے اور کیوں نہ ہو نماز ایمان کی عملی نشانی ہے اور ہر صاحب ایمان کی پہچان ہے۔

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِى السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۖ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ۝١٤٤ وَلَئِنْ اَتَيْتَ
الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا
بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ
مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝١٤٥ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا
يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝١٤٦ وقف منزل / وقف لازم
اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝١٤٧ ع ١٧

”(اے نبی ﷺ) ہم دیکھ رہے تھے، آپ ﷺ کا چہرہ بار بار آسمان کی طرف اٹھتا تھا۔ ہم نے فیصلہ کر لیا ہے

کہ آپ ﷺ کو اسی قبلے کی طرف پھیر دیں گے، جسے آپ پسند کرتے ہیں۔ اب آپ ﷺ مسجد حرام کی طرف اپنا رخ کرلیں اور مسلمان جہاں بھی ہوں، اس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کریں۔ رہے اہل کتاب تو وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ قبلے کی تبدیلی برحق ہے اور ان کے رب کی طرف سے ہے۔ مگر اس کے باوجود جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے بے خبر نہیں۔

(اے نبی ﷺ) آپ ﷺ اہل کتاب کے سامنے جتنی دلیلیں پیش کریں، وہ آپ ﷺ کے قبلے کو نہیں مانیں گے۔ آپ ﷺ خود بھی ان کے قبلے کی پیروی نہیں کرسکتے۔ اور نہ وہ خود ایک دوسرے کے قبلے کو مانتے ہیں۔ لیکن مسلمانو! اگر تم اس علم کے آجانے کے بعد جو تمہارے پاس آچکا ہے، ان لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے چلو گے تو تم بھی ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔

اہل کتاب تو اس حکم کو اس طرح جانتے پہچانتے ہیں، جیسے اپنے بیٹوں کو جانتے پہچانتے ہیں، لیکن ان کا ایک گروہ جان بوجھ کر حق بات چھپاتا ہے۔ قبلے کے بارے میں جو حکم آنا تھا، آگیا۔ اب اس بارے میں کسی کو شک نہیں ہونا چاہیے۔" (144-147)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

نَرٰی: ...... یہ رُؤْیَةٌ سے ہے، جس کے معنی دیکھنے کے ہیں۔ اس سے پہلے کُنَّا محذوف ہوگیا ہے۔ اصل میں یہ کُنَّا نَرٰی "ہم دیکھتے تھے" ہے۔ فعل مضارع سے پہلے فعل ناقص کے حذف ہونے کی مثالیں موجود ہیں، جیسے ارشاد ہوا کہ:

﴿وَ كَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ۝﴾ (الانعام 75:6)

"اور اسی طرح ہم ابراہیم علیہ السلام کو (اپنی) بادشاہی (کے جلوے) دکھاتے تھے، تاکہ وہ کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائے۔"

شَطْرَ: ...... اس جگہ یہ لفظ "طرف، جانب اور رخ" (DIRECTION) کے معنوں میں آیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے معنی کسی چیز کے آدھے یا کچھ حصے کے بھی ہوتے ہیں، جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

((اَلطُّهُوْرُ شَطْرُ الْاِيْمَانِ)) (صحیح مسلم، رقم: 534۔ ترمذی، رقم: 3517)

"پاکیزگی ایمان کا نصف یا کچھ حصہ ہے۔"

مُمْتَرِيْنَ: ...... یہ مِرْيَةٌ اور اِمْتِرَاءٌ سے ہے جس کے معنی شک کرنے کے ہیں۔

﴿قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۠ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ؕ﴾ (144)

نبی ﷺ کو خانہ کعبہ کے قبلہ مقرر کیے جانے کا انتظار تھا۔ اسی شوق میں چہرہ مبارک کبھی کبھی آسمان کی طرف پھر جاتا کہ کب جبرئیل علیہ السلام یہ حکم لے کر نازل ہوتے ہیں۔ کیونکہ آپ ﷺ کو معلوم تھا کہ بنی اسرائیل کی امامت و پیشوائیت کا زمانہ گزر چکا ہے، اور اس کے ساتھ ہی بیت المقدس کی مرکزیت ختم ہونے والی ہے اور اصل ابراہیمی مرکز خانہ کعبہ کا دور شروع ہونے والا ہے۔ آخر وہ گھڑی آ گئی جس کا انتظار تھا اور حضور ﷺ کو امت مسلمہ سمیت یہ حکم ہوا کہ اب بیت المقدس کی بجائے مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ لہٰذا آیندہ ہر مقام پر نماز کے وقت صرف کعبے کی طرف رخ کیا جائے۔ جب یہ حکم نازل ہوا تو اس وقت آپ ﷺ ظہر یا عصر کی نماز پڑھا رہے تھے۔ نماز کے دوران میں آپ ﷺ نے قبلہ تبدیل کیا اور آپ ﷺ کے پیچھے صحابہ کرام نے بھی اپنا منہ کعبے کی طرف کر لیا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی جگہ پر آج کل مدینے کی مسجد قبلتین واقع ہے۔

﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴾ (144)

اہل کتاب بالخصوص یہود اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا بالکل حق اور درست بات ہے۔ مگر وہ حسد اور دشمنی کے باعث تحویل قبلہ کے اس واقعے پر اعتراض کرتے تھے اور عام مسلمانوں کو بہکانے کی کوشش کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو تنبیہ کے طور پر فرمایا کہ وہ حق بات کو چھپانے اور مسلمانوں کو بہکانے کی جو حرکتیں کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ ان سے بے خبر نہیں ہے بلکہ وہ ان کو ان کے اِن گناہوں کی سزا دے گا۔

﴿ وَلَىِٕنْ اَتَيْتَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ بِكُلِّ اٰيَةٍ مَّا تَبِعُوْا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ﴾ (145)

فرمایا، خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے پر اہل کتاب کے سامنے جو دلیل بھی پیش کی جائے گی، وہ اسے نہیں مانیں گے اور نہ کبھی اس کو اپنا قبلہ بنانے کے لیے تیار ہوں گے، کیونکہ وہ ضد، ہٹ دھرمی اور اندھی تقلید پر ہیں۔ ان کا اپنا حال یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کے قبلے کو نہیں مانتے، بھلا وہ مسلمانوں کے قبلے...... خانہ کعبہ کو کیسے مانیں گے۔

یاد رہے کہ یہودیوں کا قبلہ صخرہ بیت المقدس ہے جو مغرب کی طرف ہے اور عیسائیوں کا قبلہ بیت اللحم ہے، جو بیت المقدس کے مشرق میں ہے۔ اس طرح ایک کا قبلہ مغرب کی جانب اور دوسرے کا مشرق کی جانب ہے۔ دونوں کے رخ الگ الگ ہیں۔

رہا خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا تو یہ سب سے قدیم عبادت گاہ اور سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی قبلہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے نبی ﷺ کے لیے بھی یہی مستقل قبلہ ہے جسے آپ ﷺ چھوڑ نہیں سکتے۔

﴿ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَاۗءَھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ﴾ (145)

یہ نبی ﷺ اور آپ ﷺ کے ذریعے اہل اسلام سے فرمایا گیا کہ قبلے کے معاملے میں صحیح علم اور وحی آ جانے کے بعد اگر تم لوگ اہل کتاب کی خواہشات کی پیروی کرو گے، تو تمہارا شمار ظالموں میں ہو گا، جن کا انجام اچھا نہیں ہے۔

آیت میں خطاب اگرچہ نبی ﷺ سے ہے، مگر اس کے اصل مخاطب عام مومنین ہیں۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دوسروں کی خواہشوں کے پیچھے چلنا کوئی دین داری نہیں، بلکہ یہ ظلم اور بڑا گناہ ہے۔ اسی طرح خود اپنی خواہشات نفس کی پیروی بھی ظلم اور بڑا گناہ ہے۔

اس میں ان نام نہاد علمائے دین کے لیے بھی سخت وعید ہے جو عوام الناس کی خواہشات اور بدعات پر مصلحت کوشی اور مداہنت سے کام لیتے ہوئے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں دیتے بلکہ عوامی خرافات کی بالواسطہ اور بلاواسطہ تائید وحمایت کے مرتکب ہوتے ہیں۔

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ۭ وَ اِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝١٤٦ ﴾ (146)

فرمایا کہ سچے اہل کتاب تو حضرت محمد ﷺ کو نبی کے طور پر ایسے پہچانتے ہیں، جیسے اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں، کیونکہ ان کی مذہبی کتابوں میں اس حوالے سے پیش گوئیاں اور بشارتیں موجود ہیں۔

ایک موقع پر عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے ، جو اسلام لانے سے پہلے ایک یہودی عالم تھے، یہ کہا تھا کہ میں اس نبی ﷺ کو اپنے بیٹے سے بڑھ کر جانتا پہچانتا ہوں۔ اس پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ان سے پوچھا: وہ کیسے؟ انہوں نے جواب دیا: مجھے حضرت محمد ﷺ کے نبی ہونے میں کوئی شک نہیں ہے، جب کہ میرے بیٹے کے بارے میں مجھے شک ہوسکتا ہے کہ شاید اس کی ماں نے مجھ سے خیانت کی ہو۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کا سر چوم لیا۔

پھر فرمایا، اہل کتاب کا ایک گروہ ایسا ہے جو حق کو چھپاتا ہے۔ جسے معلوم ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے سچے نبی ہیں اور خانہ کعبہ ہی مسلمانوں کا اصل قبلہ ہے، مگر وہ جان بوجھ کر لوگوں سے حق بات کو چھپا رہا ہے۔

﴿ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ۝١٤٧ ﴾ (147)

اب نبی ﷺ سے فرمایا گیا کہ قبلے کے بارے میں حق آچکا ہے اور وحی کے ذریعے آپ ﷺ کو بتا دیا گیا ہے کہ اب خانہ کعبہ ہی آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کا قبلہ ہے۔ لہٰذا وحی کے اس حکم کی پیروی کی جائے۔ اس معاملے میں کسی قسم کے شک میں مبتلا نہ ہوں اور مخالفوں کے بے جا اور فضول اعتراضوں کی پروا نہ کی جائے۔

آیت میں اگرچہ خطاب حضور ﷺ سے ہے، مگر اس کے اصل مخاطب وہ مسلمان ہیں، جن کا ایمان ابھی پختہ نہ تھا۔

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ۭ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝١٤٨ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَاِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝١٤٩

وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا
وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۗ
فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ ۗ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ كَمَآ
اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ
وَ الْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِيْ
وَ لَا تَكْفُرُوْنِ ﴿۱۵۲﴾ ع

”(مسلمانو) ہر گروہ کا اپنا قبلہ ہے، جس کی طرف منہ کر کے وہ عبادت کرتا ہے۔ اصل کام یہ ہے، تم نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ تم جہاں بھی ہو گے، اللہ سب کو جمع کر لے گا۔ بے شک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

اب تم جہاں بھی ہو، نماز کے لیے مسجد حرام کی طرف اپنا رخ کیا کرو، یہی تمہارے رب کا سچا حکم ہے۔ (یاد رکھو) تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں۔ اب تم جہاں کہیں بھی ہو، نماز کے لیے مسجد حرام کی طرف اپنا رخ کیا کرو، اور تم جس جگہ بھی ہو، اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔ تاکہ اہل کتاب کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل باقی نہ رہے۔ اگرچہ ان میں سے بے انصاف لوگوں کی زبانیں پھر بھی بند نہ ہوں گی، لیکن تمہیں ان سے نہیں، مجھ سے ڈرنا چاہیے تاکہ میں تمہیں اپنی ساری نعمتیں عطا کر دوں اور تم ہدایت پا جاؤ۔

جیسا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا ہے، تمہیں پاک کرتا ہے، کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور ایسی باتیں سکھاتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے۔ تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ میری نعمتوں کا شکر ادا کرو، میری ناشکری نہ کرو۔“ (148-152)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

لِكُلٍّ:...... (سب کے لیے، ہر ایک کے لیے) لفظ کُلٌّ اگرچہ عام اور سب کے لیے آتا ہے، لیکن کبھی اس سے مخصوص افراد بھی مراد ہوتے ہیں، اس وقت اس کے معنی ہوتے ہیں: ”یہ سب“ لیکن اس کے لیے کوئی قرینہ ہونا چاہیے۔

اس جگہ اس کا قرینہ موجود ہے۔ اس لیے اس سے مراد صرف اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ ہیں۔

اس لفظ کے اس استعمال کی مثالیں قرآن مجید میں موجود ہیں، جیسے سورۃ الانبیاء میں ارشاد ہوا ہے کہ:

﴿وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِدْرِيْسَ وَذَا الْكِفْلِ ؕ كُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (الانبیاء 85:21)

''اور اسماعیل اور ادریس اور ذوالکفل علیہم السلام کو (ہم نے رحمت سے نوازا)۔ یہ سب صابر لوگوں میں سے تھے۔''

وِجْهَةٌ:......اس کے اصل معنی طرف، جانب اور رخ کے ہیں، مگر اس جگہ اس سے مراد قبلہ ہے۔

﴿وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ﴾ (148)

فرمایا، ہر امت کے لیے ایک قبلہ ہے، جس کی طرف رخ کر کے وہ نماز پڑھتے ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے بھی الگ الگ قبلے ہیں اور مسلمانوں کا بھی ایک قبلہ ہے جو کہ خانہ کعبہ ہے۔ کوئی گروہ بھی اپنا قبلہ چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتا۔ اب مسلمانوں کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تمہارے لیے بھی وحی کے ذریعے ایک قبلہ مقرر کر دیا گیا ہے۔ اسی کی طرف منہ کر کے نماز پڑھا کرو۔ دین اسلام میں اصل اہمیت کسی سمت کی نہیں ہے بلکہ دین کی اصل روح نیکیوں میں آگے بڑھنا ہے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ مگر اہل کتاب ان دونوں سے محروم ہیں۔ آگے چل کر آیت برّ (آیت نمبر 177) میں نیکیوں کی تفصیل آ رہی ہے۔

﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۱۴۸﴾ (148)

فرمایا، تم جہاں کہیں بھی دنیا میں رہو گے، ایک دن اللہ تعالیٰ سب کو جمع کر کے ان سے حساب لے گا۔ اصل چیز مقامات اور جہات نہیں ہیں۔ ہر جگہ اور ہر سمت میں کی گئی نیکی اصل شے ہے جو آخرت میں تمہارے کام آسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تمہیں دنیا کے کونے کونے سے اکٹھا کر کے میدانِ محشر میں لے آئے اور تمہاری ہر نیکی بدی کا حساب لے۔ اُس کے لیے سب انسانوں کو موت کے بعد دوبارہ پیدا کرنا اور ان سے ان کے اعمال کا حساب لینا کچھ مشکل نہیں۔

﴿وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اِنَّهٗ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۴۹﴾ (149)

اب یہ دوسری مرتبہ نبی ﷺ کو مخاطب کر کے تاکید کے لیے فرمایا گیا کہ آپ ﷺ جب مدینے میں ہوں یا مدینے سے باہر کہیں بھی ہوں اور کسی مقام پر بھی ہوں، نماز کے وقت اپنا منہ مسجدِ حرام یعنی خانہ کعبہ کی طرف کر لیں، کیونکہ یہی آپ ﷺ کے لیے قبلہ برحق ہے۔

آخر میں اہل ایمان کو خطاب کر کے فرمایا کہ تم جو اعمال بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں کرو گے، اللہ تعالیٰ تمہارے ان اعمال سے بے خبر نہیں ہے، بلکہ وہ سب کچھ جانتا ہے اور تم کو تمہارے اعمال کی پوری جزا دے گا۔

﴿وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ﴾ (150)

اب تیسری مرتبہ تاکید کے لیے نبی ﷺ سے فرمایا گیا کہ آپ ﷺ سفر میں ہوں، یا مقیم ہوں، ہر جگہ نماز کے

وقت خانہ کعبہ کی طرف رخ کریں، جو کہ آپ ﷺ کا قبلہ ہے۔ پھر مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ وہ بھی دنیا میں جہاں کہیں ہوں، نماز کے وقت اپنا منہ کعبے کی طرف رکھیں، کیونکہ ان کے لیے اب یہی مستقل قبلہ ہے۔

تین مرتبہ خانہ کعبہ کی طرف قبلہ رو ہونے کا تاکیدی حکم دینے میں کئی مصلحتیں پوشیدہ تھیں، جن میں سے ایک مصلحت یہ تھی کہ اس طرح اہل کتاب، مشرکین اور منافقین کو تحویل قبلہ پر اعتراض کرنے کے لیے کوئی دلیل ہاتھ نہیں آسکتی تھی۔

اہل کتاب اپنی مذہبی کتابوں کے ذریعے جانتے تھے کہ آنے والا نبی ضرور اسماعیل علیہ السلام کی نسل میں سے ہوگا جن کا قبلہ خانہ کعبہ تھا۔ اس لیے حضرت محمد ﷺ کے لیے بیت المقدس کا مستقل طور پر قبلہ ہونا، اہل کتاب کے حق میں اس بات کی دلیل بن جاتی کہ آنے والا نبی وہ نہیں ہے جس کے پیش گوئی ان کی کتابوں میں تھی۔

دوسری طرف مشرکین مکہ جانتے تھے کہ حضرت محمد ﷺ ابراہیم علیہ السلام کی نسل میں سے ہیں اور انہی کے دین وملت کی تجدید کے لیے آئے ہیں، اس لیے ان کا مستقل قبلہ صرف وہی ہوسکتا ہے جو ان کے جدِ امجد ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کا بنایا ہوا کعبہ ہے۔

پھر جب ان دونوں گروہوں کے ہاتھ میں اعتراض کے لیے کوئی دلیل نہ رہی تو منافقین بھلا اپنے اعتراض کے حق پر کہاں سے کوئی دلیل لا سکتے تھے؟

﴿ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ ﴾ (150)

پھر مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ تحویل قبلہ میں دوسری مصلحت یہ ہے کہ اب اس پر اعتراض کرنے والوں میں صرف وہی لوگ رہ جائیں گے جو حسد اور دشمنی میں گرفتار ہیں اور بحث برائے بحث کے قائل ہیں، تو ان سے ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایسے لوگ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ تمہارے دل میں صرف اللہ تعالیٰ کا خوف ہونا چاہیے اور تمہیں اُس کے احکام کی اطاعت کر کے دنیا اور آخرت میں کامیابی حاصل کرنی چاہیے۔

﴿ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ (150)

یہ تحویل قبلہ کے حکم میں تیسری مصلحت ہے کہ خانہ کعبہ کی مرکزیت قائم ہونے کا مطلب ہے کہ اب بیت المقدس کی مرکزیت ختم ہوگئی ہے۔ نبوت ورسالت اور امامت وپیشوائی اب بنی اسرائیل کے گھرانے سے نکال کر بنی اسماعیل کے خاندان کی طرف منتقل کر دی گئی ہے۔ امت مسلمہ کے لیے خانہ کعبہ کا قبلہ اور دینی مرکز ہونا، اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے، جس میں امت کے لیے بے شمار مادی اور روحانی فائدے رکھے گئے ہیں۔ یہ ان عظیم نعمتوں، برکتوں اور سعادتوں میں سے ہے جن سے اللہ تعالیٰ نے اس امت کو نوازا ہے۔ یہ امت کے اتحاد کی علامت اور ان کے لیے ہدایت کا مرکز ہے۔ پھر اسی امت پر دین وشریعت کی تکمیل ہوئی جو اس کے لیے دنیا اور آخرت کی کامیابیوں اور سعادتوں کی امین اور ضامن ہے۔

﴿ كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَ يُزَكِّيْكُمْ وَ يُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَ يُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (151)

اب مسلمانوں سے فرمایا گیا کہ خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا، تمہارے لیے اللہ تعالیٰ کا اسی طرح کا انعام ہے جیسے اس نے تمہارے درمیان اپنا عظیم الشان آخری رسول بھیجا ہے، جو تمہیں قرآن کی آیتیں سناتا، گناہوں سے پاک کرتا اور اللہ کی کتاب اور حکمت و دانائی سکھاتا ہے اور تمہیں ایسی باتوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم اس سے پہلے نہیں جانتے تھے۔

اس آیت کی تفسیر کے لیے سورۃ بقرہ کی آیت 129 کی تفسیر بھی دیکھ لی جائے۔

بالکل اسی مضمون کی درج ذیل دو آیتیں بھی ہیں، جو ان کی نظیریں ہیں:

پہلی آیت آل عمران میں ہے:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾

(آل عمران 164:3)

”بے شک اللہ نے ایمان والوں پر احسان کیا کہ انہی میں سے ان کے پاس ایک رسول بھیجا، جو انہیں اللہ کی آیتیں سناتا، ان کو پاک کرتا اور کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، جب کہ اس کی بعثت سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔“

اسی مضمون کی دوسری آیت سورۂ الجمعہ میں اس طرح آئی ہے۔

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۗ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (الجمعہ 62:2)

”وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں انہی میں سے ایک رسول بھیجا، جو ان کو اللہ کی آیتیں پڑھ کر سناتا، انہیں پاک کرتا اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالاں کہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔“

﴿ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ﴾ (152)

اب مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ یہ وعدہ فرما رہا ہے کہ اگر تم مجھے یاد رکھو گے تو میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا۔ اس کا مطلب ہے کہ اگر تم دل و جان سے میری سچی اطاعت کرو گے تو میں اس کے بدلے میں تمہیں دنیا اور آخرت میں سربلندی اور کامیابی عطا کروں گا۔

یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر میں زبان سے اس کی حمد و تسبیح، دل میں اس کی یاد، قرآن مجید کی تلاوت، کائنات میں غور وفکر اور نماز سمیت ہر قسم کی عبادت و اطاعت شامل ہے۔

ایک متفق علیہ حدیث قدسی ہے، جس میں سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ

اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ:

((اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِيْ بِيْ۔ وَاَنَا مَعَهٗ اِذَا ذَكَرَنِيْ فِيْ نَفْسِهٖ ذَكَرْتُهٗ فِيْ نَفْسِيْ، وَاِنْ ذَكَرَنِيْ فِيْ مَلَاٍ، ذَكَرْتُهٗ فِيْ مَلَاٍ هُمْ خَيْرٌ مِنْهُمْ، وَاِنْ تَقَرَّبَ مِنِّيْ شِبْرًا، تَقَرَّبْتُهٗ اِلَيْهِ ذِرَاعًا، وَاِنْ تَقَرَّبَ اِلَيَّ ذِرَاعًا، تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا، وَاِنْ اَتَانِيْ يَمْشِيْ اَتَيْتُهٗ هَرْوَلَةً))

(صحیح بخاری، رقم: 7505۔ صحیح مسلم، رقم: 6829)

''میں ویسا ہی کرتا ہوں، جیسا میرا بندہ میرے بارے میں گمان رکھتا ہے۔ وہ جب مجھے یاد کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ جب وہ مجھے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اسے دل میں یاد کرتا ہوں۔ جب وہ دوسروں کے سامنے مجھے یاد کرتا ہے تو میں اسے ایسی جماعت کے سامنے یاد کرتا ہوں جو اس کی جماعت سے بہتر ہے۔ اگر وہ ایک بالشت میرے قریب آتا ہے تو میں دو ہاتھ اس کے قریب ہو جاتا ہوں اگر وہ میری طرف چل کر آتا ہے تو میں اس کی طرف دوڑ کر آتا ہوں۔''

اس کے بعد فرمایا کہ میرا شکر ادا کرو اور میری ناشکری نہ کرو۔ کیونکہ نعمت ملنے پر اللہ تعالیٰ کا شکر کرنے سے نہ صرف یہ کہ اس کا حق ادا ہو جاتا ہے بلکہ اس سے مزید نعمتیں ملتی ہیں اور ناشکری کی صورت میں نہ صرف نعمت چھن جاتی ہے بلکہ کفرانِ نعمت کی سزا بھی ملتی ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ اِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَ لَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۝﴾

(ابراھیم 7:14)

''اور یاد کرو جب تمہارے رب نے اعلان فرمایا کہ ''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا۔ لیکن اگر تم ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا سخت ہے۔''

اس آیت میں مسلمانوں کو تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ پہلی امتوں کی طرح کبھی نعمتوں کی ناشکری نہ کریں، ورنہ وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی نعمتوں سے محروم ہو جائیں گے۔ بلکہ خدائی قہر و غضب کا شکار ہو کر دنیا میں ذلت و غلامی اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کے عذاب کا نشانہ بنیں گے۔

تاریخِ اسلامی گواہ ہے کہ مسلمان جب تک اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند رہے اور اس کی عطا کردہ نعمتوں کا شکر ادا کرتے رہے اُس وقت تک وہ دنیا میں سربلند اور غالب رہے اور جب انہوں نے احکامِ الٰہی سے منہ موڑا، نافرمانی اور ناشکری کا رویہ اختیار کیا تو ذلت و رسوائی اور زوال و انحطاط ان کا مقدر بنا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ وَ لَا
تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵۴﴾
وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ
وَ الثَّمَرٰتِ ؕ وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۵﴾ الَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْۤا اِنَّا
لِلّٰهِ وَ اِنَّاۤ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۱۵۶﴾ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ
اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۷﴾

’’اے ایمان والو! ہر مشکل میں صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔ بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔
اور جو اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں ان کو مردہ نہ کہو، وہ زندہ ہیں مگر تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں۔
ہم تمہیں بعض آزمائشوں میں ضرور مبتلا کریں گے، جیسے دشمن کا خوف وخطرہ، فاقے کا ڈر، مال و جان کا نقصان اور قحط سالی۔ پھر خوشخبری دیجیے، صبر کرنے والوں کو، جن پر مصیبت آتی ہے تو کہتے ہیں: ’’ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔‘‘ یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے رب کی طرف سے بخشش اور رحمت ہے اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔‘‘ (157-153)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اَلْاَمْوَالِ:...... یہ مال کی جمع ہے۔ اس سے مراد مویشی جانور ہیں، کیونکہ عربوں کا زیادہ تر مال ان کے مویشی جانور ہی تھے۔ جیسے اونٹ، گائے، بکری اور بھیڑ وغیرہ۔ پنجابی زبان میں بھی مویشی جانوروں کو ’’مال ڈنگر‘‘ کہتے ہیں۔ اموال کے بعد ثمرات کا الگ سے ذکر بھی اسی مفہوم کی تائید کرتا ہے ورنہ وہ بھی اموال میں شامل تھے۔

صَلَوٰتٌ:...... یہ صَلَاةٌ کی جمع ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہو تو اس سے انسانوں کے درجات کی بلندی مراد ہے۔ فرشتوں کی طرف سے ہو تو استغفار اور بندوں کی طرف سے ہو تو دعا ہوتی ہے۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ ﴾ (153)

تحویل قبلہ کے بعد مسلمانوں کو امامت اور اقامتِ دین کا جو عظیم الشان کام سونپا گیا، اس کی راہ میں آنے والی مشکلات ومصائب کا مقابلہ کرنے کے لیے دو چیزوں سے مدد لینے کا حکم دیا گیا۔ ایک صبر اور دوسری نماز۔
صبر انسان کے باطنی اعمال میں سب سے مشکل چیز ہے اور نماز اس کے ظاہری اعمال میں سب سے زیادہ مشکل

کام ہے۔ اس لیے صرف انہی دو سے مدد طلب کرنے پر اکتفا کیا گیا۔

ہر اہم کام میں صبر کی ضرورت ہوتی ہے اور دین کے علم برداروں کے لیے یہ نہایت ضروری ہے۔ صبر سے مراد بے بسی اور بے چارگی یا رودھو کر چپ ہو جانا نہیں ہے بلکہ اس میں ثابت قدمی، استقامت اور ناخوشگوار حالات میں اپنے موقف پر ڈٹے رہنے کا مفہوم ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کی مدد فرماتا ہے۔

اس طرح نماز بھی وہی مطلوب ہے جو محض رسمی نہ ہو بلکہ اپنے تمام آداب و شرائط اور خشوع و خضوع سے ادا ہونے والی نماز مراد ہے۔ ایسی نماز ہی انسان کو نہ صرف برائیوں سے روکتی بلکہ مصیبت میں گھبرانے سے بھی باز رکھتی ہے۔ فرض نماز کے علاوہ نفلی نمازوں کا اہتمام بھی ہونا چاہیے۔ اسی سے ایک مومن کا اللہ تعالیٰ سے تعلق مضبوط ہوتا ہے اور اسے روحانی غذا ملتی رہتی ہے جس سے اس کا حوصلہ بلند رہتا ہے۔

﴿وَ لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝١٥٤﴾ (154)

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب غزوۂ بدر میں چودہ (14) مسلمان شہید ہو گئے تو کچھ لوگوں نے ان کے بارے میں کہہ دیا کہ وہ تو مر کھپ گئے ہیں اور دنیا کے عیش و آرام سے محروم ہو چکے ہیں۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل کی اور فرمایا کہ میری راہ میں جان دینے والوں کو مردہ نہ کہو۔ وہ عالمِ برزخ میں زندہ ہیں اور ان کو ایک ایسی راحت و آرام والی زندگی میسر ہے جس کا تمہیں شعور نہیں ہو سکتا۔

سورۂ آلِ عمران کی ایک آیت میں، جو اس آیت کی نظیر ہے، یہاں تک فرمایا کہ عالمِ برزخ میں شہید نہ صرف زندہ ہوتے ہیں، بلکہ ان کو وہاں روزی بھی ملتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے انعامات ملنے پر خوش بھی ہوتے ہیں:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (آل عمران 3:169،170)

''اور ان لوگوں کو جو اللہ کی راہ میں شہید ہو جائیں، مردہ نہ سمجھو۔ وہ اپنے رب کے ہاں زندہ ہیں اور انہیں روزی ملتی ہے۔ وہ اس پر خوش ہیں جو اللہ نے ان پر فضل فرمایا۔ اور جو لوگ ان کے پیچھے دنیا میں ہیں اور ابھی تک ان سے ملے نہیں، ان کے بارے میں بھی یہ خیال کر کے خوش ہوتے ہیں کہ ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔''

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((اَرْوَاحُهُمْ فِيْ جَوْفِ طَيْرٍ خُضْرٍ ، لَهَا قَنَادِيْلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ ، تَسْرَحُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ شَاءَتْ......)) (صحیح مسلم، رقم: 4885)

''اُن (شہیدوں) کی روحیں سبز رنگ کے پرندوں کے پیٹ میں ہوتی ہیں۔ ان کی قندیلیں عرش کے

ساتھ لٹکی ہوئی ہیں۔ وہ جنت (کے پھلوں) سے جہاں سے چاہتے ہیں، کھاتے ہیں۔"

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو یہ ہرگز پسند نہیں اور اس کی غیرت یہ گوارا نہیں کرتی کہ جو اس کی راہ میں اس کے دین کی سربلندی کے لیے شہید ہو، اسے عام مرنے والوں کی طرح کا مردہ کہہ کر پکارا جائے۔

﴿وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَ الْجُوْعِ وَ نَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَ الْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ﴾

(155)

اِس آیت میں اُن آزمائشوں کا تفصیلی ذکر ہے جو راہِ حق میں اہل ایمان کو پیش آ سکتی ہیں اور جن کی طرف آیت 153 میں ہلکا سا اشارہ کیا گیا تھا کہ مشکل حالات میں صبر اور نماز سے مدد لینی چاہیے۔

سب سے پہلے دشمنوں کے خوف کی آزمائش بیان ہوئی، پھر بھوک اور قحط سالی، پھر مال و دولت میں کمی اور نقصان، پھر اپنی اور اپنے عزیز و اقارب کی جانوں کی قربانی اور آخر میں پھلوں، فصلوں اور زرعی پیداوار میں کمی کا ذکر ہوا۔ اس طرح انسان کے لیے دنیا میں جس قدر آزمائشیں ہو سکتی تھیں، ان سب کو چند الفاظ میں سمیٹ کر بیان کر دیا گیا۔

اس آیت سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ ایمان لانے کے بعد ضروری نہیں کہ ایک مسلمان کو دنیا میں خوشحالی اور امن وچین کی زندگی ملے گی۔ ایمان لانا اس بات کی ضمانت نہیں ہے کہ یہ دنیا مومن کے لیے پھولوں کی سیج بن جائے۔ بلکہ تاکید اور حصر کے ساتھ فرمایا کہ اہل ایمان کو یہ آزمائشیں ضرور پیش آئیں گی۔ اس لیے اس کانٹوں بھری راہ پر قدم رکھنے سے پہلے وہ اچھی طرح سوچ سمجھ لیں۔

یہ سوادِ کوئے جاناں ، یہ قدم قدم بلائیں
جنہیں زندگی ہو پیاری ، وہ یہیں سے لوٹ جائیں

شاعرِ مشرق بھی اس راز کو سمجھ کر کہتا ہے:

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا اِلٰہ را

"جب میں اپنے آپ کو مسلمان کہتا ہوں تو کانپ جاتا ہوں، کیونکہ میں جانتا ہوں کہ لَا اِلٰہ یعنی کلمہ طیبہ پڑھنے کے بعد کیا کیا مشکلات پیش آ سکتی ہیں۔"

انبیائے کرام علیہم السلام سے بڑھ کر کس کا درجہ اور مقام ہو سکتا ہے مگر معلوم ہے کہ ان حضرات کو بھی سخت آزمائشوں اور کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑا۔

صحیح حدیث میں ہے کہ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کن لوگوں پر سب سے زیادہ آزمائشیں آتی ہیں؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلْاَنْبِیَاءُ ثُمَّ الصَّالِحُوْنَ)) "کہ نبیوں پر اور ان کے بعد نیک

لوگوں پر۔" (الصحیحہ، رقم: 144۔ ابن ماجہ، رقم: 4024۔ مستدرک حاکم: 307/4)

البتہ ایسے حالات میں صبر و استقامت سے کام لینا چاہیے۔ اسی میں ہمارے لیے اجر و ثواب اور آخرت میں کامیابی ہے۔ آیت کی نظیر اور وضاحت کے لیے اگر قرآن مجید کے درج ذیل مقامات بھی پیش نظر رکھے جائیں تو اس مضمون کی پوری حقیقت سامنے آ جائے گی۔

1۔ ﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝﴾ (البقرہ 214:2)

"کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ تم آرام سے جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالاں کہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے، جو پہلے لوگوں کو پیش آئے تھے۔ وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوئے، انہیں جسمانی تکلیفیں دی گئیں اور خوف و ہراس نے ان کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ یہاں تک کہ وقت کا رسول اور اس کے ایمان والے ساتھی کہنے لگے، اللہ کی مدد کب آئے گی؟" جان لو کہ اللہ کی مدد قریب ہے۔"

2۔ ﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْۤا اَنْ يَّقُوْلُوْۤا اٰمَنَّا وَ هُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَ لَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَ لَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ (العنکبوت 3,2:29)

"کیا لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کو اُن کے یہ کہنے پر چھوڑ دیا جائے گا کہ "ہم ایمان لائے۔" اور ان کی آزمائش نہ ہوگی؟ ہم نے ان کو بھی آزمایا جو ان سے پہلے ہو گزرے۔ اس طرح اللہ ان لوگوں کو ظاہر کر دے گا جو سچے ایمان والے ہیں اور ان کو بھی جو جھوٹے ہیں۔"

اس موقع پر حدیث خباب (رضی اللہ عنہ) کو بھی سامنے رکھنا چاہیے جو کہ صحیح بخاری میں ہے کہ:

"حضرت خباب بن ارت تمیمی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ: ہم نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرکینِ مکہ کی زیادتیوں کی شکایت کی۔ اس وقت آپ صلی اللہ علیہ وسلم خانہ کعبہ کے سائے میں ایک دھاری دار چادر کا سرہانا بنائے تشریف فرما تھے۔ ہم نے عرض کیا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس بارے میں اللہ تعالیٰ سے دعا کریں؟ یہ سنا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اٹھ کر بیٹھ گئے۔ چہرہ مبارک سرخ ہو گیا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

تم سے پہلے ایسے لوگ بھی ہو گزرے ہیں کہ ان میں سے کسی کے لیے زمین میں گڑھا کھودا جاتا۔ پھر آرہ لا کر اس کے سر پر رکھ دیا جاتا، جس سے اس کے جسم کے دو ٹکڑے کر دیے جاتے۔ مگر یہ ظلم و ستم بھی اس کو اس کے دین سے نہ ہٹا سکتا۔ کبھی کسی کے جسم کے گوشت، ہڈیوں اور پٹھوں میں لوہے کی کنگھے دھنسا دیے جاتے۔ مگر یہ چیز بھی اسے اس کے دین سے ہٹا نہ سکی۔

اللہ کی قسم! یہ دین مکمل ہو کر رہے گا، یہاں تک کہ ایک سوار صنعا (یمن) سے حضرِ موت تک سفر کرے گا۔ اسے

اللہ کے خوف کے سوا راستے میں کسی چیز کا خوف نہ ہوگا۔ البتہ بکریوں کے لیے بھیڑیے کا ڈر رہے گا۔ لیکن تم لوگ جلدی کرتے ہو۔" (صحیح بخاری، رقم: 3612۔ مسند احمد ، رقم: 27759۔ مشکوٰۃ، رقم: 5858)

﴿وَ بَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ o الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ o﴾

(156,155)

فرمایا، مشکل حالات میں صبر کرنے والے مومنین کے لیے خوش خبری ہے، جو ہر قسم کی آزمائش میں پورے اترتے اور ہر امتحان کے وقت ثابت قدم رہتے ہیں۔ ایسے موقع پر ان کی زبان سے صرف یہی الفاظ ادا ہوتے ہیں کہ: ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ مطلب یہ ہے کہ ہم اللہ کے بندے اور اسی کی ملکیت ہیں۔ اس فانی دنیا کے بعد آخرت کی دائمی زندگی میں اللہ سبحانہٗ کے سامنے پیش ہونے والے ہیں اور اسی سے اجر و ثواب کی امید رکھتے ہیں۔ اصطلاح میں ان الفاظ کو "اِسترجاع" کہا جاتا ہے۔

صحیح مسلم میں اُمّ المومنین سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی مرفوع روایت ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ:

((مَا مِنْ عَبْدٍ تُصِيْبُهٗ مُصِيْبَةٌ فَيَقُوْلُ مَا اَمَرَهُ اللّٰهُ: اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ، اَللّٰهُمَّ اْجُرْنِيْ فِيْ مُصِيْبَتِيْ وَاَخْلِفْ لِيْ خَيْرًا مِنْهَا...... اِلَّا اَخْلَفَ اللّٰهُ لَهٗ خَيْرًا مِّنْهَا))

(صحیح مسلم، رقم: 2126)

"جب کسی بندے پر کوئی مصیبت آتی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق یہ کہتا ہے کہ ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ اے اللہ! میری اس مصیبت پر (صبر کرنے کا) مجھے اجر عطا کر، اس کا مجھے نعم البدل عطا فرما......تو اللہ تعالیٰ اسے بہتر بدلہ عطا فرمائے گا۔"

اسلام میں ہر مصیبت پر ﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ﴾ کہنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ یہ الفاظ صرف کسی شخص کی وفات پر ہی کہنے کے لیے مخصوص نہیں ہیں، بلکہ اگر کسی کو معمولی کانٹا بھی چبھے، یا وہ راہ چلتے ہوئے کہیں پھسل جائے، تو بھی اسے یہ کلمات کہنے چاہئیں۔

یاد رہے کہ کسی بڑے صدمے کے وقت، یا کسی عزیز کی وفات کے موقع پر آنکھوں سے آنسو جاری ہو جانا صبر کے خلاف نہیں ہیں، کیونکہ ایسا ہونا رحمت اور ایک فطری و قدرتی بات ہے۔ البتہ ایسی حالت میں واویلا، بین اور جزع فزع کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

سیدنا انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ خود نبی کریم ﷺ کے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ جب فوت ہوئے، تو آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوئے اور فرمایا:

((اِنَّ الْعَيْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبُ يَحْزَنُ، وَلَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا يَرْضٰى رَبُّنَا، وَاِنَّا بِفِرَاقِكَ يَا

اِبْرَاهِيْمُ لَمَحْزُوْنُوْنَ)) (صحیح بخاری، رقم: 1303)

''آنکھ آنسو بہاتی ہے، دل غمگین ہے، لیکن ہم زبان سے وہی بات کہتے ہیں جسے ہمارا رب پسند فرماتا ہے۔ اور اے ابراہیم! ہم تیری جدائی سے غم زدہ ہیں۔''

﴿ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ رَحْمَةٌ ۫ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝١٥٧ ﴾ (157)

ارشاد فرمایا کہ آزمائشوں پر صبر کرنے والے اہل ایمان کے لیے ان کے رب کی طرف سے دنیا اور آخرت میں انعامات، عنایات اور رحمتیں نازل ہوں گی، کیونکہ وہ ہدایت یافتہ ہوتے ہیں اور ہر امتحان میں کامیاب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھتے ہیں اور کبھی مایوس اور بد دل نہیں ہوتے۔

اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ عنایت و رحمت اس طرح ہوتی ہے کہ وہ سخت مشکل حالات میں بھی صبر کا دامن نہیں چھوڑتے، اللہ سبحانہٗ پر بھروسہ رکھتے ہیں اور کبھی حوصلہ (MORALE) نہیں ہارتے۔ ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی مشیّت پر راضی رہتے ہیں۔

اس کے برعکس کافر لوگ جو ایمان سے خالی ہوتے ہیں۔ وہ صدمے اور مصیبت کے وقت مایوسی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بے صبری کی حالت میں اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں، بے فائدہ واویلا کرتے رہتے ہیں اور کبھی خودکشی (SUICIDE) کر کے اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیتے ہیں۔

اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ؕ وَ مَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝١٥٨

''بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس لیے جو شخص بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی کے چکر لگا لے۔ اور جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے تو اللہ قدر دان ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔'' (158)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

شَعَآئِرِ:...... یہ شعیرہ کی جمع ہے جس کے معنی علامت (SYMBOL) یا نشانی کے ہیں۔

شعیرہ کو مَشْعر اور شعائر کو مشاعر بھی کہا جاتا ہے۔ اس سے حج کے مقامات، قربانی اور مساجد وغیرہ مراد ہوتے ہیں۔

حَجَّ:...... حج کے لفظی معنی قصد کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ خانہ کعبہ جانے کا ارادہ کرنا۔

اِعْتَمَرَ:...... (عمرہ کرے) عمرہ کے معنی زیارت کرنے کے ہیں، اصطلاح میں اس سے مراد ہے، خانہ کعبہ کی زیارت کرنا اور دوسرے مناسک ادا کرنا۔

جُنَاحٌ:...... (حرج، تنگی، گناہ) اس کے لفظی معنی جھکنے کے اور مائل ہونے کے ہیں۔ اس جگہ اس سے مراد ''گناہ کی طرف جھکنے'' کے ہیں۔ لَا جُنَاحَ کے معنی ہوں گے، وہ گناہ کی طرف مائل نہیں ہوا۔ گویا اس کو کوئی گناہ نہ ہوگا۔ جیسا کہ ارشاد ہوا۔

﴿وَ اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَ تَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ﴾ (الانفال 8:61)

''اور اگر وہ صلح کی طرف جھکیں، تو آپ ﷺ بھی اس کے لیے جھک جائیں اور اللہ پر بھروسا رکھیں۔''

يَطَّوَّفَ:...... (وہ پھیرے لگائے)۔ یہ اصل میں يَتَطَوَّفَ تھا۔ ''تا'' کہ ''طا'' میں ادغام ہوا ہے۔ اس طواف سے سعی مراد ہے جو کہ حج اور عمرہ کے مناسک میں سے ہے۔

تَطَوَّعَ:...... (وہ خوشی سے کرے) یہ طَوْعٌ سے ہے جس کے معنی ہیں، کوئی کام اپنی خوشی اور مرضی سے کرنا۔ لیکن اس لفظ کا اطلاق عام طور پر نیکی کے اس کام کو برضا و رغبت کرنے کے آتے ہیں، جس کا کرنا شریعت میں فرض یا واجب نہ ہو بلکہ نفل یا مستحب ہو۔

شَاكِرٌ:...... یہ شکر سے اسم فاعل ہے۔ اس کی نسبت بندے کی طرف ہو تو اس کے معنی ہیں شکر کرنے والا۔ لیکن جب اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ قدردان یا نیکی پر اچھا بدلہ دینے والا۔

یہ لفظ بھی ان الفاظ میں سے ہے جن کے معنی نسبت تبدیل ہونے سے بدل جاتے ہیں، جیسے صلاۃ اور توبہ وغیرہ۔

﴿اِنَّ الصَّفَا وَ الْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ﴾ (158)

تحویل قبلہ اور خانہ کعبہ کے ذکر کی مناسبت سے اب صفا اور مروہ کو اس آیت میں بیان کیا گیا ہے جو خانہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں اور جن کے نشانات آج بھی موجود ہیں۔ فرمایا صفا اور مروہ کی یہ دونوں پہاڑیاں شعائر اللہ میں سے ہیں۔ شعائر اللہ سے مراد دین کی وہ ظاہری نشانیاں اور علامتیں (SYMBOLS) ہیں جن میں اس کی خاص حقیقتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ خانہ کعبہ سمیت حج و عمرہ کے تمام مناسک اور ان کے مقامات شعائر اللہ ہیں۔ اسی طرح اذان، نماز اور قربانی بھی شعائر اللہ میں سے ہیں۔ تمام شعائر اللہ کا احترام اور ان کی تعظیم ضروری ہے۔ یہ شریعت میں مقرر اور منصوص ہیں ان میں قیاس و اجتہاد کا دخل نہیں اور نہ اس کے ذریعے ان کو بدلا جا سکتا ہے۔

﴿فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ (158)

دورِ جاہلیت میں مشرکین نے صفا اور مروہ پر دو بت اساف اور نائلہ رکھ دیئے تھے اور وہ انہی کے احترام میں سعی کرتے تھے۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ اصل میں صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا تعلق مناسک حج و عمرہ سے ہے پھر جب مسلمانوں کو ان دونوں مقامات کے درمیان سعی کا حکم ہوا تو ان کو تردد ہوا کہ کہیں وہ بتوں کی موجودگی میں سعی کر کے شرک کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابھی ان بتوں کی موجودگی میں بھی سعی کر لینے میں کوئی حرج یا گناہ نہیں ہے۔

بظاہر قرآن کے الفاظ سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ سعی کرنے یا نہ کرنے، دونوں کی اجازت ہے۔ مگر جب نبی ﷺ

نے عمرے اور حج میں سعی فرمائی اور اسے بھی مناسک میں شمار کیا تو پھر یہ سعی بھی ایک لازمی حکم بن گیا جو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں فرض اور احناف کے نزدیک واجب ہے۔

بعض لوگ جو دین میں حدیث وسنت کی اہمیت کے قائل نہیں ہیں اور اسے دین کا حصہ تصور نہیں کرتے وہ قرآنی عبارت ﴿فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا﴾ کے مفہوم کو کھینچ تان کر مجبوراً اسی کے اندر سے سعی کا واجب حکم کشید کرتے ہیں۔حالانکہ اس واجب حکم کی بنیاد اور ماخذ حدیث وسنت ہے نہ کہ قرآن۔ کیونکہ قرآن سے تو سعی کا صرف مباح اور جائز ہونا ہی ثابت ہوتا ہے۔

اسی طرح بعض لوگ منیٰ کی بجائے مروہ کو اصل قربان گاہ سمجھتے ہیں اور دعویٰ کرتے ہیں کہ سیدنا اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا واقعہ یہیں پیش آیا تھا۔مگر کتاب وسنت یا اجماع امت سے ان کے اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں ملتی۔

صفا اور مروہ کے درمیان کا پس منظر وہی ہے جو حضرت ہاجرہ نے اپنے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کے لیے پانی کی تلاش میں ان دونوں مقامات کے درمیان چکر لگائے تھے۔حج اور عمرے میں سعی کرنے کا حکم اسی واقعے کی یادگار کے طور پر ہے۔

﴿وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (158)

فرمایا: شریعت کے احکام میں فرائض و واجبات کے علاوہ نفلی کام بھی ہوتے ہیں اور ان پر بھی ثواب ملتا ہے۔ جو شخص خوش دلی سے کوئی نفلی کام جیسے نفلی حج، نفلی عمرہ، نفلی صدقہ یا نفلی نماز وغیرہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی اس نیکی کو جانتا ہے، اس کی قدر کرتا ہے اور اس پر اجر وثواب دیتا ہے۔

گویا اس مقام پر قرآن مجید نے نفل اور مستحب کاموں کے کرنے کی ترغیب دی ہے۔احادیث میں بھی نفلی عبادت پر ثواب ملنے کا ثبوت ملتا ہے اور اسے تقرب الی اللہ کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔

صحیح بخاری میں حدیث قدسی ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

((مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِيْ بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ. وَمَا يَزَالُ عَبْدِيْ يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِيْ يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِيْ يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِيْ يَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِيْ يَمْشِيْ بِهَا وَإِنْ سَأَلَنِيْ لَأُعْطِيَنَّهُ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِيْ لَأُعِيذَنَّهُ وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِيْ عَنْ نَفْسِ الْمُؤْمِنِ يَكْرَهُ الْمَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَائَتَهُ)) (صحيح بخاری، رقم: 6502)

''جو شخص میرے کسی ولی (دوست) سے دشمنی کرتا ہے تو میں اس کے خلاف اعلان جنگ کرتا ہوں۔ میرا کوئی بندہ صرف فرائض کے ذریعے مجھ سے زیادہ قریب نہیں ہو جاتا بلکہ نوافل کے ذریعے بھی میرا قرب حاصل کرتا ہے، یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں تو میں اس کا وہ کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے، اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس

سے وہ دیکھتا ہے، اس کا ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے، اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جن سے وہ چلتا ہے۔ وہ اگر مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اسے دیتا ہوں وہ اگر میرے ذریعے سے کسی چیز سے پناہ مانگتا ہے تو میں اسے پناہ دیتا ہوں۔ میں جو کچھ کرتا ہوں اس کے کرنے میں مجھے اتنا تردد نہیں ہوتا جتنا مجھے اس مومن بندے کی جان کے بارے میں تردد ہوتا ہے۔ وہ موت کو ناپسند کرتا ہے اور میں اسے تکلیف دینے کو ناپسند کرتا ہوں۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِى الْكِتٰبِۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَۙ ﴿۱۵۹﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۶۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِيْنَۙ ﴿۱۶۱﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

''جو لوگ ہماری نازل کی ہوئی نشانیوں اور ہماری ہدایت کو چھپاتے ہیں، جب کہ ہم نے ان لوگوں کی رہنمائی کے لیے اپنی کتاب میں کھول کر بیان کر دیا ہے تو اللہ ایسے لوگوں پر لعنت بھیجتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے والے بھی لعنت بھیجتے ہیں۔ البتہ جو لوگ توبہ کر لیں، اپنی اصلاح کر لیں اور حق بات کو بیان کر دیں تو میں انھیں معاف کر دوں گا۔ کیونکہ میں معاف کرنے والا اور مہربان ہوں۔
مگر جو لوگ کافر ہو گئے اور اسی حال میں مر گئے، ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور سب انسانوں کی لعنت ہے۔ وہ ہمیشہ اسی لعنت میں گرفتار رہیں گے نہ ان کے عذاب میں کمی کی جائے گی اور نہ انھیں ڈھیل دی جائے گی۔''

(162-159)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

يَكْتُمُوْنَ:...... یہ کتمان سے ہے جس کے معنی چھپانے کے ہیں۔ یہ چھپانا دو طرح سے ہے۔ ایک یہ کہ کسی چیز کو پوشیدہ رکھا جائے اور اسے دوسروں پر ظاہر نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ اصل چیز کو کسی نقلی چیز سے بدل دیا جائے تاکہ اصلی چیز کا پتہ نہ چل سکے۔ گویا کچھ کا کچھ بنا دیا جائے۔

یہودی علماء ان دونوں قسموں کا کتمان (چھپانا) کرتے تھے۔ انھوں نے زنا پر رجم (سنگ ساری) کی سزا کو عام لوگوں

سے چھپا رکھا تھا۔ حالانکہ یہ سزا توریت میں موجود تھی۔ اسی طرح انھوں نے حضرت محمد ﷺ کے اسم گرامی کو اور آپ ﷺ کے بارے میں بہت سی پیش گوئیوں اور نشانیوں کو دوسرے جعلی ناموں سے اس طرح بدل دیا کہ اصل حقیقت نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

اَلْكِتٰبِ :......اس سے مراد تمام آسمانی اور الہامی کتابیں ہیں۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الْهُدٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝﴾ (159)

اسی آیت کے الفاظ اگرچہ عام ہیں مگر اس سے بالخصوص اہل کتاب کے وہ علماء مراد ہیں جن کو حکم تو یہ دیا گیا تھا کہ وہ کتابِ الٰہی کی باتوں کو لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کریں۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ اِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ وَ لَا تَكْتُمُوْنَهٗ ؗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَ اشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝﴾ (اٰلِ عمران : 3 : 187)

”اور جب اللہ نے اہل کتاب سے اس بات کا عہد لیا کہ لوگوں کے سامنے اللہ کی کتاب کو ٹھیک ٹھیک بیان کرنا اور اس کی کوئی بات نہ چھپانا۔ مگر انھوں نے اس حکم کو پسِ پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے میں دنیا کا حقیر مال حاصل کرنے لگے۔ کیسی بری چیز ہے جو انھوں نے خریدی۔“

لیکن اس عہد و پیمان کے باوجود وہ توریت و انجیل میں اللہ تعالیٰ کی فرمائی ہوئی ان واضح نشانیوں اور پیش گوئیوں کو عام لوگوں سے چھپاتے تھے جو آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں تھیں۔ اپنے اسی جرم اور گناہِ عظیم کی وجہ سے وہ دنیا اور آخرت میں اللہ تعالیٰ کی اور اس کی دوسری مخلوقات کی لعنت کے حق دار ٹھہرے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عام لوگوں اور بالخصوص علمائے دین کے لیے حق بات یا علمِ وحی کو چھپانا بہت بڑا گناہ ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ

((مَنْ سُئِلَ عَنْ عِلْمٍ فَكَتَمَهٗ اَلْجَمَهُ اللّٰهُ بِلِجَامٍ مِّنْ نَارٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ))

(ابوداؤد ، رقم: 3658 ۔ ترمذی، رقم: 2649)

”جس سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی مگر اس نے اسے جانتے بوجھتے چھپایا تو قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اسے آگ کی لگام پہنائیں گا۔“

اس آیت سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ہر حال میں انجام دینا چاہیے اور اس بارے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔

﴿اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَ اَصْلَحُوْا وَ بَيَّنُوْا فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَ اَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (160)

اس آیت میں اہل کتاب کے اُن علماء کا ذکر ہے جنھوں نے توریت وانجیل کی پیش گوئیوں کو چھپانے سے توبہ کر لی، اپنی اصلاح کر لی، کھل کر حق بیان کیا اور نبی کریم ﷺ پر ایمان لے آئے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں ان کی توبہ قبول کرتا ہوں کیونکہ میں توبہ قبول کرنے والا، درگزر کرنے والا اور رحم وکرم کرنے والا ہوں۔

دوسرے مقام پر فرمایا کہ ان لوگوں کو ان کے اعمال کا دوہرا اجر ملے گا:

﴿اُولٰٓئِكَ یُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَیْنِ بِمَا صَبَرُوْا﴾ (القصص 28: 54)

''یہی لوگ ہیں جن کو ان کے صبر کے بدلے میں دوہرا اجر ملے گا۔''

اس آیت میں توبہ کرنے کی ترغیب پائی جاتی ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَ مَاتُوْا وَ هُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ النَّاسِ اَجْمَعِیْنَ ۝۱۶۱﴾ (161)

''فرمایا: کہ حق کو چھپانے والے اور مرتے دم تک توبہ نہ کرنے والے کافروں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیشہ کی لعنت ہے۔''

اس کے علاوہ ان پر مزید ذلت اسی وقت مسلط ہوگی جب قیامت کے دن ان پر فرشتے اور تمام انسان بھی لعنت کریں گے۔ وہاں ان کو اپنے لیے اللہ سبحانہٗ کی گرفت سے بچانے والا کوئی حمایتی نہیں ملے گا۔

ویسے تو اللہ تعالیٰ کی لعنت ہی ان کے لیے کافی تھی مگر ایسے لوگوں کا جرم اور گناہ ہی کچھ ایسا ہے کہ مخلوقات میں سے جو ذی شعور بھی ان کی حرکتوں سے آگاہ ہوگا وہ ان پر لعنت بھیجے گا۔

﴿ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ لَا یُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَ لَا هُمْ یُنْظَرُوْنَ ۝۱۶۲﴾ (162)

ارشاد ہوا کہ حق کو چھپانے والے کفار ہمیشہ لعنت میں گرفتار رہیں گے۔ ان کو دائمی عذاب ہوگا۔ وہ مسلسل عذاب میں رہیں گے۔ نہ اس میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ کسی موقع پر ان کے لیے آرام کا کوئی وقفہ ہوگا۔ اب ان کو نہ توبہ فائدہ سے سکتی ہے اور نہ کسی نیکی کے کرنے کا کوئی امکان باقی ہے۔

وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ ۝۱۶۳ اِنَّ فِیْ خَلْقِ ع ۱۹/۱۱/۲
السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی
الْبَحْرِ بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا
بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِیْفِ

الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَّعْقِلُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ
كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ
يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿۱۶۵﴾ اِذْ تَبَرَّاَ
الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ
الْاَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا
تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ
بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ ع ٢٠

''اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ بڑا مہربان اور نہایت رحم کرنے والا ہے۔

بے شک آسمانوں اور زمین کا پیدا ہونا، دن رات کا بدلنا، سمندر میں کشتیوں اور جہازوں کا تیرنا اور ان سے لوگوں کا فائدہ اٹھانا، آسمان سے بارش برسنا اور اس کے ذریعے مردہ زمین کا زندہ ہو جانا، روئے زمین پر طرح طرح کے جانوروں کا پایا جانا، ہواؤں کا چلنا اور زمین و آسمان کے درمیان بادلوں کا حکم کے تابع ہونا، یہ ان لوگوں کے لیے اللہ کی (قدرت کی) کھلی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں۔

مگر کئی لوگ اللہ کے شریک بنا لیتے ہیں۔ ان سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ سے رکھنی چاہیے حالانکہ ایمان والے سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

اور اگر یہ ظالم دیکھ پاتے جب کہ عذاب کے دن دیکھیں گے کہ سارے اختیارات کا مالک صرف اللہ ہے اور وہ سخت عذاب دینے والا ہے۔ وہاں جب شرک کے پجاریوں سے ان کے پیشوا بیزاری ظاہر کریں گے۔ عذاب ان کے سامنے ہوگا اور ان کے سارے سہارے ٹوٹ جائیں گے۔ اس وقت وہ مشرک کہیں گے کاش ہمیں دنیا میں دوبارہ جانا نصیب ہو، پھر ہم بھی ان سے اسی طرح بے زاری ظاہر کریں گے جس طرح انھوں نے ہم سے کی ہے۔ اس طرح اللہ ان کے مشرکانہ اعمال کو ان کے لیے حسرت اور پشیمانی بنا کر دکھائے گا۔ ان کے لیے دوزخ

کی آگ ہوگی جس سے بچ نکلنے کی کوئی صورت نہ ہوگی۔''(163-167)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اِخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ:......اختلاف سے اس مقام پر یہ مراد ہے کہ رات اور دن کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا۔ ایک کی جگہ دوسرے کا آجانا۔ سورۃ الفرقان 62:25 میں اسی کو خِلْفَةً کہا گیا ہے۔

﴿وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا﴾

(الفرقان 62:25)

''اور وہی (اللہ) ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے بعد آنے والا بنایا تا کہ لوگ غور کریں اور شکر گزار بنیں۔''

اَلْفُلْكِ:......کشتی یا سفینہ یہ لفظ واحد، جمع، مذکر اور مونث کے لیے آتا ہے۔

دَابَّةٍ:......اس کی جمع دَوَابٌّ ہے۔عربی زبان میں یہ لفظ کئی معنوں میں آتا ہے:

1۔سواری کے جانوروں کے لیے۔

2۔زمین پر چلنے پھرنے یا رینگنے والے جانوروں کے لیے۔

3۔ ہر جاندار کے لیے جس میں کیڑے مکوڑے، مویشی، پالتو جانور، درندے، سواری کے جانور، پرندے، تمام حیوانات، اور انسان سب شامل ہیں۔

اس آیت میں یہ لفظ اپنے آخری معنوں میں استعمال ہوا ہے اور اس سے ہر قسم کی جاندار (LIVING) چیزیں مراد ہیں۔

اَلْمُسَخَّرِ:...... یہ سَخَّرَ تَسْخِيْرٌ سے اسم مفعول ہے۔تسخیر کا مطلب ہے: کسی چیز کو تابع بنا کر اس کو کسی کی بلا معاوضہ خدمت پر لگا دینا۔ بادل اس لحاظ سے مسخر ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے تابع بنا رکھا ہے اور ان سے جب اور جیسے چاہتا ہے، کام لے لیتا ہے۔انسان کے لیے سورج، چاند، ہوا اور بادل وغیرہ ان معنوں میں مسخر نہیں ہیں کہ وہ اس کے تابع اور قابو میں ہیں اور ان سے وہ جیسے چاہے کام لے سکتا ہے بلکہ ان سب کو اللہ تعالیٰ نے اپنے تابع رکھ کر انسان کی خدمت کرنے اور اسے فائدہ پہنچانے پر لگا دیا ہے۔

اور یہ انسان سے اپنی خدمت کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں یہ نہیں آتا کہ انسانوں نے ان کو مسخر کیا ہے بلکہ یوں آتا ہے کہ ان کو اللہ تعالیٰ نے تمہاری خاطر مسخر کر رکھا ہے۔گویا سَخَّرَ کا فاعل ہمیشہ اللہ تعالیٰ ہی ہے جیسے ارشاد ہوا:

﴿وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ دَآئِبَيْنِ﴾ (ابراھیم: 14 : 33)

''اور اس (اللہ) نے تمہارے لیے سورج اور چاند کو تمہاری خدمت پر لگا دیا یہ دونوں برابر حرکت کر رہے ہیں۔''

اَنْدَادًا :...... یہ نِدٌّ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں: شریک، ہمسر، ساجھی، برابر، مثیل۔

تَبَرَّءَ :......اس کے معنی ہیں سخت بیزاری کا اظہار کرنا۔ شدید نفرت کرنا۔

اَلْاَسْبَابُ :...... یہ سببٌ کی جمع ہے جس کے اصل معنی ہیں: رسی یا رسہ۔

پھر یہ تعلق ذریعے اور واسطے کے مفہوم میں استعمال ہونے لگا۔ یہاں تک کہ آخر میں اس میں کسی چیز کے تمام پہلوؤں کو شامل کرلیا گیا اور یہ ساز وسامان اور وسائل کے معنوں میں لیا جانے لگا۔

کَرَّةٌ :......اس کے معنی ہیں: دنیا میں واپس لوٹنا، دوبارہ آنا۔

حَسَرٰتٍ :...... یہ حَسْرَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی سخت پشیمانی اور شدید ندامت کے ہیں۔

﴿وَ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (163)

فرمایا تمہارا اصل معبود صرف ایک ہے اس کے سوا کسی اور کی عبادت جائز نہیں۔ کیونکہ جب خالق ایک ہے تو معبود بھی ایک ہی ہونا چاہیے۔ جو خالق نہیں ہے وہ معبود نہیں ہوسکتا۔ اکیلا خالق ہی اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اللہ تعالیٰ کی ذات میں، صفات میں اور اختیار و تصرف میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔ یہی توحید ہے جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔

﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۝﴾ (اخلاص : 1)

''کہہ دیجیے، حقیقت یہ ہے کہ اللہ ایک ہے جو وسیع رحمت والا اور ہمیشہ رحمت کرنے والا ہے۔''

﴿اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَ النَّهَارِ وَ الْفُلْكِ الَّتِيْ تَجْرِيْ فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ بَثَّ فِيْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّ تَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ وَ السَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ۝﴾ (164)

توحید کا ذکر کرنے کے بعد اب اس کے دلائل بیان ہوئے ہیں کہ اس کائنات کا پورا نظام اور کارخانہ اللہ سبحانہٗ کے وجود (EXISTENCE) اور اس کی وحدانیت (ONENESS) پر گواہی دے رہا ہے۔ یہ آسمانوں اور زمین کا پیدا ہونا، دن رات کا بدلنا اور ان کا گھٹنا بڑھنا، قانونِ الٰہی کے تحت دریاؤں اور سمندروں میں کشتیوں اور جہازوں کا تیرنا اور ان کے ذریعے انسانوں کے بے شمار فوائد حاصل کرنا۔ بارش کا برسنا اور برف کا گرنا۔ پانی سے زمین کی نباتات کا اگنا، درختوں، پودوں، پھلوں، پھولوں اور فصلوں کا پیدا ہونا۔ روئے زمین پر قسم قسم کے جانوروں اور پرندوں کا بکثرت موجود ہونا، ہواؤں کا چلنا اور ان سے درجہ حرارت میں کمی بیشی اور موسموں کا بدلنا، فضا میں بادلوں کا معلق ہونا۔ یہ سب کچھ ایک

خالق، ایک رب، ایک رحمان و رحیم اور ایک ہی قادرِ مطلق ہستی کے واضح دلائل اور کھلی نشانیاں ہیں، مگر ان کو سمجھنے کے لیے بھی عقل وشعور کی ضرورت ہے۔

وَ فِيْ كُلِّ شَيْءٍ لَهٗ اٰيَةٌ
تَدُلُّ عَلٰى اَنَّهٗ وَاحِدٌ

''اور ہر شے میں اس (اللہ) کی نشانی موجود ہے جو زبانِ حال سے پکار رہی ہے کہ وہ اکیلا ہی ہے۔''

بعض نکتہ شناس علماء کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی دو کتابیں ہیں: ایک کائنات اور دوسرا قرآن، اور ان دونوں کو پڑھنے سمجھنے سے ہدایت ملتی ہے، ورنہ گمراہی کے سوا کچھ نہیں۔

اس کائنات میں موجود نظم (DISCIPLINE) اور مقصدیت (PURPOSENESS) ظاہر کرتی ہے کہ اس کا خالق صرف اور صرف ایک ہی ہے جو بڑا حکیم و دانا ہے۔

یاد رہے کہ توحید کی تعلیم ہی دینِ اسلام کا سب سے بڑا امتیاز ہے جب کہ دوسرے مذاہب اس اعزاز سے محروم ہیں۔

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ﴾ (165)

فرمایا کہ زمین و آسمان میں ہر جگہ پھیلی ہوئی توحید کی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود نادان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے شریک بنا رکھے ہیں۔ وہ ان کی پوجا کرتے ہیں۔ ان سے ایسی عقیدت ومحبت کا اظہار کرتے ہیں جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہونی چاہیے۔ وہ مخلوق کو خالق کے حقوق میں حصہ دار بنا دیتے ہیں۔ فرشتوں، نبیوں، بزرگوں، جنوں، دیوی دیوتاؤں کی پوجا پاٹ کرتے، ان سے دعائیں مانگتے، ان کو فریاد رس سمجھتے، مصیبت میں ان کو مشکل کشا سمجھ کر پکارتے، اور ان کے نام کی نذریں نیازیں چڑھاتے ہیں۔ وہ شرک کے حق میں ایسی باطل اور بودی دلیلیں لاتے ہیں جو حق کے دلائل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتیں۔

﴿وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ﴾ (165)

مراد یہ ہے کہ بت پرستوں اور غیر اللہ کی پوجا کرنے والوں کو جتنی محبت اپنے بتوں یا غیر اللہ سے ہوتی ہے، ان کے مقابلے میں اہلِ ایمان کہیں بڑھ کر اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مشرکین کے بہت سے بے بس معبودان کے محبوب ہوتے ہیں اس طرح ایک ہی دل میں کئی محبتیں جمع ہونے کے بعد باہم تقسیم ہو جاتی ہیں۔ جب کہ اللہ والوں کا دل ایک ہی کارساز اور صاحبِ قدرت معبود کی محبت میں دھڑکتا رہتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک مومن کو دنیا کی ہر چیز سے زیادہ اللہ تعالیٰ ہی محبوب ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی مخلوق سے بھی پیار کرتا ہے تو اس کا وہ پیار بھی اللہ کی محبت کے تابع ہوتا ہے اور جب کبھی مخلوق کے پیار اور اللہ کی محبت میں تصادم (CLASH) واقع ہو جائے تو ہر صاحبِ ایمان شخص ہمیشہ اللہ کی محبت کو مخلوق کے پیار پر ترجیح دیتا ہے۔

﴿وَ لَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْۤا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّ اَنَّ اللّٰهَ

شَدِيْدُ الْعَذَابِ ﴿١٦٥﴾ (165)

فرمایا آج دنیا میں ان مشرکوں اور کافروں کو توحید کی حقیقت سمجھ میں نہیں آتی اور یہ شرک میں غرق ہیں، مگر جب قیامت کے دن سارے حجاب اٹھا دیئے جائیں گے تو یہی ظالم لوگ اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھ لیں گے کہ اللہ تعالیٰ اکیلا ہے، قادر مطلق ہے، صاحبِ قدرت واختیار ہے، اوران کے بنائے ہوئے سب جھوٹے معبود اس کے آگے عاجز اور بے بس ہیں اور اس کے محتاج ہیں۔ وہاں ان کو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ان جیسے سب لوگوں کو سخت عذاب دینے والا ہے جو دنیا میں کفر وشرک میں مبتلا رہے اور اسی حالت میں بغیر توبہ کیے مر گئے تھے۔

﴿اِذْ تَبَرَّاَ الَّذِيْنَ اتُّبِعُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا وَ رَاَوُا الْعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ﴿١٦٦﴾﴾ (166)

ارشاد ہوا کہ آخرت میں مشرک لوگوں سے ان کے جھوٹے معبود بیزاری کا اظہار کریں گے کیونکہ وہ ان کی کوئی مدد نہ کرسکیں گے۔ پھر بتوں اور ان کے پجاریوں، سب کو دوزخ کا عذاب نظر آجائے گا۔ اوران کا وہ باہمی تعلق اور رابطہ جو دنیا میں ہوا کرتا تھا یک قلم ٹوٹ جائے گا۔ ان کی باہم عقیدت والفت ایک دوسرے سے نفرت اور بے زاری میں تبدیل ہو جائے گی۔

اسی مضمون کو ایک اور مقام پر اس طرح فرمایا گیا ہے کہ:

﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ يَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا يَسْتَجِيْبُ لَهٗ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ o وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ o﴾

(الاحقاف : 46 : 5,6)

''اوران لوگوں سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبودوں کو پکاریں جو قیامت تک انھیں جواب نہ دے سکیں۔ بلکہ ان کی پکار سے بھی بے خبر رہیں۔ جب آخرت میں سب لوگ اکھٹے کیے جائیں گے تو یہی جھوٹے معبود اپنے پکارنے والوں کے دشمن ہوں گے اور ان کی پوجا سے انکار کر دیں گے۔''

﴿وَ قَالَ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْا لَوْ اَنَّ لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّاَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوْا مِنَّا ؕ كَذٰلِكَ يُرِيْهِمُ اللّٰهُ اَعْمَالَهُمْ حَسَرٰتٍ عَلَيْهِمْ ؕ وَ مَا هُمْ بِخٰرِجِيْنَ مِنَ النَّارِ ﴿١٦٧﴾﴾ (167)

فرمایا: آخرت میں بتوں کے پیروکار اور غیر اللہ کے پجاری یہ کہیں گے کہ اگر ہمیں دنیا میں دوبارہ جانے کی مہلت مل جائے تو ہم توحید کا عقیدہ اختیار کرلیں گے، نیک اعمال کرنے لگ جائیں گے اور اپنے جھوٹے معبودوں سے اسی طرح بیزاری اور نفرت کا اظہار کریں گے جیسے آج وہ ہمارے ساتھ یہ سلوک کر رہے ہیں۔

اس طرح مشرکوں اور کافروں کے برے اعمال اُن کے لیے پشیمانی، شرمندگی اور ندامت کا باعث ہوں گے۔ اُن کو جہنم کی آگ کے گڑھے میں ڈالا جائے گا جہاں سے بچ کر وہ کبھی باہر نہیں آسکیں گے۔

يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ
الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۱۶۸﴾ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَ الْفَحْشَآءِ وَ اَنْ
تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَاۤ اَنْزَلَ
اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَاۤ اَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا
يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا يَهْتَدُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ
بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً ؕ صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷۱﴾

”اے لوگو! زمین کی چیزوں میں سے جو حلال اور پاکیزہ ہیں وہ کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس کا کام یہی ہے کہ تمہیں برائی اور بے حیائی کے کاموں پر اکسائے اور اللہ کے بارے میں تمہاری طرف سے ایسی باتیں منسوب کرائے جن کے بارے میں تمہیں خود بھی علم نہ ہو۔

اور جب ان (مشرکین) سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایت نازل کی ہے، اس پر چلو تو جواب دیتے ہیں: ہم تو اسی راہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا۔ تو کیا اس اس صورت میں بھی جب ان کے باپ دادا نہ عقل سے کام لیتے ہوں اور نہ سیدھی راہ جانتے ہوں؟

کافروں کی مثال (بھیڑ بکریوں) جیسی ہے جنھیں کوئی چرواہا چلا رہا ہو اور وہ بلانے اور پکارنے کی آوازوں کے سوا کچھ نہ سمجھتی ہوں۔ یہ لوگ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، کچھ نہیں سمجھتے۔“ (168-171)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

خُطُوٰتِ :...... یہ خُطوَۃٌ کی جمع ہے جس کے معنی قدم (FOOT) کے ہیں۔ جب کوئی شخص چل رہا ہوتا ہے تو اس کے دو قدموں کے درمیان جو فاصلہ پیدا ہوتا ہے اسے خُطْوَۃٌ کہا جاتا ہے۔ اِتَّبَعَ خُطُوَاتِہٖ کے معنی ہیں اس نے اس کی پیروی کی۔ یا وہ اس کے طریقے پر چلا۔

مُبِيْنٌ :......اس کے معنی ہیں کھلا، ظاہر، مراد یہ ہے کہ سمجھ دار آدمی پر شیطان کا دشمن ہونا بالکل واضح ہے۔

يَاْمُرُ :...... یہ اَمَرَ کا مضارع ہے۔ امر کے کئی معنی ہیں: حکم دینا، مشورہ دینا، کوئی بات سمجھانا اور وسوسہ ڈالنا، اس جگہ یہ لفظ بات سمجھانے اور وسوسہ ڈالنے کے معنوں میں آیا ہے۔

السُّوْٓءِ :......اس سے ہر برائی مراد ہے۔

اَلْفَحْشَاءِ :......اس سے تمام بڑے گناہ اور کھلی بے حیائی کے کام مراد ہیں۔

اَلْفَيْنَا :......اس کے معنی ہیں وَجَدْنَا (ہم نے پایا)

يَنْعِقُ :...... یہ نَعَقَ سے فعل مضارع ہے۔ اس کے معنی ہیں: چیخنا، چلانا، پکارنا اور آواز دینا۔ نَعَقَ الرَّاعِيُ الْبَهَائِمَ چرواہے نے جانوروں کو پکارا۔

دُعَاءً وَّ نِدَاءً :......ان دونوں کے معنی پکارنے اور آواز دینے کے ہیں لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ ''دعا'' قریب کے لیے ہوتی ہے اور ''ندا'' دور کے لیے۔

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا ۖ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۱۶۸﴾ (168)

اس آیت میں عام لوگوں کو خطاب کر کے ان کو حلال چیزیں کھانے کا حکم دیا گیا ہے اور اس بارے میں شیطان کی پیروی سے روکا گیا ہے کیونکہ وہ انسان کا کھلا دشمن ہے۔ فرمایا کہ ہر حلال اور پاکیزہ چیز کھا پی سکتے ہو۔ حلال وہ ہے جو شریعت میں جائز ہے اور جسے حرام قرار نہیں دیا گیا۔ اسی طرح طیب وہ پاکیزہ، صاف ستھری اور مفید شے ہے، جو گندی، گلی سڑی، بدبودار اور ناپاک نہیں ہے۔

مشرکین کے ہاں حلال و حرام کے بارے میں بہت افراط و تفریط پائی جاتی تھی جس میں وہم پرستی اور غلط رسم و رواج کا دخل تھا۔ قرآن نے اس بارے میں اصلاح کی ہے اور حلال و حرام میں بے اعتدالی کو شیطان کی پیروی قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے شیطان انسانوں کا کھلا دشمن ہے اور ہر وقت ان کو گمراہ کرنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

اسلام میں حلال و حرام کا ضابطہ یہ ہے:

1۔ ہر شے حلال ہے جب تک اس کے حرام ہونے کی شرعی دلیل موجود نہ ہو۔ کیونکہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ اَلْاَصْلُ فِي الْاَشْيَاءِ الْاِبَاحَةُ اصل میں ہر چیز مباح ہوتی ہے۔ اس قاعدے کی دلیل یہ آیت ہے:

﴿هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا﴾ (البقرہ 2: 29)

''وہی ہے جس نے تمہارے (فائدے کے) لیے وہ سب کچھ پیدا کیا جو زمین میں ہے۔''

2۔ کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا اصلاً صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ﴾ (الشوریٰ 42: 21)

''کیا ان مشرکوں نے کچھ ایسے شریک بنا رکھے ہیں جنھوں نے ان کے لیے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی۔''

3۔ بندوں کا از خود کسی چیز کو حلال یا حرام ٹھہرانا شرک اور کفر ہے:

﴿مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّ لَا سَآئِبَةٍ وَّ لَا وَصِيْلَةٍ وَّ لَا حَامٍ ۙ وَّ لٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا

يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ط وَ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴾ (المائدہ 5: 103)

''اللہ نے (بتوں کے نام پر چھوڑے ہوئے جانوروں) بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کو مقرر نہیں کیا۔ مگر جن لوگوں نے کفر کیا، وہ اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔''

4۔ اسلامی شریعت میں صرف وہی شے حرام ہے جس میں بندوں کے لیے کوئی نقصان، مضرت یا خرابی کا پہلو موجود ہے، یا وہ چیز ویسے ہی گندی اور ناپاک ہے۔ ارشاد ہوا کہ:

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ط قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ﴾ (المائدہ 5: 4)

''وہ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں کیا چیز ان کے لیے حلال کی گئی ہے؟ کہہ دیجئے، تمہارے لیے تمام پاکیزہ اور ستھری چیزیں حلال ہیں۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ يُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَ يُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ﴾ (الاعراف 7: 157)

''وہ (رسول ﷺ) ان کے لیے پاکیزہ چیزیں حلال ٹھہراتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔''

5۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حرام چیزوں سے بچانے کے لیے حلال چیزیں مہیا فرمائی ہیں۔

6۔ جو شے کسی حرام چیز کا ذریعہ بنے وہ بھی حرام ہوتی ہے۔ جیسے کسی اجنبی مرد کا کسی عورت سے تنہائی میں ملنا حرام ہے کیونکہ یہ حرام کام کا ذریعہ بن سکتا ہے۔

7۔ حرام کو حلال کرنے کے لیے حیلہ سازی حرام ہے جیسا کہ یہودیوں نے ہفتے کے دن مچھلیوں کے شکار نہ کرنے کے حکم کے بارے میں حیلہ کیا تھا، جس کا تفصیلی ذکر سورۃ الاعراف آیات 163 تا 165 میں آیا ہے۔

8۔ نیک نیتی سے بھی حرام حلال نہیں ہوسکتا۔ جیسے اگر کوئی شخص نیک نیتی سے حرام چیز کھائے گا تو بھی گناہ گار ہوگا۔

9۔ جس چیز میں حرام ہونے کا شبہ ہو، اس سے بچنا تقویٰ ہے۔

10۔ ہر حرام چیز مکمل طور پر حرام ہوتی ہے جیسے شراب کی زیادہ مقدار بھی حرام ہے جس سے نشہ پیدا ہوتا ہے اور اس کی کم مقدار بھی حرام ہے اور اگر چہ اس سے نشہ نہ پیدا ہوتا ہو۔

١١۔ مجبوری اور اضطرار کی حالت میں حرام بھی بقدرِ ضرورت عارضی طور پر حلال ہو جاتا ہے جیسا کہ اگلی آیت میں ہے کہ:

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ﴾ (البقرہ 2: 173)

''پھر اگر کوئی مجبور ہو کر حرام چیز کھا پی لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ وہ حکم توڑنے والا اور حد سے بڑھنے والا نہ ہو۔''

12۔ کھانے پینے کی حرام اشیاء کے علاوہ سود، جوئے، بدکاری، رشوت، چوری، ڈاکہ زنی اور خیانت وغیرہ سے حاصل کی ہوئی کمائی بھی حرام ہے۔

آخر میں شیطان کے بارے میں فرمایا کہ وہ انسان کا کھلا دشمن ہے جو اسے برے کاموں کی طرف بلاتا اور نیکی کے کاموں سے روکتا ہے حرام کو حلال اور حلال کو حرام بتاتا ہے۔

دوسرے مقام پر یہی بات فرمائی گئی ہے کہ:

﴿إِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْإِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ﴾ (یوسف 12:5)

''بے شک شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔''

﴿إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَآءِ وَأَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿١٦٩﴾﴾ (169)

فرمایا کہ شیطان تمہارے دلوں میں یہی وسوسہ ڈالتا ہے کہ تم برائی اور بے حیائی کے کام کرو جس سے تمہاری دنیا بھی برباد ہو اور آخرت بھی تباہ ہو۔ وہ چاہتا ہے کہ تم اللہ کے بارے میں جاہلانہ اور مشرکانہ باتیں اور حرکتیں کرو۔ دین کی واضح تعلیمات اور محکم احکامات کو چھوڑ کر متشابہات اور اوہام (SUPERSTITION) کے پیچھے پڑو۔ اپنی خواہشِ نفس سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھ لو۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں گمراہ کن عقائد و نظریات اختیار کر لو مثلاً یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ ہم گناہ گاروں کی دعا قبول نہیں کرتا جب تک ہم کسی فوت شدہ بزرگ یا ولی کے وسیلے اور واسطے سے دعا نہ کریں۔ حالانکہ اللہ سبحانہٗ نے قرآن میں اعلان کر رکھا ہے کہ:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (المومن 40:60)

''اور تمہارے رب نے فرما دیا ہے کہ ''مجھے پکارو'' میں تمہاری پکار کو سنوں گا۔''

﴿وَإِذَا قِيْلَ لَهُمُ اتَّبِعُوْا مَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا بَلْ نَتَّبِعُ مَآ أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا﴾
(170)

''ارشاد ہوا کہ جب ان مشرکوں سے کہا جاتا ہے کہ ہر معاملہ میں صرف اللہ سبحانہٗ کی نازل کردہ شریعت کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اپنے باپ دادا کے طریقے پر چلیں گے۔''

گویا عقل و شعور اور علم و دلیل سے کام لینے کی بجائے وہ اپنے آباؤ و اجداد کی اندھی تقلید کرتے رہیں گے اور اپنے خود ساختہ رسم و رواج کے تحت حلال کو حرام اور حرام کو حلال سمجھتے رہیں گے۔ ظاہر ہے یہ بالکل گمراہی ہے۔

﴿أَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ﴿١٧٠﴾﴾ (170)

فرمایا کیا یہ مشرک لوگ ہر بات میں اپنے باپ دادا کے طریقے پر چلیں گے جن کے عقائد و اعمال نہ تو صحیح دین کے مطابق تھے اور نہ عقل و دلیل کے لحاظ سے درست تھے؟

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص خود اجتہاد کر سکتا ہو اس کے لیے دوسروں کی تقلید جائز نہیں۔ رہا عام آدمی تو اسے کسی

بھی صاحبِ علم سے مسئلہ پوچھ کر اس کے مطابق عمل کرنا چاہیے جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿فَاسْـَٔلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (النحل 16 : 43)

''اگر تمہیں معلوم نہ ہو تو اہلِ علم سے پوچھ لو۔''

البتہ جس تقلید کی بنیاد عقل وفہم اور شعور و دلیل پر ہو وہ بالکل جائز اور درست ہے جیسا کہ یوسف علیہ السلام کی بات کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا ہے کہ:

﴿وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ﴾ (یوسف 12 : 38)

''میں نے اپنے بزرگوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے دین کی پیروی کی ہے۔''

﴿وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِيْ يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً﴾ (171)

اس آیت میں باپ دادا کی اندھی تقلید کرنے والے کفار ومشرکین کی حالت کو ایک مثال کے ذریعے بیان کیا گیا ہے کہ اُن کا حال ان جانوروں کا سا ہے جس کو کوئی شخص پکار رہا ہو مگر وہ اس پکار کی صدا اور آواز کو سنتے تو ہیں مگر اس کا مطلب نہیں سمجھتے۔ یہی حالت ان کافروں اور مشرکوں کی ہے جن کو نبی ﷺ دین کی دعوت دیتے ہیں مگر وہ جانوروں کی طرح اسے سننے سمجھنے سے عاری ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ عقل وشعور کے بغیر کسی اور کی پیروی یا تقلید درست نہیں ہے۔

﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿١٧١﴾﴾ (171)

فرمایا، یہ کفار ومشرکین بیک وقت بہرے، گونگے اور اندھے ہیں۔ اور عقل سے کام نہیں لیتے۔ یہ جانوروں کی طرح سوچنے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ اس لیے گمراہ لوگوں کی اندھی پیروی کر کے گمراہی میں مبتلا ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ
كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١٧٢﴾ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَ الدَّمَ وَ لَحْمَ
الْخِنْزِيْرِ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّ لَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ
عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٧٣﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ
الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا

النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۖۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿١٧٤﴾
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ
اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿١٧٥﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ
اخْتَلَفُوْا فِى الْكِتٰبِ لَفِىْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿١٧٦﴾ ع ٢١

''اے ایمان والو! ہماری دی ہوئی پاکیزہ روزی کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو کیونکہ بندگی کا حق اسی طرح ادا ہوسکتا ہے۔ اللہ نے جو چیزیں تمہارے لیے حرام کی ہیں وہ مردار ہے، خون ہے، سؤر کا گوشت ہے۔ ان کے علاوہ ہر وہ جانور حرام ہے جس پر اللہ کے سوا کسی کا نام لیا گیا ہو۔ لیکن اگر کوئی مجبور ہو کر حرام کھا لے تو اس پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ اس کی نیت جان بچانے کے لیے کچھ کھانے کی ہو، نہ کہ حکم کی مخالفت کرنے کی۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

جو لوگ اللہ کی اتاری ہوئی کتاب کے احکام اور اس کی تعلیمات کو چھپاتے ہیں اور اس کے عوض میں دنیا کا حقیر مال حاصل کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ بھرتے ہیں۔ قیامت کے دن اللہ ان سے کلام نہیں کرے گا، نہ انھیں گناہوں سے پاک کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ہدایت کی بجائے گمراہی خریدی اور بخشش کی بجائے عذاب خریدا۔ کیا ان کو دوزخ کی آگ کا ڈر نہیں! ان کی یہ حالت اس لیے ہوئی کہ اللہ نے تو کتاب ٹھیک ٹھیک اتاری تھی مگر انھوں نے اس کے بارے میں اختلافات پیدا کر لیے اور ایک دوسرے کے سخت مخالف بن گئے۔''(172-176)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اُهِلَّ بِهٖ :......اِهْلَالٌ کے اصل معنی ''پکارنے'' کے ہیں۔ مگر یہ ''ذبح کرنے'' کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس مقام پر یہ ''ذبح'' ہی کے لیے آیا ہے۔

جاہلیت کے دور میں مشرکین اپنے بتوں کے نام پر جانور قربان کرتے تھے جب کوئی جانور ذبح کیا جاتا اُس پر اُس بت کا نام بلند آواز سے پکارا جاتا تھا جس کے نام پر اسے ذبح کیا جاتا تھا۔ جیسے بِاسْمِ اللَّاتِ (لات کے نام سے) یا بِاسْمِ الْعُزّٰی (عزیٰ کے نام سے)۔ پھر ہر ذبح کرنے والے کو مُهِلٌّ کہنے لگے خواہ وہ ذبح کے وقت کوئی نام پکارے یا نہ پکارے۔ جس طرح احرام باندھنے کو بھی اِهْلَالٌ کہتے ہیں کیونکہ اس میں تلبیہ پکارا جاتا ہے، اگرچہ کسی شخص نے اس حالت میں تلبیہ نہ بھی پکارا ہو۔

اُضْطُرَّ :......اس کے معنی اُکْرِہَ یعنی ''مجبور کیا گیا'' کے ہیں۔ یہ ضَرَّ یَضُرُّ سے باب افتعال ہے اور اس کا مصدر اضطرار ہے۔ضاد کی وجہ سے تا کا حرف طا سے بدل گیا ہے۔

غَیْرَ بَاغٍ :......بَاغٍ اصل میں بَاغِیٌ تھا۔اضافت کی وجہ سے بَاغٍ ہو گیا۔بَغٰی یَبْغِیْ کے معنی بغاوت اور سرکشی کے بھی ہیں اور چاہنے یا طلب کرنے کے بھی اس جگہ یہ دوسرے معنی مراد ہیں۔غَیْرَ بَاغٍ کے معنی ہیں غَیْرَ طَالِبٍ (نہ چاہنے والا ، نہ رغبت کرنے والا) مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص ضرورت سے زیادہ چاہنے اور کھانے والا نہ ہو، یا محض لذت کے لیے کھانے والا نہ ہو۔

غَیْرَ عَادٍ :...... عَادٍ اصل میں عَادِیٌ تھا۔اضافت کی وجہ سے عَادٍ ہو گیا۔اس کی جمع عَادُوْنَ ہے۔جیسا کہ سورۃ المومنون میں ہے:

﴿فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ﴾ (المومنون : 23:7)

''تو وہ حد سے گزرنے والے ہیں۔''

غَیْرَ عَادٍ کے معنی ہیں: حد سے بڑھنے والا نہ ہو،ضرورت یا حاجت سے تجاوز کرنے والا نہ ہو، جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ﴾ (الکہف 18 : 28)

''اور آپ ﷺ کی نظرِ کرم ان سے ہٹنے نہ پائے۔''

مطلب یہ ہے کہ آپ ﷺ کی آنکھیں ان سے ادھر ادھر نہ ہٹ جائیں، متجاوز نہ ہوں۔ان سے آنکھیں نہ چُرائیں اور ان سے صرفِ نظر نہ کریں۔

مَآ اَصْبَرَهُمْ :...... یہ فعل تعجب کا صیغہ ہے۔اس کے بعد عَلَى النَّارِ میں عَلٰی کے صلہ کی وجہ سے یہ روز مرہ بھی ہے۔اس کے معنی ہیں: تعجب ہے کہ ان کو دوزخ کا ڈر نہیں ہے۔گویا ان کی دیدہ دلیری پر تعجب آتا ہے۔

شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ :......اس کے معنی ہیں انتہائی ضد اور مخالفت۔مراد یہ ہے کہ وہ لوگ حق کی راہ سے بہت دور جا پڑے ہیں۔اب وہ سیدھی راہ کی طرف نہیں آتے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ اشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ﴿١٧٢﴾ ﴾ (172)

اس آیت میں اہل ایمان کو حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے اور اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور اسے ایک عبادت شمار کیا گیا ہے۔

کھانا پینا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔اسی پر اس کی زندگی کی حفاظت اور بقا کا انحصار ہے۔لیکن ایک مسلمان ہر چیز کھا نہیں سکتا۔اسے بہر حال حلال وحرام اور جائز و ناجائز میں تمیز کرنی ہے۔اس کے لیے اس کے رب نے حلال و حرام کا ضابطہ مقرر کر دیا ہے۔اسے حلال چیز کھانے اور حرام شے سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔اگر وہ حرام اشیاء کھائے گا تو

تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرے گا اور گناہ کمائے گا۔

انسان کے لیے اللہ نے صرف وہی چیزیں حرام کی ہیں جو جسمانی یا روحانی طور پر اس کے لیے مضر اور نقصان دِہ ہیں۔ جیسا کہ فرمایا گیا کہ رسول اللہ ﷺ کا کام یہ بھی ہے کہ وہ وحی الٰہی کے مطابق پاکیزہ چیزوں کو حلال اور ناپاک اشیاء کو حرام قرار دیں:

﴿وَ یُحِلُّ لَہُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیۡہِمُ الۡخَبٰٓئِثَ﴾ (الاعراف 7 : 157)

''اور وہ (رسول اللہ ﷺ) ان کے لیے پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔''

زیرِنظر آیت کی نظیر یہ آیت بھی ہے کہ:

﴿فَکُلُوۡا مِمَّا رَزَقَکُمُ اللّٰہُ حَلٰلًا طَیِّبًا ۪ وَّ اشۡکُرُوۡا نِعۡمَتَ اللّٰہِ اِنۡ کُنۡتُمۡ اِیَّاہُ تَعۡبُدُوۡنَ﴾

(النحل 16 : 114)

''اللہ نے تمہیں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں عطا کی ہیں، ان میں سے کھاؤ اور اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرو کیونکہ بندگی کا حق اسی طرح ادا ہوسکتا ہے۔''

﴿اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَۃَ وَ الدَّمَ وَ لَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ وَ مَاۤ اُہِلَّ بِہٖ لِغَیۡرِ اللّٰہِ ۚ﴾ (173)

اس آیت میں چار قسم کی چیزیں حرام قرار دی گئی ہیں: مردار، خون، سؤر کا گوشت اور وہ جانور جس پر ذبح کے وقت اللہ سبحانہٗ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے۔

1۔ اس میں پہلی حرام چیز مردار ہے۔ اس سے مراد ہر قسم کا وہ مردہ جانور ہے جو مرنے سے پہلے حلال تھا مگر کسی سبب سے مرجانے کے بعد اب حرام ہوگیا ہے۔ اس کی تفصیل سورہ مائدہ میں اس طرح آئی ہے:

﴿وَ الۡمُنۡخَنِقَۃُ وَ الۡمَوۡقُوۡذَۃُ وَ الۡمُتَرَدِّیَۃُ وَ النَّطِیۡحَۃُ﴾ (المائدہ : 5 : 3)

''اور وہ جو گلا گھونٹنے سے مرگیا ہو، یا چوٹ لگنے سے، یا اوپر سے گر کر مرا ہو، یا سینگ مارنے سے مرا ہو۔''

گویا جو حلال جانور بھی طبعی یا حادثاتی طور پر، یا کسی بیماری کے باعث مرجائے وہ مَیۡتَہ یعنی مردار ہے اور اس کا کھانا حرام ہے۔

2۔ دَم یعنی خون حرام ہے۔ اس سے مراد وہ خون ہے جو ذبح کے وقت جانور کی رگوں سے باہر نکلتا ہے۔ دوسرے مقام پر اسے دَمًا مَّسۡفُوۡحًا یعنی بہایا ہوا خون کہہ کر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے۔ جیسا کہ سورۃ الانعام 6 آیت 145 میں ہے۔

﴿قُلۡ لَّاۤ اَجِدُ فِیۡ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطۡعَمُہٗۤ اِلَّاۤ اَنۡ یَّکُوۡنَ مَیۡتَۃً اَوۡ دَمًا مَّسۡفُوۡحًا اَوۡ لَحۡمَ خِنۡزِیۡرٍ فَاِنَّہٗ رِجۡسٌ اَوۡ فِسۡقًا اُہِلَّ لِغَیۡرِ اللّٰہِ بِہٖ ۚ﴾ (الانعام 6:145)

''کہہ دیجیے! مجھ پر جو وحی آئی ہے، میں اُس میں کوئی ایسی چیز نہیں پاتا جو کسی کھانے والے پر حرام ہو سوائے

اُس کے جو مردار ہو، یا بہایا ہوا خون ہو، یا سؤر کا گوشت ہو، کیونکہ وہ ناپاک ہے، یا ناجائز ذبیحہ ہے جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام پکارا گیا ہو۔"

البتہ جو معمولی خون گوشت کے ساتھ لگا رہے اس میں کوئی حرج نہیں۔

3۔ سؤر کا گوشت حرام ہے کیونکہ یہ طبی لحاظ سے انسانی صحت کے لیے مضر ہے۔ اس کے علاوہ یہ ایک بے حیا جانور ہے جس کے کھانے والوں میں بے حیائی عام ہوتی ہے جو کہ اخلاقی طور پر ایک برا اثر ہے۔ سؤر کا صرف گوشت ہی حرام نہیں ہے بلکہ یہ ایک نجس العین (پورے طور پر ناپاک) جانور ہے جس کی کھال اور چربی وغیرہ کا استعمال بھی حرام ہے۔

4۔ وہ جانور بھی حرام ہے جس پر ذبح کے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیا جائے۔ اس کے علاوہ اس سے ایسی قربانی اور نذر و نیاز بھی مراد ہے جو غیر اللہ کے نام سے کی گئی ہو جیسے دیوی دیوتاؤں کی نذریں، مزاروں کے چڑھاوے، گیارہویں اور کونڈے وغیرہ، یہ سب حرام ہیں۔

یاد رہے کہ شریعت میں صرف یہی چار چیزیں حرام نہیں ہیں بلکہ ان کے علاوہ اور بھی کئی چیزیں حرام ہیں جیسے کتے اور پالتو گدھے کا گوشت جسے سنت نے حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح تمام درندے اور شکاری جانور بھی شریعت میں حرام ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں تمام حلال وحرام چیزوں کی تفصیل پیش نہیں کی گئی بلکہ مشرکین کے اس عقیدے کی تردید ہے جو وہ بعض حلال چوپایوں کو بھی حرام قرار دیتے تھے۔

ہمارے ہاں کے منکرین حدیث اور نیچریوں کا خیال یہ ہے کہ جس طرح شریعت نے بعض چیزوں کو حلال یا حرام قرار دیا ہے اسی طرح انسان کی فطرت (جسے وہ بیانِ فطرت کہتے ہیں) بھی کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دیتی ہے۔ ان لوگوں کے ہاں اشیاء کی حلت وحرمت کے دو دائرے ہیں۔ ایک دائرہ شریعت کا ہے اور اس میں صرف وہی چار چیزیں حرام ہیں جن کا ذکر قرآن نے اس آیت میں کیا ہے اور دوسرا دائرہ انسان کی فطرت کا ہے اور یہ دونوں دائرے الگ الگ حیثیت سے چیزوں کی حلت وحرمت کا تعین کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے سوال کیا جا سکتا ہے کہ وہ فطرتِ انسانی کے ڈانواں ڈول پیمانے سے پالتو گدھے کو حرام اور اونٹ کو حلال کیسے سمجھیں گے؟ اور کیا یہ انسان کی فطرت کے بس میں ہے کہ وہ کبوتر کو حلال اور چیل کو حرام سمجھ سکے؟

اس بارے میں ان لوگوں کی اصل گمراہی یہ ہے کہ یہ لوگ فطرت کو وحی و شریعت کا بدل اور قائم مقام بناتے اور اسے حلال وحرام اور طیب وخبیث اشیاء کا تعین کرنے کے لیے حکم اور جج بناتے ہیں۔ حالانکہ یہ اختیار صرف اللہ سبحانہٗ کی شریعت کو حاصل ہے کہ وہ کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کا تعین اور فیصلہ کرے۔ اشیاء کی حلت وحرمت کے معاملے میں انسانی فطرت کو شارع سمجھنا نہ صرف کھلی گمراہی ہے بلکہ شرک ہے۔

﴿فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ١٧٣﴾ (173)

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک یا بیماری کے ہاتھوں مجبور ہو کر حرام چیز کھا لے تو اس کی اجازت ہے۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کی نیت اللہ سبحانہٗ کے حکم کی خلاف ورزی نہ ہو اور صرف اتنا کھائے جس سے اُس کی جان بچ جائے۔

لیکن اگر اندازے میں غلطی سے کچھ زیادہ کھا پی لے تو بھی اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا کیونکہ وہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے کہ اپنے بندوں کو تنگی سے رہائی دیتا ہے۔ البتہ اس ضمن میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جس طرح عام حالات میں شریعت کی دی ہوئی رخصتوں پر عمل کرنا درست ہے اسی طرح خاص حالات میں عزیمت پر عمل کرنا بہتر ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَ يَشْتَرُوْنَ بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۙ اُولٰٓئِكَ مَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ اِلَّا النَّارَ وَ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَ لَا يُزَكِّيْهِمْ ۚۖ وَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴾ (174)

یہ گویا آیت 79 کی مزید وضاحت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ بعض لوگ دنیا کے حقیر مفاد کی خاطر اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ کتاب کی تعلیمات و احکامات کو چھپاتے ہیں۔

اس سے یہود و نصاریٰ کے وہ علماء بھی مراد ہیں جو نبی کریم ﷺ کے بارے میں آمدہ پیش گوئیوں کو اپنے دنیوی فائدے کی خاطر چھپاتے تھے اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال بتاتے تھے۔ جو لوگوں کی خواہشوں کے مطابق فتوے لکھ کر بیچتے تھے۔

افسوس ہماری اُمت کے دنیا پرست علمائے سوء بھی دین کے بارے میں غلط تاویلوں کے ذریعے صدیوں سے دین فروشی کا یہی کام کرتے چلے آ رہے ہیں۔

دنیا کے مال کو ''ثَمَنًا قَلِيْلًا'' اس لیے کہا کیونکہ ساری دنیا کا مال و دولت بھی آخرت کی نعمتوں کے مقابلے میں بہت تھوڑا ہے جیسا کہ فرمایا:

﴿فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ (التوبہ 9: 38)

''تو آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کا سامان بہت ہی تھوڑا ہے۔''

فرمایا: ایسے مذہبی پیشواؤں کو جو کتمانِ حق یعنی حق چھپانے جیسا کبیرہ گناہ کر کے اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں، آخرت میں یہ سزا ملے گی کہ قیامت کے دن اللہ سبحانہٗ ان سے کلام نہیں فرمائے گا، ان کو گناہوں سے پاک نہیں کرے گا اور ان کو دردناک عذاب دے گا۔

﴿ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى وَ الْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ فَمَآ اَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴾ (175)

فرمایا: دین کے ان جھوٹے رہنماؤں اور پیشواؤں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی اور بخشش کی بجائے عذاب خرید لیا۔ تعجب ہے ان دین فروشوں پر جن کو دوزخ کی آگ سے ڈرایا جاتا ہے مگر یہ اتنے کوڑھ مغز احمق ہیں کہ ایسی

ہولناک سزا بھگتنے کے لیے بھی تیار بیٹھے ہیں۔

﴿ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ نَزَّلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِي الْكِتٰبِ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ﴾ (176)

ارشاد ہوا کہ اہل کتاب کے دنیا پرست مذہبی پیشواؤں کو جو دوزخ کا عذاب ہوگا وہ ان کو حق چھپانے کی سزا کے طور پر ہوگا۔ اور اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا قرآن نازل کر دیا ہے جو سراپا حق ہے اور اختلافات ختم کرنے کے لیے قولِ فیصل ہے، جو لوگوں کو ایک ہی صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لیے اہل کتاب کے لیے بھی اب مذہبی اختلافات رکھنے کا کوئی جواز باقی نہیں رہا۔

﴿وَ اَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَ لَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ﴾ (الانعام6: 153)

''اور (اے نبی ﷺ کہہ دیجیے) کہ یہی میری سیدھی شاہراہ ہے اسی پر چلو اور دوسری پگڈنڈیوں پر نہ چلو، ورنہ وہ تمہیں اللہ کے صحیح راستے سے جدا کر دیں گی۔''

اس لیے اب کتابِ الٰہی کے ماننے والوں کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی کہ وہ مختلف فرقے بنا کر ایک دوسرے کی مخالف راہوں پر چلیں۔

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَ كَانُوْا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِيْ شَيْءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمْرُهُمْ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ﴾ (لانعام6: 159)

''بے شک جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور کئی فرقے بن گئے۔ (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ کا ان سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی ان کو بتائے گا کہ جو کچھ وہ کرتے تھے۔''

البتہ اگر کتابِ الٰہی کو سمجھنے اور اس کے فہم میں کوئی اختلافِ رائے پیدا ہو جو کہ بالکل فطری امر ہے تو اس اختلاف کو دور کرنے کا طریقِ کار بھی کتاب اللہ نے بتا دیا ہے کہ:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَ اَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَ اُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا﴾ (النساء 4: 59)

''پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہو جائے تو اسے اللہ اور رسول ﷺ کی طرف پھیر دو، اگر تم واقعی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو، یہی طریقہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس کا انجام بہت اچھا ہے۔''

مطلب یہ ہے کہ پھر دیکھا جائے کہ کس کی رائے قرآن وسنت کے مطابق ہے اور جس کی رائے قرآن وسنت

کے مطابق ہو، اسے سب اختیار کر لیں۔

لہٰذا آج مسلمانوں کے لیے بھی دینی اختلاف کی بنیاد پر گروہ بندی اور تحزب کے لیے کوئی عذر باقی نہیں ہے کیونکہ اللہ سبحانہٗ نے ان کے باہمی اختلاف کا حل بتا دیا ہے اور اختلافِ رائے کو باہمی مخالفت کا ذریعہ بننے سے روکا ہے۔ اب اہلِ علم پر یہ لازم ہے کہ وہ اپنی اختلافی آراء کو غیر جانبدارانہ طور پر قرآن وسنت کی روشنی میں جانچیں، پرکھیں اور پھر امت کے وسیع تر مفاد کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی ایک قول کو راجح قرار دے کر اس پر متفق ہو جائیں جیسا کہ خود فقہ حنفی کے علماء اپنے فقہائے احناف کے مختلف فیہ مسائل میں کسی ایک قول کو ترجیح دے کر مُفْتٰی بِہٖ قول کو اختیار کر لیتے ہیں۔ اسی طریق کار (Methodology) کو اختیار کر کے موجودہ دور کے اہل علم اپنے فقہی وکلامی اختلافات ختم کر کے امت واحدہ بن سکتے ہیں۔

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِيّٖنَ ۚ وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

”نیکی یہ نہیں کہ تم نے (عبادت کے وقت) اپنا منہ مشرق کی طرف کر لیا یا مغرب کی طرف۔ اصل نیکی یہ ہے کہ لوگ ایمان لائیں اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، اللہ کی کتابوں پر اور اس کے نبیوں پر۔ جو اللہ کی رضا کے لیے اپنا مال خرچ کریں رشتہ داروں پر، یتیموں پر، محتاجوں پر، مسافروں پر، مانگنے والوں پر اور غلاموں کو آزاد کرنے پر، جو نماز قائم کریں اور زکوۃ دیں۔ اور جب وعدہ کریں تو پورا کریں۔ کوئی مالی پریشانی یا جسمانی تکلیف ہو تو صبر کریں اور جہاد میں ثابت قدم رہیں۔ ایسے لوگ ہی سچے اور پرہیز گار ہیں۔“ (177)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

اَلْبِرَّ :...... (نیکی، تقویٰ، دینداری، وفاداری، اطاعت) اس کے لغوی معنی ہیں: اَلتَّوَسُّعُ فِی الْخَيْرِ نیکی میں وسعت ہونا، وسیع تر بھلائی، اس کی اصل بَرٌّ (خشکی، زمین) ہے جو بَحْرٌ (تری، دریا، سمندر) کی ضد ہے۔ چونکہ عربی

زبان میں زمین کے وسیع ہونے کا تصور پایا جاتا ہے۔

﴿وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ﴾ (الزمر: ۱۰)

''اور اللہ کی زمین بڑی وسیع ہے۔''

اس لیے شریعت کی اصطلاح میں بِرّ سے صحیح ایمان، نیک اعمال اور اچھے اخلاق جیسے وہ تمام امور مراد ہوتے ہیں جن کے ذریعے انسان کو اللہ سبحانہٗ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔

عَلٰی حُبِّهٖ :...... اس سے مراد عَلٰی حُبِّ الْمَالِ (مال کی محبت کے باوجود) ہے۔ ''ہٖ'' کی ضمیر اپنے قریب کے مرجع ''مال'' کی طرف لوٹتی ہے۔

جیسا کہ ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا﴾ (الدهر 76 : 8)

''اور وہ کھانے کی چاہت کے باوجود اسے مسکین، یتیم اور قیدی کو کھلاتے تھے۔''

اِبْنُ السَّبِيْلِ ...... اس کے معنی ہیں راستے کا بیٹا مسافر۔ عربی زبان میں ''ابن'' بیٹا اور ''ابو'' باپ کے الفاظ کسی چیز سے تعلق یا نسبت کی وجہ سے بھی آتا ہے۔ جیسے ابوتراب۔ اردو زبان میں بھی ''ابن الوقت'' کی ترکیب اسی مفہوم کے لیے استعمال ہوتی ہے۔

چونکہ مسافر اپنے گھر بار اور رشتہ دار واحباب سے دور ہونے کی وجہ سے امداد کا محتاج ہوتا ہے اس لیے اُس کو صدقہ اور زکٰوۃ بھی دی جاسکتی ہے۔

فِي الرِّقَابِ :...... یہ اصل میں فِیْ فَكِّ الرِّقَابِ یا فِیْ تَحْرِيْرِ الرِّقَابِ ہے جس کے معنی ہیں غلام آزاد کرنا۔

اَلصَّابِرِيْنَ :...... عام عربی قاعدے کے لحاظ سے اَلْمُوْفُوْنَ کے بعد اَلصَّابِرُوْنَ آنا چاہیے تھا لیکن اسم کو مرفوع کی جگہ منصوب لانا بھی عربیت کا ایک اسلوب ہے جسے علی سبیل المدح یا علی سبیل الاختصاص کہا جاتا ہے۔ اس میں مخاطب کو کسی بات کی اہمیت کے پیشِ نظر خصوصی طور پر متوجہ کیا جاتا ہے۔ عربی ادب کے علاوہ خود قرآن مجید میں اس اسلوب کی مثالیں موجود ہیں۔ مثال کے طور پر سورۃ النساء میں ہے۔

﴿ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَ مَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَ الْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَ الْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ ﴾ (النساء 4 : 162)

''اور اہل ایمان اُس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ ﷺ پر نازل ہوئی اور اُن کتابوں پر جو آپ ﷺ سے پہلے نازل ہوئیں۔ وہ نماز کے پابند ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔''

اس جگہ بھی المومنون کے بعد اَلْمُقِيْمُوْنَ کی جگہ اَلْمُقِيْمِيْنَ اسی اسلوب کی وجہ سے آیا ہے حالانکہ اس کے بعد وَالْمُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ مرفوع آیا ہے۔

اَلْبَأْسَآءُ :...... یہ بُؤْسٌ سے ہے جس کے معنی سختی، محتاجی اور تنگ دستی کے ہیں۔

اَلضَّرَّآءِ:...... یہ ضرر سے ہے اور اس سے مراد جسمانی اور ذہنی تکلیف یا پریشانی ہے جیسے بیماری اور غم وغیرہ۔

اَلَّذِیْنَ صَدَقُوْا :......اس سے یہ مراد ہے کہ وہ اپنے ایمان کے دعوے میں سچے ہیں اور وفا شعار ہیں۔

﴿لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْھَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ﴾ (177)

فرمایا کہ عبادت کے وقت مشرق یا مغرب یا شمال یا جنوب کی طرف منہ کر لینا بجائے خود کوئی نیکی نہیں ہے اور نہ یہ دین کا کوئی مقصد ہے کہ اس پر کوئی اختلاف یا جھگڑا پیدا کیا جائے۔ شریعت میں قبلہ صرف اس لیے مقرر کیا گیا ہے تا کہ نمازی کو یہ احساس دلایا جائے کہ وہ ہر طرف سے منہ موڑ کر صرف ایک اللہ کی طرف متوجہ ہے اور اس سے سرگوشی کر رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر امت کے لیے اس کا قبلہ ایک دینی شعار ہے جو لوگوں کے فکر وعمل میں یک جہتی اور اتفاق واتحاد کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک ہی قبلے کو ماننے والوں میں نماز کے وقت کسی کا رخ مشرق کی طرف ہوتا ہے، کسی کا مغرب کی طرف، کسی کا شمال کی طرف اور کسی کا جنوب کی طرف۔ جیسا کہ خانہ کعبہ میں نماز کے دوران میں ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دین کا اصل مقصد اور نیکی کسی خاص سمت کی طرف رخ کرنا نہیں ہے ورنہ ایک ہی قبلہ والوں میں بھی اطراف وجوانب کا جھگڑا شروع ہو جاتا۔

﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَ الْكِتٰبِ وَ النَّبِیّٖنَ﴾ (177)

ارشاد ہوا کہ اصل نیکی اور دین کی بنیاد ایمان ہے۔ جو شخص اللہ پر، آخرت پر، فرشتوں پر، الہامی کتابوں پر اور نبیوں پر صحیح ایمان رکھتا ہے وہ نیکوکار اور دین دار ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات پر یقین کیا جائے کہ وہ موجود ہے، اکیلا ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، وہی سب کا خالق، مالک، رازق اور حاکم ہے۔ وہ نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ قادرِ مطلق ہے، تمام اعلیٰ صفات کا مالک اور ہر عیب ونقص سے پاک ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

آخرت کے دن پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دنیا ایک دن فنا ہو جائے گی اللہ تعالیٰ لوگوں کو دوبارہ زندہ کر کے اُن سے اُن کے اعمال کا حساب لے گا۔ پھر نیک لوگوں کو ہمیشہ کی نعمت بھری جنت عطا کرے گا اور برے لوگوں کو دوزخ کا عذاب دے گا۔

فرشتوں پر ایمان لانے کا مطلب ہے کہ یہ یقین کیا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک طاقت ور، معصوم اور غیبی مخلوق ہے جو انسان کی تخلیق سے پہلے نور سے پیدا ہوئی ہے۔ فرشتے اللہ کے حکم سے کائنات کا نظام چلاتے ہیں۔ ان کی مختلف ذمہ داریاں ہیں جو وہ اللہ سبحانہٗ کے حکم سے سرانجام دیتے ہیں۔

کتابوں پر ایمان لانے سے مراد وہ تمام الہامی یا آسمانی کتابیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے ہر زمانے میں اپنے رسولوں پر نازل فرمائیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کا کلام تھا جو لوگوں کی ہدایت ورہنمائی کے لیے اتارا گیا جیسے توریت،

زبور، انجیل، صحائف اور قرآن مجید۔ ان میں سے اب صرف آخری کتاب محفوظ ہے باقی کوئی الہامی کتاب اب اصل حالت میں دنیا میں موجود نہیں ہے۔

نبیوں اور رسولوں پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے انسانوں کی ہدایت و راہنمائی کے لیے انہی میں سے بعض پاکیزہ ہستیوں کو ہر زمانے میں مبعوث فرمایا۔ آخر میں حضرت محمد ﷺ کو بھیجا گیا۔

﴿وَ اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنَ وَ ابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَ السَّآئِلِيْنَ وَ فِي الرِّقَابِ ۚ﴾ (177)

پھر فرمایا کہ ایمان لانے کے بعد نیک اعمال ضروری ہیں جن میں سے ایک یہ ہے کہ بندہ اللہ کے دیئے ہوئے مال میں سے اُس کی رضا کے لیے رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں، سوالیوں اور غلاموں (یا قیدیوں) پر بھی خرچ کرے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد ہوا کہ:

﴿وَ يُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّ يَتِيْمًا وَّ اَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّ لَا شُكُوْرًا﴾ (الدھر 76: 8،9)

''اور وہ (نیک لوگ) مسکین، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ ہم صرف اللہ کی رضا کے لیے تمہیں کھلاتے ہیں۔ تم سے کوئی بدلہ نہیں چاہتے، نہ شکریہ مانگتے ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے کے بعد نیکی کے کام کیے جائیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کیا جائے۔ مال کو خود اپنے اوپر خرچ کرنے کے علاوہ اسے دوسرے محتاجوں پر بھی خرچ کیا جائے۔ زکوٰۃ، عشر اور صدقہ و خیرات کے ذریعے دوسرے حق داروں کا حق ادا کیا جائے۔ مال و دولت کو فضول خرچی اور اسراف و تبذیر کی نذر نہ کیا جائے بلکہ اس کو اس کے صحیح مصارف میں خرچ کیا جائے۔ یہ بڑی اور اصلی نیکی ہے۔

﴿وَ اَقَامَ الصَّلٰوةَ وَ اٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ﴾ (177)

پھر فرمایا کہ نیک اور دین دار ہونے کے لیے نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا ضروری ہے۔ فرض نمازوں کے علاوہ نوافل کا بھی اہتمام کیا جائے۔ اسی طرح زکوٰۃ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ صدقہ و خیرات بھی کرتے رہنا چاہیے۔

اب جہاں تک نماز کا تعلق ہے یہ اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ایک اہم رکن ہے۔ یہ وہ ستون ہے جس کے بغیر اسلام کی عمارت کھڑی نہیں رہ سکتی۔ نماز سب سے بڑی عبادت ہے جو پہلی امتوں پر بھی فرض تھی۔ ہر عاقل و بالغ مرد اور عورت پر نماز فرض ہے۔ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں: فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔

زکوٰۃ بھی اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ہے۔ قرآن مجید کے اکثر مقامات پر نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ساتھ ساتھ آیا ہے۔ زکوٰۃ کی فرضیت قرآن، سنت اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔ زکوٰۃ کے لفظی معنی ''بڑھنے'' اور ''پاک ہونے'' کے ہیں۔ اسلامی شریعت میں زکوٰۃ وہ مال ہے جسے کوئی مسلمان اپنے رب کے دیئے ہوئے مال میں سے ہر سال اس

کے حق داروں کے لیے نکالتا ہے۔

اس مقامات پر نماز اور زکوۃ کا ذکر کر کے تمام اسلامی عبادات مراد لے لی گئی ہیں۔

﴿وَ الْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ﴾ (177)

ایمان اور چند نیک اعمال کے ذکر کے بعد اخلاق کو بیان کیا گیا۔ اس ضمن میں پہلے۔ ایفائے عہد کو بڑی نیکی اور دین داری قرار دیا گیا اور اس کے بعد صبر کا ذکر آئے گا۔

عہد و معاہدے اور قول و اقرار کی پابندی اسلامی اخلاقیات میں سے ہیں اور اسے پورا کرنے پر بہت زور دیا گیا ہے۔ قرآن وسنت میں ایفائے عہد کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی مضمون کو قرآن مجید نے کئی مقامات پر بیان فرمایا ہے اور اسے مومن کی ایک صفت قرار دیا گیا ہے۔ جیسے ارشاد ہوا:

﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا﴾ (بنی اسرائیل 17 : 34)

''اور عہد کو پورا کرو۔ بے شک عہد کی پوچھ ہوگی۔''

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عٰهَدْتُّمْ﴾ (النحل 16 : 91)

''اور جب تم اللہ کے نام سے کوئی وعدہ کرو تو اسے پورا کرو۔''

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ﴾ (المومنون 23 : 8)

''اور جو اپنی امانتوں اور اپنے وعدوں کا خیال رکھتے ہیں۔ (وہی سچے مومن ہیں)''

قرآن نے کئی مقامات پر وعدہ خلافی کو نفاق سے تعبیر کیا ہے۔ اور صحیح حدیث میں بدعہدی اور عہد شکنی کو منافقت کہا گیا ہے اور اسے منافق کی ایک نشانی قرار دیا گیا ہے۔

(صحیح بخاری، رقم : 34، صحیح مسلم، رقم : 210، ابوداؤد، رقم : 4688)

﴿وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَ الضَّرَّآءِ وَ حِيْنَ الْبَاْسِ ؕ﴾

عہد کی پابندی کے بعد صبر کا ذکر ہوا کہ نیکی اور دین داری کا تقاضا یہ بھی ہے کہ بندہ ہر مشکل صورتِ حال میں صبر کا دامن تھامے رکھے۔ خاص طور پر جب ایسی حالت ہو کہ تنگ دستی ہو، یا بیماری ہو یا جہاد کا موقع ہو تو ان حالات میں صبر کرنا اگرچہ زیادہ مشکل ہے مگر یہ بڑی نیکی اور دین داری کا کام ہے۔

قرآن وحدیث میں صبر کی بڑی فضیلت آئی ہے اور اس پر بڑا اجر بتایا گیا ہے۔ اس مقام پر قرآن نے ایفائے عہد اور صبر کا ذکر کر کے ساری اخلاقیات کی طرف اشارہ کر دیا ہے کہ تمام اخلاقی قدریں نیکی کے کام ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝﴾ (177)

آخر میں فرمایا کہ صرف وہی لوگ سچے مومن ہیں جو ایمان، نیک اعمال اور اچھے اخلاق رکھتے ہیں اور ایسے لوگ ہی پرہیزگار، نیکوکار اور دین دار ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس آیت بر میں پورے اسلام کی تعلیم مجمل طور پر موجود ہے اور اس میں ایمان و عمل کے اعلیٰ معیار اور بلند ترین درجے کو بیان کر دیا گیا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰى ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَ لَكُمْ فِی الْقِصَاصِ حَیٰوةٌ یّٰۤاُولِی الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۷۹﴾

''اے ایمان والو! مقتول کے خون کا بدلہ لینا تم پر فرض ہے۔ قاتل آزاد ہو تو اُس آزاد کو، غلام ہو تو اُس غلام کو، اور عورت ہو تو اس عورت کو قصاص میں قتل کیا جائے۔ اگر کسی قاتل کو اس کا وہ بھائی جو مقتول کا وارث ہے خون معاف کر دے تو دستور کے مطابق خون بہا لے سکتا ہے اور قاتل کو چاہیے کہ وہ صحیح طریقے سے پورا خون بہا ادا کرے۔ یہ حکم تمہارے رب کی طرف سے ایک آسانی اور مہربانی ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص خون بہا لینے کے بعد بھی زیادتی کرے تو اللہ کے ہاں اسے دردناک عذاب ہوگا۔ اور اے عقل والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ لہٰذا اس حکم کی خلاف ورزی سے بچ جاؤ۔'' (178-179)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

كُتِبَ :...... كَتَبَ یَكْتُبُ كِتَابَةً کے اصل معنی ''لکھنے'' کے ہیں لیکن جب اس کے بعد عَلٰی کا صلہ (PREPOSITION) آجائے تو کنایہ کے طور پر اس کے معنی فرض کرنے اور لازم قرار دینے کے ہو جاتے ہیں۔ اس جگہ یہی معنی مراد ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ﴾ (البقرہ 2: 183)

''تم پر روزہ رکھنا فرض کر دیا گیا ہے۔''

اَلْقِصَاصُ :...... اس کے اصل معنی ہیں: کسی کے پاؤں کے نشانات کے پیچھے چلنا۔ کھوج لگانا۔ جیسے کہ ارشاد ہوا:

﴿فَارْتَدَّا عَلٰٓی اٰثَارِهِمَا قَصَصًا﴾ (الکہف 18: 64)

''پھر دونوں اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے واپس لوٹے۔''

لیکن شریعت کی اصطلاح میں قصاص سے مراد قاتل کو قتل کرنا ہے۔

اَلْبَاب :...... یہ لب کی جمع ہے جس کے معنی ''عقل'' کے ہیں۔ اُولُوْ الْاَلْبَاب کا مطلب ہے: عقل والے۔

﴿ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَ الْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَ الْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ؕ فَمَنْ عُفِیَ لَهٗ مِنْ اَخِیْهِ شَیْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَ اَدَآءٌ اِلَیْهِ بِاِحْسَانٍ ؕ ذٰلِكَ تَخْفِیْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ رَحْمَةٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰی بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۝۱۷۸ ﴾ (178)

یہ آیت قصاص اور دیت کے بارے میں ہے۔ عربوں میں قصاص کے معاملے میں بڑی بے اعتدالیاں پائی جاتی تھیں۔ وہ غلام قاتل کے بجائے کسی آزاد کو قتل کر دیتے تھے۔ قاتل عورت کی بجائے کسی مرد کو قصاص میں قتل کیا جاتا تھا۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ایک مقتول کے بدلے میں کئی انسانوں کو قتل کر دیا جاتا۔

جب قرآن نازل ہوا تو اس نے حکم دیا کہ صرف قاتل ہی کو قصاص میں قتل کیا جا سکتا ہے، خواہ وہ قاتل غلام ہو، آزاد ہو، عورت ہو، مرد ہو، بہر صورت صرف قاتل ہی سے قصاص لیا جائے گا۔ البتہ اگر مقتول کے ورثاء قصاص نہ لینا چاہیں اور اس کے بجائے دیت (خون بہا BLOOD MONEY) لینے پر راضی ہو جائیں، یا دیت لیے بغیر ہی معاف کر دیں تو یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ البتہ دیت پر رضا مند ہونے کے بعد اس کی ادائیگی ٹھیک طریقے سے ہونی چاہیے اور دیت کے معاہدے کے بعد اس کی خلاف ورزی کر کے قصاص نہیں لیا جا سکتا۔ ایسا کرنا صریح زیادتی ہوگی۔

قتلِ عمد میں دیت کی یہ اجازت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک رحمت اور رعایت ہے کیونکہ اس سے پہلے کی شریعتوں میں، جیسا کہ یہودیوں کے قانون میں یہ سختی تھی کہ قتل کے معاملے میں صرف قصاص لیا جا سکتا تھا، دیت اور معافی کی اجازت نہ تھی۔

چونکہ اسلام ایک عالمگیر دین ہے اور دنیا میں کامل اصلاح اور دین کی تکمیل کے لیے آیا ہے اس لیے امت مسلمہ کی شریعت میں یہ گنجائش رکھ دی گئی کہ قصاص کے بجائے دیت بھی لی جا سکتی ہے اور ویسے معاف بھی کیا جا سکتا ہے۔

یاد رہے کہ قتلِ عمد میں قصاص کی بجائے جو دیت ہوتی ہے وہ اس دیت سے مختلف ہوتی ہے جو قتلِ خطا کی دیت ہے۔ کیونکہ پہلی کی مقدار مقرر نہیں ہے۔ باہمی رضا مندی سے کچھ بھی طے ہو سکتی ہے جب کہ دوسری کی مقدار سو اونٹ یا ان کی قیمت مقرر ہے جو کہ سنت سے ثابت ہے۔

جمہور کے نزدیک کافر کے قصاص میں کسی مسلمان کو قتل نہیں کیا جا سکتا کیونکہ یہی سنت ثابتہ ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ:

﴿وَاَنْ لَا یُقْتَلَ مُسْلِمٌ بِكَافِرٍ﴾ (صحیح بخاری، رقم: 6903، ترمذی رقم: 1412، نسائی، رقم: 4748)

مگر احناف اس بات کے قائل ہیں کہ مسلمان کو بھی کافر کے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔ اس معاملے میں وہ قرآن

کے عام حکم میں سنت کی تخصیص کو نہیں مانتے۔

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ دیت کی رقم یک مشت بھی ادا کی جا سکتی ہے اور قسطوں میں بھی اس کی ادائیگی ممکن ہے جو تین برسوں کے اندر اندر عاقلہ (خاندان یا کمپنی) کی طرف سے ادا ہوں گی۔

یاد رہے قصاص کا قانون جس طرح جان کے بدلے میں ہے اسی طرح انسانی اعضاء کے بارے میں بھی ہے۔ جیسا کہ سورۃ المائدہ کی آیت 45 میں ہے کہ آنکھ کے بدلے آنکھ، کان کے بدلہ میں کان، دانت کے بدلے دانت اور اسی طرح ہر زخم کا برابر بدلہ لیا جائے گا۔ البتہ اس میں بھی قصاص کے عوض دیت لی جا سکتی ہے جسے اصطلاح میں ''ارش'' کہا جاتا ہے، یا پھر ویسے ہی معاف کیا جا سکتا ہے۔

﴿وَ لَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝١٧٩﴾ (179)

یہ آیت بھی قرآن حکیم کی معجزانہ فصاحت و بلاغت کی مظہر ہے۔ چند بلیغ الفاظ میں ایک وسیع مضمون ادا کیا گیا ہے۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ فرمایا، تم قاتل کی جان لے کر پورے معاشرے کی جانیں محفوظ کر سکتے ہو۔

اس میں اہل بصیرت اور دانشوروں سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ قصاص کے قانون میں خواہ وہ جان کے بدلے جان ہو، یا اعضاء کے بدلے اعضا ہوں انسانوں کے لیے زندگی اور امن وسکون کا پیغام ہے۔ کیونکہ جب کسی شخص کو یہ معلوم ہوگا کہ کسی اور کی آنکھ پھوڑنے کے بعد اس کی اپنی آنکھ بھی پھوڑی جائے گی تو وہ دوسرے کی آنکھ پھوڑنے کا ارادہ ترک کر دے گا۔ بہرحال دونوں صورتوں میں معاشرہ امن وامان کا گہوارہ بن جائے گا اور سب کی جانیں محفوظ و مامون رہیں گی۔

افسوس ہمارے ہاں کے بعض مغرب زدہ ناعاقبت اندیش لوگ قصاص کے اس قرآنی قانون کو قید کی سزا میں بدلنے کی ناپاک جسارت کرتے ہیں۔ آخر میں فرمایا: لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ اس سے مراد یہ ہے تاکہ تم قصاص کے ڈر سے ایک دوسرے کی جان لینے سے باز رہو اور آخرت میں عذاب سے بچ جاؤ۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۚۖ اِلْوَصِيَّةُ
لِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝١٨٠ؕ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ
بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ۝١٨١ؕ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ
اِثْمَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝١٨٢ ع ٢٢

''جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجائے اور وہ اپنے پیچھے مال چھوڑ رہا ہو تو ضروری ہے کہ وہ اپنے

والدین اور رشتہ داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کر جائے۔ یہ ایک ذمہ داری ہے اللہ سے ڈرنے والوں کی۔ پھر جو وصیت سننے کے بعد اسے بدل ڈالے تو وہ گناہ گار ہوگا۔ بے شک اللہ سننے ولا جاننے والا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے غلطی سے یا جان بوجھ کر کسی کی حق تلفی کی ہے اور پھر وہ وارثوں میں صلح صفائی کرا دے تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔''

(182-180)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

خَیْرٌ :......قرآن مجید میں یہ لفظ تین مختلف معنوں میں آیا ہے:

1۔ نیکی یا بھلائی کے معنوں میں جیسے:

﴿وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ﴾ (البقرہ 2: 197)

''اور جو نیکی تم کرتے ہو اللہ اسے جانتا ہے۔''

2۔ بہتر (BETTER) کے معنوں میں جیسے:

﴿وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ﴾ (البقرہ 2: 221)

''اور آزاد مشرک مرد خواہ تمہیں کتنا ہی پسند ہو اس سے مسلمان غلام بہتر ہے۔''

3۔ مال کے معنوں میں جیسے:

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ﴾ (البقرہ 2: 272)

''اور جو مال تم (اللہ کی راہ میں) خرچ کرو گے، اپنے لیے کرو گے۔''

اِس جگہ یہ لفظ اپنے تیسرے معنوں یعنی ''مال'' کے لیے استعمال ہوا ہے۔

خَافَ :......خوف کے معنی ڈرنے کے علاوہ اندیشہ ہونے یا علم ہونے کے بھی آتے ہیں اور اس جگہ یہی مراد ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں حضرت زکریا عَلَیْہِ السَّلَام کے بارے میں ہے کہ:

﴿وَ اِنِّىْ خِفْتُ الْمَوَالِىَ مِنْ وَّرَآئِىْ﴾ (مریم 19: 5)

''اور مجھے اپنے رشتہ داروں کے بارے میں اندیشہ ہے کہ وہ میرے بعد دین میں خرابی پیدا نہ کر دیں۔''

مُوْصٍ :...... یہ اصل میں مُوْصِیٌ تھا۔ اس کے معنی ہیں وصیت کرنے والا۔

جَنَفًا :......اس کے اصل معنی مائل ہونے کے ہیں۔ مگر یہ زیادہ تر نیکی کی بجائے برائی کی طرف مائل ہونے کے لیے آتا ہے۔ آیت میں اس کے معنی جانب داری اور ناانصافی کے ہیں۔

اِثْمٌ :...... اس کے معنی گناہ اور حق تلفی کے ہیں۔

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَكَ خَيْرَا ۖ ۨ الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۸۰ۭ ﴾ (180)

فرمایا جب کوئی شخص قریب المرگ ہو اور وہ مال دار ہو تو اسے چاہیے کہ مرنے سے پہلے اپنے والدین اور دوسرے قریبی رشتہ داروں کے حق میں اپنی وراثت کے بارے میں وصیت لکھ دے اور یہ حکم فرض کی حیثیت رکھتا ہے۔

مگر وصیت کا یہ فرض حکم ابتدائی دور کے لیے تھا۔ بعد میں جب سورہ النساء کی آیاتِ مواریث (وہ آیتیں جن میں وراثت کے بارے میں احکام دیئے گئے ہیں) نازل ہو گئیں اور میت کے ترکے کے تمام وارثوں کے حصے مقرر کر دیئے گئے تو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ لیکن غیر وارث کے حق میں وصیت کی اجازت سنت سے ثابت ہے اور اس کے لیے زیادہ سے زیادہ ایک تہائی مال کی وصیت کی جا سکتی ہے۔

(صحیح بخاری ،رقم : 2742، صحیح مسلم ، رقم : 4209، ترمذی ، رقم : 2116 ، نسائی ، رقم : 3665)

اور اس کی حیثیت ایک مستحب کام کی ہے۔ البتہ وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں ہے جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے کہ لَا وَصِيَّةَ لِوَارِثٍ وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی۔

(ابو داؤد ، رقم : 2870، ترمذی، رقم : 2120، نسائی، رقم : 3671)

بعض اہل علم مخصوص حالات میں وارث کے حق میں بھی وصیت کے قائل ہیں۔

اس آیت سے پہلے قصاص کا حکم بیان ہوا تھا جو اصل میں موت ہی سے متعلق تھا۔ اب موت ہی کے حوالے سے وصیت کا مضمون آ گیا۔

یاد رہے کہ وصیت تحریر کر لینی چاہیے اور اس پر دو معتبر آدمیوں کو گواہ بنا لینا چاہیے۔

﴿ فَمَنْۢ بَدَّلَهٗ بَعْدَ مَا سَمِعَهٗ فَاِنَّمَآ اِثْمُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يُبَدِّلُوْنَهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۱۸۱ۭ ﴾ (181)

فرمایا اگر گواہ یا وصی یعنی جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو، وصیت کو بدلیں گے تو ان کو اس کا گناہ ہوگا۔ مُوصی یعنی وصیت کرنے والا بے قصور ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اسے وصیت کرنے کا اجر ملے گا۔

آخر میں تنبیہ کے انداز میں فرمایا کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ کہ اللہ تعالیٰ سب کی باتیں سنتا اور ہر ایک کی نیت کو جانتا ہے کہ اگر جھوٹ یا کسی اور غلط طریقے سے وصیت کو بدلا جائے گا تو وصیت کو بدلنے والے یاد رکھیں اللہ سبحانہٗ ان کی حرکتوں سے واقف ہے اور ان کو سزا دے گا۔

﴿ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۱۸۲ۧ ﴾ (182)

فرمایا اگر کسی یہ پتہ چل جائے کہ وصیت کرنے والے نے جان بوجھ کر، یا بے جانے بوجھے اپنی وصیت میں کسی کی حق

تلفی کی ہے، یا ناجائز جانب داری سے کام لیا ہے تو ایسی وصیت کی اصلاح کر دینی چاہیے۔ جو شخص کسی ایسی غلط وصیت کی اصلاح کر کے لوگوں کا جھگڑا ختم کرے گا اسے کوئی گناہ نہ ہوگا۔

پھر آخر میں فرمایا: ﴿إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ الرَّحِيْمٌ﴾ کہ جو کوئی غلط وصیت کی اصلاح کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ بخشے گا اور اپنی رحمت سے اس نیک کام پر اجر و ثواب بھی دے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿١٨٣﴾ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ
مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ
فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ؕ فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ ؕ وَاَنْ تَصُوْمُوْا
خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٤﴾ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ
الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ
شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ؕ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ
مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ؕ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا
الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿١٨٥﴾ وَاِذَا
سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ ؕ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ
فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لِيْ وَلْيُؤْمِنُوْا بِيْ لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُوْنَ ﴿١٨٦﴾ اُحِلَّ لَكُمْ
لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ
لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ
عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْـٰٔنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ۠

وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۪ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ ۚ وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ ۙ فِي الْمَسٰجِدِ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۷﴾

”اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض ہے جیسے پہلے لوگوں پر فرض تھا تا کہ تم پرہیز گار بن جاؤ۔ یہ روزے گنتی کے چند دن ہیں۔ لیکن اگر کوئی بیمار ہو، یا مسافر ہو، تو وہ اور دنوں میں قضا کے روزے رکھ کر تعداد پوری کر لے۔ جس کے لیے کسی اور عذر کی وجہ سے روزہ رکھنا مشکل ہو، وہ ایک روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا دے۔ جو کوئی اپنی خوشی سے کچھ زیادہ دیدے تو اس کے لیے بہتر ہے۔ البتہ روزہ رکھنا تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے، اگر تم جانو۔

رمضان کے مہینے میں قرآن نازل ہوا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے، جس میں سیدھی راہ کی کھلی نشانیاں ہیں اور جو حق و باطل کا فرق بتانے والا ہے۔ (مسلمانو) جب رمضان کا مہینہ آئے اور تم مقیم ہو تو روزے رکھو۔ لیکن بیمار اور مسافر دوسرے دنوں میں قضا روزے رکھ کر تعداد پوری کر لیں۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے، وہ تم پر سختی کرنا نہیں چاہتا، تا کہ اس طرح تم روزوں کی تعداد پوری کر لو، اللہ کی بڑائی بیان کرو، جس نے تمہیں ہدایت بخشی اور اس کی شکر گزاری کرو۔ (اے نبی ﷺ) جب میرے بندے میرے بارے میں پوچھیں تو آپ ﷺ ان سے کہیں: میں ان کے بہت قریب ہوں۔ ہر پکارنے والے کی پکار سنتا اور اس کا جواب دیتا ہوں۔ انہیں چاہیے کہ وہ میرا حکم مانیں اور مجھ پر یقین رکھیں تا کہ ہدایت پائیں۔

(مسلمانو) روزے کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جا سکتے ہو۔ وہ تمہارے لیے لباس ہیں، تم ان کے لیے لباس ہو۔ اللہ کو معلوم ہے تم اس سے پہلے اپنے ساتھ خیانت کرتے رہے۔ مگر اللہ نے مہربانی کی اور تمہاری خطا معاف کی۔ اب تم روزے کی رات میں اپنی بیویوں سے ہم بستری کر سکتے ہو اور جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دیا وہ حاصل کر سکتے ہو۔ اس کے علاوہ رات کو اُس وقت تک کھا پی سکتے ہو جب صبح کی سفید دھاری، کالی دھاری سے الگ ظاہر ہو جائے۔ اس کے بعد رات تک روزہ پورا کرو۔ لیکن جب مسجد میں اعتکاف کی حالت میں ہو تو پھر رات کو گھر میں آ کر اپنی بیویوں سے صحبت نہیں کر سکتے۔ یہ حدیں اللہ نے قائم کی ہیں، ان کے قریب نہ جاؤ۔ اللہ

اپنی آیتیں لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ وہ تقویٰ اختیار کریں۔" (183-187)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اَلصِّيَامُ :...... صِيَام یا صوم (روزہ رکھنا) مصدر ہے جس کے اصل معنی کسی چیز سے رُک کے رہنے کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں روزے کی یہ تعریف کی گئی ہے:

"اللہ تعالیٰ سے ثواب حاصل کرنے کی نیت کے ساتھ فجر سے لے کر مغرب تک کھانے پینے اور ازدواجی تعلق سے رُکے رہنا۔"

﴿لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ تا کہ تم میں تقویٰ پیدا ہو۔

اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ :......اس سے رمضان المبارک کے فرض روزے مراد ہیں۔

يُطِيْقُوْنَهٗ :...... یہ اِطَاقَةٌ طَاقَةٌ سے اور طوق سے بنا ہے۔ عربی زبان میں وُسْعَ کا لفظ ایسی قوت اور استطاعت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے کوئی کام آسانی اور سہولت سے کیا جا سکے۔ اس کے برعکس طَاقَةٌ اور اِطَاقَةٌ ایسی قوت اور استطاعت کے لیے استعمال ہوتا ہے جس سے کوئی کام سخت محنت، تنگی اور مشقت ہی سے کیا جا سکے:

اَلْاِطَاقَةُ : القدرة على الشيء مع تحمل المشقة الشديدة (تفسير مراغی)

"گویا 'طاقت' کسی کام کے کرنے کی صلاحیت کا کم سے کم درجہ ہے اور اس کے بعد بے بسی اور عجز ہے۔"

غور کیجئے تو ان دونوں کا فرق قرآن مجید میں ان کے استعمالات ہی سے ظاہر ہو جاتا ہے وُسْعَ کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ 2 : 286)

"اللہ کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔"

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ذمہ داریوں کا اتنا ہی بوجھ ڈالتا ہے جتنا وہ آسانی اور سہولت سے اٹھا سکتے ہیں۔

اسی طرح طَاقَةَ کا لفظ قرآن مجید میں صرف دو جگہ آیا ہے:

﴿قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ (البقرہ 2 : 249)

"وہ بولے آج ہم میں جالوت اور اس کے لشکروں سے لڑنے کی طاقت اور ہمت نہیں۔"

مراد یہ ہے کہ لڑنا تو ہم جانتے ہیں مگر اس جنگ میں جتنی سخت محنت اور مشقت درکار ہے وہ ہم سے نہیں ہو سکتی۔

دوسری جگہ دعا میں آیا ہے کہ:

﴿رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ﴾ (البقرہ 2 : 286)

"اے ہمارے رب! ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوا جس کی ہم میں طاقت اور ہمت نہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ ہمیں ایسے مشکل احکامات کا پابند نہ کرنا جن کی وجہ سے ہمیں تنگی اور دشواری پیش آجائے اور ہم سخت محنت اور مشقت میں پڑ جائیں۔

اس لیے ہماری رائے میں لفظ يُطِيْقُوْنَ کے معنی ہی یہ ہیں جیسا کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ جو لوگ مشکل اور دشواری سے روزہ رکھ سکتے ہوں اُن کے لیے یہ رخصت ہے کہ وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ یہی کافی ہے۔ اس طرح ان پر روزے کی قضا بھی لازم نہ آئے گی۔ جیسے دائمی مریض، بہت زیادہ بوڑھے، حاملہ اور دودھ پلانے والی عورتیں۔

عَاكِفُوْنَ :...... یہ عَاكِفٌ کی جمع ہے جو عَكَفَ يَعْكِفُ سے اسم فاعل ہے۔ عَكَفَ کے معنی ہیں اس نے روکا، اس نے ٹھہرایا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا﴾ (الفتح 25:48) اور قربانی کے جانوروں کو روکا گیا ہے۔

عَكَفَ عَلَى الشَّيْءِ کے معنی ہیں کسی چیز پر جمے بیٹھے رہنا، جیسا کہ بنی اسرائیل کے واقعے میں ہے کہ ان کا گزر ایک بت پرست قوم پر ہوا جو اپنے بتوں پر جمے بیٹھے تھے:

﴿وَ جٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰى قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓى اَصْنَامٍ لَّهُمْ﴾

(الاعراف 7: 138)

''اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر پار کرا دیا۔ پھر ان کا گزر ایک ایسی قوم پر ہوا جو اپنے بتوں پر جمی بیٹھی تھی۔''

اسی سے اعتکاف کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں: اپنے آپ کو کسی چیز سے وابستہ کرنا اور روکے رکھنا، خواہ وہ چیز اچھی ہو یا بری۔''

مگر شریعت کی اصطلاح میں اس سے مراد ہے:

''ثواب کی نیت سے مسجد میں رکا رہنا۔''

شرعی اعتکاف کا ذکر اس سے پہلے بھی سورۃ البقرہ میں آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کو حکم دیا تھا کہ:

﴿اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ﴾ (البقرہ 2: 125)

''کہ وہ میرے گھر کو پاک رکھیں طواف کرنے والوں کے لیے، اعتکاف کرنے والوں کے لیے، رکوع کرنے والوں کے لیے اور سجدہ کرنے والوں کے لیے۔''

اَلْخَيْطُ الْاَبْيَضُ :...... (سفید دھاگہ) اس سے صبح کی سفید دھاری مراد ہے۔

اَلْخَيْطُ الْاَسْوَدِ...... (سیاہ دھاگہ) اس سے رات کی سیاہ دھاری مراد ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾ (183)

اس آیت میں مسلمانوں کو رمضان المبارک کے روزے فرض ہونے کا حکم سنایا گیا ہے۔

ارشاد ہوا کہ اہل ایمان پر روزہ فرض ہے۔ یہی حکم پہلی امتوں کے لیے بھی تھا۔ اس کا مقصد تقوے کا حصول ہے جو تمام نیکیوں کی بنیاد ہے۔

انسانی طبیعت کا یہ خاصا ہے کہ اگر کوئی مشکل ایسی ہو جو اجتماعی شکل میں ہو تو وہ آسان محسوس ہوتی ہے۔ اس آیت میں روزے کا حکم دیتے وقت جو پہلی قوموں کا ذکر کیا گیا تو اس میں یہی حکمت کارفرما ہے تاکہ اس حکم کی دشواری کا احساس کم کر دیا جائے۔ کیونکہ انسانی فطرت پابندیوں سے گھبراتی ہے اور جب کوئی پابندی عام ہو جائے تو پھر اسے قبول کرنے لگتی ہے۔

اس آیت میں روزے کا مقصد اور فائدہ یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے تمہارے اندر تقویٰ پیدا ہوگا۔

تقوے کی حقیقت کیا ہے؟ یہ دل کی ایسی کیفیت کا نام ہے جو اللہ سبحانہٗ کے خوف سے پیدا ہوتی ہے اور اس کے اثر سے نیکی کرنا اور برائی سے بچنا آسان ہو جاتا ہے۔ ایک نیک، متقی اور پرہیزگار شخص، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے انجام سے ڈر کر کسی برائی یا گناہ کے قریب نہیں جاتا بلکہ اس سے بچ بچا کر نیکی کی راہ پر چلتا رہتا ہے۔

روزہ اسلام کے پانچ بنیادی ارکان میں سے ایک رکن ہے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں ہے:

(صحیح بخاری، رقم: 8، صحیح مسلم، رقم: 113، ترمذی، رقم: 2609، نسائی، رقم: 5051)

﴿ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ﴾ (184)

''گنتی کے چند دن۔'' اس سے مراد رمضان المبارک کا مہینہ ہے جو 29 یا 30 دن کا ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے ایک ماہ جلد ہی گزر جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پورے بارہ مہینوں میں صرف ایک مہینے کے روزے فرض کیے ہیں تاکہ اس کے بندے آسانی اور سہولت سے روزے رکھ سکیں۔ یہ اللہ سبحانہٗ کی اپنے بندوں پر بڑی رحمت، شفقت، اور رعایت ہے، ورنہ وہ چاہتا تو کئی مہینوں کے روزے فرض کر دیتا جس سے لوگ مشقت اور تنگی میں پڑ جاتے۔

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ (184)

اس سے پہلے یہ رعایت اور سہولت دی گئی کہ بارہ مہینوں میں سے صرف ایک ماہ کے روزے فرض کیے گئے کیونکہ دین اسلام میں آسانی ہے۔ صحیح حدیث میں ہے کہ:

((اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ)) (صحیح بخاری، رقم: 39، نسائی، رقم: 5034)

دین آسانی کا نام ہے۔

پھر چونکہ بیمار اور مسافر کے لیے بعض حالات میں روزہ رکھنا ناممکن تھا یا اس میں ان کے لیے بڑی تنگی اور مشقت

تھی۔اس لیے ان دونوں کے لیے روزے قضا کرنے اور ان کو بعد میں ادا کرنے کی اجازت دی گئی۔کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج 22: 78)

''اور اس (اللہ) نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

اسی طرح احادیث میں حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت کو بھی روزہ چھوڑنے کی اجازت دی گئی ہے اور وہ اپنے قضا شدہ روزے بعد میں رکھیں گی۔

﴿وَ عَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ (184)

یہ ان لوگوں کے لیے رخصت دی گئی ہے جن کے لیے روزہ رکھنے میں حد درجہ مشقت اور تنگی تھی۔جیسے دائمی مریض یا بہت بوڑھے لوگ، کہ وہ ہر روزے کے بدلے کسی مسکین یا محتاج کو ایک دن دو وقت کا کھانا کھلا دیں یا اس کی قیمت کے برابر رقم دے دیں۔اور یہ ایک روزے کا فدیہ ہے۔

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ﴾ (184)

پھر فرمایا کہ ہر روزے کے بدلے جو ضروری فدیہ دینے کا حکم دیا گیا ہے تو اس میں اگر کوئی شخص اپنی مرضی سے زیادہ دے گا اور کسی محتاج پر زیادہ خرچ کرے گا تو اسے اسی نسبت سے زیادہ اجر ملے گا۔گویا وہ واجب حکم ادا کرنے کے ساتھ ساتھ نفلی صدقے کا ثواب بھی پائے گا۔

نفل اور مستحب کاموں پر اجر و ثواب کے حوالے سے مزید وضاحت آیت 158 کی تفسیر میں دیکھ لیجیے۔

﴿وَ اَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (184)

فرمایا اگر تمہیں علم ہو کہ روزہ رکھنے کا کتنا اجر و ثواب ہے تو تم اس کا فدیہ دینے کی بجائے روزہ رکھنے کو ترجیح دو گے۔کیونکہ فدیہ تو رخصت ہے۔وہ روزے کا صحیح نعم البدل نہیں ہے۔اس لیے تم یہ بھی کر سکتے ہو کہ فدیہ بھی دے دو اور جتنے روزے ممکن ہوں وہ بھی رکھو تا کہ زیادہ سے زیادہ ثواب پاؤ۔

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَ الْفُرْقَانِ﴾ (185)

فرمایا رمضان المبارک وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہونا شروع ہوا اور قریباً تیئس 23 برس میں اس کا نزول مکمل ہوا۔یہ قرآن تمام لوگوں کے لے سراپا ہدایت ہے۔اس میں ہر قسم کی رہنمائی اور اس کے واضح دلائل موجود ہیں۔یہ حق اور باطل میں فرق کرنے والی کتاب ہے۔اس کی واضح آیات سے گمراہی کے اندھیرے چھٹتے اور ہدایت کی شاہراہ روشن ہوتی ہے۔ایسی بابرکت کتاب میں انسانوں کے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی اور سرفرازی ہے۔اس مبارک کتاب کے نازل ہونے پر رمضان المبارک کے روزے فرض کیے گئے ہیں تا کہ اس نعمت کا صحیح طور پر شکر ادا کیا جا سکے۔

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (185)

ارشاد ہوا کہ جو شخص مقیم ہو اور وہ مسافر نہ ہو تو اس پر لازم ہے کہ رمضان المبارک کے روزے رکھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسافر کے لیے روزہ رکھنا لازمی نہیں ہے بلکہ وہ بعد میں اپنے چھوڑے ہوئے روزوں کی قضا پوری کرے گا۔ آیت کے اس فقرے سے بھی روزے کا فرض ہونا ثابت ہوتا ہے جیسا کہ آیت 183 سے اس کا فرض ہونا ثابت ہوا ہے۔

﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ (185)

یہ فقرہ دوبارہ آیا ہے کہ مریض اور مسافر پر روزہ رکھنا لازم نہیں ہے بلکہ وہ مرض کے دور ہونے اور سفر کے ختم ہونے پر رمضان المبارک کے بعد قضا شدہ روزے رکھیں گے۔ مزید وضاحت کے لیے آیت 184 میں اسی فقرے کی تفسیر دیکھ لی جائے۔

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (185)

یہ اللہ سبحانہٗ کی رحمت و شفقت کا اظہار ہے کہ وہ اپنے بندوں کے لیے آسانی چاہتا ہے دشواری نہیں چاہتا۔ وہ لوگوں کو سہولت دینا چاہتا ہے ان کو تنگی میں مبتلا نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ان کو آسان احکام دیتا ہے اور ان کے ساتھ رخصت بھی دیتا ہے۔

یہی مضمون کئی اور مقامات پر بھی بیان ہوا ہے جیسے:

﴿مَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ حَرَجٍ﴾ (المائدہ 5:6)

''اللہ نہیں چاہتا کہ وہ تم پر کوئی تنگی ڈالے۔''

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج 22:78)

''اور اُس (اللہ) نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ 2:286)

''اللہ کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔''

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا﴾ (النساء 4:28)

''اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے پابندیوں کا بوجھ ہلکا کر دے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ (185)

فرمایا کہ قضا شدہ روزے رکھنے کا مقصد رمضان المبارک کے روزوں کی تعداد پوری کرنا ہے تاکہ اس طریقے سے پورا پورا ثواب حاصل کیا جا سکے اور اجر و برکت میں کوئی کمی باقی نہ رہے۔

﴿وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ﴾ (185)

فرمایا، اللہ سبحانہٗ نے تمہیں دین کی جو ہدایت و رہنمائی فرمائی ہے اور دین کے ایسے احکام دیئے ہیں جن میں

تمہارے لیے دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے، تو اس پر تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو اور ذکر و تسبیح کرو کہ اس نے تمہاری فلاح و بہبود کے لیے عمدہ احکام دیے ہیں اور ان کے ساتھ رخصتیں بھی عطا کی ہیں۔

﴿ وَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝۱۸۵ ﴾ (185)

آخر میں فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ کی تمام نعمتوں کا شکر ادا کرو۔ اس کے دیے ہوئے احکام پر عزیمت کے ساتھ عمل بھی کرو اور ضرورت کے وقت اس کی رخصتوں سے بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو۔ اسی طریقے سے تمہارا ایمان کامل ہوگا اور تمہارا رب بھی تم سے راضی ہو جائے گا۔

گویا اس جگہ قران حکیم کے نزول کی نعمت پر اور رمضان المبارک کے روزوں کی برکات حاصل ہونے پر خصوصی شکر ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

﴿ وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ ﴾ (186)

تفسیر طبری میں اس آیت کا شانِ نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے پاس ایک دیہاتی آیا اور اس نے سوال کیا کہ کیا ہمارا رب قریب ہے کہ ہم اسے آہستہ سے پکاریں، یا وہ دور ہے کہ ہم اسے بلند آواز سے پکاریں، اس پر حضور ﷺ خاموش رہے تو اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔

ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک غزوہ (غالباً غزوہ خیبر) کے موقع پر بعض صحابہ کرام کو دیکھا کہ وہ بلند آواز سے تہلیل و تکبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو پکار رہے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے فرمایا: لوگو! اپنے آپ میں رہو۔ تم کسی بہرے یا غائب خدا کو نہیں پکار رہے ہو، بلکہ تم ایسے خدا کو پکار رہے ہو جو ہر بات سنتا اور قریب ہے۔

(صحیح بخاری، رقم: 2992، ابو داؤد، رقم: 1526)

البتہ بعض حالات میں شریعت نے اجازت دی ہے کہ اللہ سبحانہٗ کا نام بلند آواز سے پکارا جائے جیسے حج اور عمرہ میں تلبیہ کہنا، عیدین کی تکبیرات یا دورانِ جنگ اللہ اکبر کا نعرہ لگانا وغیرہ۔

اس سے پہلے روزوں کا اور پھر اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے کا ذکر ہوا۔ اب دعا کے وقت پکارنے کا طریقہ بتایا گیا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہے کہ اے نبی ﷺ! جب میرے بارے میں لوگ پوچھیں تو آپ ﷺ کہیں کہ اللہ تمہارے بالکل قریب ہے۔ وہ ہر دعا کرنے والے کی دعا براہِ راست خود سنتا ہے۔ اس کے اور بندوں کے درمیان کوئی پردہ حائل نہیں ہے اور کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ درمیان میں کوئی ایسا سفارشی بھی موجود نہیں ہے جو ان کی دعا کی عرضیاں ان کے رب تک پہنچاتا ہو، یا جس کی سفارش سے ان کی دعائیں قبول ہوتی ہوں۔

اس مضمون کی نظیر کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے قریب ہے، یہ آیت ہے کہ:

﴿ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴾ (ق 16:50)

''اور ہم اس کی شہ رگ سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔''

﴿فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝١٨٦﴾ (186)

فرمایا: دعا سے پہلے بندوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ میرے احکام پر چلتے ہوئے صرف مجھ سے دعا کریں۔ مجھ پر ایمان رکھیں اور بھروسا کریں تاکہ میں ان کی دعائیں قبول کروں۔ جب وہ حالتِ ایمان کے ساتھ میری اطاعت کریں گے تو میں ان کی دعا ضرور قبول کروں گا۔ آخر میں فرمایا: ﴿لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ﴾ کہ یہی طریقہ ہے ہدایت پانے اور بامراد ہونے کا، کہ بندے اپنے رب پر ایمان لائیں، اس کے احکام کی اطاعت کریں اور پھر اپنی حاجات پوری کرنے کے لیے اور اپنی مشکلات حل کرنے کے لیے صرف اسی سے دعائیں مانگیں۔ صرف اسی طریقے سے ان کو دنیا اور آخرت کی بھلائی اور فلاح و کامرانی حاصل ہو سکتی ہے۔ دعا کے بارے میں تفصیل ان شاء اللہ سورۃ المومن (40) کی آیت 60 کی تفسیر میں ملے گی۔

﴿أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ﴾ (187)

ارشاد ہوا کہ تمھیں رمضان المبارک کی راتوں کو بیویوں سے ہم بستری کی اجازت دی جاتی ہے مگر دن کے وقت روزے کی حالت میں ایسا کرنا بالکل جائز نہیں ہے۔

﴿هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَأَنتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ﴾ (187)

فرمایا تمہاری بیویاں تمہارے لیے لباس کی طرح ہیں اور تم اپنی بیویوں کے لیے لباس کی مانند ہو۔

میاں بیوی کے باہمی ربط و تعلق کو ایک دوسرے کا لباس قرار دینا نہایت بلیغ استعارہ ہے۔ اسی جسمانی قربت و مصاحبت کی بنا پر چونکہ بعض طبائع کے لیے مہینہ بھر کا صبر دشوار ہو سکتا تھا۔ لہٰذا اس تنگی اور حرج کو دور کرتے ہوئے ملاقات کی رخصت دے دی گئی جو شریعت کے عام قاعدے کے مطابق بھی ہے کہ جہاں تنگی ہو گی وہاں رخصت دی جائے گی۔

﴿عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنتُمْ تَخْتَانُونَ أَنفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنكُمْ﴾ (187)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری اس حرکت کا علم تھا کہ تم میں سے کچھ لوگوں نے ایک کام کو ناجائز سمجھتے ہوئے بھی اس کا ارتکاب کیا۔ گویا تم نے اپنے آپ سے خیانت کی۔ پھر چونکہ اس بارے میں ابھی تک کوئی واضح شرعی حکم موجود نہ تھا اس لیے تمہاری اس خطا پر اللہ سبحانہٗ نے کوئی گرفت نہیں فرمائی اور اپنی کمال مہربانی سے تمھیں معاف کر دیا۔

﴿فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ﴾ (187)

فرمایا: اب تمھیں ایک واضح حکم کے ذریعے اجازت دی جاتی ہے کہ روزوں کی راتوں میں تم اپنی بیویوں کے قریب جا سکتے ہو اور جو کچھ اللہ سبحانہٗ نے تمہاری قسمت میں لکھا ہے وہ حاصل کر سکتے ہو، یعنی اولاد اور ایک دوسرے کے لیے

پاک دامنی اور صدقہ کرنے کا اجر بھی، جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے۔
(صحیح مسلم، رقم: 2329، مسند احمد، رقم: 21805)

﴿وَ كُلُوْا وَ اشْرَبُوْا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ﴾
(187)

اب فرمایا کہ روزوں کی راتوں میں کھانے پینے اور بیویوں سے ملنے کی عام اجازت ہے اس وقت تک کے لیے جب صبح کی سفیدی رات کی سیاہی سے الگ ظاہر ہو جائے، گویا جب رات ختم ہونے اور صبح طلوع ہونے کے آثار پیدا ہو جائیں۔ اسی کو صبح صادق کہا جاتا ہے۔ اس سے یہ باریک اشارہ بھی نکلتا ہے کہ بعض اوقات جنابت کی حالت میں بھی روزہ رکھ کر بعد میں غسل کیا جا سکتا ہے۔

﴿ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّيَامَ اِلَى الَّيْلِ﴾ (187)

ارشاد ہوا کہ صبح صادق سے لے کر سورج غروب ہونے تک روزے کی حالت ہے جس میں کھانا پینا وغیرہ منع ہے۔ پھر جب سورج ڈوب گیا تو اب روزہ کھولنے میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ جیسا کہ صحیح حدیث میں یہ وضاحت موجود ہے کہ:

((اِذَا اَقْبَلَ اللَّيْلُ مِنْ هَاهُنَا، وَ اَدْبَرَ النَّهَارُ مِنْ هَاهُنَا، وَغَرَبَتِ الشَّمْسُ فَقَدْ اَفْطَرَ الصَّائِمُ)) (صحیح بخاری، رقم: 1954، صحیح مسلم، رقم: 2558)

''جب رات اس طرف سے آجائے اور دن اس طرف پلٹ جائے اور سورج غروب ہو جائے تو روزے دار کو چاہیے کہ وہ افطار کر لے۔''

اور متفق علیہ ایک حدیث میں آیا ہے کہ:

((لَا يَزَالُ النَّاسُ بِخَيْرٍ مَا عَجَّلُوْا الْفِطْرَ))

''لوگ جب تک افطاری کرنے میں جلدی کرتے رہیں گے، وہ خیر اور بھلائی پر رہیں گے۔''

بعض لوگ اِلَى اللَّيْلِ (رات تک) کے الفاظ سے رات کے اندھیرے کا چھا جانا مراد لیتے ہیں جو کہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اول تو یہ صحیح احادیث کے خلاف ہے۔ دوسرے سیدھی بات یہ ہے کہ دن کا اختتام ہی رات کا آغاز ہوتا ہے اس لیے سورج کے چھپ جانے کے فوراً بعد ہی روزہ افطار کر لینا قرآن و سنت دونوں ہی کے عین مطابق ہے۔

﴿وَ لَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَ اَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ﴾ (187)

اس سے پہلے چونکہ روزوں کی راتوں میں کھانے پینے کے علاوہ بیویوں کے قریب جانے کی عام اجازت دی گئی جیسا کہ فرمایا گیا: ﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ﴾

اس سے یہ غلط فہمی ہو سکتی تھی کہ شاید مسجد میں رمضان المبارک کے اعتکاف کے دوران بھی بیویوں کے پاس جایا جا سکتا ہے تو اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ اس کی بالکل اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ اس سے اعتکاف باطل ہو

جاتا ہے جیسے دن کے وقت کھانے پینے سے روزہ ختم ہو جاتا ہے۔

اس سے بعض اہل علم نے یہ سمجھا ہے کہ جس طرح مردوں کے اعتکاف کے لیے ضروری شرط ہے کہ وہ مسجد ہی میں ہو اسی طرح عورتوں کے اعتکاف کے لیے بھی مسجد کا ہونا شرط ہے۔ لیکن آیت کے الفاظ اس بارے میں صریح یا قطعی نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک عورت کے اعتکاف کے لیے مسجد کا ہونا ضروری شرط نہیں ہے بلکہ وہ اپنے گھر کے مصلّے وغیرہ میں اعتکاف کرے گی اور فتنے کے اس دور میں ہم اسی رائے کو ترجیح دیتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جب شریعت نے کسی فرض عبادت کے لیے عورت کو مسجد میں حاضری کے لیے پابند نہیں کیا تو کسی سنت یا نفل عبادت کے لیے اسے مسجد میں آنے کے لیے کیوں پابند کیا جائے؟

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَقْرَبُوْهَا ﴾ (187)

ارشاد ہوا کہ ابھی جو احکامات دیے گئے ہیں، جن میں بعض فرض ہیں، بعض حرام اور کچھ مباح ہیں مگر یہ سب حدودُ اللہ ہیں، یعنی اللہ سبحانہٗ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں جن کو پھلانگنا تو درکنار، ان کے قریب بھی نہ پھٹکنا۔

ظاہر ہے اس فقرے میں جو سختی اور وعید ہے وہ اس سے بہت زیادہ ہے جس میں یہ فرمایا گیا ہے کہ:

﴿ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ﴾ (البقرہ 2: 229)

''یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے باہر نہ نکلو۔''

اس کے علاوہ قرآن کے اور مقامات جہاں پر لَا تَقْرَبُوْا کہہ کر خبردار کیا گیا ہے کہ کبھی ان چیزوں کے قریب نہ جاؤ، وہ یہ ہیں:

1۔ یتیم کا مال کھانا:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ﴾ (الانعام 6: 152)

''اور یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو۔ یہاں تک کہ وہ یتیم اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔''

2۔ زنا:

﴿ وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓى اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَآءَ سَبِيْلًا ﴾ (بنی اسرائیل 17: 32)

''اور زنا کے قریب نہ جاؤ، وہ بے حیائی ہے اور برا راستہ ہے۔''

اسی مضمون کو ایک متفق علیہ حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

((اَلَا! وَاِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى ، اَلَا ! وَاِنَّ حِمَى اللّٰهِ مَحَارِمُهٗ . . . . .))

(صحیح بخاری، رقم: 52، صحیح مسلم، رقم: 4094)

''خبردار! ہر بادشاہ کی ایک محفوظ چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی زمین پر اس کی محفوظ چراگاہ اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ عام طور پر بادشاہ اپنی ایک خاص محفوظ چراگاہ رکھتا ہے جو دوسروں کے لیے ممنوع ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ سبحانہٗ کی محفوظ اور ممنوع چراگاہ اس کی حرام کی ہوئی چیزیں ہیں جن سے بچنا ضروری ہے اور ان کی خلاف ورزی جائز نہیں ہے۔

﴿كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝۱۸۷﴾ (187)

مراد یہ ہے کہ قرآن حکیم نے روزے سے متعلق تفصیلی احکام دیے ہیں اس میں عزیمت و رخصت کے پہلوؤں کو واضح کیا ہے اور روزے کی حکمت اور مقصد بیان کیا ہے تاکہ اہل ایمان خواہش پرستی سے بچ کر تقوے اور پرہیز گاری کی زندگی اختیار کر سکیں۔

وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۱۸۸ ع

ع ۲۳ ۷

''اور ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ، رشوت کو حاکموں تک رسائی کا ذریعہ نہ بناؤ کہ اس طرح جان بوجھ کر دوسروں کا مال ہڑپ کر جاؤ۔'' (188)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

وَلَا تَاْكُلُوْا :......اس سے صرف کھانا مراد نہیں ہے بلکہ ناجائز مال حاصل کر کے اسے اپنے استعمال اور تصرف میں لانا مراد ہے۔ تُدْلُوْا بِهَا :...... یہ اصل میں لَا تُدْلُوْا بِهَا ہے۔ اس کا لَا (لائے نہی) حذف ہو گیا ہے کیونکہ اس جملے کا عطف پہلے جملے پر ہے اور وہاں لَا موجود ہے جو اس پر اثر انداز ہوا ہے۔ اَدْلٰى يُدْلِىْ اِدْلَاءً کے اصل معنی اِلْقَاءُ الدَّلْوِ لِاِخْرَاجِ الْمَاءِ کے ہیں، یعنی پانی حاصل کرنے کے لیے کنوئیں میں ڈول ڈالنا، جیسا کہ سورۂ یوسف میں ہے:

﴿وَجَاءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى دَلْوَهٗ﴾ (یوسف 12:19)

''اور ایک قافلہ آیا۔ انھوں نے اپنا پانی بھرنے والا بھیجا۔ تو اس نے اپنا ڈول لٹکایا۔''

پھر اسی سے اس میں رسائی اور قرب و تعلق کا مفہوم پیدا ہو گیا۔ جس طرح رسی کے ذریعے سے ڈول پانی تک پہنچتا ہے اسی طرح رشوت کا مال حرام خور حاکموں تک رسائی کا ذریعہ بنتا ہے۔

فَرِيْقًا :......اس سے مراد سارا یا بہت زیادہ مال ہے۔

بِالْاِثْمِ :......اِثْم میں گناہ اور حق تلفی دونوں شامل ہیں

﴿وَ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ (188)

اس سے پہلے یہ بتایا گیا کہ روزے کی حالت میں کھانا پینا منع ہے۔ حالانکہ کھانے پینے کی چیزیں اپنا ہی مال ہوتا ہے۔ اب یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ دوسروں کا مال بِالْبَاطِلِ یعنی ناحق اور ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔ اس میں ہر قسم کی حرام کمائی آ گئی ۔ گویا اس حکم کے ذریعے تمام حرام طریقوں جیسے سُود، رشوت، جوا، خیانت، سٹہ، چوری، غصب، ڈاکہ، فریب کاری اور کرپشن وغیرہ سے حاصل کیا ہوا دوسروں کا مال کھانے سے روک دیا گیا ہے۔

پھر دوسروں کے مال کو اَمْوَالَكُمْ (تمہارے مال) کہا گیا۔ یہ وہی اسلوب ہے جیسے بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ:

﴿وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَ كُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِ كُمْ﴾

(البقرہ2 : 84)

''اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنے خون نہ بہانا اور اپنے لوگوں کو ان کے گھروں سے نہ نکالنا۔''

اس میں دِمَآءُ كُمْ (تمہارے خون)، اَنْفُسَكُمْ (اپنے آپ کو) اور دِيَارِ كُمْ (اپنے گھروں) کے الفاظ بھی اسی طرح آئے ہیں جیسے اس آیت میں اَمْوَالَكُمْ (تمہارے مال) آیا ہے۔

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ امت مسلمہ ایک اکائی اور وحدت ہے۔ وہ ایک جسم کی طرح ہے جس کے ایک عضو کا نقصان سارے جسم کا نقصان ہے گویا دوسروں کا نقصان بھی اپنا نقصان ہے۔

﴿وَ تُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ﴾ (188)

مطلب یہ ہے کہ مال کو حاکموں تک رسائی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ اس سے رشوت مراد ہے جس سے روکا گیا ہے۔ اسلامی شریعت میں رشوت کا مال کھانا حرام ہے۔

﴿لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٨﴾﴾ (188)

مراد یہ ہے کہ دوسروں کا مال اور جائیداد جان بوجھ کر جھوٹے مقدموں، جھوٹی گواہیوں اور رشوت کے ذریعے نہ ہتھیا لو، یہ سراسر گناہ اور حرام ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ؕ قُلْ هِيَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَ الْحَجِّ ؕ وَ
لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ
مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ
تُفْلِحُوْنَ ﴿١٨٩﴾ وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا

تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۱۹۰﴾ وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ
ثَقِفْتُمُوْهُمْ وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ وَ الْفِتْنَةُ اَشَدُّ
مِنَ الْقَتْلِ ۚ وَ لَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ
فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ؕ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾ فَاِنِ
انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾ وَ قٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ
فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا
عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ
فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَ اتَّقُوا
اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۹۴﴾ وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا
تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛۚ وَ اَحْسِنُوْا ۛۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۹۵﴾
وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ
وَ لَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ؕ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا
اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَاۤ
اَمِنْتُمْ ۫ وقفة فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ
لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ؕ تِلْكَ عَشَرَةٌ
كَامِلَةٌ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ اتَّقُوا

ع ۲۴ ۸ ۸ اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۹۶﴾ ع

''(اے نبی ﷺ) لوگ آپ سے چاند کے گھٹنے بڑھنے کے بارے میں پوچھتے ہیں آپ ﷺ کہیں کہ اس سے لوگوں کو وقت کا حساب معلوم ہوتا ہے اور حج کے دنوں کا پتہ چل جاتا ہے۔ اور نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے گھروں میں چھت پر سے آؤ۔ اصل نیکی اللہ سے ڈرنا ہے۔ لہٰذا اپنے گھروں میں داخل ہونے کے لیے ان کے دروازوں سے آیا کرو۔ اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔

(مسلمانو) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں لیکن زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ وہ جہاں بھی تمہارے مقابلے میں آئیں ان کو قتل کرو۔ جس شہر سے انھوں نے تمہیں نکالا، تم بھی وہاں سے ان کو نکال باہر کرو، کیونکہ (حرم میں کفر اور شرک کا) فتنہ قتل سے بھی بڑا جرم ہے۔ لیکن مسجدِ حرام میں تم ان سے نہ لڑو جب تک وہ نہ لڑیں۔ اگر وہاں بھی وہ جنگ چھیڑ دیں تو انھیں قتل کرو۔ ایسے کافروں کی یہی سزا ہے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

اور ان سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ (کفر و شرک کا) فتنہ باقی نہ رہے اور اللہ کا دین غالب ہو جائے۔ پھر اگر وہ باز آجائیں تو ظالموں کے سوا کسی اور پر سختی نہ کی جائے۔

جنگ میں محترم مہینے کی حرمت کا خیال صرف اس صورت میں رکھا جائے گا جب دشمن بھی اس کی حرمت کا خیال رکھے۔ اسی طرح دوسری تمام حرمت والی چیزوں میں بھی ادلے کا بدلہ ہے۔ لہٰذا (اے مسلمانو) جو لوگ تم سے زیادتی کریں، تم بھی ان کی زیادتی کے برابر جوابی کارروائی کر سکتے ہو۔ لیکن ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو، اور یقین رکھو اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔

اور اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے مال خرچ کرو ورنہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالو گے۔ ہر حال میں بھلائی کرو۔ اللہ بھلائی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اور اللہ کے لیے حج اور عمرے کو (تمام آداب و شرائط کے ساتھ) پورا کرو۔ اگر راستے میں بدامنی کی وجہ سے مجبوراً رکنا پڑے تو جو قربانی کا جانور میسر ہو اس کی قربانی کرو، اور اس وقت تک سر کے بال نہ منڈواؤ جب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے۔ پھر اگر کوئی بیمار ہو، یا اس کے سر میں تکلیف ہو، (اور عذر کی وجہ سے اپنا سر منڈوالے) تو اسے چاہیے کہ کفارے کے طور پر کچھ روزے رکھے، یا صدقہ کرے، یا قربانی کرے۔ لیکن جب امن کی حالت میں ہو اور کوئی شخص حج سے پہلے عمرہ بھی کرنا چاہے تو جو قربانی کا جانور میسر ہو، اس کی قربانی کرے۔ قربانی نہ کر سکتا ہو تو تین روزے حج کے دوران میں رکھے اور سات روزے حج کے بعد گھر واپس آکر رکھے۔ یہ پورے دس روزے ہوئے۔ مگر اس طرح عمرہ کرنے کی اجازت ایسے شخص کے لیے ہے جس کے اہل و عیال مکے میں نہ رہتے ہوں۔ ہر حال میں اللہ سے ڈرو، اور یاد رکھو کہ اللہ

عذاب دینے میں بڑا سخت ہے۔''

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اَلْاَهِلَّةِ :...... یہ هِلَالٌ کی جمع ہے جس سے پہلی، دوسری یا تیسری رات کا چاند مراد ہوتا ہے۔ اَهَلَّ اور اِسْتَهَلَّ کے معنی ہیں آواز بلند کرنا۔ جب بچہ پیدا ہونے کے بعد روتا چیختا ہے تو کہا جاتا ہے اِسْتَهَلَّ الصَّبِیُّ ۔ اسی طرح اَهَلَّ الْقَوْمُ بِالْحَجِّ کے معنی ہیں لوگوں نے حج کے لیے تلبیہ پکارا۔ چونکہ لوگ نیا چاند دیکھ کر اس کی اطلاع دینے کے لیے بلند آواز سے پکارتے تھے اس لیے نئے چاند کا نام ہلال پڑ گیا۔ بعض لوگ ہلال سے پہلے پورا مہینہ مراد لیتے ہیں اور پھر اس سے حرمت والے مہینے مراد لے لیتے ہیں جو کہ صحیح نہیں ہے۔

مَوَاقِیْتُ :...... یہ میقات کی جمع ہے۔ اس سے مراد اوقات (TIMINGS) ہیں۔

ظُهُوْرِ:...... یہ ظَهْرٌ کی جمع ہے جس کے معنی پیٹھ کے ہیں۔ اس جگہ اس سے مکان کا پچھواڑہ (پیچھے کی طرف کا حصہ) مراد ہے۔

اَلْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ :...... (فتنہ قتل سے بڑھ کر ہے) اس میں "اَلْفِتْنَةُ" سے مراد ہے کسی کو مذہب بدلنے کے لیے مجبور کرنا۔ جسے انگلش میں (PERSECUTION) کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید کے درج ذیل مقامات پر بھی یہ لفظ اپنے انہی معنوں میں آیا ہے:

1۔ سورۃ النحل میں ہے:

﴿ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِیْنَ هَاجَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا فُتِنُوْا ثُمَّ جٰهَدُوْا وَ صَبَرُوْۤا ۙ اِنَّ رَبَّكَ مِنْۢ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ﴾ (النحل 16: 110)

''پھر جن لوگوں نے سخت آزمائشوں میں پڑنے کے بعد اللہ کی راہ میں ہجرت کی، جہاد کیا اور ثابت قدم رہے، تو اُن کے ان اعمال کی بدولت آپ ﷺ کا رب انھیں ضرور بخشنے والا مہربان ہے۔''

اسی طرح سورۃ البروج میں ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ لَمْ یَتُوْبُوْا فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ وَلَهُمْ عَذَابُ الْحَرِیْقِ﴾ (البروج 85: 10)

''بے شک جن لوگوں نے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو ستایا اور توبہ نہ کی، ان کے لیے دوزخ میں جلنے کا عذاب ہے۔''

فَتَنَ کے اصلی معنی ہیں کسی چیز کو آگ پر تپانا۔ پھر اس کا استعمال ہر آزمائش، امتحان، سختی، جبر اور تشدد کے لیے ہونے لگا۔

اَلْمَسْجِدِ الْحَرَامِ :......اس کا واحد حُرْمَةٌ ہے جس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس کا احترام اور پابندی لازم ہو۔ جیسے رمضان المبارک کا مہینہ۔

اَلتَّهْلُكَةِ :......اس کے معنی ہلاکت و بربادی کے ہیں مگر اس جگہ اس سے مراد ہے جہاد کے لیے مال خرچ نہ کرنا اور جہاد چھوڑ دینا۔

اَلْعُمْرَةَ :......عمرہ کے لفظی اور لغوی معنی بھی (حج کی طرح) کسی جگہ کا قصد و ارادہ کرنے کے ہیں لیکن اس کے اصطلاحی یا شرعی معنی خانہ کعبہ کا قصد وارادہ کرنے کے ہیں۔ حج کے دن تو مقرر ہیں مگر عمرہ سال کے کسی بھی حصے میں کیا جا سکتا ہے۔ عمرہ کو بعض نے فرض قرار دیا ہے اور بعض اسے سنت مانتے ہیں جیسا کہ فقہ حنفی میں ہے۔

اُحْصِرْتُمْ :...... یہ حَصَرَ سے ہے جس کے معنی اَلْحَبْسُ وَالتَّضْيِيْقُ یعنی روکنے اور تنگ کرنے کے ہیں۔

اَلْهَدْيُ :......(قربانی کا جانور) یہ واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ اس سے حج میں قربانی کے جانور مراد ہیں۔

مَحِلَّهٗ :......(اس کا ٹھکانہ) مَحِلٌّ کے معنی اترنے یا ٹھہرنے کی جگہ کے ہیں۔ یہ حَلَّ يَحِلُّ سے اسم ظرف ہے۔

حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ :......اس سے اہل مکہ مراد ہیں۔ اس کے علاوہ اس سے اہل حرم بلکہ اہل حِل بھی مراد ہیں جو میقاتوں کے اندر رہتے ہیں۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ ۭ قُلْ هِىَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ ۭ﴾ (189)

اس سے پہلے رمضان المبارک اور اس کے روزوں کا ذکر تھا۔ اب اسی مناسبت سے چاند کا ذکر آگیا۔ کیونکہ رمضان المبارک کے شروع اور ختم ہونے کا سارا انحصار صرف رویتِ ہلال یعنی چاند دیکھنے پر ہے جیسا کہ ایک متفق علیہ حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((صُوْمُوْا لِرُؤْيَتِهٖ وَاَفْطِرُوْا لِرُؤْيَتِهٖ)) (صحيح بخاری، رقم: 1909، صحيح مسلم رقم: 2515)

''(رمضان کا) چاند دیکھنے پر روزہ رکھو اور (شوال کا) چاند دیکھنے پر روزہ رکھنا ختم کر دو۔''

مذکورہ آیت کا شانِ نزول وہ روایت ہے جسے ابو نعیم اور ابن عساکر نے ابو صالح کے حوالے سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے نقل کیا ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ حضرت معاذ بن جبل اور ثعلبہ بن غنیمہ رضی اللہ عنہما (دو انصاری صحابہ) نے نبی کریم ﷺ سے چاند کے بارے میں سوال کیا تھا تو اس پر یہ آیت اتری تھی۔

ہر ماہ چاند کے گھٹنے بڑھنے سے متعلق اہل ایمان کی طرف سے یہ سوال بالکل اسی نوعیت اور اسلوب کا ہے جو ہمیں قرآن میں جا بجا ملتا ہے۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى﴾ (البقرہ 2: 220)

''اے نبی ﷺ! لوگ آپ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔''

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ﴾ (البقرہ 2: 222)

''اے نبی ﷺ! لوگ آپ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔''

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ﴾ (البقرہ 2:219)

''اے نبی ﷺ! لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔''

ان سوالوں میں یہ نہیں پوچھا گیا تھا کہ یتیم کیا ہوتا ہے اور کیا کام کرتا ہے۔ یا عورتوں کو حیض کیوں آتا ہے۔ اس کا رنگ کیسا ہوتا ہے۔ یا شراب کیا چیز ہوتی ہے اور وہ کیسے بنائی جاتی اور پی جاتی ہے اور انسانی صحت پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ یا جوا کیا شے ہے۔ وہ کیوں اور کیسے کھیلا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

بلکہ ان سوالوں کے پوچھنے کی غرض یہ تھی کہ ان چیزوں کے بارے میں شریعت کیا کہتی ہے اور دین کیا تعلیم دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ لوگوں نے ان باتوں سے متعلق یہ پوچھا تھا کہ ان کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ بالکل یہی اسلوب اس مقام پر چاند کے بارے میں پوچھنے کا ہے کہ اس کے نکلنے اور گھٹنے بڑھنے کے بارے میں شرعی حکم کیا ہے اور دین کی تعلیم کیا ہے۔

جو لوگ قرآن مجید کے اس اسلوب سے واقف نہ تھے انھیں اس مقام کی تفسیر میں بڑی الجھن پیش آئی۔ انھوں نے پہلے تو اسے ایک سائنسی اور فلکیات (SPACE SCIENCE) کا سوال سمجھا۔ پھر کہنے لگے کہ اگر اس سوال کا جواب سائنسی انداز میں دیا جاتا تو عام لوگ اس کی پیچیدہ حقیقت کو سمجھ نہ پاتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس سوال کا سیدھا جواب دینے کے بجائے اس کا رخ شریعت کی طرف موڑ کر اس کا جواب دے دیا۔

اسی طرح کچھ اور لوگوں نے یہ خیال کیا کہ اس طرح کا سائنسی سوال کرنا عربوں کے مزاج ہی کے خلاف تھا۔ اس لیے ان کی طرف سے ایسا کوئی سوال نہیں ہوسکتا تھا۔ پھر آگے بڑھ کر انھوں نے اس کی یہ تاویل اختیار کر لی کہ یہ سوال ''اشہر حرم'' یعنی حرمت والے مہینوں سے متعلق تھا اور چاند سے مراد مہینہ ہے۔ پھر اپنی طرف سے ایک مصنوعی اور دور از کار سیاق وسباق گھڑ کر اس سے حرمت والے مہینے مراد لے لیے۔ جب کہ ان کا ذکر الگ سے آیت 194 میں آیا ہے اور یہاں ان کو بیان کرنے کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔

اسی آیت میں قمری مہینوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں فرمایا گیا کہ گویا یہ ایک قدرتی جنتری اور کیلنڈر ہے جسے خاص و عام سب سمجھ سکتے ہیں۔ جب کہ دوسرے کیلنڈروں مثلاً عیسوی یا بکرمی کیلنڈر کو صرف پڑھے لکھے لوگ ہی سمجھ سکتے ہیں۔ اسلامی کیلنڈر سے سب لوگوں کو اپنے معاملات کے لیے اوقات کا پتہ چل جاتا ہے اور خاص طور پر اس سے حج کے دنوں کا ٹھیک تعین ہوسکتا ہے۔

یاد رہے کہ اسلام میں دن رات کے چوبیس 24 گھنٹوں کے نظام الاوقات کا تعلق سورج کے طلوع وغروب سے ہے جیسے روزانہ کی پانچ نمازوں اور سحری وافطاری کے اوقات وغیرہ۔ مگر دنوں، مہینوں اور برسوں کی گنتی کا تعلق ہر ماہ چاند کے گھٹنے بڑھنے سے ہے جیسے زکوٰۃ کے لیے سالانہ مدت، بیوہ اور مطلقہ عورت کی عدت، حمل اور بچے کی رضاعت، اور

بالخصوص حج کے مہینوں ماہ شوال، ماہ ذی قعدہ اور ذوالحجہ کے ابتدائی دس دن۔ کیونکہ اگر چاند ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتا تو ان تمام شرعی احکام کا تعین نہایت مشکل ہو جاتا جن کا تعلق چاند کے اتار چڑھاؤ سے ہے۔

یہی مضمون قرآن مجید کی درج ذیل آیات میں بھی آیا ہے:

1۔ ﴿اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ﴾ (الرحمٰن 55:5)

''سورج اور چاند ایک حساب کے ساتھ چلتے ہیں۔''

2۔ ﴿وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰى عَادَ كَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِيْمِ ۝ لَا الشَّمْسُ يَنْۢبَغِيْ لَهَاۤ اَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا الَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ ؕ وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ ۝﴾ (یٰس 36:39، 40)

''اور (ایک نشانی) چاند ہے جس کے لیے ہم نے منزلیں مقرر کیں، یہاں تک کہ وہ آخر میں ایسا رہ جاتا ہے جیسے کھجور کی پرانی ٹہنی، نہ سورج کی مجال ہے وہ چاند کو جا پکڑے اور نہ رات کے بس میں ہے کہ وہ دن کی جگہ لے۔ سب اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔''

3۔ ﴿هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِيَآءً وَّ الْقَمَرَ نُوْرًا وَّ قَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِيْنَ وَ الْحِسَابَ ۝﴾ (یونس 10:5)

''اسی (اللہ) نے سورج کو روشن بنایا، چاند کو چمک دار بنایا، اور اسی کی منزلیں مقرر کر دیں تاکہ تم ان کے ذریعے برسوں کی گنتی اور حساب معلوم کرو۔''

﴿وَ لَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا﴾ (189)

اسی جگہ جاہلیت کے دور کی ایک بدعت اور غلط مذہبی طریقے کی اصلاح کی گئی ہے۔ اہل عرب جب احرام باندھ لیتے اور کسی ضرورت سے ان کو گھر میں داخل ہونا پڑتا، یا جب وہ حج سے واپس آتے تو گھر کے دروازے سے داخل نہ ہوتے بلکہ اس کے پچھواڑے سے داخل ہوتے اور اپنی اس حرکت کو بڑی نیکی، تقویٰ اور دین داری خیال کرتے۔ جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اور مستدرک حاکم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کی روایات سے ظاہر ہے۔

﴿وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى ۚ وَ اْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا ۪ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝١٨٩﴾ (189)

قرآن نے ان کے اس غلط مذہبی رواج کی اصلاح فرمائی اور حکم دیا کہ احرام کی حالت ہو یا حج سے واپسی، دونوں صورتوں میں اپنے گھروں کے دروازوں ہی سے داخل ہوا کرو۔ اور یہ قرار دیا کہ اصل نیکی اور دین داری گھروں کے پچھواڑے پھلانگنا نہیں ہے بلکہ تقویٰ یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے احکام کی پیروی کرے اور اس کی نافرمانی سے بچے تاکہ اسے دنیا اور آخرت کی فلاح و کامیابی حاصل ہو سکے۔

﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ

لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿١٩٠﴾ (190)

اس سے پہلے چاند، قمری مہینوں اور حج کا ذکر ہوا۔ پھر درمیان میں حج کے حوالے سے عربوں کے ایک غلط مذہبی طریقے کی اصلاح کی گئی۔ اب مسلمانوں کو مشرکینِ قریش کے خلاف دفاعی جنگ لڑنے کی اجازت دی گئی، خواہ یہ مدافعتی جنگ حج یا عمرے کے موقع پر، یا حرمت والے مہینوں میں، یا پھر حرم کی حدود میں کیوں نہ لڑنی پڑے جہاں پر ابھی تک مشرکین کا قبضہ تھا اور وہ مسلمانوں کو حج اور عمرہ کرنے سے زبردستی روکتے تھے۔

اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ صلح حدیبیہ جو ذوالقعدہ 6 ہجری (مارچ 628ء) میں ہوئی تھی کے بعد والے سال میں نازل ہوئی، جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ عمرۃ القضا کی تیاری کر رہے تھے اور مشرکین قریش کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ کہیں ان سے جنگ نہ چھیڑ دیں۔ کیونکہ مسلمانوں کو حدودِ حرم میں اور حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنے سے تامل تھا خواہ وہ جنگ دفاعی ہی کیوں نہ ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔

ارشاد ہوا کہ مسلمانوں کو حج کے دوران میں بھی اپنے دفاع کے لیے دشمن کے خلاف لڑائی کی اجازت ہے۔ لیکن اس میں بھی وہ اپنی طرف سے پہل نہیں کر سکتے۔ وہ صرف اتنی ہی کارروائی کر سکتے ہیں جتنی دفاعی نقطہ نظر سے ضروری ہو اس میں بھی بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور معذوروں پر ہاتھ اٹھانا جائز نہیں۔ ان کی طرف سے کسی حال میں کوئی زیادتی نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اللہ سبحانہٗ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ دوسرے، جہاد کا مقصد قتل و غارت گری یا مفاد پرستی نہیں ہے بلکہ اس سے اللہ کے دین کا تحفظ اور اس کے کلمے کی سربلندی مقصود ہے۔

﴿وَ اقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ﴾ (191)

مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ دفاعی جنگ میں دشمن کے لوگ جہاں بھی مقابلے پر آئیں وہاں ان کو قتل کرو خواہ وہ حرم کی حدود میں پائے جائیں، یا کہیں اور جگہ پر ہوں، ان کو زندہ نہ چھوڑو، اس سلسلے میں اس کی کوئی پرواہ نہ کرو کہ تم احرام کی حالت میں ہو، یا کوئی حرمت والا مہینہ ہے، یا حرم کی سرزمین ہے۔

﴿وَ اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ حَيْثُ اَخْرَجُوْكُمْ﴾ (191)

اس مقام پر مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ وہ اُن مشرکین قریش کو مکے کی حدود سے نکال باہر کریں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو تکلیفیں پہنچائیں، اذیتیں دیں اور ان کو ان کے گھروں سے نکال کر مدینے ہجرت کر جانے پر مجبور کیا اور جو اب مسلمانوں کو حج و عمرہ سے روکتے اور معاہدے توڑتے ہیں۔

﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ﴾ (191)

فرمایا ان مشرکین سے حرم میں بھی دفاعی جنگ لڑنے کی اجازت اس لیے ہے کہ یہ لوگ فتنہ پرور ہیں۔ اور فتنہ (PERSECUTION) قتل سے بڑا جرم اور گناہ ہے۔ اس جگہ فتنہ سے مراد ظلم و ستم کی وہ حالت ہے جس میں

مشرکینِ قریش مسلمانوں کو حرم میں عبادت سے روکتے تھے۔ ان کو دین اسلام سے ہٹانے کے لیے ان پر تشدد (TORTURE) کرتے تھے۔ ان کو ان کے گھروں سے نکال کر ہجرت پر مجبور کرتے تھے۔ یہ کفر وشرک کے غلبے کی وہ صورتِ حال تھی جس میں اسلام لانے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا جاتا تھا۔ ایسی حالت کو قتل سے بڑھ کر گناہ اور جرم قرار دیا گیا۔

﴿وَلَا تُقٰتِلُوْهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰى يُقٰتِلُوْكُمْ فِيْهِ ۚ فَاِنْ قٰتَلُوْكُمْ فَاقْتُلُوْهُمْ ۗ كَذٰلِكَ جَزَآءُ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۹۱﴾﴾ (191)

پہلے فرمایا تھا کہ مسلمانوں کو مشرکین قریش سے دفاعی جنگ کی اجازت ہے۔ اب خاص مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ کی مسجد کے بارے میں فرمایا کہ وہاں کفار سے لڑنے میں پہل نہ کی جائے اگر وہ وہاں بھی جنگ چھیڑ دیں تو پھر تم بھی ان سے لڑو۔ ایسی صورت میں تم بے قصور ہو گے اور سارا گناہ کفار کے کھاتے میں جائے گا۔ کیونکہ ابتدا ان کی طرف سے ہوگی اور وہ کعبے کی حرمت کو پامال کریں گے جس کی سزا وہ دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں پائیں گے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کو عذاب دے گا۔

﴿فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۹۲﴾﴾ (192)

پھر ارشاد ہوا کہ اگر وہ باز آجائیں تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ وہ لڑنے سے باز آجائیں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ کفر وشرک سے باز آجائیں اور توبہ تائب ہو کر اسلام قبول کر لیں تو اللہ تعالیٰ ان کے تمام گناہ معاف کر دے گا۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا:

﴿قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ﴾ (الانفال 8 : 38)

''کافروں سے کہہ دیجئے اگر وہ کفر سے باز آجائیں تو جو کچھ ہو چکا، انہیں معاف کر دیا جائے گا۔''

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ۭ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۹۳﴾﴾ (193)

اب مزید وضاحت کر دی گئی کہ مشرکین قریش کے خلاف جہاد اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک حرم کی اس سرزمین سے کفر وشرک کا فتنہ ختم نہیں ہو جاتا اور اللہ تعالیٰ کا دین غالب نہیں آجاتا۔

آخر میں فرمایا کہ اگر مشرکینِ مکہ کفر وشرک اور ظلم وزیادتی سے باز آجاتے ہیں تو ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

اس جگہ ''عدوان'' کا لفظ ظلم وزیادتی کے معنوں میں نہیں آیا ہے بلکہ اس سے مراد جوابی کارروائی ہے جو کہ جائز ہے جیسا کہ ایک مقام پر فرمایا:

﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا﴾ (الشوریٰ 42 : 40)

تو اس میں دوسری سیئۃ سے مراد برائی نہیں بلکہ برائی کا بدلہ اور اس کا ازالہ ہے۔

﴿ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَ الْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ﴾ (194)

حرمت والے مہینے چار ہیں: رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔

اہل عرب ان مہینوں کا احترام کرتے اور ان میں لڑائی سے باز رہتے۔ اب مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ کسی حرمت والے مہینے کا احترام یہی ہے کہ اس میں کسی پر ظلم اور زیادتی نہ کی جائے۔ لیکن اس احترام کا یہ مطلب نہیں ہے کہ دشمن اس مہینے میں تم پر حملہ کر دے اور تمہیں قتل کرنے لگے تو تم اپنا دفاع نہیں کر سکتے۔

بلکہ تمہیں اپنے دفاع کا پورا حق حاصل ہے۔ اگر مشرکین مکہ کسی محترم مہینے کی حرمت پامال کرتے ہوئے تم پر حملہ آور ہو جاتے ہیں تو تم اپنے تحفظ کی خاطر ان سے جنگ کر سکتے ہو۔ یہ تو ادلے کا بدلہ ہے۔ اگر کفار محترم مہینوں میں یا حرم کی حدود میں تم سے جنگ چھیڑ دیتے ہیں تو تمہیں اپنے دفاع میں ان سے لڑنے کی اجازت ہے۔ اس طرح بدلے اور قصاص کا یہ اصول ہر قسم کی حرمتوں کے بارے میں ہے۔ اگر دشمن ان کا احترام کرے تو تم بھی کرو۔ اگر وہ بے حرمتی کریں اور جنگ کریں تو ان کے خلاف کارروائی کرنے کا تمہیں پورا حق ہے۔

﴿ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ﴾ (194)

کیونکہ جو لوگ کسی محترم چیز کی حرمت کا خیال نہیں رکھتے بلکہ اسے پامال کرتے ہیں تو دراصل وہ اپنے لیے بھی حرمت کا حق کھو دیتے ہیں۔ اس لیے ان کے خلاف اقدام بجا ہے۔ جیسے کسی کو ناحق قتل کر کے اس کی جان لینے والا بھی اپنی جان کے احترام کا حق کھو دیتا ہے اور واجب القتل ہو جاتا ہے۔ اس لیے جو گروہ جس قدر زیادتی کرے وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کے ساتھ بھی اتنی زیادتی کی جائے تاکہ حساب برابر ہو اور آئندہ کسی کو زیادتی کرنے کی جرأت نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کا یہی طریقہ ہے کہ وہ اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کا پورا بدلہ لیتے ہیں۔ لیکن بدلہ لینے میں حد سے نہیں بڑھتے جیسا کہ فرمایا:

﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَاۤ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴾ (الشوریٰ 42: 39)

''اور جب ان پر کوئی زیادتی ہوتی ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔''

﴿ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝۱۹۴ ﴾ (194)

آخر میں مسلمانوں سے فرمایا کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اس کی نافرمانی سے بچو۔ ہمیشہ یاد رکھو کہ اللہ سبحانہٗ تقوے والوں کے ساتھ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان کا مددگار اور حامی و ناصر ہے۔ اس لیے ان کو کفار کی کثرت و طاقت سے ہرگز مرعوب نہیں ہونا چاہیے بلکہ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی مدد پر بھروسا کریں گے تو فتح و کامرانی ان کے قدم چومے گی۔ تاریخ اس بات کی صداقت پر ہمیشہ گواہ رہی ہے۔

﴿ وَ اَنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ لَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ﴾ (195)

جہاد کے بعد اب انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا۔

اللہ کی راہ میں جان و مال سے جہاد نہ کرنے اور اس سے جی چرانے اور بخل کرنے کو ہلاکت قرار دیا گیا۔ یہی مضمون سورۃ التوبہ میں منافقوں کے حوالے سے آیا ہے:

﴿لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّ سَفَرًا قَاصِدًا لَّاتَّبَعُوْكَ وَ لٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ؕ وَسَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝﴾ (التوبہ 9: 42)

"(اے نبی ﷺ) اگر ان منافقوں کو کوئی فوری فائدہ نظر آتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ بھی جہاد کے لیے آپ ﷺ کے ساتھ چلتے۔ لیکن انھیں یہ منزل مشکل اور کٹھن نظر آئی۔ اب وہ اللہ کی قسمیں کھا کر کہیں گے۔ اگر ہم سے ہو سکتا ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔ دراصل وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اللہ جانتا ہے وہ بالکل جھوٹے ہیں۔"

مطلب یہ ہے کہ جہاد کی تیاری کے لیے جان کے ساتھ مال بھی خرچ کرو۔ دشمن سے مقابلے کے لیے ہر قسم کا جدید اسلحہ اور سامانِ جنگ بھی فراہم کرو۔ اگر اس بارے میں بخل اور بزدلی سے کام لو گے تو اپنے آپ کو ہلاکت و بربادی میں ڈالو گے اور خود اپنے ہاتھوں سے مارے جاؤ گے۔ کیونکہ کفار کے پاس زیادہ جنگی وسائل ہیں۔ تمہیں ان سے مقابلے کے لیے مال خرچ کر کے سامانِ جنگ فراہم کرنا ہوگا۔ ورنہ تم ہلاک و برباد ہو جاؤ گے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ یہ آیت انصار کے کچھ لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی جس میں انھوں نے اسلام کا غلبہ ہو جانے کے بعد جہاد میں مال خرچ کرنے سے ہاتھ روک لینے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کو بتا دیا گیا کہ کسی مرحلے پر بھی جہاد چھوڑنے کا انجام ہلاکت کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے ہر حال میں جنگی تیاریاں جاری رہنی چاہئیں۔ (ترمذی، رقم: 2972)

جہاد کی تیاری کے لیے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا کہ:

﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّ مِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَ اٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ﴾ (الانفال 8: 60)

"(مسلمانو!) جس قدر تم سے ہو سکے فوجی قوت اور گھوڑے تیار رکھو جس سے اللہ کے دشمنوں پر، تمہارے دشمنوں پر اور ان لوگوں پر تمہارا رعب رہے جنھیں تم نہیں جانتے لیکن اللہ جانتا ہے۔"

بعض لوگ اس آیت کے الفاظ ﴿وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ﴾ سے فدائی حملے کے ناجائز ہونے پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر ایسا کرنا قرآن کے سیاقِ کلام اور صحیح حدیث دونوں کے خلاف ہے۔ البتہ قرآن و حدیث کے دوسرے دلائل سے خودکشی کا حرام ہونا ثابت ہے اور مخصوص حالات میں شہادتی حملہ یعنی خودکش فدائی حملہ نہ صرف جائز

ہے بلکہ ایسا اقدام کرنے والا شہید ہے۔

﴿وَ اَحْسِنُوْا ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (195)

فرمایا: بھلائی کرو اور احسان کے درجے کی بھلائی اور نیکی کرو۔ اچھے طریقے سے نیکی اور بھلائی کرنے والوں کو اللہ سبحانہ، پسند کرتا ہے۔

سیاق کلام (CONTEXT) سے ظاہر ہے کہ اس مقام پر احسان اور بھلائی سے مراد جہاد میں مال خرچ کرنا ہے۔ مسلمانوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ بخل سے کام نہ لیں اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں دل کھول کر مال خرچ کیا کریں۔ یہ چیز اللہ سبحانہٗ کو بہت پسند ہے اور وہ اس پر بڑا اجر وثواب عطا فرمائے گا۔

﴿وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ؕ﴾ (196)

اس سے بعض اہل علم نے عمرہ کے فرض یا واجب ہونے پر استدلال کیا ہے جو کہ صحیح نہیں ہے کیونکہ یہ بات صحیح احادیث کے خلاف ہے۔

فرمایا حج یا عمرہ کی نیت کر لینے، احرام باندھ لینے اور تلبیہ کہنے کے بعد ان کو پورا اور مکمل کیا جائے۔ ان کے تمام مناسک صحیح طریقے سے ادا کیے جائیں۔ اخلاص کے ساتھ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے حج یا عمرے کی عبادت کی جائے۔ یہ عبادت کا کام محض کاروبار، یا سیر سپاٹے، ریا کاری، دکھاوے یا 'الحاج' کہلانے کی نیت سے نہ کیا جائے۔ ورنہ حج کا ثواب ضائع ہو جائے گا۔ اسی طرح حرام مال سے کیے ہوئے حج پر بھی کوئی اجر نہیں ملے گا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی شخص حج کے مناسک سے بے خبر ہے اور صرف مدینے میں روضۂ رسول ﷺ کی زیارت ہی کو حج سمجھتا ہے تو اس کا حج بھی معتبر اور مقبول نہیں ہے۔

البتہ حج کے دوران میں اگر ضمنی طور پر کوئی شخص تجارت یا خرید وفروخت کر لے تو اس کی اجازت ہے جیسا کہ فرمایا:

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ﴾ (البقرہ 2: 198)

''اور اگر تم (حج کے دوران میں) اپنے رب کا فضل تلاش کرتے ہوئے کوئی کاروبار کر لو، تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔''

حج اسلام کا بنیادی رکن اور فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَ لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا﴾ (آل عمران 3: 97)

''اور اللہ کی طرف سے لوگوں پر فرض ہے کہ جو اس گھر (خانہ کعبہ) تک پہنچنے کی طاقت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے۔''

حج کے بارے میں مزید تفصیل انشاء اللہ آلِ عمران کی اسی آیت کی تفسیر میں آئے گی۔

﴿فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ﴾ (196)

مطلب یہ ہے کہ جب تم احرام کی حالت میں حج یا عمرے کے سفر پر ہو اور کسی مجبوری یا بیماری کی وجہ سے تمہیں رُکنا پڑے اور آگے نہ جا سکو تو جہاں رکے ہو، وہیں ایک جانور کی قربانی کرو اور احرام کھول دو۔ اس صورت میں حرم میں جا کر قربانی کرنا لازم نہیں ہے۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر حرام مکہ سے باہر حِلّ میں قربانی کر کے احرام کھول دیا تھا۔

﴿وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ﴾ (196)

فرمایا، عام حالات میں مکہ مکرمہ پہنچنے کے بعد جب تک قربانی اپنے صحیح ٹھکانے پر نہ پہنچ جائے اس وقت تک حلق یا قصر کرانا یعنی سر منڈانا یا سر کے بال کٹوانا اور احرام کھولنا منع ہے۔ دوسرے مقام پر قربانی کے اصل ٹھکانے کے بارے میں فرمایا گیا:

﴿هَدْيًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ﴾ (المائدہ 5: 95)

''(کفارے کا) جانور حرم کعبہ تک پہنچایا جائے۔''

﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ﴾ (196)

پھر جو شخص کسی بیماری یا سر میں تکلیف کے سبب سے قربانی سے پہلے حلق یا قصر کرا بیٹھے اور احرام کھول دے تو اسے چاہیے کہ فدیے کے طور پر تین دن کے روزے رکھے۔ یا چھ (6) مسکینوں کو کھانا کھلائے، یا ایک بکرے کی قربانی کرے (دَم دے) جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت کعب بن عجرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے ثابت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

((صُمْ ثَلَاثَةَ اَيَّامٍ، اَوْ تَصَدَّقْ بِفَرَقٍ بَيْنَ سِتَّةٍ، اَوْ نُسُكٍ مِمَّا تَيَسَّرَ))

(صحیح بخاری، رقم: 1816، 1817)

﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ﴾ (196)

پھر جب دشمن کا خطرہ نہ رہے اور امن نصیب ہو جائے، یا بیماری کے بعد شفا مل جائے تو حج یا عمرہ پورا کرنا چاہیے۔ پھر جو حج تمتع، یا حج قِران میں حج کے ساتھ پہلے عمرے کی سعادت حاصل کرنا چاہے تو اس پر واجب ہے کہ وہ ایک جانور کی قربانی کرے، جو اصل میں اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا شکر ادا کرنا ہے کہ اس نے حج کے علاوہ عمرے کی سعادت بھی بخشی۔

﴿فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ﴾ (196)

ارشاد ہوا جو شخص حجِ تمتع (یا حجِ قِران) کر رہا ہو اور قربانی نہ کر سکتا ہو تو وہ احرام کی حالت میں یومِ نحر (دس ذی الحجہ) تک تین دنوں کے روزے رکھ لے اور سات روزے حج سے واپسی پر گھر پہنچ کر رکھے۔ اس طرح اس کے یہ

پورے دس (10) دنوں کے روزے ہو جائیں گے جو کہ قربانی نہ کر سکنے کا کفارہ ہے۔

اس میں تین کے بعد سات کو جمع کر کے پورے دس دنوں کا ذکر اہل عرب جیسی ان پڑھ قوم کے حسب حال اور رواج کے مطابق ہوا ہے، جو الگ الگ عدد کو بیان کرنے کے بعد ان کو جمع کر کے بتاتے تھے تاکہ صحیح تعداد کے بارے میں کسی طرح کا شک وشبہ باقی نہ رہے۔ خود ہمارے ہاں بھی لین دین کی بعض دستاویزات (Documents) میں اصل رقم لکھ کر اس کا نصف لکھنے کا رواج اسی مقصد کے لیے ہوتا ہے۔

﴿ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ (196)

ارشاد ہوا کہ حج کے ساتھ عمرہ کرنے کی رخصت اور سہولت صرف باہر سے آنے والے آفاقی حاجیوں کے لیے ہے کہ ان کو حج اور عمرے کے لیے الگ الگ سفر کرنے کی زحمت اور مشقت سے بچایا جائے اور وہ سفر حج کے ساتھ ہی عمرہ کرنے کی سعادت بھی حاصل کر لیں۔ اس لیے ان کو حجِ قِران اور حجِ تمتع دونوں میں حج کے ساتھ عمرہ کرنے کی بھی اجازت دی گئی، جب کہ اہل حرم یعنی اہل مکہ کو اس رخصت اور سہولت کی ضرورت نہ تھی وہ آسانی کے ساتھ حج کے موقع کے بغیر بھی جب چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں۔ اس لیے ان کو صرف حج افراد (یا مفرد) کرنے کا حکم ہے جس کے ساتھ عمرہ شامل نہیں ہوتا۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝١٩٦﴾ (196)

آخر میں فرمایا کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اس کے دیے ہوئے احکام کی نافرمانی سے بچو اور یاد رکھو، جو کوئی اس کے احکامات کی خلاف ورزی کرے گا تو اللہ تعالیٰ اسے سخت سزا دے گا۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ ۙ
وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ
خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝١٩٧ لَيْسَ عَلَيْكُمْ
جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ
فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠ وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ وَاِنْ
كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝١٩٨ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ

النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿١٩٩﴾ فَاِذَا قَضَيْتُمْ
مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ۭ فَمِنَ
النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ
مِنْ خَلَاقٍ ﴿٢٠٠﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً
وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿٢٠١﴾ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ النصف
مِّمَّا كَسَبُوْا ۭ وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿٢٠٢﴾ وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ
مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ
تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ
اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ﴿٢٠٣﴾

’’حج کے مہینے مقرر ہیں۔ جو کوئی ان میں حج کی نیت سے احرام باندھ لے پھر اسے حج کے دوران میں نہ فحش بات کرنی ہے، نہ گناہ کی اور نہ لڑائی جھگڑے کی، اور جو نیک کام تم کرتے ہو، اللہ اسے جانتا ہے۔ اور (حج پر روانہ ہونے سے پہلے) زادِ راہ لے لیا کرو۔ اگرچہ اصل زادِ راہ تقویٰ ہے۔ اور اے عقل والو! صرف مجھ سے ڈرو۔ اور اگر تم حج کے دوران میں اپنے رب کا فضل تلاش (کرتے ہوئے کوئی کاروبار) کر لو تو اس میں کوئی گناہ نہیں پھر جب تم لوگ عرفات سے واپس آ کر مشعرِ حرام یعنی مُزدلفہ میں قیام کرو تو یہ وقت اللہ کی یاد میں گزارو۔ اور اللہ کو ایسے یاد کرو جیسے اس نے تمہیں بتایا ورنہ اس سے پہلے تم راہ بھٹکے ہوئے تھے۔ پھر جہاں سے اور لوگ واپس ہوں تم بھی وہاں سے واپس ہو اور اللہ سے بخشش مانگو۔ بے شک اللہ معاف کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اور جب حج کے اعمال پورے کر لو تو اللہ کو یاد کرو جس طرح پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے، بلکہ اس سے بھی زیادہ اللہ کو یاد کرو۔ پھر بعض لوگ یہ دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں سب کچھ دیدے۔ ایسے لوگوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور بعض یہ دعا کرتے ہیں۔ اے ہمارے رب! ہمیں دنیا میں بھی بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور دوزخ کی آگ سے بچانا۔ ایسے لوگوں کو ان کی نیکیوں کا صلہ ملے گا اور اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

حج کے چند دنوں میں اللہ کو خوب یاد کرو۔ پھر جو شخص جلدی کر کے دو دنوں میں (مکہ واپس) آجائے اس پر کوئی گناہ نہیں، اور جو ٹھہر جائے اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔ (دونوں طرح کی) یہ اجازت ایسے شخص کے لیے ہے جو اللہ سے ڈرے۔ ویسے تم سب اللہ سے ڈرو، اور یاد رکھو تمہیں ایک دن اس کے سامنے پیش ہونا ہے۔" (197-203)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اَلْحَجُّ :......اس سے صرف حج مراد ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے عمرہ مراد لیا ہے مگر وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ عمرے کے لیے مخصوص مہینے نہیں ہیں بلکہ وہ کسی وقت بھی ہوسکتا ہے۔

اَشْهُرٌ :...... یہ جمع ہے شَهْرٌ کی جس کے معنی ہیں مہینہ۔ اس کی ایک اور جمع شُهُوْرٌ بھی قرآن مجید میں آئی ہے۔

﴿اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُوْرِ عِنْدَ اللّٰهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ﴾ (التوبہ 9:36)

"بے شک اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ مہینے ہے۔"

مَعْلُوْمٰتٌ :......اس کے معنی ہیں معروفات یعنی جانے پہچانے۔ یہ مَعْلُوْمَةٌ کی جمع ہے اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ کا مطلب یہ ہے کہ لوگ ان کو اچھی طرح جانتے پہچانتے ہیں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور جمہور علما کے نزدیک اس سے شوال، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ کے پہلے دس دن مراد ہیں۔

فَرَضَ :......اس کے معنی ہیں: اپنے اوپر لازم کر لیا۔

رَفَثَ :......اس کے اصل معنی فحش بات کے ہیں مگر اس جگہ اس سے مراد جماع ہے۔

فُسُوْقَ :......اس سے ہر قسم کا گناہ اور غیر شرعی کام مراد ہے۔

جِدَالَ :...... یہ جدل سے ہے اور اس کا مطلب ہے لڑائی جھگڑا کرنا۔

تَزَوَّدُوْا :...... یہ زود سے ہے۔ اس کے معنی ہیں زادِ راہ لینا۔ سفر خرچ لینا۔

فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ :......اس جگہ اس سے مراد تجارتی اور معاشی فائدہ ہے۔ قرآن میں کئی مقامات پر یہی معنی مراد ہیں جیسے سورہ بنی اسرائیل 12:17، المزمل 20:73، فاطر 12:35، الجمعہ 10:62۔

اَفَضْتُمْ :...... یہ افاضہ سے ہے جس کے معنی ہیں زیادہ تعداد میں نکل کر روانہ ہونا۔

عَرَفٰتٍ :......اس سے عرفات کا میدان مراد ہے جہاں ۹ ذوالحجہ کو حاجی لوگ وقوف کرتے (ٹھہرتے) ہیں۔ یہ عرفہ کا دن کہلاتا ہے۔ عرفات کو عرفات اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں لوگوں کو ایک دوسرے سے تعارف حاصل ہوتا ہے۔

اَلْمَشْعَرِ الْحَرَامِ :......اس سے مزدلفہ کا مقام مراد ہے۔ یہ بھی حج کا مشعر یعنی عبادت کی جگہ ہے اور الحرام کے معنی محترم کے ہیں۔ یاد رہے کہ مشاعر اور شعائر ایک دوسرے کے ہم معنی اور مترادف (SYNONYMOUS) الفاظ ہیں۔ گویا حج کے مشاعر اور حج کے شعائر ایک ہی چیز ہے۔

اِنْ كُنْتُمْ :......اِنْ کا حرف اِنَّ (بے شک) کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ جو دراصل اِنَّ ہی کا مخفف ہوتا ہے۔ اس جگہ اس سے یہی معنی مراد ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں قرآن میں موجود ہیں جیسے۔ سورۃ الانعام میں ہے:

﴿وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ لَغٰفِلِيْنَ ۝﴾ (الانعام 6 :156)

''اور بے شک ہم اس کے پڑھنے پڑھانے سے غافل تھے۔''

بلکہ اس جگہ اِنْ کا حرف اِنَّ بلکہ اِنَّمَا کے معنوں میں ہے۔

﴿اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ ۚ﴾ (197)

مطلب یہ ہے کہ حج کا فریضہ ادا کرنے کے لیے جو مہینے مقرر ہیں، وہ شروع سے معلوم و معروف چلے آرہے ہیں اور وہ یہ ہیں: شوال، ذوالقعدہ، اور ذوالحجہ (کے ابتدائی دس دن)

یہی تفسیر عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے کی ہے اور اسی کو امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ نے اختیار کیا ہے۔ ان مہینوں کے سوا دوسرے مہینوں میں احرام تو باندھا جاسکتا ہے مگر حج کے مناسک صرف انہی تین مہینوں میں ادا کیے جاسکتے ہیں۔

﴿فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَ لَا فُسُوْقَ ۙ وَ لَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ؕ﴾ (197)

فرمایا جو شخص ان مہینوں میں حج کا ارادہ کر لے اور احرام باندھ لے تو اس حالت میں اس کے لیے تین چیزیں بالکل منع ہیں:

1۔ **رفث** : اس سے مراد شہوانی باتیں اور جماع ہے۔

2۔ **فسوق** : اس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور ہر قسم کا غیر شرعی کام۔

3۔ **جدال** : اس سے مراد آپس میں لڑائی جھگڑا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ حج کے حوالے سے یہ ایک جامع نصیحت اور حکم ہے جس سے اس اجتماعی عبادت کے لیے پاکیزگی، پاک دامنی اور امن و امان کا وہ بے مثال ماحول فراہم ہو جاتا ہے جس کی کوئی مثال دنیا کی دوسری قوموں کے مذہبی اجتماعات میں نہیں پائی جاتی۔

﴿وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ؕ﴾ (197)

ارشاد ہوا تم جو نیک کام بھی حج کے دوران میں کرو گے جیسے صدقہ کرنا، کسی کو کھانا کھلا دینا، یا دوسرے حاجیوں کی خدمت وغیرہ، تو اللہ سبحانہٗ تمہارے اس طرح کے ہر نیک کام کو جانتا ہے اور تمہیں اس کا اجر دے گا۔

﴿وَ تَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۫﴾ (197)

پھر فرمایا کہ سفرِ حج کے لیے زادِ راہ لے کر نکلو اور بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔

اس حکم کا پس منظر (BACK GROUND) یہ ہے کہ دورِ جاہلیت میں عرب کے بعض قبیلے سفرِ حج کے لیے

زادِراہ لے کر نہیں جاتے تھے۔وہ اس چیز کو تقوے اور توکل کا نام دیتے تھے۔پھر زادِراہ نہ ہونے کی وجہ سے خود بھی پریشان ہوتے تھے اور دوسروں کے لیے بھی بوجھ اور پریشانی کا باعث بنتے تھے۔اس پر اللہ سبحانہٗ نے حکم دیا کہ جب حج کے سفر پر نکلو تو اپنے ساتھ زادِراہ ضرور لے کر نکلا کرو۔یہ ایک تمہاری مادی اور جسمانی ضرورت ہے مگر یاد رکھو حج کا سفر سیر سپاٹے، پکنک یا میلے کا نام نہیں ہے۔اس کے لیے بہترین زادِراہ تقویٰ ہے، وہ ضرور ساتھ لے چلو تاکہ تمہیں حج کے روحانی فائدے اور اس کی برکتیں نصیب ہو سکیں۔

گویا ظاہری زادِراہ سے بڑھ کر باطنی زادِراہ تقویٰ ضروری ہے اور ایک دن جب تم آخرت کے سفر پر روانہ ہو گے تو اس کے لیے تقوے کے سوا کوئی زادِراہ نہ ہوگا۔

یہ قرآن مجید کا وہی اسلوب ہے جو اس نے مثال کے طور پر لباس کے بارے میں اختیار فرمایا ہے۔

﴿یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ قَدۡ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکُمۡ لِبَاسًا یُّوَارِیۡ سَوۡاٰتِکُمۡ وَ رِیۡشًا ؕ وَ لِبَاسُ التَّقۡوٰی ۙ ذٰلِکَ خَیۡرٌ ؕ ذٰلِکَ مِنۡ اٰیٰتِ اللّٰہِ لَعَلَّہُمۡ یَذَّکَّرُوۡنَ ﴿﴾ (الاعراف 7: 26)

''اے بنی آدم! ہم نے ایسا لباس پیدا کیا جو تمہارے جسم کی ستر پوشی کرتا ہے اور زینت بھی ہے۔لیکن پرہیز گاری کا لباس سب سے بہتر ہے اور یہ لباس کا ہونا اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہے تاکہ لوگ غور کریں۔''

مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے اللہ تعالیٰ نے کپڑوں کا مادی لباس پیدا فرمایا ہے جو پردہ پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے۔لیکن تقوے کا روحانی لباس اس سے بھی بہتر ہے جو ایمان، شرم وحیا اور نیک عملی سے عبارت ہے۔جس کے ذریعے انسان کو قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے اور دنیا و آخرت کی فلاح نصیب ہوتی ہے۔اگر کوئی شخص اس روحانی لباس سے محروم ہے تو اس کے لیے مادی لباس بھی بے کار ہے اور اللہ سبحانہٗ کے ہاں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔

بعض لوگ جو تفسیر میں حدیث وسنت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے اور اپنا یہ اصول بتاتے ہیں کہ قرآنی الفاظ کے صرف معروف معنی ہی لیے جا سکتے ہیں، انھوں نے اس مقام پر لفظ تَزَوَّدُوْا (زادِراہ لے لیا کرو) کے معروف معنی اختیار نہ کر کے خود اپنے اصول کا خون کیا ہے۔

﴿وَ اتَّقُوۡنِ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ ﴿۱۹۷﴾﴾ (197)

آخر میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر عقل مندوں کو خطاب کر کے تقوے کی تاکید فرمائی، حالانکہ تقوے کی ضرورت سب کو ہے۔یہ بھی قرآن حکیم کا ایک خاص اسلوب ہے جس میں وہ بالخصوص اہل عقل و دانش کو مخاطب کر کے اپنی دعوت اور احکام دیتا ہے۔

اس اسلوب کی چند مثالیں یہ ہیں:

(1)۔ ﴿وَ لَکُمۡ فِی الۡقِصَاصِ حَیٰوۃٌ یّٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ﴾ (البقرہ 2: 179)

"اور اے عقل والو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے تا کہ تم اس حکم کی خلاف ورزی سے بچو۔"

(2)۔ ﴿قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَ الطَّيِّبُ وَ لَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾ (المائدہ 5: 100)

"آپ ﷺ کہہ دیں کہ ناپاک اور پاک برابر نہیں ہو سکتے، اگرچہ ناپاک کی کثرت تمہیں اچھی لگے۔ اس لیے اے عقل والو! اللہ سے ڈرو تا کہ تم فلاح پاؤ۔"

(3)۔ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ﴾ (الطلاق 65: 10)

"پس اے عقل والو! تم اللہ سے ڈرو۔"

(4)۔ ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ﴾ (الحشر 59: 2)

"پس اے آنکھوں والو! تم عبرت حاصل کرو۔"

(5)۔ ﴿اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى﴾ (طٰہٰ 20: 128)

"بے شک اس میں عقل مندوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔"

اس اسلوب سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہوتا ہے کہ عقل و دانش کا تقاضا یہی ہے کہ قرآن حکیم کی ہر بات کو سمجھ کر مانا جائے اور اس کے مطابق عمل کیا جائے اور ہر دانش مند کا یہی طرز عمل ہونا چاہیے ورنہ وہ دانش مند کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ﴾ (198)

"فرمایا، حج کے دنوں میں تمہیں تجارت کرنے اور روزی کمانے کی بھی اجازت ہے۔ کیونکہ یہ چیز تمہارے رب کا فضل ہے اور رب کا فضل تلاش کرنے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ تاہم اصل ارادہ اور مقصد حج کی عبادت ہی ہونی چاہیے۔ وہاں زیادہ وقت مناسکِ حج کی ادائیگی میں صرف کرنا چاہیے اور دنیا کے کاموں سے فارغ ہو کر پوری یکسوئی سے ذکر و عبادت میں مشغول رہنا چاہیے۔"

قرآن مجید نے کئی مقامات پر تجارت اور رزق کے حصول کو اللہ کا فضل قرار دیا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (الجمعہ 62: 10)

"پھر جب نماز پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل تلاش کرو۔"

﴿فَاِذَآ اَفَضْتُمْ مِّنْ عَرَفٰتٍ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ عِنْدَ الْمَشْعَرِ الْحَرَامِ ۠﴾ (198)

ارشاد ہوا پھر جب عرفات سے واپس مزدلفہ پہنچو تو وہاں بھی رات کے اوقات میں اللہ تعالیٰ کو خوب یاد کرو۔ دعا، تلبیہ اور ذکر و تسبیح میں مشغول رہو۔ کیونکہ ابھی تم احرام کی حالت میں ہو اور حج کے مناسک ابھی ختم نہیں ہوئے۔ کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ وقوفِ عرفات یعنی عرفات میں حاضری کے بعد حج مکمل ہو گیا ہے۔

یاد رہے کہ حاجی کے لیے مزدلفہ میں رات گزارنا واجب ہے۔

﴿وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ۚ﴾ (198)

فرمایا، اللہ سبحانہٗ کو اس طریقے سے یاد کرو جو طریقہ اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ جس میں عاجزی، گریہ زاری اور ثواب حاصل کرنے کی نیت ہو۔ دعا صرف اللہ سبحانہٗ ہی سے مانگی جائے۔ چونکہ مشرکین عرب تلبیہ کے الفاظ میں شرک کرتے تھے۔ اس لیے ان کو ایسے تلبیہ سے روکا گیا۔ اس کے علاوہ وہ بتوں کے وسیلے سے بھی دعائیں مانگتے تھے لہٰذا ان کو ایسی دعاؤں سے بھی روکا گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا ذکر کرنے کا صرف وہی طریقہ صحیح ہے جو قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور جس کی شریعت نے اجازت دی ہے۔ رہے وہ اذکار و وظائف جو لوگوں نے شریعت کے خلاف بنا رکھے ہیں تو وہ سب ناجائز ہیں۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ ۝﴾ (198)

مطلب یہ ہے کہ قرآن کے نزول اور رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پہلے دورِ جاہلیت میں تم لوگ گمراہ تھے، عقائد واعمال مشرکانہ تھے، اب اللہ تعالیٰ نے تمہیں ذکرِ الٰہی کا صحیح طریقہ اور ہدایت کا راستہ بتا دیا ہے۔ تمہارے مشرکانہ عقائد واعمال کی اصلاح کردی ہے۔ یہی مضمون سورہ آل عمران (3) آیت 164 میں اور سورۃ الجمعہ (62) آیت 2 میں بھی موجود ہے۔

﴿ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ﴾ (199)

دورِ جاہلیت میں قریش نے اپنے لیے ایک خاص امتیاز اور تفاخر پیدا کر لیا تھا کہ وہ حج میں مزدلفہ جا کر ٹھہر جاتے اور عرفات تک نہیں جاتے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ وہ اہل حرم ہیں اور ان کے لیے اس موقع پر حرم کی حدود سے باہر نکلنا ان کی شان کے خلاف ہے جیسا کہ ایک متفق علیہ حدیث میں ہے۔

(صحیح بخاری، رقم: 4520، صحیح مسلم، رقم: 2955)

قرآن نے اُن کے اِس جھوٹے امتیاز اور وی آئی پی کلچر کا خاتمہ کرتے ہوئے حکم دیا کہ حج میں قریش سمیت سب حاجی لوگ پہلے عرفات جا کر وقوف کریں اور واپسی پر مزدلفہ رات گزاریں۔ اسلام رنگ ونسل اور زبان وقومیت وغیرہ جھوٹے امتیازات کا قائل نہیں ہے۔ اس کے نزدیک تقوے کے سوا کوئی اور امتیاز نہیں۔

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ (الحجرات 49 : 13)

''بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔''

﴿وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾ (199)

پھر فرمایا، ان تمام بدعات اور مشرکانہ اعمال سے توبہ استغفار کرو جو دورِ جاہلیت میں تم نے حج کے کاموں میں شامل کر رکھے تھے اور اب حج کے تمام مناسک شریعت کے احکام کے مطابق ادا کیا کرو۔ پھر جب تم سچے دل کے ساتھ اپنے

گناہوں سے توبہ کرو گے تو اللہ سبحانہ تمہارے سارے گناہ معاف کردے گا۔ کیونکہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

﴿فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾ (200)

مطلب یہ ہے کہ حج کے مناسک سے فارغ ہونے کے بعد اللہ سبحانہ کو اس طرح یاد کرو جیسے تم اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرو۔

دورِ جاہلیت میں لوگ حج سے فراغت کے بعد منیٰ میں محفلیں جماتے اور بعض دوسرے مقامات پر میلے لگاتے تھے ۔پھر ان میں اپنے باپ دادا اور اپنے قبیلوں کے کارناموں پر بڑے جوش وخروش کے ساتھ فخر کا اظہار کرتے تھے۔

قرآن نے ان کی اس جاہلانہ سماجی برائی کی اصلاح فرمائی۔ ان کو اس برے رسم ورواج سے روکا اور حکم دیا کہ جتنے جوش اور جذبے کے ساتھ اپنے بڑوں پر فخر کرتے ہو اس سے بڑھ کر اللہ سبحانہ کا ذکر کیا کرو۔

﴿فَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝﴾ (200)

دنیا پرست لوگ سمجھتے ہیں چونکہ حج کے موقع پر ان کی دعائیں زیادہ قبول ہوتی ہیں اس لیے وہاں بھی وہ صرف ایسی دعائیں مانگتے ہیں جن سے ان کو دنیا کی مرادیں حاصل ہوں۔ بعض تو حج کا سفر کرتے ہی اس لیے ہیں کہ اس طرح ان کی کوئی دنیوی مراد پوری ہو جائے گی۔ وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دنیا کی عارضی زندگی سے زیادہ آخرت کی دائمی زندگی کی فکر کرنی چاہیے۔ مگر ایسے لوگوں کا حال قرآن نے اس طرح بتایا ہے کہ:

﴿بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ۝﴾ (الاعلیٰ 87: 16، 17)

”مگر تم لوگ دنیا کی زندگی کو ترجیح دیتے ہو، حالانکہ آخرت اس سے بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔“

فرمایا ایسے خواہش پرستوں کو دنیا کی کوئی سہولت تو مل سکتی ہے مگر آخرت میں جنت کی نعمتوں میں ان کے لیے کوئی حصہ نہیں۔

﴿وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝﴾ (201)

لیکن حج میں ایسے سچے ایمان والے بھی ہوتے ہیں جو اپنی دعاؤں میں اللہ رب العالمین سے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی اور نعمتیں مانگتے ہیں۔ وہ اپنی دنیا کی زندگی کے لیے حلال روزی، امن وعافیت اور بیوی بچوں کے لیے خیر وبرکت کی دعائیں کرتے ہیں اور آخرت کی زندگی کے لیے اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور جنت حاصل ہونے کی دعا کرتے ہیں۔ دوزخ کی آگ سے پناہ مانگتے ہیں۔ یہی لوگ اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں۔

﴿اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا﴾ (202)

مطلب یہ ہے کہ یہ دوسرا گروہ جو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی چاہتا ہے، وہ ضرور اپنے اچھے اعمال کی کمائی کا حصہ پائے گا۔ ان لوگوں کے اعمال قبول ہوں گے۔ ان کی نیکیوں پر ان کو بڑا اجر وثواب ملے گا۔

﴿وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۝۲۰۲﴾ (202)

پھر اہل ایمان کی تسلی اور اطمینان کے لیے ارشاد ہوا کہ اللہ جلد حساب لینے والا ہے۔

اس کے دو معنی ہیں اور دونوں ہی درست ہیں۔ ایک یہ کہ قیامت کے حساب کتاب میں زیادہ دیر نہیں ہے۔ ادھر انسان کی زندگی کا چراغ بجھا اور ادھر قیامت کی صبح طلوع ہوگئی۔ اس کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو انسانوں کے اعمال کا حساب لینے میں ذرا دیر نہیں لگے گی۔ وہ بہت کم وقت میں اپنے سب بندوں کے اعمال کا حساب لے لے گا۔

﴿وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ ۭ﴾ (203)

حج کے چند دنوں میں اللہ تعالیٰ کو خوب یاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ ان چند دنوں سے مراد ''ایامِ منیٰ'' یا ''ایامِ تشریق'' ہیں جو حاجی لوگ منیٰ میں گزارتے ہیں اور وہ ہیں 11، 12، 13 ذوالحجہ۔ ان دنوں میں ہر نماز کے بعد تکبیریں کہنے کا حکم ہے لیکن غیر حاجیوں کے لیے ان تکبیراتِ تشریق کا حکم ۹ ذولحجہ کی نمازِ فجر سے لے کر 13 ذوالحجہ کی نمازِ عصر تک ہے۔ ان تکبیروں کے الفاظ یہ ہیں:۔

اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ كَبِيْرًا .

اور ان کے یہ الفاظ بھی ثابت ہیں:

اَللّٰهُ اَكْبَرُ اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاللّٰهُ اَكْبَرُ ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ .

﴿فَمَنْ تَعَجَّلَ فِيْ يَوْمَيْنِ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَاَخَّرَ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ ۙ لِمَنِ اتَّقٰى ۭ﴾ (203)

فرمایا، جن حاجی لوگوں کو کوئی جلدی ہو، ان کو کوئی گناہ نہیں ہوگا اگر وہ ایامِ تشریق کے پہلے دو دن گزار کر 12 ذوالحجہ ہی کو منیٰ چھوڑ دیں اور حج سے واپسی کی راہ لیں۔ اسی طرح جو حاجی 13 ذوالحجہ تک منیٰ ہی میں ٹھہرے رہیں، ان کو بھی کوئی گناہ نہ ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں لیکن افضل اور مسنون طریقہ یہی ہے کہ 13 ذوالحجہ تک منیٰ ہی میں قیام کیا جائے۔ پھر فرمایا یہ دونوں جائز صورتیں ان نیک لوگوں کے لیے رکھی گئی ہیں جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے اور اس کی نافرمانی سے بچتے ہیں اور سچے حاجیوں کی یہی صفت ہوتی ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ ۝۲۰۳﴾ (203)

آخر میں فرمایا کہ حج کے مناسک ہوں، یا شریعت کے دوسرے احکام ہوں، سب پر عمل کرتے ہوئے اللہ سبحانہٗ کی نافرمانی سے بچو۔ ہر حال میں تقویٰ اختیار کرو اور یقین رکھو کہ ایک دن اسی کی عدالت میں اعمال کی جزا وسزا کے لیے جمع

کیے جاؤ گے۔ پھر آخرت کے عقیدے پر جتنا پختہ یقین ہوگا اتنا ہی زیادہ تقویٰ حاصل ہوگا۔ جس کے نتیجے میں نیکی کرنا اور برائی سے بچنا آسان ہو جائے گا۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ يُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَ هُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ﴿٢٠٤﴾ وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ﴿٢٠٥﴾ وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٢٠٦﴾ وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿٢٠٧﴾

"لوگوں میں کوئی (منافق) ہے جو دنیوی زندگی کے بارے میں بات کرتا ہے تو تمھیں اس کی گفتگو بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو سچا ثابت کرنے کے لیے اللہ کی قسمیں کھاتا ہے۔ حقیقت میں وہ سخت جھگڑالو ہے۔ جب تمھاری مجلس سے اٹھ کر کہیں جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ فساد پھیلائے، فصلیں اجاڑے اور جانیں تلف کرے، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔ اگر اسے کہا جائے اللہ سے ڈر، تو اس کا جھوٹا وقار اسے اور زیادہ گناہ پر ابھارتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے دوزخ کافی ہے جو بہت برا ٹھکانہ ہے۔"
لوگوں میں (مخلص مسلمان) بھی ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لیے اپنی جان تک قربان کر دیتا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔" (207-204)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

يُشْهِدُ اللّٰهَ :...... (وہ اللہ کو گواہ بناتا ہے) اس سے مراد قسم کھانا ہے۔ جیسا کہ سورۃ المنافقون میں ہے:
﴿اِذَا جَآءَكَ الْمُنٰفِقُوْنَ قَالُوْا نَشْهَدُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُ اللّٰهِ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّكَ لَرَسُوْلُهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَكٰذِبُوْنَ﴾ (المنافقون 63: 1، 2)

"(اے نبی ﷺ!) جب منافق لوگ آپ ﷺ کے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں ہم گواہی دیتے ہیں آپ ﷺ بے شک اللہ کے رسول ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے بے شک آپ ﷺ اس کے رسول ہیں۔ مگر اللہ گواہی دیتا ہے یہ منافقین جھوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے اور وہ اللہ کی راہ سے

دوسروں کو بھی روکتے ہیں۔''

اَلَدُّ :...... یہ اسم صفت ہے اور اس کے معنی ہیں شَدِیْدُ الْخُصُوْمَۃِ یعنی سخت جھگڑا کرنے والا۔

اَلْخِصَامِ :......بعض کے نزدیک یہ خَصْمٌ (مخالف) کی جمع ہے۔ بعض اسے خَاصَمَ سے مصدر سماعی قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کا مضاف حذف ہو گیا ہے اور اصل کلام یوں ہے: اَشَدُّ ذُوالْخِصَامِ یعنی سخت جھگڑا کرنے والا، بہت جھگڑالو۔

تَوَلّٰی: ......اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں: وہ واپس مڑتا ہے۔ یا وہ غلبہ اور اختیار پاتا ہے۔

اَلْعِزَّۃُ: ......اس کے اصل معنی عزت و اقبال کے ہیں مگر اس جگہ مجازی طور پر یہ جھوٹی عزت، انانیت اور جھوٹے وقار کے معنوں میں ہے۔

بِئْسَ الْمِهَادُ :......اس کے معنی ''بُری آرام گاہ'' کے ہیں۔

یَشْرِیْ :...... یہ یَبِیْعُ کے معنوں میں ہے یعنی وہ بیچتا ہے، خرچ کرتا ہے۔

اِبْتِغَاءَ :......اس کے معنی چاہنے یا ڈھونڈنے کے ہیں۔

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ﴾ (204)

اس سے پہلے یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ ہر عبادت کا مقصد تقوے کا حصول ہے اور اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت دونوں جہان کی بھلائی مانگنا اس کے خلاف نہیں ہے۔ پھر چونکہ تقوے کا مقام زبان نہیں بلکہ دل ہے اس لیے ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو زبان سے بہت اچھی باتیں کرتے ہیں مگر ان کے دل تقوے سے خالی ہوتے ہیں۔ یہی لوگ منافق ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس جن کے دلوں میں تقویٰ اور اخلاص ہوتا ہے وہ ہر کام اللہ سبحانہٗ کی رضا اور خوشنودی کے لیے کرتے ہیں اور اس کے حصول میں اپنی جان بھی قربان کر دیتے ہیں۔

اس آیت میں نبی ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا کہ بعض لوگ ایسے چرب زبان ہوتے ہیں جو بڑی میٹھی باتیں کرتے ہیں۔ وہ گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔ اپنی نیکی اور پارسائی کا چرچا کرتے پھرتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں وہ منافق ہوتے ہیں۔ ہر بات پر قسمیں کھاتے ہیں کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، دل سے کہہ رہے ہیں تاکہ دوسرے ان کی جھوٹی باتوں کو سچ سمجھ کر ان پر اعتبار کر لیں۔

یاد رہے کہ جو بات اللہ کو گواہ بنا کر کہی جائے وہ بھی قسم ہوتی ہے۔

﴿وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝﴾ (204)

ارشاد ہوا کہ ایسے منافق لوگ سخت جھگڑالو ہوتے ہیں۔ بظاہر دوستی کا دم بھرتے ہیں مگر اپنے مفاد کے لیے جھگڑے

اور گالی گلوچ پر اُتر آتے ہیں۔

اس مقام پر منافقین کی صرف تین نشانیاں بیان ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چرب زبان اور باتونی ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ بار بار قسمیں کھاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ وہ جھگڑالو ہوتے ہیں۔ ان تین نشانیوں کے علاوہ بھی قرآن و حدیث میں منافقین کی کچھ اور نشانیاں بیان ہوئی ہیں۔ جیسے جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی، امانت میں خیانت، نماز میں سستی اور جہاد نہ کرنا وغیرہ۔

﴿وَ اِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَ يُهْلِكَ الْحَرْثَ وَ النَّسْلَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝۲۰۵﴾ (205)

فرمایا یہ منافق لوگ اپنے مفاد کے لیے جہاں بھی ان کا بس چلے فتنہ وفساد برپا کر دیتے ہیں۔ اصلاح کے نام پر بگاڑ پیدا کرتے ہیں۔ دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتے، اُن کی فصلیں اُجاڑتے اور ان کو جانی و مالی نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ اپنے اقتدار کے لیے ہر حربہ آزماتے، غداری کرتے اور ملک تباہ کرتے ہیں۔ جب کہ اللہ سبحانہٗ کسی قسم کے فتنہ وفساد کو ہرگز پسند نہیں کرتا۔ وہ منافقوں کی ظاہری حالت نہیں دیکھتا بلکہ ان کے باطن کا حال جانتا ہے۔ اس لیے ان سے نفرت کرتا ہے۔

﴿وَ اِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ بِالْاِثْمِ﴾ (206)

جب ایسے منافقین کو اللہ تعالیٰ سے ڈرنے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کی نصیحت کی جائے کہ منافقانہ حرکتیں نہ کرو اور برے کام چھوڑ کر نیک انسان بن جاؤ تو یہ لوگ تکبر، غرور، رعونت اور انانیت کی وجہ سے نہ کسی کی بات مانتے ہیں اور نہ کوئی نصیحت قبول کرتے ہیں۔ ہمیشہ گمراہی اور گناہ میں مبتلا رہتے ہیں۔

﴿فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ؕ وَ لَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝۲۰۶﴾ (206)

ارشاد ہوا ایسے بدبختوں کے لیے جہنم کی آگ کافی ہے ان کا یہی علاج ہے کہ ان کو ایسی ہی بری جگہ پر رکھ کر عذاب دیا جائے۔

﴿وَ مِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِىْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ؕ﴾ (207)

اب فرمایا، منافقین کے برعکس مخلصین کا نیک گروہ بھی موجود ہے جو اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے احکام پر عمل کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ ؎

جان دی ، دی ہوئی اُسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ بعض حالات میں باطل قوتوں کے خلاف فدائی حملہ بھی جائز ہوتا ہے جس کے نتیجے میں مجاہد کو شہادت کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔

﴿وَ اللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۲۰۷﴾ (207)

آخر میں فرمایا اللہ سبحانہٗ اپنے نیک بندوں پر شفقت فرماتا ہے۔ وہ ان کے تھوڑے اعمال پر بھی ان کو بہت بڑے اجر سے نوازے گا۔ وہ ان کی طاقت سے زیادہ ان پر بوجھ نہیں ڈالتا۔ وہ ایک نیکی کے بدلے میں کئی گنا ثواب دیتا ہے۔ جب کہ ایک برائی کو صرف ایک ہی شمار کرتا ہے۔ وہ کبھی ان کو مال دے کر ان سے فرماتا ہے کہ اس میں سے کچھ میری راہ میں بھی خرچ کرو۔ وہ جان عطا کر کے پھر اسے خرید تا ہے کہ اس کی راہ میں اسے قربان کر دو تا کہ تمہیں اس کے بدلے میں ہمیشہ کی جنت اور اس کی دائمی نعمتیں حاصل ہوں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَّ لَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿٢٠٨﴾ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ
مَا جَاۗءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٠٩﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ
اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ وَقُضِيَ
ع ٢٥/١٤ ٩ الْاَمْرُ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿٢١٠﴾ ع

''اے ایمان والو! اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، بے شک وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ لیکن اگر واضح ہدایات آجانے کے بعد تم پھسل گئے تو یاد رکھو! اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔
کیا کافر لوگ اس انتظار میں ہیں کہ اللہ ان کے سامنے بادل کے سائبانوں میں ظاہر ہو، فرشتے بھی آجائیں اور معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ سارے معاملات اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔'' (208-210)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اَلسِّلْمِ: ...... یہ مصدر ہے اور اس کے اصل معنی اَلتَّسْلِيْمُ وَالْاِنْقِيَادُ یعنی اطاعت کے ہیں اور اس جگہ اس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت مراد ہے۔ لیکن یہ لفظ کئی دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ جیسے صلح، سلامتی اور دین اسلام۔ غور سے دیکھا جائے تو اس کے تمام مختلف معانی ایک ہی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہی کا دوسرا نام اسلام ہے اور اسلام وہ دین ہے جس پر عمل کرنے سے امن، صلح اور سلامتی حاصل ہو سکتی ہے۔

كَاۗفَّةً: ...... یہ بھی مصدر ہے اور واحد ہی استعمال ہوتا ہے۔ اس کا تثنیہ یا جمع نہیں ہے۔ اس کے معنی جماعت یا مجموعے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سب مل کر پورے اسلام کو اختیار کرو۔

زَلَلْتُمْ:......(تم پھسل گئے) زَلَّ کے اصل معنی ہیں پاؤں کا پھسلنا۔ لیکن یہ راہِ حق چھوڑ دینے کے معنوں میں بھی آتا ہے اور اس جگہ یہی معنی مراد ہیں۔

اَلْبَيِّنٰتُ :......(روشن دلیلیں) اس سے دینِ حق کے عقلی اور نقلی دلائل مراد ہیں۔

يَنْظُرُوْنَ :......(وہ انتظار کرتے ہیں) نَظَرَ کے ایک معنی دیکھنے کے ہیں اور دوسرے انتظار کرنے کے۔ اس جگہ یہی دوسرے معنی مراد ہیں۔

ظُلَلٍ:......یہ ظُلَّةٌ کی جمع ہے جس کے معنی چھتری یا سائبان کے ہیں۔

اَلْغَمَامِ:......اس سے وہ بادل مراد ہوتا ہے جو ہلکا اور سفید ہو۔

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (208)

اسلام ایک کامل دین اور مکمل ضابطہ حیات (Code of Life) ہے۔ یہ ایک اکائی (Unit) ہے جس کے حصے بخرے نہیں کیے جا سکتے اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔ یہ ایک ایسا مجموعہ (Package) ہے جسے پورے طور پر ماننا ہوتا ہے یا پورے طور پر نہیں ماننا ہوتا۔ پہلی صورت میں یہ اسلام اور دوسری صورت میں کفر ہے۔

یہ بات ایک مثال سے سمجھی جا سکتی ہے:

دینِ اسلام میں تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان لانا مسلمان ہونے کے لیے ایک ضروری شرط ہے۔ کسی ایسے شخص کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جو سارے نبیوں پر ایمان نہ لائے۔ اگر کوئی آدمی یہ کہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سوا باقی تمام انبیاء کرام علیہم السلام پر ایمان رکھتا ہے تو اس کا ایمان کامل نہیں۔ بلکہ وہ سرے سے مسلمان ہی نہیں ہے اور اس کے لیے آخرت میں نجات بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر کوئی دوسرا شخص حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی اور کی نبوت تسلیم کرے گا تو وہ بھی دائرۂ اسلام سے خارج ہو جائے گا۔ گویا رسالت کے عقیدے میں کسی ایک نبی کو نہ ماننا، یا کسی نئے مدعی نبوت کو مان لینا دونوں ہی اسلام کے خلاف ہیں اور ایسا شخص نہ مسلمان ہے اور نہ نجات کا مستحق۔ اس مسئلے پر تمام علمائے اسلام متفق ہیں۔

اسی طرح فرض نمازوں کی رکعتوں میں کمی بیشی کرنے سے بھی نماز ادا نہیں ہوتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کے عقائد و اعمال میں کسی قسم کی کمی بیشی کرنا جائز نہیں اور جو شخص ایسا کرے وہ مسلمان نہیں رہتا۔

زیرِ نظر آیت میں اہلِ ایمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ پورے کے پورے اسلام میں داخل ہوں۔ آدھے یا ایک تہائی یا دو تہائی اسلام کو قبول نہ کریں بلکہ مکمل اسلام کو اختیار کریں۔ اسلام نے زندگی کے ہر شعبے میں جو احکام دیئے ہیں ان پر پورا پورا عمل کیا جائے۔ نہ کسی نیکی کو چھوڑا جائے اور نہ کسی برائی کو اختیار کیا جائے۔ اسلام کے تمام عقائد و اعمال کی پابندی کی جائے۔

آج مسلمانوں کو جس ذلت، غلامی اور بربادی کا سامنا ہے، اس کا واحد سبب یہی ہے کہ انھوں نے اسلام کی بعض من پسند تعلیمات کو لے لیا ہے اور اس کے بعض دوسرے عقائد و اعمال کو چھوڑ رکھا ہے۔ ان کی اس منافقت، دو رُخی اور عملی کفر کا انجام سب کے سامنے ہے۔

﴿وَّ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴾ (208)

دینِ اسلام کی مکمل پابندی کرنے کے حکم کے بعد فرمایا کہ شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو، کیونکہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص اپنے دین کے جتنے حصے کو چھوڑتا ہے وہ اتنے حصے کو شیطان کے حوالے کر دیتا ہے اور اس کے پیچھے چلتا ہے، خواہ اس کا تعلق عقیدے سے ہو یا عمل سے۔ گویا دین اسلام سے ہٹ کر جو کام بھی کیا جائے گا وہ شیطان کی پیروی کہلائے گا۔

﴿فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ (209)

اس آیت میں سخت تنبیہ (Warning) کی گئی ہے کہ اگر لوگ دین کے واضح احکام اور ہدایات آ جانے کے بعد بھی ان میں تبدیلی یا کمی بیشی کریں گے، اور اگر راہِ حق پر چلتے ہوئے ان کے قدم ڈگمگا گئے تو وہ جان لیں کہ اللہ تعالیٰ غالب اور حکمت والا ہے اور اس کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ جو لوگ دین اسلام کی سچائی اور حقانیت واضح ہو جانے کے بعد بھی اس سے منہ موڑیں گے اور شیطان کے پیچھے چلیں گے تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا زبردست ہے کہ وہ ان کو ان کی سرکشی پر ضرور سزا دے گا۔ وہ بدلہ لینے پر پوری طرح قادر ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔

﴿هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَ قُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَ اِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴾ (210)

اس آیت میں تنبیہ اور وعید کے انداز میں فرمایا کہ اب جب کہ نبی ﷺ کی صداقت ظاہر ہو چکی اور دینِ اسلام کا سچا دین ہونا واضح ہو گیا تو یہ لوگ جلدی سے مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے؟ کیا یہ اس بات کے منتظر ہیں کہ خود اللہ سبحانہٗ اور اس کے فرشتے آسمان کے بادلوں سے اچانک نمودار ہو کر ان سرکشوں پر عذاب نازل کر دیں اور ان کا قصہ تمام ہو جائے۔

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ بندے کو اپنے گناہوں سے جلد توبہ کر لینی چاہیے اس سے پہلے کہ توبہ کا موقع ہی نہ ملے۔

آخر میں فرمایا کہ دنیا اور آخرت کے تمام معاملات کا حتمی اور آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جو چاہے فیصلہ صادر فرمادے کوئی اسے روکنے والا نہیں۔

سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ وَ مَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ
اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۱۱﴾ زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ
كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَ یَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ وَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا
فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ وَ اللّٰهُ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴿۲۱۲﴾ كَانَ
النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۫ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ ۪
وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِیَحْكُمَ بَیْنَ النَّاسِ فِیْمَا اخْتَلَفُوْا
فِیْهِ ؕ وَ مَا اخْتَلَفَ فِیْهِ اِلَّا الَّذِیْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ
الْبَیِّنٰتُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ۚ فَهَدَی اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِیْهِ
مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَ اللّٰهُ یَهْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۱۳﴾

”بنی اسرائیل سے پوچھو، ہم نے انھیں ہدایت کی کتنی کھلی نشانیاں دیں! مگر جو لوگ اللہ کی اُن نعمتوں کو ٹھکرا دیں جو اُن کے پاس آچکی ہوں تو یاد رکھیں کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

کافروں کی نظر میں دنیا کی زندگی خوش نما کر دی گئی ہے اور وہ ایمان والوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ لیکن جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں وہ قیامت کے دن کافروں کے مقابلے میں اونچے اور بلند مرتبہ ہوں گے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔

شروع میں لوگوں کی ایک ہی امت تھی پھر جب انھوں نے اختلاف پیدا کر لیا تو اللہ نے ان کی طرف نبی بھیجے جو لوگوں کو خوش خبری سناتے اور (نافرمانی کے برے انجام سے) ڈراتے تھے۔ ان کے پاس اللہ کی نازل کی ہوئی برحق کتاب تھی تاکہ وہ ان باتوں کا فیصلہ کر دے جن میں لوگ اختلاف کر رہے ہیں۔ یہ اختلاف ان لوگوں نے پیدا کیے جن کو کتاب دی گئی اور انھوں نے واضح ہدایات کی موجودگی میں محض ضد کی وجہ سے اختلافات پیدا کر لیے۔ پھر اللہ نے اپنے فضل سے ایمان والوں کو حق کے معاملے میں صحیح راہ دکھا دی جس کے بارے میں لوگ جھگڑ رہے تھے۔ اور اللہ جسے چاہتا ہے، سیدھی راہ دکھا دیتا ہے۔“ (211-213)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اٰیَةٍ بَیِّنَةٍ:...... (روشن نشانیاں، واضح دلیلیں) اس سے وہ کھلے معجزات مراد ہیں جو بنی اسرائیل کو دکھائے گئے جیسے عصا اور من وسلویٰ وغیرہ۔

نِعْمَةَ اللّٰهِ:...... (اللہ کی نعمتیں) اس جگہ اس سے مراد دین اور شریعت ہے۔

اَلْعِقَابِ:...... اس سے وہ عذاب مراد ہوتا ہے جو اصل میں کسی گناہ کا نتیجہ یا بدلہ دیتا ہے۔

یَسْخَرُوْنَ:...... (وہ مذاق اڑاتے ہیں)۔ سَخِرَ مِنْهُ کے معنی ہیں: اس نے اس کا مذاق اڑایا۔

﴿سَلْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ كَمْ اٰتَیْنٰهُمْ مِّنْ اٰیَةٍۭ بَیِّنَةٍ ؕ﴾ (211)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نبی ﷺ کو خطاب کرکے فرمایا کہ آپ ﷺ ان یہودیوں کو جھنجوڑ کر ان سے پوچھیں کہ ان کے اسلاف اور بڑوں کو انبیائے کرام کے ذریعے کتنے معجزے دکھائے گئے، کتنی نعمتیں دی گئیں مگر انھوں نے ان سب کا انکار کیا اور ناشکری کی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو عذاب میں پکڑا۔ تو کیا اب یہ لوگ اپنے انجام سے نہیں ڈرتے کہ اگر یہ بھی ہٹ دھرمی، ضد اور تکبر سے نبی ﷺ اور قرآن کا انکار کریں گے تو ان پر بھی اللہ سبحانہٗ کا عذاب آئے گا۔

﴿وَمَنْ یُّبَدِّلْ نِعْمَةَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝۲۱۱﴾ (211)

پھر فرمایا جو لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کی ناشکری کریں، اس کے احکام کی نافرمانی کریں، جان بوجھ کر ان میں ردو بدل کر دیں اور ان سے ہدایت حاصل کرنے کی بجائے گمراہی مول لیں تو ایسے لوگ اللہ سبحانہٗ کے عذاب کے مستحق ہیں اور ضرور اپنے برے انجام کو پہنچیں گے۔

اس آیت میں آج مسلمانوں کے لیے بھی بڑا سبق ہے جنھوں نے قرآن جیسی عظیم ہدایت کو پس پشت ڈال رکھا ہے جنھوں نے اسلامی اخوت اور بھائی چارے جیسی بابرکت نعمت کو چھوٹی چھوٹی الگ ریاستوں، فرقوں اور پارٹیوں میں بانٹ کر ضائع کر دیا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ دنیا میں کمزور، غلام اور ذلیل ہو کر رہ گئے ہیں۔

﴿زُیِّنَ لِلَّذِیْنَ كَفَرُوا الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا وَیَسْخَرُوْنَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ۘ﴾ (212)

فرمایا کافروں کے لیے یہ دنیا اتنی پیاری اور پرُکشش ہے کہ اس نے ان کو آخرت کی دائمی زندگی سے غافل کر رکھا ہے۔ وہ اسی کی خاطر جیتے اور عیش وعشرت میں پڑے رہتے ہیں۔ وہ ان اہل ایمان کو حقیر اور بے وقوف سمجھ کر ان کا مذاق اڑاتے ہیں جو دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیتے ہیں۔ جو دنیا کے عارضی مفاد کی خاطر اپنی عاقبت برباد نہیں کرتے۔ جو حلال وحرام کا خیال رکھتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے احکامات کے مطابق زہد وقناعت اور توکل علی اللہ کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

﴿وَالَّذِیْنَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ ؕ﴾ (212)

فرمایا، قیامت کے دن یہی ایمان والے، جن کا آج مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ وہ ان مذاق اڑانے والے کفار سے بہتر پوزیشن میں ہوں گے۔ کافروں کو دوزخ کے عذاب میں ڈالا جائے گا۔ جب کہ اہل ایمان جنت کی ہمیشہ دائمی نعمتیں

حاصل کریں گے۔

یاد رہے کہ افراد ہوں یا اقوام دونوں کی خرابی کی جڑ ہمیشہ یہی دنیا پرستی رہی ہے خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا اہل اسلام۔

﴿وَ اللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢١٢﴾﴾ (212)

آخر میں فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ ہی سب کا رازق اور روزی رساں ہے۔ وہ جسے چاہے بے حساب روزی دیتا ہے۔ دنیا میں آزمائش اور امتحان کے لیے دیتا ہے اور آخرت میں اُس کی جزا و سزا دے گا۔

﴿كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ﴾ (213)

فرمایا، ابتدا میں لوگ ایک ہی دین پر تھے۔ ایک ہی امت تھی۔ سب ہدایت پر تھے۔ مگر بعد میں انھوں نے خواہش پرستی، ظلم و سرکشی اور آپس کی ضدم ضدا کی وجہ سے دین حق کی واضح تعلیمات کی موجودگی میں اختلاف پیدا کر لیا جس سے وہ گمراہ ہو گئے، اور کفر و شرک اور فرقہ بندی میں مبتلا ہو گئے۔

پھر ان کی اصلاح و ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ نے جنت کی خوشخبری دینے والے اور دوزخ کی آگ سے ڈرانے والے پیغمبر بھیجنے شروع کر دیے۔

﴿وَ اَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ﴾ (213)

''اور اُن پر کتابیں اور صحیفے نازل کیے تاکہ اُن کی روشنی میں لوگوں کے مذہبی اختلافات کا فیصلہ کیا جا سکے، اُن کو گمراہی سے بچایا جا سکے اور اُن پر اِتمام حجت کر دیا جائے۔''

﴿وَ مَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَ اللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٢١٣﴾﴾ (213)

پھر باہمی ضد و عناد سے کچھ لوگ گمراہ رہے لیکن جو حق کے طالب تھے ان کو اللہ تعالیٰ نے ایمان کی دولت سے نوازا۔ ان کے اختلاف ختم کر کے ان کو ہدایت کی سیدھی راہ دکھا دی۔

اللہ تعالیٰ کی یہی سنت اب نبی کریم ﷺ کی بعثت اور قرآن کے نزول کی صورت میں ظاہر ہو چکی ہے۔ جو لوگ اب حق کی پیروی کریں گے اور ایمان لائیں گے تو اللہ سبحانہٗ ان کو اپنی ہدایت عطا فرمائے گا۔ مگر جو باہمی ضد، خواہش پرستی، نفس کی پیروی اور فرقہ پرستی کے تعصب میں مبتلا رہیں گے وہ اس ہدایت سے محروم رہیں گے۔

اس آیت سے ان لوگوں کے اس غلط فلسفے کی تردید ہو جاتی ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانیت کی ابتدا گمراہی اور شرک کے ماحول میں ہوئی تھی اور پھر انسان بتدریج توحید اور ہدایت کی طرف آتا گیا۔ جب کہ قرآن کہتا ہے کہ دنیا کا پہلا انسان ایک پیغمبر تھا جس کا نام آدم علیہ السلام تھا اور انسانیت کا آغاز ہدایت سے ہوا۔ بعد میں شیطان کے وسوسوں کے

سبب سے لوگ شرک و گمراہی میں مبتلا ہوئے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾

''(مسلمانو!) کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ آرام اور مزے سے جنت میں داخل ہو جاؤ گے، حالانکہ ابھی تم پر وہ حالات نہیں گزرے جن سے پہلے لوگوں کو سابقہ پیش آیا، وہ مالی پریشانیوں میں مبتلا ہوئے، انھیں جسمانی اذیتیں دی گئیں اور خوف و ہراس نے انھیں جھنجوڑ کر رکھ دیا، یہاں تک کہ وقت کا رسول اور اس کے ایمان والے ساتھی کہنے لگے: اللہ کی مدد کب آئے گی؟ جان لو اللہ کی مدد قریب ہے۔'' (214)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

اَلْبَأْسَآءُ:...... اس سے ہر طرح کی مالی اور ماحولیاتی پریشانی مراد ہوتی ہے جیسے تنگ دستی، مال چوری ہو جانا، گھر سے بے گھر ہو جانا وغیرہ۔

اَلضَّرَّآءُ:...... اس سے ہر قسم کی بدنی اور جانی تکلیف مراد ہے جیسے، بیماری، درد، زخم اور قتل وغیرہ۔

زُلْزِلُوْا:...... یہ زلزلہ یا زلزال سے ہے جس کے معنی بار بار ہلنے اور جھنجھوڑے جانے کے ہیں۔ زمین کے ہلنے کو بھی زلزلہ کہا جاتا ہے۔ انسانوں کے حوالے سے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ مصیبتوں اور تکلیفوں کی وجہ سے سخت گھبراہٹ کا شکار ہوئے، ان کے دل دہل گئے اور کلیجے منہ کو آنے لگے۔ جیسا کہ غزوۂ خندق کے موقع پر مسلمانوں کی حالت کو قرآن مجید نے اس طرح بیان کیا ہے:

﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا○ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ زُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا﴾

(الاحزاب 33: 10، 11)

''یاد کرو جب دشمن تم پر حملہ آور ہوا، تمہارے اوپر کی طرف سے اور تمہارے نیچے کی طرف سے۔ جب آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور کلیجے منہ کو آنے لگے اور تم اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اس وقت مومنوں کو سخت امتحان پیش آیا اور وہ بالکل ہلا دیے گئے۔''

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَ لَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (214)

اس مقام پر اہل ایمان کو راہِ حق کی مشکلات سے آگاہ کیا گیا ہے جس سے وہ اسلام کے ابتدائی دور میں مبتلا ہوئے تھے۔ فرمایا کہ تم جنت کے طلب گار ہو تو اس راستے میں کچھ مشکل مقامات بھی ہیں۔ اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ بلکہ ایک متفق علیہ حدیث میں ہے کہ جنت تلواروں کے سائے تلے ہے۔

"وَاعْلَمُوْا اَنَّ الْجَنَّةَ تَحْتَ ظِلَالِ السُّيُوْفِ"

(صحیح بخاری، رقم: 2965، صحیح مسلم، رقم: 4542)

مطلب یہ ہے کہ جنت اللہ کی راہ میں جان و مال قربان کرنے سے ملتی ہے۔ یہ سودا اتنا سستا نہیں ہے بلکہ مہنگا ہے۔ اس راہ و منزل کے مسافروں کو پہلے بھی سخت اور کڑے امتحانوں میں سے گزرنا پڑا تھا اور تم مسلمانوں کو بھی ان میں سے گزرنا پڑے گا۔ کیونکہ یہی سُنت اللہ ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی۔

﴿مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَ الضَّرَّآءُ وَ زُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ۝﴾ (214)

فرمایا، پہلے دور کے اہل ایمان اور پیغمبروں کو بھی راہِ حق میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ تنگ دستی، بیماری، جسمانی تکلیفیں اور دل ہلا دینے والے واقعات و حادثات نے ان کو جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یہی حالات اب مسلمانوں کو بھی پیش آئیں گے۔ اس آیت میں لف و نشر غیر مرتب ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دو الگ الگ متکلم افراد کی طرف سے دو جدا جدا اقوال بیان ہوئے ہیں۔ اب ان اقوال کو ہر متکلم کے مقام و مرتبہ کے لحاظ سے جوڑا جائے گا جو اُن کے مناسب حال ہوگا۔ اس میں پہلے قول مَتٰی نَصْرُ اللّٰہِ (اللہ کی مدد کب آئے گی؟) کا تعلق اہل ایمان سے ہے اور اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰہِ قَرِیْبٌ (جان لو کہ اللہ کی مدد قریب ہے) کا تعلق رسولوں سے ہے جن کی طرف سے یہ پہلے سوال کا جواب ہے۔ کیونکہ اہل ایمان کے سوال میں بے بسی کے ساتھ مایوسی کا پہلو بھی کچھ نمایاں ہے۔ اس اسلوب کی مثال اور نظیر سورۃ الفتح (48) کی آیات 8، 9 ہیں:

﴿اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝﴾ (الفتح 48:8,9)

"بے شک ہم نے آپ ﷺ کو حق کی گواہی دینے والا، خوشخبری سنانے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔ تاکہ تم لوگ اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اس کی مدد کرو، اس کی تعظیم کرو۔ اور صبح و شام اُس کی تسبیح کرو۔"

اس میں مدد اور تعظیم کرنے کا تعلق رسول اللہ ﷺ سے ہے اور صبح و شام تسبیح کرنے کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔ کیونکہ یہ دو مختلف باتیں ہیں اور ان کو اُن کے مناسبِ حال ہستیوں سے جوڑنا ضروری ہے۔

جب کہ انبیاء کرام علیہم السلام سخت ترین حالات میں بھی صبر وتحمل سے کام لیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کسی حال میں بھی مایوس نہیں ہوتے ۔ جیسا کہ یعقوب علیہ السلام نے دو سخت آزمائشوں کے موقع پر فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ (یوسف 12: 18، 83) فرمایا تھا اور جیسا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا واقعہ ہے جب غارِ ثور میں ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی پریشانی اورتشویش دیکھ کرحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں فرمایا:

﴿لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (التوبہ 9: 40)

''غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام بھی نہ اُس وقت گھبرائے اور نہ مایوسی کا شکار ہوئے حالانکہ اُن کی قوم بنی اسرائیل گھبرا اُٹھی تھی جب وہ لوگ مصر سے فلسطین کی طرف ہجرت کر کے جا رہے تھے۔ اُس وقت اُن کے پیچھے فرعون کی فوجیں تھیں اور آگے سمندر کی موجیں تھیں۔ اس نازک موقع پر بنی اسرائیل گھبرا کر بولے:

﴿اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ٥﴾ (الشعراء 26: 61)

''ہم تو پکڑے گئے۔''

مگر عین اُس وقت موسیٰ علیہ السلام بڑے اطمینان سے فرما رہے تھے:

﴿قَالَ كَلَّا ۚ اِنَّ مَعِيَ رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ٥﴾ (الشعراء 26: 62)

''اُس (موسیٰ) نے کہا: ہرگز نہیں، بے شک میرا رب میرے ساتھ ہے، وہ مجھے ضرور کوئی راستہ بتائے گا۔''

افسوس بعض مفسرین نے اس آیت کے لف ونشر کو نہ سمجھا اور انبیائے کرام علیہم السلام جیسی عظیم ہستیوں کو بھی بے بسی کی تصویر اور نا امیدی میں مبتلا قرار دے دیا۔

مزید تفصیل کے لیے آیت 155 کی تفسیر دیکھ لی جائے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ ؕ وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۱۵﴾

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) لوگ آپ سے پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں: تم جو مال خرچ کرو، اس میں حق ہے تمہارے والدین کا، غریب رشتہ داروں کا، یتیموں کا، مسکینوں کا اور مسافروں کا اور جو بھلائی بھی تم کرتے ہو، اللہ اسے جانتا ہے۔'' (215)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ :......قرینہ دلیل ہے کہ اس جگہ خَیْرٌ سے مراد مال ہے۔

﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ﴾ (215)

یہ سوال اہل ایمان کی طرف سے کیا گیا تھا کہ وہ اپنا مال کہاں اور کن لوگوں پر خرچ کریں اور اس کے لیے کیا مصارف ہیں۔یاد رہے یہ سوال نفلی صدقے اور خیرات سے متعلق تھا، زکوٰۃ کے بارے میں نہ تھا کیونکہ اس کے جواب میں نصاب یا مقدار کا ذکر نہیں۔

﴿قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَ الْاَقْرَبِيْنَ وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ وَ ابْنِ السَّبِيْلِ﴾ (215)

یہ اوپر کے سوال کا جواب ہے کہ تمہیں اپنا مال اپنے والدین پر، غریب رشتہ داروں پر، یتیموں پر، محتاجوں، مسکینوں پر اور ضرورت مند مسافروں پر خرچ کرنا چاہیے۔

اس سے معلوم ہوا کہ بندے پر اپنے والدین اور عزیز و اقارب کا حق سب سے پہلے ہے اور ان کے بعد دوسرے لوگوں کا حق ہے۔ کیونکہ اپنوں کی محتاجی میں عار بھی ہوتی ہے اور غیروں کی کفالت سے معاشرے میں مالی استحکام پیدا ہوتا ہے۔خاص طور پر ایسے افراد جو کسی وجہ سے معذور یا محتاج ہوں، ان کی اجتماعی کفالت نہایت ضروری ہے۔

﴿وَ مَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ۝٢١٥﴾ (215)

مطلب یہ ہے کہ اوپر کے بتائے ہوئے مصارف پر تم جو مال خرچ کرو گے، یا کوئی نیکی کا کام جب بھی کرو گے تو اللہ تعالیٰ کی نگاہوں سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ وہ تمہارے سب نیک کاموں سے واقف ہے اور ان کا اجر و ثواب کئی گنا بڑھا کر دے گا۔

یہی مضمون سورۃ البقرہ 2 آیت 158 میں بھی آیا ہے وہاں بھی دیکھ لیا جائے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ
خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ
ع ٢٦ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝٢١٦ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ
فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ
اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَ لَا

يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ
وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓىِٕكَ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا
خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓىِٕكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾

"(اے مسلمانو!) تم پر جہاد فرض کیا گیا ہے جو تمھیں ناگوار محسوس ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے تمھیں کوئی چیز ناپسند ہو مگر وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ممکن ہے تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو، اصل حقیقت اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

(اے نبی ﷺ) لوگ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں حرمت والے مہینے میں لڑنا کیسا ہے؟ آپ ﷺ کہہ دیں اس میں لڑنا بہت برا ہے۔ مگر اللہ کے نزدیک اس سے بھی زیادہ برا یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکا جائے، کفر اختیار کیا جائے، مسجدِ حرام سے روکا جائے اور وہاں کے رہنے والوں کو نکال باہر کیا جائے۔ یاد رکھو! (کفر اور شرک کا) فتنہ قتل سے بھی بڑھ کر برائی ہے۔

اور (اے مسلمانو!) یہ مشرک لوگ تم سے لڑتے رہیں گے یہاں تک کہ تمھیں تمہارے دین سے ہٹا دیں، اگر وہ تم پر قابو پائیں۔ لیکن یاد رکھو تم میں سے جو اپنے دین سے پھرے گا اور کفر کی حالت میں مرے گا، اس کے سارے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔ ایسے لوگ دوزخی ہوں گے اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

مگر جو لوگ ایمان لائے، انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، وہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔" (216-218)

آیات کی تفسیر:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَ هُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ﴾ (216)

مال خرچ کرنے کے حکم کے بعد اب جہاد کا ذکر ہے۔ کیونکہ جہاد میں جان و مال دونوں خرچ ہوتے ہیں۔ فرمایا، تم مسلمانوں پر جہاد و قتال فرض ہے۔ گویا نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کی طرح کفار و مشرکین کے خلاف جہاد کرنا بھی فرض ہے۔ بلکہ بعض خاص ہنگامی حالات میں یہ دوسرے تمام دینی فرائض سے بڑھ کر مقدم ہو جاتا ہے اور اس وقت اسے مؤخر

نہیں کیا جا سکتا، جب کہ دوسرے احکام مؤخر ہو سکتے ہیں۔

عام حالات میں جہاد فرضِ کفایہ ہے۔ مگر جب کوئی دشمن مسلمانوں کے علاقوں پر حملہ کر دے تو پھر یہ فرضِ عین ہو جاتا ہے۔ اُس وقت نفیرِ عام کی صورت ہو جاتی ہے اور پھر خلیفہ یا حکمران کی اجازت کی شرط بھی ختم ہو جاتی ہے۔

﴿وَ عَسٰٓی اَنْ تَكْرَهُوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَ عَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْـًٔا وَّ هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۟﴾ (216)

ارشاد ہوا کہ جہاد کی حکمت و اہمیت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے تمہیں اس کے بارے میں ابھی کچھ ناگواری سی محسوس ہوتی ہے۔ تم اسے ایک ہولناک شے سمجھتے ہو کیونکہ ابھی تم کمزور ہو، تعداد میں تھوڑے ہو اور جس دشمن سے لڑنا ہے وہ بہت طاقت ور اور تعداد میں بہت زیادہ ہے۔ تمہیں اندیشہ ہے کہ اس میں جان جانے کا بھی خطرہ ہے اور اس میں مالی وسائل بھی خرچ ہوں گے جو تمہیں ابھی بہت کم میسر ہیں۔ پھر اس میں اپنے بیوی بچوں سے جدائی سہنی پڑے گی اور سفر کی صعوبتیں اور مشقتیں برداشت کرنی پڑیں گی جو بہرحال پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ اس لیے تم جہاد کرنے سے گھبراتے ہو۔

مگر تم بھول جاتے ہو کہ جہاد میں تمہارے لیے کتنے فوائد ہیں۔ اسلامی سرحدوں کی حفاظت، دین اسلام کا غلبہ اور اس کی سربلندی، مالِ غنیمت اور غازیوں اور شہیدوں کے لیے بخشش اور جنت کا اجر و ثواب، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی، یہ سب انعامات تمہیں صرف اور صرف جہاد ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتے ہیں۔ ورنہ ترکِ جہاد کی صورت میں کفار تمہارے ملکوں اور علاقوں پر قابض ہو کر تمہیں اپنا غلام بنا لیں گے۔ تمہارے ملکی و قومی وسائل پر قبضہ کر لیں گے اور تم غلامی کی ذلت و لعنت میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

اس مقام پر یہ حقیقت بھی بتا دی گئی کہ انسان اپنے حقیقی نفع و نقصان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، صرف اللہ سبحانہٗ ہی جانتا ہے کہ کس بات میں انسان کے لیے فائدہ اور کس میں اس کا نقصان ہے۔ بندے کا کام یہ ہے کہ وہ ہر حال میں اللہ سبحانہٗ کے ہر حکم کی پیروی کرے خواہ اس میں اسے بظاہر نقصان نظر آتا ہو۔

صرف اسی صورت میں اسے دنیا اور آخرت کی فلاح و کامیابی حاصل ہو سکتی ہے۔

یہ عجیب معاملہ ہے کہ انسانی طبیعت جن باتوں میں زیادہ رغبت اور کشش محسوس کرتی ہے وہ اس کے مقام کو پست کرنے والی ہیں لیکن جو باتیں اس کے نفس پر گراں اور بھاری ہوتی ہیں وہی اس کے درجے کو بلند کرنے والی ہیں۔ عیش و آرام اور کاہلی کی زندگی ہمیں مرغوب اور پسند ہے مگر یہی چیز ہماری شخصیت کو گرانے والی اور ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اپنی روزمرہ زندگی میں بھی ہم کئی ناگوار چیزوں کو صرف اس لیے گوارا کر لیتے ہیں کہ اس میں ہمارا فائدہ ہوتا ہے۔ مریض کو کڑوی دوا ناپسند ہے مگر بعض اوقات اس کی صحت یابی اور شفا کے لیے وہی ضروری ہے۔

﴿یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِیْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِیْهِ كَبِیْرٌ﴾ (217)

حرمت والے مہینوں کا کچھ ذکر آیت 194 میں گزر چکا۔ اب جہاد فرض ہونے کی مناسبت سے دوبارہ ان کا ذکر

آ گیا کہ ان مہینوں میں جہاد جائز ہے یا نہیں۔

اس آیت کا شان نزول اور پس منظر جیسا کہ تفسیر طبری وغیرہ میں ہے، یہ ہے کہ جمادی الثانی 2ہجری میں نبی ﷺ نے عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ (اپنے پھوپھی زاد بھائی) کی کمان میں آٹھ (8) مہاجرین صحابہ کا ایک دستہ نخلہ (مکے اور طائف کے درمیان ایک مقام) کی طرف بھیجا تاکہ کفارِ قریش کی نقل وحرکت کا پتہ چلایا جاسکے۔ کیونکہ ان کی طرف سے مدینے پر چڑھائی کا ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ اس دستے کو کافروں کے چار معزز افراد کا ایک مختصر تجارتی قافلہ مل گیا جس پر انھوں نے حملہ کر دیا۔ ان میں سے ایک شخص جس کا نام عمرو بن حضرمی تھا، اُس کو قتل کیا، دو کو قیدی بنالیا، جب کہ چوتھا بھاگ نکلا۔ پھر جب یہ صحابہ کرام دو قیدیوں سمیت مالِ غنیمت لے کر مدینے پہنچے تو نبی ﷺ نے ناراض ہوکر فرمایا ''میں نے تمھیں دشمن کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا تھا، نہ کہ حرمت والے مہینے میں لڑنے کے لیے۔'' پھر آپ ﷺ نے مالِ غنیمت لینے سے انکار کر دیا۔ چونکہ یہ واقعہ حرمت والے مہینے رجب (2ھ) کی پہلی تاریخ کو پیش آیا جب کہ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ آج 30 جمادی الثانی ہے۔ بعد میں صورتِ حال واضح ہونے پر وہ شرمسار بھی ہوئے۔ مگر اس واقعے سے کفارِ مکہ کو مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا کہ یہ کیسے دین دار لوگ ہیں جو حرمت والے مہینوں کا احترام نہیں کرتے، جب کہ اس میں لڑائی کرنا منع ہے۔

اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی جس کے بعد نبی ﷺ نے اس مالِ غنیمت میں سے پانچواں حصہ بھی قبول فرمایا اور باقی مال اسی دستے کے مجاہدین میں تقسیم کر دیا۔

یہی واقعہ آگے چل کر جنگِ بدر کا سبب اور پیش خیمہ بن گیا۔

﴿وَ صَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ كُفْرٌۢ بِهٖ وَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَ اِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ﴾ (217)

ارشاد ہوا کہ حرمت والے مہینے میں جنگ کرنا اگرچہ بڑی سنگین بات ہے مگر اللہ کی راہ یعنی دین اسلام سے لوگوں کو روکنا، کفر میں مبتلا رہنا، مسجد حرام یعنی خانہ کعبہ میں عمرے، حج اور عبادت سے منع کرنا، وہاں کے مسلمان باشندوں کو گھروں سے نکال کر ہجرت پر مجبور کرنا...... ایسے گناہ اور جرائم ہیں جو کسی حرمت والے مہینے میں جنگ کرنے کے گناہ سے بڑھ کر شدید اور گھناؤنے ہیں۔ اس لیے ان شدید اور گھناؤنے جرائم کو روکنے کے لیے اگر حرمت والے مہینوں میں بھی جنگ کرنی پڑے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بلکہ یہ عین جہاد ہوگا۔

﴿وَ الْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ﴾ (217)

فرمایا فتنہ، قتل سے بھی بڑھ کر گناہ ہے۔ لفظ فتنہ کی وضاحت اس سے پہلے آیت 191 میں گزر چکی ہے۔ اس سے وہ ظلم وستم مراد ہیں جو قریش مکہ کی طرف سے مسلمانوں کو دین اسلام سے ہٹانے کے لیے روا رکھا گیا۔ یہ کفر وشرک کے غلبے کی حالت ہے جس کے خاتمے کے لیے اسلام میں جہاد فرض کیا گیا ہے۔

﴿وَ لَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا﴾(217)

اب مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان کو بتایا گیا کہ کفار و مشرکین اُس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے اور تمہارے خلاف ہر وقت جنگ چھیڑتے رہیں گے جب تک وہ تمہیں تمہارے دین سے نہ پھیر دیں اور تم اسلام چھوڑ کر کفر و شرک اختیار نہ کرلو۔ یہ حق و باطل کی کشمکش اور جنگ ہے جو ہمیشہ سے چلی آ رہی ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفوی سے شرارِ بولہبی

﴿وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ (217)

فرمایا، اگر کوئی مسلمان کفار کے دباؤ میں آ کر اپنا دین چھوڑ کر مرتد ہو جائے گا اور پھر کفر کی حالت میں مر جائے گا تو ایسے لوگ یاد رکھیں کہ ان کے تمام اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو جائیں گے۔ ان کا ٹھکانہ دوزخ ہو گا جس میں وہ ہمیشہ عذاب میں مبتلا رہیں گے۔

اسلامی شریعت میں ارتداد یعنی مرتد ہونا سخت جرم ہے جس کی سزا قتل ہے اور جو صحیح احادیث، تعاملِ صحابہ اور اجماعِ امت سے ثابت ہے۔

مرتد کی سزا کے بارے میں اب ہم تفصیل سے گفتگو کریں گے کیونکہ منکرین حدیث اور بعض مغرب زدہ لوگوں نے اس بارے میں کئی غلط فہمیاں پھیلا رکھی ہیں۔

صحیح احادیث:

نبی کریم ﷺ کے جن مستند فرامین کی بنا پر علمائے امت کا مرتد کی سزا قتل ہونے پر اجماع ہے، وہ درج ذیل ہیں:

1۔ صحیح بخاری میں سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت ہے:

((مَنْ بَدَّلَ دِيْنَهٗ فَاقْتُلُوْهُ)) (صحيح بخاري ، رقم : 6922)

"جو (مسلمان) اپنا دین بدل دے، اسے قتل کر دو۔"

اسی مضمون کی کچھ احادیث بعض جلیل القدر صحابہ کرام: سیدنا ابوبکر صدیق، سیدنا علی، سیدنا ابوموسیٰ الاشعری، سیدنا خالد بن ولید اور سیدنا معاذ بن جبل رضی اللہ عنہم سے بھی مروی ہیں۔

مذکورہ حدیث صحیح بخاری کے علاوہ سنن ابوداؤد، سنن ابی ماجہ اور موطا امام مالکؒ میں بھی موجود ہے۔

2۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی ایک متفق علیہ حدیث ہے کہ:

((عَنْ عَبْدِاللّٰهِ قَالَ:قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : "لَايَحِلُّ دَمُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ يَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، وَاَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَّا بِاِحْدٰى ثَلَاثٍ: اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ ، وَالثَّيِّبُ الزَّانِيْ ، وَالْمُفَارِقُ

لِدِيْنِهِ التَّارِكُ لِلْجَمَاعَةِ)) (صحیح بخاری، رقم : 2878)

''سیدنا عبداللہ (بن مسعود رضی اللہ عنہ) سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کسی مسلمان کا خون بہانا جائز نہیں جو یہ گواہی دیتا ہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یہ کہ میں اللہ کا رسول ہوں، سوائے تین صورتوں کے: ایک یہ کہ اس نے کسی کو قتل کیا ہو، دوسری یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو اور تیسری یہ کہ وہ اپنا دین چھوڑ کر (مسلمانوں کی) جماعت سے الگ ہو جائے۔''

یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم کے علاوہ سنن ابوداؤد، جامع ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، سنن دارمی اور مسند احمد بن حنبل میں بھی موجود ہے اور اسے سیدنا عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے علاوہ سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا اور سیدنا عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے بھی روایت کیا ہے۔ اس حدیث سے بھی مرتد کے لیے قتل کی سزا ثابت ہوتی ہے۔

3۔ سنن ابی داؤد کی حدیث ہے کہ:

((عَنْ أَبِي أُمَامَةَ بْنِ سَهْلٍ قَالَ كُنَّا مَعَ عُثْمَانَ وَهُوَ مَحْصُورٌ فِي الدَّارِ وَكَانَ فِي الدَّارِ مَدْخَلٌ مَنْ دَخَلَهُ سَمِعَ كَلَامَ مَنْ عَلَى الْبَلَاطِ . فَدَخَلَهُ عُثْمَانُ فَخَرَجَ إِلَيْنَا وَهُوَ مُتَغَيِّرٌ لَوْنُهُ فَقَالَ إِنَّهُمْ لَيَتَوَاعَدُوْنَنِيْ بِالْقَتْلِ آنِفًا . قَالَ قُلْنَا يَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ يَا أَمِيرَ الْمُؤْمِنِينَ . قَالَ وَلِمَ يَقْتُلُونَنِي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ لَا يَحِلُّ دَمُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِإِحْدَى ثَلَاثٍ: كُفْرٌ بَعْدَ إِسْلَامٍ أَوْ زِنًا بَعْدَ إِحْصَانٍ أَوْ قَتْلُ نَفْسٍ بِغَيْرِ نَفْسٍ . فَوَاللّٰهِ مَا زَنَيْتُ فِيْ جَاهِلِيَّةٍ وَلَا فِيْ إِسْلَامٍ قَطُّ وَلَا أَحْبَبْتُ أَنَّ لِيْ بِدِيْنِيْ بَدَلًا مُنْذُ هَدَانِيَ اللّٰهُ وَلَا قَتَلْتُ نَفْسًا فَبِمَ يَقْتُلُوْنَنِيْ)) (ابی داؤد، رقم : 4502)

''سیّدنا ابوامامہ بن سہل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں اور دوسرے لوگ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے، جب وہ اپنے گھر میں محصور تھے۔ اس گھر کا ایک راستہ تھا، جس کے اندر کھڑا آدمی گھر کی بالکونی پر کھڑے لوگوں کی بات آسانی سے سن سکتا تھا۔ سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ وہاں تشریف لائے، ان کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔ وہ باہر نکلے اور فرمایا: ابھی یہ لوگ مجھے قتل کر دینے کی دھمکی دے رہے تھے۔ ہم نے عرض کیا: اے امیر المؤمنین! ان کے مقابلے میں اللہ آپ کے لیے کافی ہے۔ پھر فرمایا: یہ لوگ مجھے کیوں قتل کر دینا چاہتے ہیں؟ جب کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ کسی مسلمان کا خون حلال نہیں، سوائے اس کے کہ تین صورتوں میں سے کوئی ایک صورت ہو۔ وہ اسلام لانے کے بعد کفر اختیار کرے۔ (مرتد ہو جائے) یا شادی کے بعد زنا کرے، یا کسی کو ناحق قتل کر دے۔ اللہ کی قسم! میں نہ تو جاہلیت میں زنا کا مرتکب ہوا اور نہ اسلام لانے کے بعد۔ دوسرے یہ کہ میں نے اپنا دین بدلنا کبھی پسند نہیں کیا جب سے اللہ نے مجھے ہدایت عطا فرمائی ہے۔ تیسرے یہ کہ میں نے کسی کو ناحق قتل بھی نہیں کیا۔ پھر یہ لوگ کس بنا پر

مجھے قتل کرنا چاہتے ہیں؟"

مذکورہ بالا صحیح احادیث سے یہ امر بالکل واضح ہوجاتا ہے کہ اسلام میں مرتد شخص واجب القتل ہوتا ہے۔ چنانچہ انہی احادیث صحیحہ کی بنا پر تمام فقہائے اسلام کا اس پر اجماع ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے۔

کتبِ احادیث (جن میں صحیح بخاری بھی شامل ہے) اور معتبر کتبِ تاریخ سے ثابت ہے کہ چاروں خلفائے راشدین نے اپنے اپنے دورِ خلافت میں مرتدین کو ہمیشہ قتل کی سزا دی۔ طوالت کے اندیشے سے ہم یہاں ان واقعات کی تفصیل نہیں دے رہے۔

اسی طرح خلفائے بنواُمیہ اور خلفائے بنوعباس نے بھی مرتد پر سزائے قتل نافذ کی۔

اجماعِ امت:

ائمہ مجتہدین کا بھی اس پر اتفاق ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے اور اس پر اجماعِ اُمت ہے کہ اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہی ہے۔ اس سلسلے میں درج ذیل حوالے ملاحظہ ہوں:

1۔ ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے فقہی مسائل پر مبنی کتاب " **الفقه على المذاهب الأربعة** " (از عبدالرحمٰن جزیری) میں ہے کہ:

((واتفق الأئمة الأربعة عليهم رحمة الله تعالىٰ على أن من ثبت ارتداده عن الإسلام ــ والعياذ بالله ــ وجب قتله ، وأهدر دمه .))

(الفقه على المذاهب الاربعه ، جلد 5، صفحه 423)

"ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کا اس پر اتفاق ہے کہ جو شخص اسلام سے پھر جائے ...... اللہ بچائے ...... اُس کا قتل واجب ہے اور اُس کا خون بہانا جائز ہے۔"

2۔ اسلامی فقہ کے اجماعی مسائل پر مشتمل انسائیکلو پیڈیا 'موسوعۃ الاجماع' میں ہے کہ مرتد کا خون بہانا جائز ہے:

((اتفقوا على أن من كان رجلا مسلمًا حرًّا ...... ثم ارتد إلى دين كفر ...... أنه حل دمه .)) (موسوعة الاجماع جلد اوّل، ص 436)

"اس پر تمام فقہائے اسلام کا اتفاق ہے کہ آزاد مسلمان مرد مرتد ہوجائے تو اس کا خون بہانا جائز ہے۔"

3۔ اسلامی فقہ کی مشہور کتاب **الفقه الاسلامى و أدلته** میں ڈاکٹر وہبہ زحیلی بھی **أحكام المرتد** کے تحت مرتد کی سزا قتل ہونے پر اجماعِ اُمت نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

((اتفق العلماء على وجوب قتل المرتد لقوله ﷺ: " من بدّل دينه فاقتلوه ." وقوله عليه السلام:" لا يحل دم امرئ مسلم إلا بإحدىٰ ثلاث: الثيب الزاني، والنفس بالنفس ، والتارك لدينه المفارق للجماعة . " وأجمع أهل العلم على وجوب قتل

المرتد.)) (الفقه الاسلامی و ادلته، جلد 6، صفحه 186)

''علما کا اس پر اتفاق ہے کہ مرتد کا قتل واجب ہے کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جو مسلمان اپنا دین بدل لے، اسے قتل کردو۔ نیز آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ کسی مسلمان شخص کا خون حلال اور مباح نہیں ہوتا مگر تین صورتوں میں: ایک یہ کہ وہ شادی شدہ زانی ہو، دوسرے یہ کہ وہ کسی جان کا قاتل ہو اور تیسرے یہ کہ وہ دین کو چھوڑ دے، یعنی مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہوجائے اور اہل علم کا اس پر اجماع ہے کہ مرتد واجب القتل ہے۔''

مذکورہ بالا شرعی دلائل کی تفصیل سے یہ بات پوری طرح واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے اور اس پر اجماعِ اُمت ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ کی رائے:

مرتد کو سزائے موت دین کے سلسلے میں نہیں دی جاتی بلکہ اسے ایک سیاسی غداری کی سزا دی جاتی ہے۔ دنیا کی کوئی حکومت غداری کرنے والے کو معاف نہیں کرتی۔ اسلام میں چونکہ سیاست اور دین میں کوئی دوئی نہیں۔ اس لیے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ محض دین سے انحراف کی سزا ہے۔ ہم کسی کو اسلام میں داخل ہونے اور اسلامی امت کا رکن بننے کے لیے جبر نہیں کرتے لیکن جب وہ مسلمان ہونے کے بعد اس اجتماعی نظام سے بغاوت کرتا ہے تو اس کو دنیا کے عام سیاسی قواعد اور سیاسی ضرورتوں کے تحت غداری کی سزا دی جاتی ہے۔ (ڈاکٹر محمد حمید اللہ رحمہ اللہ ''خطبات بہاولپور'' ص 333)

مرتد کے لیے سزائے قتل کے عقلی دلائل:

اب تک ہم نے ایسے شرعی دلائل پیش کردیے ہیں جن سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ اسلامی شریعت میں مرتد کی سزا قتل ہے اور اس کی بنیاد احادیث صحیحہ، تعاملِ صحابہؓ اور اجماعِ اُمت پر ہے۔ ان شرعی دلائل کو جان لینے کے بعد ایک صاحبِ ایمان کا دل تو مطمئن ہوجاتا ہے کہ اسلام میں ارتداد کی یہی سزا ہے۔ مگر کیا کیجیے، آج کل بہت سے اہل ایمان کے دلوں کو کسی شرعی حکم کے بارے میں محض شرعی دلائل سے اطمینان حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ اس کے علاوہ عقلی دلائل بھی چاہتے ہیں تاکہ اُنھیں شرحِ صدر حاصل ہو۔ اس لیے ہم ذیل میں مرتد کی سزائے قتل کے بارے میں چند عقلی دلائل بھی پیش کرتے ہیں:

1۔ سب سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ اسلام دوسرے مذاہب کی طرح کا کوئی ایسا مذہب نہیں ہے جو انسانی زندگی کا محض ایک جزو یا ضمیمہ بن کر رہے اور جو ہر شخص کا ایک ذاتی اور نجی معاملہ (Private Matter) ہو۔ وہ کوئی لباس بھی نہیں جسے کوئی شخص آج پسند کرکے پہنے اور کل اُسے ناپسند کرکے اپنے جسم سے اُتار پھینکے۔ وہ دراصل ایک دین اور ایک نظامِ زندگی ہے۔ ایک مکمل ضابطہ حیات (Code of Life) ہے۔ وہ انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر محیط ایک منظم معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ عبادت، معاشرت، معیشت،

سیاست اور اخلاق، غرض انسانی زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے، وہ ایک ایسی منظم و منضبط ریاست (Disciplined State) کی تشکیل کا خواہاں ہے جس کا ہر شہری اس کے جملہ احکام وقوانین کی پابندی کرے اور ان کی خلاف ورزی سے باز رہے۔

اب اگر اسلامی ریاست کا کوئی شہری اس کے کسی قانون کو توڑتا ہے تو وہ اپنے شہری کو اپنے قانون کے مطابق سزا دینے میں حق بجانب ہے۔ جب کوئی مسلمان شہری مرتد ہوجائے گا تو اسلامی ریاست ایسے شخص کو ارتداد (Apostasy) کے جرم کا ارتکاب کرنے پر موت کی سزا دے گی۔ یہ اسلامی ریاست کا قانون ہے اور دنیا کی دوسری ریاستوں کی طرح وہ بھی اپنے قانون کے نفاذ کا اختیار رکھتی ہے۔

2۔ اسلام نے اپنے دائرے میں داخل نہ ہونے والوں اور اس میں داخل ہوکر نکل جانے والوں میں فرق کیا ہے۔ وہ پہلے گروہ کو ''کفار'' اور دوسرے کو ''مرتدین'' کہتا ہے۔ وہ پہلے گروہ کو برداشت کرتا اور کچھ حقوق بھی دیتا ہے، مگر دوسرے گروہ کو برداشت نہیں کرتا اور اُسے ہر حق سے محروم رکھتا ہے۔ پہلا گروہ بیگانوں کا ہے اور دوسرا بے وفا یگانوں کا۔ اُسے بیگانوں کی بے مروّتی پر کوئی شکوہ نہیں، مگر اپنوں کی بے وفائی اُسے گوارا نہیں۔ وہ بیگانوں سے محتاط رہتا ہے اور اُن کو اپنا رازدان نہیں بناتا۔ اس لیے بیگانے اُسے زیادہ نقصان بھی نہیں پہنچاسکتے۔ مگر اپنوں سے اُس کی رازداری ہے۔ جن کے چھوڑ جانے سے اُس کا دل کڑھتا ہے اور اُن کی طرف سے اُسے بہت زیادہ نقصان پہنچنے کا اندیشہ لاحق ہوجاتا ہے کہ کہیں وہ سازش کرکے اُسے کسی بڑے خطرے سے دوچار نہ کردیں، کیوں کہ ''گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے'' ہے۔

مرتد کا معاملہ اسی دوسری قسم سے متعلق ہے، وہ اسلام کا رازداں ہوتا ہے۔ جب وہ ارتداد کا مرتکب ہوکر دین اسلام سے الگ ہوتا ہے تو اپنے ساتھ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نفرت اور دشمنی کے جذبات لیے ہوئے اہل کفر کی صف میں شامل ہوجاتا ہے۔ اُس کے یہ منفی جذبات کفار کی طرف سے اسلام اور اسلامی ریاست کے خلاف کسی بڑے خطرے اور سازش کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں، جس کے انسداد کے لیے اسلام نے مرتد کو موت کی سزا سنائی ہے۔

3۔ اسلام نے دنیا کے سامنے سوا چودہ سو برس پیشتر سے یہ اعلان کر رکھا ہے کہ اس کے دائرے میں داخل ہونے یا نہ ہونے کی ہر شخص کو کھلی آزادی حاصل ہے۔ اس کے لیے کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ﴾ (البقرہ 256:2)

''دین (اسلام قبول کرنے) میں کوئی زبردستی نہیں۔''

لیکن اس دائرے میں داخل ہونے کے بعد اس سے باہر نکلنے پر پابندی عائد ہے اور جو کوئی اس پابندی کو توڑے گا اُسے موت کے گھاٹ اُتارا جائے گا۔

اب اگر کوئی شخص اسلام کا یہ اعلان سن لینے کے بعد اپنی آزاد مرضی سے اس کے دائرے میں داخل ہوتا ہے۔ پھر اپنی آزاد مرضی کے ساتھ اس سے باہر نکلنے پر عائد پابندی کو توڑتا ہے اور پھر اپنی اس حرکت پر اپنے کیے کی سزا پاتا ہے تو بتایئے اس میں اسلام کا کیا قصور ہے؟

4۔ ارتداد کو اسلام کے خلاف سازش کا ذریعہ بھی بنایا جاسکتا ہے اور مدینے کے یہودیوں نے مسلمانوں کے خلاف یہ ہتھیار فی الواقع استعمال بھی کیا تھا، جیسا کہ قرآنِ مجید میں ہے کہ:

﴿وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝﴾ (آل عمران: 72)

''اہل کتاب کا ایک گروہ (اپنے لوگوں سے) کہتا ہے: تم جا کر صبح کو اس (دین) پر ایمان لے آؤ جو مسلمانوں پر اُترا ہے اور پھر شام کو انکار کر دو تاکہ اس طرح اور (مسلمان) بھی (اپنے دین سے) پھر جائیں۔''

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہودیوں نے یہ سازش کی تھی کہ اپنے ہاں کے کچھ پڑھے لکھے معتبر لوگوں کو مسلمانوں کی جماعت میں شامل کیا جائے، وہ بظاہر دائرۂ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ پھر جلد ہی اسلام کو چھوڑ کر اس سے بیزاری کا اظہار کریں۔ اس کی ''خرابیاں'' دوسرے لوگوں تک پہنچائیں، اس طرح مسلمانوں بالخصوص نومسلموں کا ایمان کمزور اور متزلزل کیا جاسکے اور وہ اسلام سے برگشتہ ہو جائیں کہ جب پڑھے لکھے معقول حضرات بھی اسلام کے قریب جا کر اس سے بدک جاتے ہیں تو ضرور اس دین میں کچھ خرابیاں ہیں۔ اس کے علاوہ اس طریقے سے عام لوگوں میں اسلام اور اہل اسلام کے لیے کوئی کشش اور ترغیب باقی نہ رہے گی۔ اگرچہ یہودیوں کی یہ سازش بوجوہ ناکام رہی، تاہم آج بھی ارتداد کی کسی سازش کے ذریعے کمزور ایمان والے مسلمانوں کے لیے کسی مقام پر بھی کوئی فتنہ کھڑا کیا جاسکتا ہے۔

5۔ آج کی مہذب ریاستوں کے عام قانون کی رُو سے کسی شخص کو فوجی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ مگر جب کوئی شخص اپنی مرضی سے فوجی ملازمت اختیار کر لیتا ہے تو اُسے ایک خاص مدت سے پہلے نوکری چھوڑنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ اگر وہ اپنی مرضی سے وقت سے پہلے نوکری چھوڑ دے تو اسے مجرم قرار دیا جاتا ہے۔ اُس کا کورٹ مارشل کر کے اسے سزا دی جاتی ہے اور اگر وہ مفرور (Deserter) ہو جائے تو اسے سزائے موت کا مستحق بھی قرار دیا جاتا ہے۔

آخر ایسا کیوں ہے اور اس عالمگیر قانون پر اعتراض کیوں نہیں کیا جاتا؟

اس لیے کہ فوج بھیڑوں کا گلہ نہیں ہوتا، وہ ایک منظم ادارہ ہوتا ہے۔ وہ اجتماعی ذمہ داریوں کا ایسا نظام ہے جو نظم و ضبط (Discipline) کی سختی کے بغیر قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ سول (Civil) میں جن کاموں کو بالکل معمولی سمجھ کر ان سے اِعراض کیا جاتا ہے، وہی کام فوج میں جرائم قرار پاتے ہیں۔ وقت پر حجامت نہ بنوانا، اپنے بوٹ پالش نہ

کرنا، اُن کے تسمے نہ باندھنا، وقت پر کھانا نہ کھانا، اپنا بستر درست نہ رکھنا، سول (Civil) میں کوئی جرائم نہیں مگر یہی کام فوج میں جرائم شمار ہوتے ہیں۔

بالکل یہی معاملہ اسلامی ریاست کا ہے، وہ بھی کوئی بکریوں کا ریوڑ نہیں ہوتی کہ جس بکری کا جب جی چاہا ریوڑ سے الگ ہوگئی اور جب چاہا اس میں پھر شامل ہوگئی۔ اسلامی ریاست ایک خدائی فوج (حزب اللہ) ہے۔ جس کے نظم وضبط میں عام فوجی نظم وضبط سے بڑھ کر سختی اور پابندی ہے۔ عام فوج کے لیے چوبیس گھنٹوں میں صرف دو دفعہ حاضری ہے، مگر اسلامی معاشرے کے مردوں کو پانچ وقت مسجد میں حاضری دینی پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اسلامی ریاست ارتداد کو جرم قرار دیتی اور مرتد کو سخت ترین سزا دیتی ہے تاکہ اس کا اندرونی نظم وضبط قائم رہے۔ وہ ایک مرتد کو سزا دے کر اسی طرح اپنے لاکھوں کروڑوں مسلمانوں کے ایمان کا تحفظ کرتی ہے جس طرح کسی قاتل کو سزا دے کر پورے معاشرے کی زندگی کو تحفظ دیا جاتا ہے۔ لہٰذا اسلامی ریاست کے اس نظم وضبط کی سختی پر اعتراض کرنے والوں کو پہلے اپنے ہاں کے فوجی نظم وضبط کی سختی پر غور کر لینا چاہیے اور اپنے گریبان میں بھی جھانک لینا چاہیے۔

⊙ اس مقام پر بعض لوگ یہ اعتراض بھی کرتے ہیں کہ جب کوئی مرتد مسلح ہو کر بغاوت کرے تو صرف اسی صورت میں وہ واجب القتل ہوسکتا ہے اور اگر وہ اسلامی ریاست کے خلاف مسلح جدوجہد اور بغاوت نہ کرے تو اُسے قتل کی سزا نہیں دی جاسکتی۔

اس اعتراض کا شرعی جواب تو یہ ہے کہ جن احادیث صحیحہ کی بنیاد پر مرتد کے واجب القتل ہونے پر اجماع ہے، اُن احادیث میں یہ بات مذکور نہیں ہے کہ مرتد جب تک مسلح بغاوت نہ کرے، اُسے قتل نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ ان احادیث میں مرتد کے محض مرتد ہونے پر اس کے لیے قتل کی سزا کا ذکر آیا ہے۔

اور اس اعتراض کا عقلی جواب یہ ہے کہ جس طرح دنیا بھر میں کسی مفرور فوجی کو محض مفرور ہو جانے پر فوجی قانون کی رُو سے موت کی سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے اور اسے یہ سزا دینے کے لیے اُس کی طرف سے مسلح بغاوت ہونا کوئی شرط نہیں، بالکل اسی طرح ایک اسلامی ریاست بھی اپنے شرعی قانون کے مطابق مرتد کو، اُس کی طرف سے مسلح بغاوت کیے بغیر بھی موت کی سزا دے سکتی ہے۔

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۱۸ ﴾ (218)

کفار ومشرکین اور مرتدین کے بعد اب اللہ سبحانہٗ کے نیک بندوں کا ذکر ہے جو ایمان لائے، انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ ایسے لوگ ہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اس کے فضل وکرم کی توقع رکھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ بھی ان لوگوں کو دنیا اور آخرت کی بھلائی اور فلاح سے نوازے گا۔

آخر میں فرمایا کہ جو بندہ اپنے گناہوں سے توبہ کرلے اور اللہ تعالیٰ سے بخشش اور مغفرت کی دعا مانگے تو اللہ تعالیٰ

اسے بخش دیتا ہے کیونکہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ؗ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۙ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

”(اے نبی ﷺ!) لوگ آپ ﷺ سے شراب اور جوئے کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ ﷺ کہہ دیں: ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے۔ ابھی بعض لوگوں کا مفاد ان سے وابستہ ہے، مگر ان دونوں کا گناہ ان کے ساتھ وابستہ مفاد سے بڑھ کر ہے۔

(اے نبی ﷺ) لوگ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں اللہ کی راہ میں کیا خرچ کریں؟ آپ ﷺ کہہ دیں: جو ضرورت سے زائد ہو۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ تم غور وفکر کرو، دنیا اور آخرت کے معاملات میں۔

(اے نبی ﷺ) لوگ آپ ﷺ سے یتیموں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیں جس میں ان کا بھلا ہو، وہ کرنا بہتر ہے۔ اگر تم ان کو اپنے ساتھ شامل کرلو، تو وہ تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کون ان کا خیر خواہ ہے اور کون بدخواہ۔ اللہ چاہتا تو اس بارے میں تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔ بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔“ (219-220)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اَلْخَمْرِ:...... اس کے معنی شراب کے ہیں۔ خَمَرَ الشَّیْءَ کے معنی ہیں کسی چیز کو ڈھانپ دینا، یا اس پر پردہ ڈال دینا۔ اسی سے خِمَارٌ ہے جس کے معنی اوڑھنی یا دوپٹے کے ہیں جس سے جسم کو ڈھانپا جاتا ہے۔ شراب کو خمر اس لیے کہتے ہیں کہ یہ عقل کو ڈھانپ لیتی ہے اور اس پر پردہ ڈال دیتی ہے۔

اَلْمَیْسِرُ :......اس کے معنی جوئے کے ہیں۔ یہ یُسْرٌ سے بنا ہے جس کے معنی آسانی کے ہیں۔ جوئے کو اس لیے مَیْسِرٌ کیا جاتا ہے کہ اس میں بغیر محنت ومشقت کے آسانی سے مال حاصل ہو جاتا ہے۔

لَاَعْنَتَکُمْ :......(وہ ضرور تمہیں مشقت میں ڈالتا) یہ اَلْعَنْتُ سے بنا ہے جس کے معنی زحمت، مشقت اور بھاری کام کے ہیں۔ اسی سے باب افعال اَعْنَتَ یُعْنِتُ اِعْنَاتًا ہے جس کے معنی کسی کو زحمت دینے، اسے مشقت میں ڈالنے اور اس سے بھاری کام لینے کے ہیں۔

﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ قُلْ فِیْهِمَآ اِثْمٌ کَبِیْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَکْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا﴾ (219)

فرمایا گیا جو لوگ شراب اور جوئے کے بارے میں شرعی حکم پوچھتے ہیں ان کو جواب دیا جائے کہ یہ دونوں کام کبیرہ گناہ ہیں۔ البتہ ابھی کچھ لوگوں کا تجارتی مفاد یا وقتی مفاد ان سے وابستہ ہے۔ مگر ان دونوں کا گناہ ان کے وقتی فائدے سے بڑھ کر ہے۔

شراب اور جوئے کے بارے میں یہ ابتدائی حکم ہے۔ اس کے بعد سورۃ النساء میں یہ حکم آیا کہ:

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُکٰرٰی﴾ (النساء 4 : 43)

''اے ایمان والو! نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔''

اور آخر میں سورۃ المائدہ میں ان کو ممنوع اور حرام قرار دیا گیا۔

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَ الْمَیْسِرُ وَ الْاَنْصَابُ وَ الْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ○اِنَّمَا یُرِیْدُ الشَّیْطٰنُ اَنْ یُّوْقِعَ بَیْنَکُمُ الْعَدَاوَةَ وَ الْبَغْضَآءَ فِی الْخَمْرِ وَ الْمَیْسِرِ وَ یَصُدَّکُمْ عَنْ ذِکْرِ اللّٰهِ وَ عَنِ الصَّلٰوةِ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ﴾ (المائدہ 5 : 90، 91)

''اے ایمان والو! شراب، جوا، بتوں کے آستانے اور تیروں سے فال لینا، سب گندے کام ہیں شیطان کے، ان سے بچو تا کہ تم فلاح پاؤ۔ شیطان تو چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بغض ڈال دے اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ تو کیا تم ان برے کاموں سے باز نہیں آؤ گے۔''

اس مقام پر بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ قرآن نے شراب اور جوئے کے نقصانات کے ساتھ ان کے بعض فوائد کو بھی تسلیم کیا ہے۔ مگر یہ شبہ کئی لحاظ سے غلط ہے۔

1۔ اس جگہ نفع کے مقابلے میں ضرر (نقصان) کا ذکر نہیں آیا بلکہ اِثْمٌ یعنی گناہ کا لفظ آیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ قرآن کا مقصد ان کے فائدے اور نقصان کا موازنہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ حقیقت بتانا ہے کہ ان کا وقتی فائدہ اپنی جگہ مگر ان

میں گناہ بہت زیادہ ہے۔

2۔ اس مقام پر مَنَافِعُ لِلنَّاسِ (لوگوں کے لیے فائدے) کے الفاظ سے ان وقتی اور عارضی فائدوں کی طرف اشارہ ہے جو شراب نوشی اور جوئے بازی سے وابستہ ہو گئے تھے۔

عربوں میں دستور تھا شرابی شراب پینے کے بعد اور جواری جوا جیتنے کے بعد اپنے مال میں سے بہت سخاوت کرتے تھے جس سے غریبوں کو فائدہ پہنچتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے ان فوائد کے مقابل میں جو ان دونوں کے ذریعے سے اخلاقی خرابیاں معاشرے میں پھیلتی ہیں ان کا گناہ کہیں بڑھ کر ہے۔

3۔ قرآنی احکام میں جو تدریجی اصول ہے، اس آیت کا حکم اس کی ایک مثال ہے جس سے معاشرے کی اصلاح و ترتیب مرحلہ وار کی جاتی ہے۔ ورنہ فوری طور پر معاشرے میں تبدیلی نہیں لائی جا سکتی اور لوگوں کی عادتوں کو یک دم بدلا نہیں جا سکتا۔ اس لیے پہلے شراب کو گناہ قرار دے کر اس سے نفرت دلائی گئی۔ پھر نمازوں کے اوقات میں اس سے روکا گیا اور آخر میں اسے ممنوع اور حرام ٹھہرایا گیا۔ اس تدریج کے نتیجے میں عرب معاشرے سے یہ برائی ختم ہو گئی۔

زمانہ حال میں بعض مغربی ممالک میں کئی بار قانون کے ذریعے اچانک شراب کو جرم قرار دیا گیا۔ مگر ہر بار ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور لوگوں نے شراب نوشی نہیں چھوڑی جس کے بعد اس قانون ہی کو ختم کرنا پڑا۔ ؏

چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۃ المائدہ آیات 90، 91 کی تفسیر میں آئے گی۔

﴿وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ۬ قُلِ الْعَفْوَ﴾ (219)

مدینے کی اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی معاشرے کی اصلاح کے حوالے سے کئی سوالات پیدا ہوئے تھے۔ عام مسلمانوں کی طرف سے یہ سوال بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی کہ اللہ کی راہ میں کتنا مال خرچ کیا جائے؟

اس سوال کے جواب میں فرمایا کہ جتنا مال تمہاری اور تمہارے اہل و عیال کی ضروریات سے زائد ہو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کر دو۔

جمہور فقہا کے نزدیک یہ حکم صرف نفلی صدقات اور خیرات سے متعلق ہے اور زکوٰۃ کا حکم اس سے بالکل الگ چیز ہے۔

اشتراکی لوگ (Communists) اور بعض منکرین حدیث نے قرآنی الفاظ "قُلِ الْعَفْوَ" کی من مانی تفسیر کی ہے۔ وہ اس کا یہ مطلب لیتے ہیں کہ ہر شہری کی ضروریات سے زائد مال حکومت کا حق ہے جو وہ لوگوں سے زبردستی وصول کرنے کا حق رکھتی ہے۔ مگر یہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ "قُلِ الْعَفْوَ" سے تو الٹا اشتراکیت (Communism) اور سوشلزم (Socialism) کی جڑ کٹ جاتی ہے کیونکہ اس سے شہریوں کو ذاتی ملکیت کا حق ثابت ہوتا ہے جو کہ اشتراکی فلسفے کی رو سے حرام ہے۔ دوسرے اس کے بعد زکوٰۃ کا حکم کالعدم ہو جاتا ہے جو اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ہے۔

﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝٢١٩ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ﴾ (220-219)

فرمایا، اللہ تعالیٰ تمہارے لیے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت دونوں کے حوالے سے غور و فکر کرو کہ قرآن کے تمام احکامات ایسے ہیں جن پر عمل کرنے سے دنیا اور آخرت کی سعادت اور فلاح حاصل ہوسکتی ہے۔ انسانی زندگی انتہا پسندی اور عدم توازن کے بگاڑ سے محفوظ رہتی ہے۔ ان میں وہ اعتدال اور توازن ہے جس میں نہ ترکِ دنیا اور رہبانیت ہے اور نہ خواہشات کی پیروی ہے اور نہ دنیا پرستی۔

﴿ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ؕ﴾ (220)

جو لوگ یتیموں کے بارے میں شرعی حکم پوچھتے ہیں ان کو بتا دیا جائے کہ ان کی اصلاح اور کفالت کرنی چاہیے اور ان کی فلاح و بہبود کا خیال رکھا جائے۔ پھر اگر خیر خواہی کی نیت سے اور سہولت کی خاطر تم ان کا مال اپنے مال میں شامل کرلو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ وہ تمہارے نسبی یا دینی بھائی ہی تو ہیں۔

﴿ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ﴾ (220)

فرمایا، اللہ سبحانہٗ اچھی طرح جانتا ہے کہ یتیموں کا سرپرست اور کفیل شخص کیسا ہے؟ ان کا خیر خواہ ہے یا بدخواہ؟ ان کے مال کی حفاظت کرنے والا ہے یا ان کا مال ہڑپ کرنے اور برباد کرنے والا ہے۔ پھر وہ ہر ایک کے رویے اور طرزِ عمل کے مطابق اسے جزا و سزا دے گا۔

﴿ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ﴾ (220)

پھر فرمایا، اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی آسانی اور سہولت کے لحاظ سے آسان احکام دیے ہیں اور اپنے بندوں کو تنگی اور مشقت سے بچایا ہے۔ اگر وہ چاہتا تو تم لوگوں کو سخت احکام دے کر تمہیں مشقت میں ڈال دیتا۔ مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ دین کے معاملے میں اس نے کوئی تنگی نہیں رکھی۔

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (الحج 22: 78)

”اور اس (اللہ) نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔“

﴿ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝٢٢٠﴾ (220)

آخر میں فرمایا اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اس لیے یتیموں کے بدخواہ سرپرستوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ اس کے ساتھ وہ حکمت والا بھی ہے کہ اس کے ہر حکم میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور حکمت ہوتی ہے جس میں بندوں کے لیے بھلائی، سعادت اور فلاح ہے۔ یتیموں کے بارے میں مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۃ النساء 4 کی آیات 2، 3، 10 کی تفسیر میں آئے گی۔

وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ
وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ
خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَ اللّٰهُ
يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ
ع ٢٧ ١٥ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۲۱﴾

''(اے مسلمانو!) مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ کیونکہ مشرک عورت خواہ تمہیں کتنی پسند ہو اس سے مسلمان لونڈی بہتر ہے۔ اسی طرح مسلمان عورتوں کو مشرک مردوں کے نکاح میں نہ دو جب تک وہ ایمان نہ لائیں۔ کیونکہ آزاد مشرک مرد خواہ کتنا پسند ہو اس سے مسلمان غلام بہتر ہے۔ مشرک لوگ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔ مگر اللہ اپنے فضل و کرم سے جنت اور بخشش کی طرف بلاتا ہے۔ اللہ اپنے احکام لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتا ہے تا کہ وہ سمجھیں۔'' (221)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿وَ لَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَ لَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَ لَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَ لَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّ لَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ﴾ (221)

فرمایا مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ یہ جائز نہیں ہے بلکہ حرام ہے۔ کوئی مشرک عورت خواہ تمہیں کتنی ہی اچھی لگے اس سے مسلمان لونڈی بہتر ہے۔ اسی طرح کسی مشرک مرد سے اپنی لڑکی کا نکاح نہ کرو، یہ بھی حرام ہے خواہ وہ مشرک تمہیں کتنا ہی بھلا معلوم ہو، اس سے مسلمان غلام بہتر ہے۔

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ اگر میاں بیوی میں سے کوئی ایک مشرک، کافر یا مرتد ہو جائے تو ان میاں بیوی کا نکاح خود بخود ختم ہو جائے گا۔

﴿اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ۖۚ وَ اللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَ الْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾ (221)

یہ مشرک مردوں اور عورتوں سے نکاح نہ کرنے اور ایسے ہر نکاح کے حرام ہونے کی وجہ اور دلیل بتائی گئی ہے کہ

مشرک لوگ خود بھی دوزخ کا ایندھن بنیں گے اور اپنے جیون ساتھیوں کو بھی وہاں لے جانے کا سبب بنیں گے۔ گویا ؎

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

والی بات ہوگی۔ جب کہ اللہ تمہیں گناہوں سے بخشش اور جنت کی طرف بلاتا ہے جو صرف اس صورت میں تم کو میسر آسکتی ہے جب تمہارے گھر میں ایمان اور دینداری کا ماحول ہوگا؟ شرک اور کفر کا ماحول نہ ہوگا۔

اس طرح کے نکاح کے بارے میں یہ سوال اس لحاظ سے بہت اہمیت رکھتا تھا کہ نزولِ قرآن کے وقت ایسا بھی ہوتا تھا کہ ایک ہی قبیلے کے مردوں اور عورتوں میں کوئی شخص مشرک اور کافر تھا اور کوئی مسلمان ہو چکا تھا۔

بعض لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی مشرکین (خواہ وہ مرد ہوں یا عورت) کا ذکر آیا ہے اس سے صرف عرب کے اسی زمانے کے مشرکین مراد ہیں۔لیکن یہ تخصیص خود قرآن مجید کے نصوص کے خلاف ہے۔قرآن نے کئی مقامات پر مشرکین عرب کے علاوہ دوسری قوموں کے لیے بھی مشرکین کا لفظ استعمال کیا ہے۔

ایک مقام پر ارشاد ہوا:

﴿قُلْ سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّشْرِكِيْنَ﴾ (الروم 30 :42)

"کہہ دیجیے! تم زمین میں چلو پھرو اور دیکھو ان لوگوں کا کیا انجام ہوا، جو ان سے پہلے ہو گزرے ہیں۔ان میں سے اکثر مشرکین تھے۔"

اس آیت میں صرف عرب کے مشرکین مراد نہیں ہو سکتے بلکہ قرآن نے ساری زمین کے تمام مشرکین مراد لیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عرب مشرکین کے علاوہ بھی دنیا کی بہت سی قومیں مشرکین تھیں۔قرآن نے ایک جگہ اور بھی سارے جہان کے مشرکین کو مشرکین اور کافروں کو کفار قرار دیا ہے۔جس میں عرب کے مشرکین و کفار کی کوئی تخصیص نہیں ہے: فرمایا:

﴿اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ كَانُوْا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَاَشَدَّ قُوَّةً وَّآثَارًا فِي الْاَرْضِ فَمَا اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ○ فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ○ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ ○ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ؕ سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ﴾ (المومن 40: 82تا85)

"کیا یہ لوگ زمین پر چلے پھرے نہیں تاکہ دیکھتے ان لوگوں کا انجام کیا ہوا جو ان سے پہلے گزرے ہیں؟ وہ ان سے قوت میں بھی زیادہ تھے اور اُن آثار میں بھی جو وہ زمین پر چھوڑ گئے، اِن سے بڑھ کر تھے۔ پھر ان

کی کمائی ان کے کام نہ آئی۔ جب اُن کے پاس ہمارے پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ لوگ اپنے علم و ہنر پر مغرور رہے جو ان کے پاس تھا، اور پھر ان پر وہ عذاب آپڑا جس کا وہ مذاق اڑاتے تھے۔ جب انھوں نے ہمارا عذاب آتا دیکھا تو کہنے لگے اب ہم اللہ واحد پر ایمان لائے۔ ہم ان معبودوں کو نہیں مانتے جن کو مان کر ہم پہلے مشرکین بنے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت ان کا ایمان لانا ان کے کام نہ آیا کیونکہ وہ ہمارا عذاب دیکھ چکے تھے۔ اس بارے میں اللہ کی یہی سنت ہے جو اس کے بندوں میں جاری ہے کہ عذاب آنے پر کافروں کو برباد ہونا ہوتا ہے۔"

معلوم ہوا عربوں سے پہلے بھی مشرکین اور کفار ہوتے تھے اور آج بھی دنیا میں موجود ہیں۔

پھر اس غلط بنیاد پر یہ لوگ موجودہ دور کے تمام مشرکوں اور کفار مثلاً ہندوؤں اور سکھوں سے مسلمان مردوں اور عورتوں کا نکاح جائز قرار دیتے ہیں جو کہ قرآن، سنت اور اجماعِ اُمت تینوں کے خلاف ہے۔

﴿وَ يُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٢١﴾﴾ (221)

"آخر میں فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ لوگوں کے لیے اپنی آیتیں کھول کر بیان کرتا ہے اور واضح احکام دیتا ہے تاکہ لوگ ان کو سمجھیں، ان کے بارے میں غور وفکر کریں، اور ان کے مطابق عمل کر کے دنیا اور آخرت کی کامیابی حاصل کریں۔"

وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ
وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ
اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَآؤُكُمْ
حَرْثٌ لَّكُمْ ۪ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَ قَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ
وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٢٣﴾ وَ لَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً
لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَ تَتَّقُوْا وَ تُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٢٤﴾
لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَ لٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ
قُلُوْبُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٢٥﴾ لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآئِهِمْ تَرَبُّصُ

اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٢٢٦﴾ وَ اِنْ عَزَمُوا
الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٢٧﴾ وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ
ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ
اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ
ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا ؕ وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪
وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٢٨﴾

”(اے نبی ﷺ!) لوگ آپ ﷺ سے حیض کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ ﷺ کہہ دیں: وہ ناپاکی ہے لہٰذا اس میں بیویوں سے الگ رہو۔ جب تک وہ پاک نہ ہو جائیں ان کے قریب نہ جاؤ۔ پھر جب وہ پاک صاف ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ جیسے اللہ نے سکھایا ہے۔ بے شک اللہ توبہ کرنے والوں کو اور پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

تمہاری بیویاں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ اپنی کھیتی میں جس طرح چاہو جاؤ۔ اور اپنی آخرت کے لیے بھی کچھ آگے بھیجو۔ ہر حال میں اللہ سے ڈرو اور یقین رکھو کہ تمہیں ایک نہ ایک دن اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے۔ اور اے نبی ﷺ! آپ ایمان والوں کو خوشخبری دیں۔

(مسلمانو) اللہ کی ذات کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ کہ قسم کھالی ہے اس لیے کوئی نیکی اور پرہیز گاری کا کام نہیں کر سکتے اور نہ لوگوں میں صلح صفائی کرا سکتے ہیں بے شک اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ اللہ تمہاری بے ارادہ قسموں پر نہیں پکڑے گا، لیکن جن قسموں میں تمہارا دلی ارادہ شامل ہو گا (اور وہ جھوٹی ہوں گی) تو ان پر ضرور پکڑے گا۔ اللہ بخشنے والا تحمل والا ہے۔

جو لوگ اپنی بیویوں کے قریب نہ جانے کی قسم کھا لیں، ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اگر اس عرصے میں رجوع کر لیں تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے اور اگر طلاق کا پکا ارادہ کر لیں تو یاد رکھیں اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔

جن عورتوں کو طلاق دی گئی ہو، وہ تین حیض تک انتظار کریں اور اگر وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں کہ اس چیز کو چھپائیں جو اللہ نے ان کے پیٹ میں پیدا کی ہے۔ اور اس دوران میں اگر ان کے شوہر صلح کرنا چاہیں وہ زیادہ حق رکھتے ہیں کہ وہ اپنی عورتوں کو واپس لے آئیں اور یاد رکھو ان عورتوں کے لیے

دستور کے مطابق اسی طرح حقوق ہیں جس طرح دستور کے مطابق ان پر ذمہ داریاں ہیں۔ البتہ مردوں کو ان پر ایک درجہ برتری حاصل ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔'' (222-228)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اَذًی :...... اس کے معنی ''تکلیف'' اور ''ناپاکی'' کے ہیں۔

عُرْضَةً :...... اس کے معنی نشانے اور ہدف (TARGET) کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو قسموں کا نشانہ اور ہدف بنانے سے مراد یہ ہے کہ اس کے پاک نام کو اپنی فضول، بے مقصد اور بلاضرورت قسموں کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

اَنْ تَبَرُّوْا :...... یہ اصل میں جیسا کہ تفسیر طبری میں ہے، اَنْ تَبَرُّوْا تھا۔ عربی زبان میں اَنْ کے بعد کا لَا کبھی حذف بھی ہو جاتا ہے اور سیاق کلام (CONTEXT) اور قرینے سے اس محذوف (ABBREVIATION) کا پتہ چل جاتا ہے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:

﴿يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ط وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ﴾ (النساء 4 : 176)

''اللہ تمہارے لیے (اپنے احکام) وضاحت سے بیان کرتا ہے تاکہ تم گمراہی میں نہ پڑ جاؤ اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔''

اس جگہ اَنْ کے بعد لَا محذوف ہے جسے ترجمے میں کھول دیا گیا ہے۔

يُؤْلُوْنَ:...... یہ ایلاء سے ہے جس کے اصل معنی قسم کھانے کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص اس بات کی قسم کھالے کہ وہ اتنی مدت تک یا غیر معینہ مدت تک اپنی بیوی کے قریب نہیں جائے گا۔

قُرُوْءٍ :...... یہ قُرْءٌ یا قَرْءٌ کی جمع ہے جس کے اصل معنی ''وقت'' کے ہیں۔ لیکن اس سے حیض یا طہر مراد ہوتا ہے کیونکہ دونوں کا تعلق وقت ہی سے ہے۔ لیکن یہ لفظ اپنے دو مختلف معنی رکھنے کی وجہ سے مشترک (COMMON) کہلاتا ہے۔

بُعُوْلَتُهُنَّ :...... بُعُوْلَة جمع ہے بَعْلٌ کی۔ اس کی ۃ (تائے تانیث) جمع کو ظاہر کرتی ہے۔ بَعْلٌ کے معنی زَوْجٌ (SPOUSE) کے ہیں۔ پھر جس طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے زوج ہوتے ہیں، اسی طرح میاں بیوی ایک دوسرے کے بعل ہیں۔

دَرَجَةٌ:...... اس سے ایک درجے (GRADE) کی برتری مراد ہے جس کو سورۃ النساء میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ وَّ بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ﴾ (النساء 4 : 34)

''مرد بیویوں کے سربراہ ہیں، کیونکہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر برتری دی اور اس وجہ سے کہ مرد

بیویوں پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔''

﴿ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِي الْمَحِيْضِ ۙ وَ لَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ﴾ (222)

عورتوں کے حیض سے متعلق سوال کیا گیا کہ اس بارے میں شرعی حکم کیا ہے؟ اس پر فرمایا گیا کہ وہ ایک ناپاکی ہے اور جب تک بیوی اس سے پاک نہ ہو جائے اس کے قریب نہیں جانا چاہیے۔ پھر ''اس قریب جانے'' کی تشریح ایک صحیح حدیث میں اس طرح فرمائی گئی:

((اِصْنَعُوْا كُلَّ شَيْءٍ اِلَّا النِّكَاحَ))

(صحیح مسلم، رقم: 694،ابو داؤد،رقم: 258 ، ترمذی،رقم: 2977،نسائی ، رقم: 288)

''جماع کے سوا سب کچھ کر سکتے ہو۔''

گویا بوس و کنار جائز ہے مگر صحبت جائز نہیں۔

یہودیوں اور بعض دوسری قوموں کے ہاں اس بارے میں بڑی افراط و تفریط پائی جاتی تھی۔ اکثر اِن دنوں میں عورتوں کو اچھوت بنا کر رکھ دیتے تھے۔ اُن کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا نہ کھاتے تھے اور ان کو الگ مکان میں رکھتے تھے۔

لیکن اسلام میں ان خاص دنوں میں بیوی سے جماع کے سوا کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی گئی۔ البتہ ان ایام میں عورت نہ نماز پڑھے گی، نہ روزہ رکھے گی، نہ کسی مسجد میں ٹھہرے گی اور نہ قرآن پاک کی تلاوت کرے گی۔

يَطْهُرْنَ :...... (وہ پاک ہو جائیں) سے مراد وہ حالت ہے جب حیض کا خون آنا بند ہو جائے۔ اس کے بعد صحبت جائز تو ہو جاتی ہے مگر شریعت میں یہ ناپسندیدہ ہے اور پسندیدہ یہ ہے کہ کہ ان کے نہا دھو کر اچھی طرح پاک صاف ہو جانے تک انتظار کیا جائے۔

حیض کی حالت میں جماع سے زوجین کو طبی اور جسمانی نقصانات بھی ہوتے ہیں۔

حیض سے متعلق تفصیلی احکام فقہ کی کتابوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

﴿ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ﴾ (222)

مراد یہ ہے کہ حیض کا خون بند ہو جانے کے بعد جب وہ نہا دھو کر اچھی طرح پاک صاف ہو جائیں تو پھر ان سے صحبت کی جائے۔ یہی پسندیدہ طریقہ ہے۔

﴿مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ﴾ (جہاں سے اللہ نے تمہیں سکھایا ہے) میں اَمَرَ کے معنی شرعی حکم نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ لفظ کئی معنوں میں آتا ہے۔ اس جگہ اس سے مراد وہ طبعی طریقہ ہے جس سے سب انسان بلکہ جانور بھی فطری طور پر واقف ہوتے ہیں اور جس کی وضاحت اگلی آیت 223 میں لفظ حَرْثٌ (کھیتی) سے ہو گئی ہے۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾﴾ (222)

فرمایا، اللہ سبحانہٗ توبہ کرنے والوں اور پاک صاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے گویا جو لوگ توبہ کے ذریعے اپنے باطن کو ہر قسم کے گناہوں سے پاک کر لیتے ہیں اور اپنے ظاہر کو ہر طرح کی گندگی اور نجاست سے پاک صاف رکھتے ہیں، وہی اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندے ہیں، جن کو وہ اپنے انعامات سے نوازے گا۔

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ جو لوگ گناہوں میں مبتلا رہتے ہیں اور توبہ نہیں کرتے، یا جسمانی طور پر نجاست اور گندگی میں لتھڑے رہتے ہیں وہ اللہ سبحانہٗ کے ہاں ناپسندیدہ ہیں۔

﴿نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ﴾ (223)

ارشاد ہوا کہ تمہاری بیویاں تمہاری کھیتی ہیں جن کے ذریعے تم اولاد کی پیدوار حاصل کرتے ہو، یہ اس سے پہلی آیت کے الفاظ ﴿مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ﴾ (جہاں سے تمہیں اللہ نے سکھایا ہے) کی مزید وضاحت ہوگئی۔ ظاہر ہے اولاد حاصل کرنے کے لیے بیوی کے پاس جانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ اس کے خلاف سارے طریقے غیر فطری اور حرام ہیں جن سے بچنا لازم ہے۔ جیسے حیض کی حالت میں بیوی کے قریب جانا یا اس سے بدفعلی کرنا۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ بیوی سے جماع اس کے مخصوص مقام پر کرو اور اس کے جو انداز اور پوزیشن چاہو وہ اختیار کر سکتے ہو۔ قرآن نے بیوی کو کھیتی قرار دے کر خاندانی منصوبہ بندی یا بہبود آبادی جیسی سکیموں کا غلط اور نا معقول ہونا ثابت کر دیا ہے۔ کیونکہ کھیتی کے بارے میں معقول بات یہی ہے کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اور اچھی پیداوار حاصل کی جائے مگر یہ نہایت نامعقول اور احمقانہ حرکت ہے کہ کھیتی میں بیج تو زیادہ سے زیادہ ڈالے جائیں مگر پیداوار کم سے کم لی جائے۔

مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۃ الانعام (6) آیت (151) کی تفسیر میں آئے گی۔

﴿وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ﴾ (223)

اس سے مراد ہے کہ بیوی سے جماع کا مقصد صرف لذت اور لطف اندوزی نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کا اصل مقصد اولاد کا حصول ہونا چاہیے۔ اولاد کو اگر تم صحیح تعلیم و تربیت سے آراستہ کرو گے تو وہ تمہارے لیے آخرت میں نیکی کا سامان اور صدقہ جاریہ ہے۔ جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت ابوھریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ اِنْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهٗ اِلَّا مِنْ ثَلَاثَةِ اَشْيَاءَ: صَدَقَةٍ جَارِيَةٍ، اَوْ عِلْمٍ يُنْتَفَعُ بِهٖ، اَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُوْ لَهٗ)) (صحیح مسلم، رقم: 4223، ابوداؤد، رقم: 2880)

''جب انسان فوت ہو جاتا ہے تو اس کے اعمال کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے سوائے تین چیزوں کے ایک صدقہ جاریہ، دوسری چیز وہ علم ہے جس سے فائدہ اٹھایا جائے، اور تیسری وہ نیک اولاد ہے جو اس کے حق میں دعا کرتی رہے۔''

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٢٣﴾﴾ (223)

اس مقام پر تقویٰ یعنی اللہ سے ڈرنے کی تاکید اس لیے فرمائی گئی کہ آج دنیا میں ہر شخص کو مہلت ملی ہوئی ہے کہ وہ

چھپ کر یا سب کے سامنے اللہ کی قائم کی ہوئی حدوں کو توڑ سکتا ہے اور فطرت کے قوانین کی خلاف ورزی کر سکتا ہے۔ لیکن وہ یاد رکھے کہ اسے ایک دن اللہ سبحانہٗ کے پاس حاضر ہونا ہے۔ جو ہماری ہر حرکت کو دیکھتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ اس لیے اس کی پکڑ سے بچو۔

البتہ جو ایمان والے ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتے ہیں، وہ آخرت میں نہ صرف سزا سے بچ جائیں گے بلکہ ان کے لیے جنت کی نعمتوں کی خوش خبری ہے۔

﴿وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (224)

فرمایا، اللہ کے نام کو اپنی غلط قسموں کے لیے ڈھال (SHIELD) اور بہانہ نہ بناؤ کہ جس کے بعد کوئی نیکی کا کام نہ کر سکو، جیسے صلہ رحمی ختم کر دو اور رشتہ داروں کے حقوق ادا نہ کرو، یا صدقہ و خیرات کرنے سے ہاتھ روک لو، یا لوگوں کے درمیان صلح صفائی اور مصالحت کرانی چھوڑ دو۔ بلکہ ایسی قسمیں جو تمہیں نیکی کے کاموں سے روکنے والی ہوں ان کا کفارہ ادا کر دو اور نیکی کے کام کرتے رہو، جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث میں ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ کو نبی ﷺ نے قسم کا کفارہ ادا کرنے کا حکم اس طرح دیا تھا:

((اِذَا حَلَفْتَ عَلٰى يَمِيْنٍ ، فَرَءَيْتَ غَيْرَهَا خَيْرًا مِنْهَا فَكَفِّرْ عَنْ يَمِيْنِكَ ، وَائْتِ الَّذِيْ هُوَ خَيْرٌ)) (صحيح بخاري، رقم: 6622)

”جب تو کسی بات کی قسم کھائے، پھر اس کے خلاف کرنا بہتر سمجھے تو اپنی قسم کا کفارہ ادا کر، اور جس کام کو بہتر سمجھے وہی کر۔“

﴿وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (224)

آخر میں فرمایا اللہ تعالیٰ تمہاری ہر بات سنتا اور تمہاری نیت اور ارادے کو جانتا ہے۔ پھر جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ویسا تمہیں بدلہ دے گا۔ تمہارے اچھے اعمال پر ثواب اور برے اعمال پر سزا دے گا۔

﴿لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ﴾ (225)

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری بے مقصد، بے ارادہ اور فضول قسموں پر تمہیں نہیں پکڑے گا جو تم تکیہ کلام کے طور پر کھاتے ہو، مگر تمہاری ان سنجیدہ قسموں پر ضرور پکڑے گا جو تم نے دلی ارادے کے ساتھ اٹھائی ہوں گی۔ پھر یا تو ان کو پورا کرو گے یا پھر ان کا کفارہ ادا کرو گے، ورنہ پکڑ ہوگی۔

﴿وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝﴾ (225)

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا تحمل والا ہے کہ وہ غلط طرح کی سنجیدہ قسم توڑنے پر کفارہ ادا کرنے والوں کو بخشنے والا ہے، اور تمہاری فضول قسموں پر تمہاری گرفت اس لیے نہیں کرتا کیونکہ وہ تحمل والا ہے۔ اس کی مزید تفصیل ان شاء اللہ

سورۃ المائدہ 5 آیت 89 کی تفسیر میں ملے گی۔

﴿لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَآءُوْ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴾ (226)

شوہر کی طرف سے بیوی کے قریب نہ جانے کی قسم کھالینا "اِیْلَاء" کہلاتا ہے۔

دورِ جاہلیت میں بیویوں کو تنگ کرنے کے لیے اُن کے خاوند اس طرح کی قسم کھا لیتے اور پھر طویل عرصے تک نہ ان کے قریب جاتے اور نہ ان کو طلاق دیتے تھے۔ ظاہر ہے اس سے عورتوں کی حق تلفی ہوتی تھی اور وہ معلقہ (درمیان میں لٹکی ہوئی) بن کر رہ جاتی تھیں۔

اس لیے اللہ سبحانہٗ نے اس زیادتی کے خلاف قرآن میں یہ حکم نازل فرما دیا کہ ایسے خاوندوں کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے۔ اس مدت کے اندر اندر وہ رجوع کر سکتے ہیں، یا پھر ان کو طلاق دینی پڑے گی۔ اگر وہ اس عرصے میں رجوع کر لیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کی یہ کوتاہی معاف کر دے گا کیونکہ وہ بخشنے والا مہربان ہے۔

﴿وَ اِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (227)

لیکن طلاق دینے کی صورت میں اگر کوئی خاوند بد نیتی سے عورت کو تنگ کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ ہر بات سنتا اور ہر ایک کی نیت کو جانتا ہے۔ اس لیے وہ ایسی حرکت پر اسے سزا دے گا۔

اس جگہ چونکہ قسم کے کفارے کا ذکر نہیں ہے اس لیے بعض فقہا کی رائے یہ ہے کہ رجوع کر لینے کی صورت میں قسم کا کوئی کفارہ نہیں ہے۔ لیکن فقہا کی اکثریت کے نزدیک خاوند کو اپنی قسم توڑنے کا کفارہ دینا پڑے گا جو قرآن کی سورۃ المائدہ (5) آیت 89 میں بیان ہوا ہے۔

پھر آیت میں چونکہ قسم اٹھانے کا ذکر ہے اس لیے اکثر فقہا (جن میں احناف بھی شامل ہیں) کے ہاں ایلاء کے اس حکم کا اطلاق صرف قسم کھانے کی صورت میں ہوگا، ورنہ نہیں ہوگا۔ مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے یہ ہے کہ اس بارے میں خاوند قسم کھائے یا قسم نہ کھائے دونوں حالتوں میں ایلاء ہو جائے گا۔ کیونکہ دونوں صورتوں میں عورت کے لیے ضرر یعنی نقصان ایک جیسا ہے اور دونوں حالتوں میں رجوع کے لیے چار مہینوں کی مہلت ہوگی۔

اس کے علاوہ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی رائے میں ایلاء کے حکم کا اطلاق صرف اسی صورت میں ہوگا جب میاں بیوی میں ناچاقی اور ناراضی ہو، ورنہ خوشگوار تعلقات کی موجودگی میں اس حکم کا اطلاق نہیں ہوگا، اگر وہ کسی مصلحت سے آپس میں قربت نہ کریں، خواہ اس کے لیے کتنی ہی مدت گزر جائے۔

لیکن بعض فقہاء کے نزدیک ایسی قسم اٹھانا جس سے میاں بیوں میں جنسی تعلق نہ رہے، وہ ایلاء ہے اور اس میں رجوع کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ چار ماہ گزر جانے کے بعد طلاق کے بارے میں بھی فقہا کا اختلاف ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اسے ایک طلاق رجعی قرار دیتے ہیں۔ جب کہ احناف کے نزدیک یہ مدت

گزرتے ہی طلاق پڑ جائے گی اور یہ طلاق بائن ہو گی۔ جس کا مطلب ہے کہ اب ان کا نکاح ٹوٹ چکا اور میاں بیوی میں علیحدگی ہو چکی۔ لیکن اگر فریقین چاہیں تو باہمی رضامندی سے آپس میں دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔

امام مالک رحمۃ اللہ علیہ اور بعض دوسرے فقہا کی رائے میں چار مہینے کی مدت کے بعد معاملہ قاضی کے پاس جائے گا اور وہ خاوند کو حکم دے گا کہ وہ رجوع کر لے یا طلاق دیدے۔ پھر اگر وہ ان دونوں باتوں سے انکار کر دے تو قاضی اس عورت کے حق میں طلاق کا فیصلہ دے سکتا ہے۔

ان دونوں آیتوں پر غور کرنے سے اس بات کا اشارہ ملتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایلاء کے معاملے میں رجوع کر لینا طلاق دینے سے بہتر اور افضل ہے۔ کیونکہ اس پر بخشش اور رحمت کا ذکر آیا ہے اور طلاق کی صورت میں تنبیہ کا سا انداز ہے۔

یاد رہے ایلاء بھی طلاق ہی کی ایک قسم ہے۔

﴿ وَ الْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ﴾ (228)

اس سے پہلے ''ایلاء'' (جو کہ طلاق ہی کی ایک قسم ہے) کا ذکر آیا تھا۔ اب اسی مناسبت سے طلاق کے بارے میں تفصیلی احکام دیئے جا رہے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ جن بیویوں کو طلاق دی جائے ان کو چاہیے کہ وہ تین حیض تک (جیسا کہ احناف کی رائے ہے) یا تین طہر تک (جیسا کہ امام شافعی رحمہ اللہ کی رائے ہے) رکی رہیں۔ یہی ان کے لیے طلاق کی عدت ہے۔

جاہلیت کے زمانے میں طلاق کے لیے کوئی عدت مقرر نہ تھی۔ اس لیے جب عورت کو طلاق دی جاتی اور بعد میں اس کا حمل ظاہر ہوتا تو اس بچے کو عورت کے دوسرے شوہر کی طرف منسوب کر دیا جاتا۔

قرآن نے اس جاہلی رواج کو حرام قرار دیا۔ مطلقہ عورت کے لیے عدت مقرر کر دی تاکہ نسب کی حفاظت بھی ہو اور عورت ذہنی طور پر دوسرے نکاح کے لیے تیار بھی ہو سکے۔

﴿ وَ لَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ﴾ (228)

فرمایا، طلاق والی عورتوں کے لیے جب کہ وہ حاملہ ہوں، یہ جائز نہیں ہے کہ وہ جان بوجھ کر اپنے حمل کو چھپائیں، یا حیض کے بارے میں صحیح معلومات نہ دیں تاکہ اگر دوسرے نکاح کا جلد امکان نہ ہو تو وہ محض نان ونفقہ لینے کی خاطر اپنی عدت کا عرصہ بڑھا لیں۔

پھر فرمایا اگر وہ طلاق یافتہ حاملہ عورتیں صحیح مسلمان ہیں تو ان کو چاہیے کہ وہ حمل کو نہ چھپائیں اور حیض کے بارے میں ٹھیک بات کریں۔ اللہ سبحانہٗ نے حلال وحرام کا جو ضابطہ بنایا ہے وہ بندوں کے فائدے ہی کے لیے بنایا ہے۔ اس لیے وہ اس ضابطے کی پابندی کریں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ پر ایمان کا یہی تقاضا ہے۔ اسی طرح آخرت پر ایمان رکھنے کا تقاضا

یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔ ورنہ قیامت کے دن مواخذہ اور احتساب ہوگا۔

﴿وَ بُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا اِصْلَاحًا﴾ (228)

مطلب یہ ہے کہ شوہر اس بات کا زیادہ حق دار ہے اور اسے یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ عدت کے دوران میں، یا عدت گزر جانے کے بعد بھی جب کہ ابھی تیسری طلاق نہ دی ہو، رجوع کرلے۔ لیکن اس کی نیت خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کی ہو اور وہ بیوی کو تنگ کرنے یا اسے نقصان پہنچانے کے لیے ایسا نہ کرے۔ اگر وہ بیوی کو تنگ کرنے یا اسے نقصان پہنچانے کے لیے رجوع کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں پکڑا جائے گا۔

شوہر اس لیے رجوع کا زیادہ حق رکھتا ہے کیونکہ کبھی تو وہ اپنے طلاق کے فیصلے پر خود پشیمان ہوتا ہے۔ کبھی اسے اپنے بچوں کی صحیح پرورش اور تربیت کے لیے ان کی ماں کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اسلام میں مردوں کو عورتوں کا سربراہ ہونے کی وجہ سے بھی طلاق اور رجوع کا زیادہ حق حاصل ہوتا ہے۔

رجوع کے بارے میں یہی مضمون آگے آیت 232 میں بھی آرہا ہے۔

﴿وَ لَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۠ وَ لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (228)

اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح دستور کے مطابق بیویوں کے ذمے فرائض ہوتے ہیں اسی طرح دستور کے مطابق ان کے حقوق ہوتے ہیں۔ البتہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجے کی برتری حاصل ہے جس کی وضاحت سورۃ النساء 4 آیت 34 میں اس طرح کی گئی ہے کہ مرد عورتوں کے سربراہ ہیں۔

گویا مردوں کو عورتوں کی سربراہی کا درجہ حاصل ہے۔

بعض لوگ اس آیت کو مساواتِ مرد و زن کے مغربی تصور کی دلیل بناتے ہیں جو کہ غلط ہے۔ اول تو اس آیت میں مردوں اور عورتوں کے حقوق و فرائض کی مساوات بیان نہیں ہوئی ہے۔ صرف عورتوں کے بارے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جہاں ان پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں وہاں ان کو کچھ حقوق بھی حاصل ہیں۔ اس سے دونوں میں مساوات کہاں سے آگئی۔ دوسرے بعد کے ٹکڑے ﴿لِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (اور مردوں کو ان پر ایک درجہ یا فضیلت حاصل ہے) کے الفاظ عدمِ مساوات کا اعلان کر رہے ہیں۔

﴿وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ﴾ (228)

آخر میں فرمایا کہ اوپر کے تمام احکام، مردوں اور عورتوں کے درمیان حقوق و فرائض کی تقسیم، یہ سب کچھ اس اللہ کی طرف سے ہے جو غالب اور حکمت والا ہے۔

مزید تفصیل ان شاء اللہ سورۃ النساء (4) آیت 34 کی تفسیر کے تحت آئے گی۔

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَ لَا
يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا
حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا
فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ
حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ
مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَاۤ
اَنْ يَّتَرَاجَعَاۤ اِنْ ظَنَّاۤ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ
يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۰﴾ وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ
فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ ۪ وَّ لَا تُمْسِكُوْهُنَّ
ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ؕ وَ لَا
تَتَّخِذُوْۤا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ۫ وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَاۤ اَنْزَلَ
عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ؕ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْۤا
اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾ ع الثلثة ۲۹ ع ۱۲

’’طلاق دو بار ہے۔ اس کے بعد دستور کے مطابق یا تو بیوی کو رکھ لینا ہوتا ہے یا خوش اسلوبی سے رخصت کر دینا۔ اگر ان کو رخصت کرو تو تمھارے لیے یہ جائز نہیں کہ جو مال انھیں دے چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس لو۔ البتہ اگر یہ صورت ہو کہ دونوں میاں بیوی کو یہ اندیشہ ہو کہ وہ اللہ کے بعض احکام کی صحیح پابندی نہ کر سکیں گے تو پھر جائز ہے کہ باہمی رضا مندی سے عورت اپنے شوہر کو کچھ مال دے کر خلع (کی طلاق حاصل) کر لے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں، ان سے باہر نہ نکلو، اور جو اللہ کی حدوں سے نکل جائیں وہی ظالم ہیں۔

اور اگر شوہر نے تیسری طلاق دی تو پھر جدائی ہوگئی۔ اب وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں۔ لیکن اگر وہ عورت کسی اور مرد سے نکاح کر لے اور وہ (اپنی مرضی سے) اسے طلاق دیدے تو ایسی صورت میں پہلے شوہر سے اس عورت کا دوبارہ نکاح درست ہے، بشرطیکہ دونوں کو اللہ کی حدوں پر قائم رہنے کی توقع ہو۔ یہ اللہ کے احکام ہیں جنھیں وہ ان لوگوں کے لیے وضاحت سے بیان کرتا ہے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ اگر تم اپنی بیویوں کو (دو دفعہ) طلاق دو اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں تو انھیں یا تو دستور کے مطابق رکھ لو، یا بھلے طریقے سے رخصت کر دو۔ مگر ان کو تکلیف پہنچانے کی غرض سے نہ روکو کہ پھر ان پر زیادتی کرو۔ جو ایسا کرے گا وہ اپنا ہی برا کرے گا۔

اور اللہ کی آیتوں کو مذاق نہ بناؤ۔ بلکہ اپنے اوپر اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھو، اور کتاب وحکمت کو بھی، جو اس نے نازل کی ہے اور جس کے ذریعے وہ تمہیں سمجھاتا ہے۔ ہر حال میں اللہ سے ڈرو اور اچھی طرح جان لو کہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔'' (229-231)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ :...... اس جگہ فعل کی بجائے طلبِ فعل کا مفہوم مراد لیا جائے گا۔ مطلب یہ ہوگا کہ ان لوگوں کے لیے جو جاننا چاہتے ہیں۔

﴿ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ﴾ (229)

فرمایا، جس طلاق کے بعد رجوع ہو سکتا ہے وہ صرف دو بار ہے۔ پھر تیسری طلاق دینے کے بعد رجوع نہیں ہو سکتا اور میاں بیوی میں جدائی ہو جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بیک وقت تین طلاقیں دینا قرآن کے منشاء کے خلاف ہیں۔

تیسری طلاق کا ثبوت بعد کے الفاظ ﴿فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْتَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ﴾ (پھر دستور کے مطابق روک لینا یا بھلے طریقے سے رخصت کر دینا) سے مل جاتا ہے۔

ارشاد ہوا کہ دو طلاقوں کے بعد عدت کے دوران میں یا تو بھلے طریقے سے رجوع کر لینا ہوتا ہے یا پھر عدت گزر جانے کے بعد عورت کو خوش اسلوبی سے رخصت کر دینا ہوتا ہے۔

دورِ جاہلیت میں طلاقوں کی تعداد پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اہل عرب اپنی بیویوں کو تنگ کرنے کے لے ان کو جتنی چاہتے طلاقیں دے ڈالتے۔ پھر عدت کے دوران رجوع کر لیتے تھے۔ اس طرح عورت بیچاری معلقہ بن کر رہ جاتی جو قانونی طور پر بیوی ہوتی مگر عملی طور پر بیوی نہ ہوتی۔ وہ کسی اور مرد سے نکاح بھی نہیں کر سکتی تھی۔

اس آیت کا شانِ نزول جامع ترمذی کی وہ حدیث ہے جو ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کی ہے کہ:

جاہلیت کے دور میں مرد اپنی بیوی کو جتنی چاہتا طلاقیں دیتا اور عدت کے اندر رجوع کر لیتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ سو

بار یا اس سے بھی زیادہ مرتبہ طلاق دیتا اور رجوع کر لیتا تھا۔ ایک (انصاری) مرد نے اپنی بیوی سے کہا: اللہ کی قسم! نہ تجھے طلاق دوں گا کہ تو مجھ سے الگ ہو جائے اور نہ تجھے رکھوں گا۔ عورت نے پوچھا: وہ کیسے؟ اس نے جواب دیا: میں تجھے طلاق دیتا رہوں گا اور عدت ختم ہونے سے پہلے رجوع کر لیا کروں گا۔ یہ جواب سن کر وہ عورت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس فریاد لے کر آئی۔ اس کی بات سن کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا خاموش رہیں۔ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لائے تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو سارا قصہ سنایا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی۔
﴿اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ﴾ (ترمذی، رقم: 1192)

قرآن کریم نے اس جاہلی طریقے اور معاشرتی خرابی کی اصلاح فرمائی۔ عورت کی حق تلفی کا ازالہ کیا۔ مردوں کو حکم دیا کہ وہ صرف دو طلاقوں تک رجوع کر لینے کا حق رکھتے ہیں۔ جب وہ تیسری مرتبہ طلاق دیں گے تو ان کے لیے رجوع کا حق ختم ہو جائے گا۔ عورت عدت گزارنے کے بعد آزاد ہو گی کہ جہاں چاہے دوسرا نکاح کر لے۔

طلاق کے بارے میں تفصیلی احکام یہ ہیں:

1۔ بیوی کو حیض کی حالت میں طلاق دینا سخت گناہ ہے۔ ایسے ایک واقعہ پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سخت ناراضی اور ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا تھا۔ (صحیح بخاری، رقم: 4908، صحیح مسلم، رقم: 3652)
ایسی طلاق کو بدعی طلاق کہتے ہیں مگر یہ بھی ایک (پہلی) طلاق شمار ہوتی ہے۔

2۔ حیض کی حالت کے دوران میں ایک تو بیوی کی طرف خاوند کی رغبت کم ہوتی ہے اور میاں بیوی میں کچھ دوری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ دوسرے اس حالت میں عام طور پر عورت کا مزاج نارمل (NORMAL) نہیں رہتا جس کی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان جھگڑے کا امکان ہو سکتا ہے جو بڑھ کر طلاق کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ اسی سے بچنے کے لیے مرد کو اس عرصے میں صبر و تحمل اور برداشت سے کام لینے کی تاکید اور اپنی بیوی کو طلاق نہ دینے کی ہدایت کی گئی ہے۔ لیکن اگر ایسی حالت میں خاوند سے غلطی ہو جائے اور وہ طلاق دے بیٹھے تو اسے رجوع کر لینا چاہیے۔ البتہ اگر طلاق دیے بغیر چارا نہ ہو تو بعد میں ایسے طہر میں جس میں بیوی سے صحبت نہ کی ہو، اسے ایک طلاق دی جائے۔ اس طرح اگرچہ دو طلاقیں واقع ہو جائیں گی تاہم رجوع کا حق باقی رہے گا۔

3۔ طلاق اللہ تعالیٰ کو ناپسند ہے اس لیے اسے صرف آخری چارہ کار کے طور پر اختیار کرنا چاہیے۔ اگر ناگزیر حالات میں بھی اس کی اجازت نہ دی جاتی تو میاں بیوی کے لیے زندگی مصیبت اور عذاب بن جاتی۔

4۔ طلاق دینے کا سب سے بہتر اور احسن طریقہ یہ ہے کہ بیوی کو ایسے طہر میں، جس میں صحبت نہ کی گئی ہو، ایک طلاق (رجعی) دی جائے تاکہ عدت کے دوران میں رجوع کر لینے کی گنجائش باقی رہے۔ شوہر اگر عدت کے دوران میں رجوع کر لیتا ہے تو نکاح برقرار رہتا ہے۔ لیکن اگر عدت کی مدت گزر جائے تو رجوع نہیں ہو سکتا کیونکہ اب نکاح ختم ہو چکا ہے۔ البتہ دونوں کی رضا مندی سے دوبارہ نکاح ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ اگر دوبارہ نکاح نہیں کرتے تو

عدت گزارنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے شادی کر سکتی ہے۔

طلاق دینے کا ایک اور طریقہ بھی حسن اور درست ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو ہر طہر میں ایک ایک کر کے الگ الگ تین طلاقیں دے۔ اس کے بعد عورت اپنی عدت گزارنے کے بعد کسی اور مرد سے نکاح ثانی کر سکتی ہے۔

5۔ طلاق صرف خاوند دے سکتا ہے۔ بیوی اپنے شوہر کو طلاق نہیں دے سکتی۔

6۔ شوہر اپنی بیوی کو صرف تین طلاق دینے کا اختیار رکھتا ہے۔

7۔ طلاق کی تین قسمیں ہیں: رجعی، بائن (یا بائنہ) اور مغلظہ۔

طلاق رجعی یہ ہے کہ خاوند اپنی بیوی کو ایک طلاق دے یا دو طلاقیں (الگ الگ) دے اور عدت گزرنے سے پہلے رجوع کر لے۔

طلاق بائن (یا بائنہ) یہ ہے کہ شوہر نے ایک طلاق یا دو طلاقیں دیں اور طلاق کی عدت گزر گئی تو اب نکاح ٹوٹ گیا اور میاں بیوی میں جدائی ہو گئی۔ (عربی زبان میں بَيْنَ یا بَيْنُوْنَتْ کے معنی جدائی کے ہیں۔) لیکن اگر فریقین چاہیں تو باہمی رضا مندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔

طلاق مغلظہ یہ ہے کہ پہلے ایک طلاق یا دو طلاقیں دی جائیں۔ پھر عدت ختم ہونے سے پہلے تیسری طلاق دے دی جائے۔ اس صورت میں نکاح بھی ختم ہو جاتا ہے اور دوبارہ نکاح بھی نہیں ہو سکتا۔

8۔ ایک ہی وقت اور مجلس میں تین طلاقیں دے ڈالنا طلاق بدعی ہے جو شریعت میں سخت ناپسندیدہ اور گناہ کی بات ہے۔ لیکن یہ طلاقیں مؤثر (Effective) ہوتی ہیں۔ اس کے بعد مرد کو نہ تو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ وہ اس عورت سے دوبارہ نکاح کر سکتا ہے۔ ائمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا یہی مسلک ہے۔ لیکن یاد رہے کہ اس مسلک اور رائے پر امت کا اجماع اور اتفاق نہیں ہے۔ جو لوگ اس پر اجماع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان کا دعویٰ صحیح نہیں ہے۔ اہل حدیث مسلک میں بیک وقت دی گئی تین طلاقیں ایک ہی طلاق شمار ہوتی ہے جس کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔ بعض حنفی فقہا نے بھی مخصوص حالات میں اس مسلک کو اختیار کر لینے کے فتوے دیئے ہوئے ہیں۔

﴿وَ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْئًا﴾ (229)

مطلب یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد شوہر کو یہ حق نہیں ہے کہ جو مہر، زیور اور کپڑے وغیرہ اس نے بیوی کو دیے ہوں، وہ ان میں سے کوئی چیز واپس لے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ اِنْ اَرَدْتُّمُ اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَّكَانَ زَوْجٍ وَّ اٰتَيْتُمْ اِحْدٰىهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا ؕ اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّ اِثْمًا مُّبِيْنًا ۝ وَ كَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَ قَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ وَّ اَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝﴾ (النساء 4: 20،21)

''اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی بدلنا چاہو جب کہ تم پہلی کو ڈھیروں مال دے چکے ہو، تو طلاق کے

بعد علیحدگی کی صورت میں اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا تم اپنا دیا ہوا مال کسی بہتان یا ظلم کے ذریعے واپس لو گے؟ اور تم کس طرح وہ مال لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے خلوت کر چکے اور وہ نکاح کے وقت تم سے پختہ عہد لے چکیں۔''

اسلام میں ویسے بھی یہ بات سخت ناپسندیدہ ہے کہ کوئی شخص کسی کو تحفہ، ہدیہ، ہبہ یا صدقہ دے کر اس سے واپس مانگے۔ ایسی ذلیل حرکت کرنے والا گویا اپنی قے خود چاٹ لینے والا ہے۔ جیسا کہ متفق علیہ حدیث ہے:

((فِإنَّ الْعَائِدَ فِيْ صَدَقَتِهِ كَالْكَلْبِ يَعُوْدُ فِيْ قَيْئِهِ))

(صحیح مسلم، رقم: 4163، صحیح بخاری، رقم: 1490)

''بے شک اپنا صدقہ واپس لینے والا شخص اُس کُتے کی طرح ہے جو اپنی قے خود چاٹتا ہے۔''

لیکن کسی شوہر کا اپنی بیوی کو طلاق دے کر رخصت کرتے وقت ایسی شرمناک حرکت کرنا کہ وہ اس کو دیے ہوئے تحفے تحائف واپس لے، انتہائی کمینگی اور بے غیرتی ہے۔

بلکہ قرآن نے ایسے موقع پر یہ تاکید کی ہے کہ ہر قسم کی طلاق کے بعد عورت کو کچھ دے دلا کر رخصت کیا جائے اور فرمایا ہے کہ:

﴿وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (البقرہ 2: 241)

''اور جن عورتوں کو طلاق دی جائے ان کو دستور کے مطابق کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔ یہ اللہ سے ڈرنے والوں کی ذمہ داری ہے۔''

﴿اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ﴾ (229)

فرمایا، میاں بیوی کی ناچاقی کی صورت میں اگر بیوی اپنے خاوند کو کچھ مال دے کہ طلاق حاصل کر لے تو یہ جائز ہے۔ اصطلاح میں اسے ''خلع'' کہا جاتا ہے۔ اور یہ بھی طلاق کی ایک قسم ہے۔

خلع کا معاملہ اگر گھر پر طے ہو جائے تو ٹھیک، ورنہ عدالت میں جائے گا اور عدالت صورتِ حال کا جائزہ لے کر اگر بیوی کے حق میں فیصلہ دیتی ہے اور کوئی مناسب رقم بطور فدیہ مقرر کرتی ہے تو خاوند اپنی بیوی سے وہ فدیہ لے کر اسے طلاق دے گا۔ اور یہ خلع کی طلاق ہوگی جو رجعی نہیں ہوتی بلکہ بائن ہوتی ہے۔ اس میں خاوند کو رجوع کا حق حاصل نہیں ہوتا۔ البتہ اگر وہ دونوں چاہیں تو باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔

جمہور فقہا کے نزدیک خلع کی عدت وہی ہے جو طلاق کی ہے۔ ویسے ایک حدیث سے اس کی عدت ایک حیض بھی ثابت ہے۔

خلع سے متعلق چند احکام یہ ہیں:

1۔ ’’خلع‘‘ یہ ہے کہ کوئی عورت اپنے شوہر کو کچھ دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کر لے۔
2۔ خلع کا معاملہ گھر میں طے ہو سکے تو بہتر ہے اور جو کچھ طے ہو جائے اس کے مطابق اس پر عمل درآمد ضروری ہے
3۔ لیکن اگر معاملہ عدالت میں چلا جائے تو عدالت اس بات کی تحقیق کرے گی کہ کیا عورت کو اپنے شوہر سے اس حد تک نفرت ہو چکی ہے کہ اب وہ اپنے شوہر کے ساتھ نباہ نہیں کر سکتی۔ جب یہ معلوم ہو جائے تو عدالت حالات کے لحاظ سے جو فدیہ (یا معاوضہ) چاہے مقرر کر سکتی ہے۔ یہ فدیہ (یا معاوضہ) بیوی اپنے شوہر کو ادا کرے گی جسے قبول کر کے شوہر اپنی بیوی کو طلاق دے دے گا۔
4۔ عام حالات میں شوہر کی رضامندی ہی سے خلع ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر وہ ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرے یا بیوی کے خاندان کو پریشان کرنے کا رویہ اختیار کرے۔ عدالت کے بار بار سمن اور طلبی کی جان بوجھ کر تعمیل نہ کرے اور عدالت میں حاضر ہونے سے گریز کرے تو عدالت کو اختیار حاصل ہے کہ وہ خاوند کی رضامندی کے بغیر بھی خلع کی ڈگری جاری کر دے۔ پھر عدالت کا یہ یک طرفہ فیصلہ ہی خلع کی طلاق کے قائم مقام ہو جائے گا۔ کیونکہ لوگوں کے حقوق کی حفاظت بہر حال ضروری ہے۔ فقہی مُوشگافیوں کے ذریعے کسی کی حق تلفی نہیں کی جا سکتی۔
5۔ مناسب یہ ہے کہ جتنا مال شوہر نے بیوی کو پہلے دیا تھا یعنی حق مہر، تو اتنا مال ہی فدیے میں اسے واپس لوٹا دیا جائے، یا مرد چاہے تو یہ فدیہ معاف بھی کر سکتا ہے۔
6۔ بیوی کی طرف سے خلع لینے کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً شوہر نان نفقہ نہ دیتا ہو یا وہ نامرد ہو وغیرہ۔
7۔ خلع کی طلاق رجعی طلاق نہیں ہوتی بلکہ یہ بائنہ ہوتی ہے اور چونکہ اسے عورت نے فدیہ دے کر خریدا ہوتا ہے اس لیے شوہر کو اس طلاق سے رجوع کا حق نہیں ہوتا۔ لیکن اگر یہی میاں بیوی آپس میں راضی ہو جائیں اور دوبارہ نکاح کرنا چاہیں تو اس کی بالکل اجازت ہے۔
8۔ جمہور فقہا کے نزدیک خلع کی عدت وہی ہے جو طلاق کی ہے لیکن بعض فقہا خلع کی عدت صرف ایک ہی حیض قرار دیتے ہیں۔

﴿تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَ مَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝﴾ (229)

آخر میں فرمایا کہ یہ سارے احکام اللہ کی حدود ہیں۔ ان سے آگے نہ بڑھو۔ ان کی پابندی کرو۔ جو لوگ ان حدود سے تجاوز کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی خلاف ورزی کریں گے وہ ظالم ہوں گے اور اللہ سبحانہٗ ایسے ظالموں کو سزا دے گا۔

﴿فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ﴾ (230)

مطلب یہ ہے کہ تیسری طلاق دینے کے بعد میاں بیوی میں جدائی واقع ہو جاتی ہے اور دونوں میں خاوند بیوی کا تعلق بالکل ختم ہو جاتا ہے۔

البتہ ایک ممکنہ صورت باقی رہتی ہے جو یہ ہے کہ طلاق یافتہ عورت نے کسی اور مرد سے نکاح کر لیا اور اس نے اپنی آزاد مرضی سے اسے طلاق دے دی تو اب اس عورت کا نکاح اس کے پہلے خاوند سے درست ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ دوبارہ خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے پر آمادہ ہوں۔ لیکن وہ سازشی اور لعنتی نکاح جسے حلالہ کہتے ہیں۔ سخت حرام، بے غیرتی اور ایک قسم کی زناکاری ہے کہ کوئی مرد کسی عورت سے صرف اس لیے نکاح کرے کہ وہ بعد میں اسے طلاق دیدے گا تاکہ وہ پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جائے۔ صحیح حدیث میں ایسے مرد کو کرائے کا سانڈ (اَلتَّيْسُ الْمُسْتَعَارُ) کہا گیا ہے۔ (ابن ماجہ، رقم:1936) ایک اور صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے، دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔ جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَلْمُحَلِّلَ وَالْمُحَلَّلَ لَهٗ)) (ترمذی، رقم: 1120)

''رسول اللہ ﷺ نے حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا جائے، دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔''

اس کے علاوہ جیسا کہ تفسیر ابن کثیر میں اس آیت کی تفسیر کے تحت لکھا ہے کہ امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اسے زنا سمجھتے ہوئے اس پر رجم یعنی سنگساری کی سزا دینے کا اظہار فرمایا تھا۔

﴿وَ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝۲۳۰﴾ (230)

پھر تاکید کے لیے آخر میں دوبارہ فرمایا کہ یہ سارے احکام اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدیں ہیں، جن کو کھول کر بیان کر دیا گیا ہے تاکہ لوگ ان کو سمجھیں اور ان کے مطابق عمل کر کے اجر و ثواب پائیں۔

﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ سَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ (231)

فرمایا جب تم اپنی بیویوں کو دو مرتبہ طلاق دے دو تو عدت گزرنے سے پہلے یا تو رجوع کر لو اور دستور کے مطابق ان کو رکھ لو، یا پھر بھلے طریقے سے کچھ دے دلا کر ان کو رخصت کر دو، تو یہ تیسری طلاق ہو جائے گی۔ جس کے بعد میاں بیوی میں بالکل علیحدگی ہو گئی۔ ساتھ ہی مرد کے لیے رجوع کا حق بھی ختم ہو گیا۔

﴿وَلَا تُمْسِكُوْهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوْا ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهٗ ۭ﴾ (231)

فرمایا، ایک یا دو طلاق دینے کے بعد رجوع کر کے بیوی کو رکھ لینا اسے نقصان پہنچانے یا تنگ کرنے کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ پھر سے خوشگوار ازدواجی زندگی گزارنے کے لیے ہونا چاہیے۔ اگر کوئی خاوند اس لیے رجوع کرے تاکہ عورت کو تنگ کیا جائے یا اسے کوئی نقصان پہنچایا جائے یا اسے خلع لینے پر مجبور کیا جائے، تو جو کوئی ایسا کام کرے گا وہ خود اپنے اوپر ظلم کرے گا، گناہ کمائے گا اور آخرت میں عذاب کا مستحق ہو گا۔

﴿وَ لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا ﴾ (231)

پھر فرمایا طلاق اور رجوع سے متعلق اللہ کی آیتوں کو اور اس کے دوسرے احکام کو مذاق نہ بناؤ، اور ان کی خلاف ورزی نہ کرو۔ بلکہ ان پر ان کی اصل روح (Spirit) کے مطابق عمل کرو۔ کیونکہ اگر مذاق کی صورت میں طلاق دو گے تو وہ بھی واقع اور موثر ہو جائے گی۔

﴿وَّ اذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَ مَآ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ وَ الْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهٖ ﴾ (231)

پھر ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو۔ اس کا شکر ادا کرو جس نے تمہیں جاہلیت سے نکال کر اسلام کی دولت عطا فرمائی، جو تمہیں ایسے احکام دیتا ہے جس میں تمہارے لیے بھلائی ہی بھلائی ہے۔ اس کے علاوہ تم قرآن و سنت اور دین کی حکمت و دانائی جیسی نعمتیں ملنے پر بھی اللہ سبحانہٗ کا شکر کرو اور ان کے مطابق عمل کرو۔

﴿وَ اتَّقُوا اللّٰهَ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۳۱﴾﴾ (231)

آخر میں تقوے کی تلقین کی گئی کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، یہ بات اچھی طرح سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے، تمہارے ایک ایک کام کو جانتا ہے اور اس کے مطابق تمہیں جزا و سزا دے گا۔

وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ
يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ ذٰلِكَ
يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ ذٰلِكُمْ
اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۳۲﴾ وَ الْوَالِدٰتُ
يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ
وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا
وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ بِوَلَدِهَا وَ لَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۗ وَ عَلَى الْوَارِثِ
مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَ تَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْهِمَا ؕ وَ اِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا

سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ
بَصِيْرٌ ﴿۲۳۳﴾ وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ
اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾ وَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ
عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ
تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ؕ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ
اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا
اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿۲۳۵﴾ ع ۳۰ ۱۴

''اور جب تم اپنی بیویوں کو طلاق دے دو اور وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو ان کو اس سے نہ روکو کہ وہ اپنے پہلے یا (ہونے والے) شوہروں سے نکاح کر لیں، جب کہ وہ دستور کے مطابق آپس میں راضی ہوں۔ یہ ان لوگوں کو نصیحت کی جاتی ہے جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ تمہارے لیے یہی طریقہ زیادہ پاکیزہ اور ستھرا ہے۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

اور وہ مائیں جن کو ان کے شوہروں نے طلاق دی ہو، اپنے بچوں کو پورے دو سال تک دودھ پلائیں جب کہ وہ لوگ ان سے پوری مدت دودھ پلانا چاہتے ہوں۔ ایسی صورت میں بچے کے باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ دستور کے مطابق ان عورتوں کو روٹی کپڑا دے۔ ہر کسی کے لیے اس کی گنجائش کے مطابق حکم دیا جاتا ہے۔ نہ کسی ماں کو بچے کی وجہ سے تکلیف دی جائے اور نہ کسی باپ کو اس کے بچے کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے۔ باپ موجود نہ ہو تو اس کی ذمہ داری اس کے وارث پر ہے اور جب ماں باپ باہمی رضامندی اور آپس کے صلاح مشورے سے بچے کا دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔ اور اگر تم اپنے بچوں کو ماں کی بجائے کسی اور عورت سے دودھ پلانا چاہو تو پھر بھی تم پر کوئی گناہ نہیں بشرطیکہ اس کا جو معاوضہ دینا طے کرو، وہ دستور کے مطابق ادا کر دو۔ ہر حال میں اللہ سے ڈرو اور یاد رکھو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے۔''

''اورتم میں سے جو لوگ مرجائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو ان بیواؤں کو چار مہینے دس دن کی عدت گزارنی چاہیے۔ اس مدت کے بعد وہ دستور کے مطابق کہیں نکاح کرلیں تو اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں۔ اور اللہ تمہارے کاموں سے اچھی طرح باخبر ہے۔''

''اورتم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم ان عورتوں کو عدت کے دوران میں اشارے کنائے سے نکاح کا پیغام دے دو، یا اس معاملے کو اپنے تک محدود رکھو۔ اللہ جانتا ہے کہ تمہارے دل میں ایسی عورتوں کا خیال آئے گا لیکن اس دوران خفیہ طور پر ان سے نکاح کی بات پکی نہ کرو۔ البتہ دستور کے مطابق ان سے کوئی بات کہہ سکتے ہو۔ مگر جب تک عدت پوری نہ ہو، نکاح کا حتمی فیصلہ نہ کیا جائے۔ خوب جان لو کہ اللہ تمہارے دلوں کی بات بھی جانتا ہے، لہٰذا اس سے ڈرو اور یہ بھی جان لو کہ اللہ بخشنے والا اور تحمل والا ہے۔ (232-235)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

تَعْضِلُوْهُنَّ :...... عَضْلٌ کے معنی روکنے اور رکاوٹ ڈالنے کے ہیں۔

اَزْوَاجَهُنَّ :...... اس سے ان عورتوں کے آئندہ ہونے والے شوہر مراد ہیں۔

حَوْلَيْنِ :...... (دو سال) حَوْلٌ کے معنی ایک سال یا برس کے ہیں۔ اس کے ہم معنی الفاظ میں عَامٌ ، سَنَةٌ اور حِجَّةٌ (اصل میں حِجَجٌ آیا ہے جو کہ جمع ہے حِجَّةٌ کی) قرآن مجید میں آئے ہیں۔

اَلْمَوْلُوْدُ لَهٗ :...... (وہ جس کا بچہ ہے) اس سے بچے کا باپ مراد ہے کیونکہ نسب اسی کا ہے۔

لَا تُكَلَّفُ :...... عربی زبان میں ''تکلیف'' کے معنی ہیں: کسی شخص پر کسی کام کی ذمہ داری سونپ دینا۔

وُسْعَهَا :...... (اس کی طاقت) وُسْعٌ کے معنی ایسی قوت وصلاحیت کے ہیں جس کے ذریعے کوئی کام آسانی کے ساتھ کیا جاسکے اور اس کے کرنے میں کوئی تنگی یا مشقت نہ ہو۔

فِصَالًا :...... فِصَالٌ کے معنی فِطَامٌ کے ہیں یعنی بچے کا دودھ چھڑانا۔ کیونکہ اس کے بعد بچہ اپنی ماں سے کچھ الگ سا (فصل) ہو جاتا ہے اور غذا کھانے کے قابل ہوتا ہے۔

اَلْكِتٰبَ :...... یہ اَلْمَكْتُوْبَ کے معنوں میں ہے یعنی لکھا ہوا، فرض کیا گیا اور لازم کیا گیا۔

﴿وَ اِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ اَنْ يَّنْكِحْنَ اَزْوَاجَهُنَّ اِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (232)

فرمایا جب تم اپنی بیویوں کو ایک یا دو بار طلاق دے دو اور عدت گزر چکی ہو مگر ابھی تک تیسری طلاق نہ دی ہو تو ولی یا کسی اور کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان عورتوں کو نکاح سے روکیں، جب کہ وہ اپنی رضا مندی سے پہلے شوہر کے ساتھ یا ہونے والے دوسرے خاوند سے دستور کے مطابق نکاح کرنا چاہیں۔

مشرکین عرب ایسی صورت میں اپنی بیویوں کو بہت تنگ کرتے تھے۔ان کو طلاق دینے کے بعد انتقامی طور پر نکاح ثانی سے روکتے تھے۔

اس آیت سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ ولی کی اجازت کے بغیر بھی عورت کا نکاح درست ہے۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہی مسلک ہے۔لیکن جمہور فقہا (جن میں امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ بھی شامل ہیں) کے نزدیک ولی کی اجازت کے بغیر عورت کا نکاح جائز نہیں ہے۔ان کی دلیل درج ذیل حدیث ہے جو حضرت ابوموسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کی ہے۔

((لَا نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ)) (ابو داؤد، رقم: 2085،ترمذی ،رقم: 1101،ابن ماجه، رقم: 1881)

''ولی کے بغیر (عورت کا) نکاح نہیں۔''

اس حدیث کے علاوہ بھی کئی صحیح حدیثیں ہیں جن میں ولی کے بغیر عورت کے نکاح کو ناجائز قرار دیا گیا ہے۔لیکن صحیح مسلم میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلثَّيِّبُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا ، وَالْبِكْرُ يُسْتَاْذِنُهَا اَبُوْهَا فِيْ نَفْسِهَا ، وَاِذْنُهَا صُمَاتُهَا))

(صحیح مسلم، رقم: 3478،ابو داؤد، رقم: 2099، ترمذی،رقم: 1108،نسائی،رقم: 3262)

''شادی کے بعد بے شوہر ہونے والی (مطلقہ یا بیوہ) عورت اپنے بارے میں اپنے ولی سے زیادہ حق رکھتی ہے۔اور کنواری لڑکی کے نکاح کے لیے اس کا باپ اس سے اجازت حاصل کرے گا۔اور اس لڑکی کا خاموش رہنا بھی اس کی طرف سے اجازت ہے۔''

اس مسئلے کے حوالے سے درج ذیل امور قابل غور ہیں۔

1۔ اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ بالغ لڑکے کے نکاح کے لیے اس کے ولی کا ہونا شرط نہیں ہے۔وہ اپنا نکاح کرنے میں خود مختار ہے۔

2۔ اس پر بھی سب متفق ہیں کہ نابالغ لڑکی کا نکاح درست ہے۔مگر یہ نکاح اس کے ولی (سرپرست) کے بغیر نہیں ہو سکتا۔گویا نابالغ لڑکی کے نکاح کے لیے ولی کا ہونا ضروری شرط ہے۔بلکہ وہ نابالغہ کا نکاح زبردستی بھی کرا سکتا ہے اور بالغہ ہونے کے بعد لڑکی کو وہ نکاح باقی رکھنے یا فسخ یعنی ختم کرانے کا اختیار ہے۔

3۔ بعض صحیح احادیث کی بنیاد پر جمہور فقہا کے نزدیک بالغہ عورت (خواہ وہ کنواری ہو، یا طلاق یافتہ ہو، یا بیوہ ہو) کے نکاح کے لیے ولی کا ہونا ضروری شرط ہے۔اس کے بغیر اس عورت کا نکاح درست نہیں ہے۔مگر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاں بالغہ عورت کے نکاح کے لیے ولی کی کوئی شرط نہیں ہے بلکہ ولی کے بغیر بھی نکاح ہو سکتا ہے۔

4۔ ہمارے ملک کی اکثریت فقہ حنفی کی پیروکار ہے، اس لیے ہماری عدالتیں بھی اس فقہ کی پیروی میں ولی کی اجازت کے بغیر بالغہ لڑکی کے نکاح کو جائز قرار دیتی ہیں۔مگر یہ صورتِ حال عام طور پر نہایت بھیانک نتائج پیدا کرتی

ہے۔اس سے نوجوان نسل میں یاری آشنائی (Love Affair) کا رجحان فروغ پاتا ہے۔ والدین اور خاندان کی عزت برباد ہوتی ہے جو موقع پا کر کبھی اپنی مفرور لڑکی کو اس کے شوہر سمیت قتل کر ڈالتے ہیں۔اس سے جرائم میں اضافہ ہوتا ہے اور یہ صورتِ حال ہمارے جج صاحبان اور حنفی علمائے کرام کے لیے لمحہ فکریہ ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے کہ ایسے معاملے میں دیکھا جائے کہ زیادتی کس جانب سے ہوئی ہے۔ ولی کی طرف سے یا لڑکی کی جانب سے۔ ولی کی طرف سے زیادتی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ دولت کے لالچ میں اپنی جوان لڑکی کا نکاح کسی امیر بوڑھے مرد سے کرنا چاہتا ہے اور لڑکی نے تنگ آ کر اپنی شادی خود کرنے کا فیصلہ کر لیا، ایسی صورت میں لڑکی کے حق میں فیصلہ دیا جائے۔لیکن اگر یہ صورت ہو کہ لڑکی اپنے والدین کی مرضی کے خلاف، ان کی اور ان کے خاندان کی عزت کو محض اپنی خواہش نفس پر قربان کر رہی ہے تو ولی کے حق میں فیصلہ دیتے ہوئے ایسے نکاح کو فسخ کر دیا جائے۔

5۔ جمہور کی رائے کے برخلاف جس حنفی فقہ کے سہارے ہماری عدالتیں مفرور لڑکیوں کے حق میں فیصلے دیتی ہیں اسی فقہ میں یہ حکم بھی ہے کہ اگر لڑکی اپنی مرضی سے کسی غیر کفو لڑکے سے خود نکاح کر لے، تو ولی ایسے نکاح کو فسخ کرانے کا اختیار رکھتا ہے۔مگر ہماری عدالتیں حنفی فقہ کے اس فتوے پر شاذ و نادر ہی عمل کرتی ہیں اور اس طرح وہ مغرب کے زیر اثر خود حنفی فقہ کے بارے میں بھی اپنا دوہرا معیار (Double Standard) رکھتی ہے۔

﴿ذٰلِكَ يُوْعَظُ بِهٖ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ﴾ (232)

فرمایا، ان عورتوں کے بارے میں نکاح کا یہ حکم ایک ایسی نصیحت ہے جو ہر اُس شخص کو قبول کرنی چاہیے جو اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اور اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کرنے والا نہ ہو۔اس لیے اسے چاہیے کہ ایسی عورتوں کے نکاح میں کسی قسم کی کوئی رکاوٹ نہ ڈالے۔

﴿ذٰلِكُمْ اَزْكٰى لَكُمْ وَ اَطْهَرُ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (232)

کیونکہ ایسی عورتوں کے نکاح میں، خواہ یہ پہلے شوہر کے ساتھ تجدیدِ نکاح کی صورت میں ہو، یا دوسرے شوہر سے نکاحِ ثانی کی صورت میں، کتنی برکت اور فائدہ ہے اور اس سے کس قدر پاکیزگی اور پاک دامنی حاصل ہوتی ہے، اسے تم نہیں جانتے ہو، صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

﴿وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ﴾ (233)

مطلب یہ ہے کہ ہر ماں، خواہ وہ مطلقہ ہو یا غیر مطلقہ، اپنے بچے کو پورے دو (2) سال دودھ پلائے کیونکہ رضاعت کی پوری مدت یہی ہے۔یہ رضاعت بچے کا حق ہے اور یہ ماں باپ پر واجب ہے۔

﴿وَ عَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَ كِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (233)

مراد یہ ہے کہ مطلقہ ماں کے دودھ پلانے کی صورت میں اس کے لیے روٹی کپڑے (نان ونفقہ) کا انتظام بچے کے باپ کے ذمے ہے، جو حالات اور ماحول کے مطابق طے ہوگا۔ لیکن اس بارے میں کسی جان پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جائے گا۔

﴿لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ﴾ (233)

مراد یہ ہے کہ مطلقہ والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے کہ اس کو نان ونفقہ سے محروم رکھا جائے اور خرچہ نہ دیا جائے، یا اگر وہ بچے کو خود دودھ پلانا چاہتی ہو تو اسے دودھ پلانے سے روکا جائے۔ اسی طرح اگر وہ بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہتی ہو تو اس سے بچہ چھین لیا جائے۔ یہ سب صورتیں ماں کو نقصان پہنچانے اور اسے تنگ کرنے کی ہیں۔ لہٰذا ایسی حرکتوں سے باز رہو۔ اسی طرح باپ کو اس کی حیثیت سے زیادہ خرچہ دینے کے لیے مجبور نہ کیا جائے۔ غرض والدین میں سے کسی کو بھی ان کے بچے کی وجہ سے کسی قسم کا نقصان نہ پہنچایا جائے کیونکہ ایسا کرنا سخت گناہ ہے۔

پھر اگر باپ موجود نہ ہو تو بچے کے سرپرست یا ولی پر وہی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جو بچے کے باپ کی ہیں۔

﴿فَاِنْ اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا﴾ (233)

پھر اگر والدین باہمی رضامندی اور آپس کے مشورے سے کسی مصلحت کے تحت رضاعت کی اس مدت کو کم کرلیں تو یہ بھی جائز ہے اور اس پر اُن کو کوئی گناہ نہ ہوگا۔

﴿وَاِنْ اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ﴾ (233)

اور اگر باپ اپنے بچے کو کسی اور عورت سے دودھ پلانا چاہے تو اس کی بھی اجازت ہے، بشرطیکہ دستور کے مطابق جو معاوضہ دینا طے کیا جائے وہ پورا ادا کر دیا جائے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ﴾ (233)

آخر میں فرمایا ہر معاملے میں اللہ سبحانہٗ سے ڈرتے رہو۔ اس کے احکام کی نافرمانی سے بچو اور ہمیشہ یاد رکھو کہ تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اور وہ اس کا تم سے حساب لے گا۔

﴿وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا﴾ (234)

طلاق کی عدت کے بعد اب وفات کی عدت کا ذکر آ گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن عورتوں کے خاوند فوت ہو جائیں تو ان بیواؤں کو چار (4) مہینے دس (10) دن کی عدت گزارنی چاہیے۔ یہ ان پر واجب ہے۔ یہی ہر بیوہ کی عدت ہے۔

عدت خواہ بیوہ کی ہو یا طلاق کی، اس میں عورت پر کچھ شرعی پابندیاں عائد ہوتی ہیں جن کی تفصیل یہ ہے:

1۔ وہ شوخ رنگین کپڑے نہیں پہنے گی۔

2۔ وہ زینت کے لیے آنکھوں میں سرمہ نہیں لگائے گی۔

3۔ وہ خوشبو استعمال نہیں کرے گی۔

4۔ وہ زیورات نہیں پہنے گی۔

5۔ وہ مہندی یا خضاب نہیں لگائے گی۔

اس کے علاوہ جب کسی جوان بیوہ عورت کی عدت گزر جائے تو اس کے بعد اسے کسی مرد سے ضرور شادی کر لینی چاہیے۔ یہی صحیح اسلامی طریقہ ہے۔

ہمارے ہاں بعض بیوہ عورتیں شوہر کے مرتے ہی میکے چلی جاتی ہیں اور شوہر کے گھر جو عدت گزارنی ہوتی ہے، وہ نہیں گزارتیں، یہ چیز شریعت کے خلاف ہے۔ ایک عام غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف جوان بیوہ عورت کے لیے عدت ضروری ہے اور زیادہ عمر کی بیوہ عورت کے لیے عدت گزارنا ضروری نہیں ہے۔ حالانکہ یہ عدت شوہر کی وفات اور اس سے جدائی کا غم اور سوگ بھی ہے، تو کیا زیادہ عمر کی بیوہ عورتوں کو اپنے شوہروں کی وفات اور اس سے جدائی کا غم اور سوگ نہیں ہونا چاہیے؟ جب کہ یہ چیز قرآنی حکم کے علاوہ صحیح حدیث کے حکم کے بھی خلاف ہے۔

﴿فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ﴾

(234)

فرمایا جب بیوہ عورتوں کی عدت پوری ہو جائے تو اب وہ آزاد ہیں اور دستور کے مطابق اگر چاہیں تو کہیں دوسری جگہ اپنا نکاح کر سکتی ہیں۔ لیکن اگر وہ حاملہ ہوں تو ان کی عدت وضعِ حمل (DELIVERY) تک ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَاُولَاتُ الْاَحْمَالِ اَجَلُهُنَّ اَنْ يَّضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ (الطلاق 4:65)

''اور جو مطلقہ عورتیں حاملہ ہوں تو اُن کی عدت وضعِ حمل تک ہے۔''

﴿وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾﴾ (234)

آخر میں فرمایا تم جو کچھ کرتے ہو اللہ سبحانہ اس سے باخبر ہے پھر جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ان کے مطابق وہ جزا وسزا دے گا۔

﴿وَ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ﴾

(235)

اس مقام پر مردوں کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ بیوہ عورتوں کو ان کی عدت کے دوران میں نہ تو نکاح کا پیغام بھیجیں اور نہ ان سے منگنی کریں۔ لیکن دل میں ان سے نکاح کا ارادہ رکھنے، یا اشارے کنائے سے بات کر لینے پر کوئی گناہ نہیں۔ جیسے یوں کہا جائے کہ آپ ابھی جوان ہیں، خوب صورت ہیں، مجھے بھی کسی اچھے جیون ساتھی کی تلاش ہے وغیرہ۔

﴿عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَ لٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْهُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۬ وَ لَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ﴾ (235)

مطلب یہ ہے کہ تم مرد لوگ ان بیوہ عورتوں کا ذکر ضرور کرو گے مگر ان کی عدت کے دوران خفیہ طور پر ان سے نکاح کی بات پکی نہ کرو اور نہ نکاح کرو۔ ایسا نکاح حرام ہے۔ پھر جب ان کی عدت گزر جائے تو نکاح کا پیغام بھیج سکتے ہو اور ان سے شادی کر سکتے ہو۔

﴿وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۠﴾ (235)

آخر میں فرمایا کہ یاد رکھو اللہ سبحانہٗ صرف تمہارے اعمال ہی سے واقف نہیں بلکہ باتوں اور نیتوں کو بھی جانتا ہے۔ اس لیے اُس کی پکڑ سے ڈرو اور اس کے کسی حکم کی نافرمانی نہ کرو۔ البتہ برائی کا محض ارادہ کرنے پر وہ تمہارا مواخذہ نہیں کرے گا بلکہ اسے معاف کر دے گا۔ ایک متفق علیہ حدیث میں تو یہ بھی ہے کہ:

((وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَ اللّٰهُ عِنْدَهٗ حَسَنَةً كَامِلَةً))

(صحیح بخاری، رقم: 6419،صحیح مسلم، رقم: 338)

''اور جو کسی برائی کا ارادہ کرے مگر وہ برا کام نہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ایک نیکی لکھ دیتا ہے۔''

پھر یہ بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے ان کو جو اپنے گناہوں سے توبہ کر لیتے ہیں اور وہ تحمل والا بھی ہے کہ گناہوں پر تمہیں فوراً نہیں پکڑتا۔

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۖۚ وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝۲۳۶ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۳۷

''اور اگر تم اپنی بیویوں کو ایسی حالت میں طلاق دو کہ ابھی ان کو ہاتھ نہ لگایا ہو اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا ہو تو

دستور کے مطابق کچھ دینا ہوگا۔خوش حال مرد اپنی حیثیت کے مطابق دے کر رخصت کرے گا اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق۔ یہ لازم ہے نیک لوگوں پر۔

اور اگر تم اپنی بیویوں کو ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دو جب کہ ان کے لیے مہر بھی مقرر کر چکے تھے تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا، اس کا آدھا ادا کر دو۔ البتہ بیویاں چاہیں تو یہ آدھا بھی معاف کر سکتی ہیں۔ اسی طرح شوہر پورا مہر دینا چاہیں تو بھی دے سکتے ہیں، کیونکہ تقویٰ یہی ہے کہ نرمی اور معافی کا برتاؤ کرو۔ اور کسی حال میں بھی ایک دوسرے سے بھلائی کرنا نہ بھولو۔ بے شک تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔'' (237-236)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

تَمَسُّوْهُنَّ :...... یہ مَسٌّ اور مِسَاسٌ سے بنا ہے جس کے اصل معنی ہاتھ سے اس طرح چھونے کے ہیں کہ درمیان میں کوئی چیز حائل نہ ہو۔ مگر شریعت کی زبان کے اسلوب میں اس سے جماع مرا ہے۔

فَرِيْضَةً :......اس سے مراد مہر ہے۔

مَتِّعُوْهُنَّ :...... یہ متاع سے ہے جس کے معنی کسی چیز سے وقتی اور عارضی طور پر فائدہ اٹھانے کے ہیں۔ اسی سے متعہ اور تَمَتُّعٌ کے الفاظ ہیں جو انھی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔

اَلْمُوْسِعِ :...... یہ اَوْسَعَ سے ہے جس کے معنی خوش حالی اور فارغ البالی کے ہیں۔

اَلْمُقْتِرُ :...... یہ اِقْتَرَ سے ہے جس کے معنی تنگ دست ہونے کے ہیں۔

اَلَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ :......اس سے شوہر مراد ہے جس کو نکاح کی گرہ باندھنے اور اسے کھول دینے کا اختیار حاصل ہے۔

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ مَا لَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً ۚۖ﴾ (236)

مطلب یہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت مہر مقرر نہ ہوا، یا ابھی رخصتی نہیں ہوئی اور میاں بیوی ابھی ملے نہیں اور اس موقع پر اگر کسی سبب سے طلاق دینی پڑی تو اس میں کوئی گناہ نہیں اور ایسی طلاق بہر حال مؤثر ہو جائے گی۔

﴿وَّ مَتِّعُوْهُنَّ ۚ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَ عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ ۚ﴾ (236)

فرمایا، ایسی صورت میں نہ تو مہرِ مثل (اسی خاندان کی دوسری عورتوں کے مہر کے برابر) واجب ہوگا اور نہ پورا مہر دینا ہوگا، البتہ کچھ مال دینا پڑے گا تا کہ اس طرح عورت کا رشتہ ٹوٹنے سے اُس کو جو نقصان پہنچا ہے اس کی کچھ تلافی ہو سکے۔ خوشحال آدمی اپنی حیثیت کے مطابق مال دے گا اور غریب شخص اپنی بساط کے لحاظ سے دے گا۔

﴿مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (236)

فرمایا، اس طرح کی مطلقہ عورت کو کچھ نہ کچھ مال دیا جائے۔ جو لوگ اللہ سبحانہٗ سے ڈرتے ہیں، ظلم و زیادتی کو ناپسند کرتے ہیں اور ہر معاملے میں دوسروں سے بھلائی کرتے ہیں، ان کو چاہیے کہ وہ ضرور کچھ مال ایسی عورتوں کو دیں۔

چونکہ اس مال کی نوعیت اور مقدار کا تعین قرآن وسنت کی کسی نص سے ثابت نہیں ہے، اس لیے اس بارے میں فقہا کے درمیان اختلاف ہو گیا ہے۔ بعض نے اسے واجب اور کچھ نے مستحب قرار دیا ہے۔ فقہ حنفی میں اس کی مقدار کم سے کم پانچ درہم اور زیادہ سے زیادہ نصف مہر مثل سے کم ہے۔ یا تین کپڑوں کا وہ جوڑا ہے جو عام طور پر ایک مسلمان عورت پہنتی ہے۔

﴿ وَ اِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ وَ قَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ ﴾ (237)

اب ایسی طلاق کا ذکر ہے جو رخصتی یا ملاقات سے پہلے دی جائے اور نکاح کے وقت اس کا مہر مقرر کیا جا چکا تھا۔ ایسی صورت میں خاوند کی طرف سے عورت کو آدھا مہر دینا پڑے گا۔

﴿ اِلَّاۤ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ؕ وَ اَنْ تَعْفُوْۤا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ؕ وَ لَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ؕ ﴾ (237)

البتہ عورت خود یا اس کا ولی یہ آدھا مہر یا اس کا کچھ حصہ معاف بھی کر سکتا ہے اور خاوند چاہے تو آدھے کے بجائے پورا مہر بھی دے سکتا ہے۔ کیونکہ تقوی یہی ہے کہ مرد اور عورتیں ایک دوسرے سے اچھا برتاؤ کریں، باہمی خیر خواہی اور بھلائی کریں خواہ اس کے لیے اپنا حق بھی چھوڑنا پڑے، یا دوسرے کو اس کے حق سے زیادہ دینا پڑے۔ صرف اسی طریقے سے انسانوں کے باہمی تعلقات خوشگوار رہ سکتے ہیں۔

﴿ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۳۷ ﴾ (237)

آخر میں فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ ہر شخص کے اعمال دیکھ رہا ہے اور ان کے مطابق جزا و سزا دے گا۔ اس اسلوب میں ایک طرح کی تنبیہ پائی جاتی ہے۔

حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝۲۳۸
فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا
لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۳۹ وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۚۖ
وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ

فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۴۰﴾ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴿۲۴۱﴾ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲۴۲﴾ ع ۳۱/۷ ۱۵

’’(مسلمانو!) ساری نمازوں کی پابندی کرو اور خاص طور پر درمیانی (عصر کی) نماز کی۔ اور اللہ کے سامنے عاجزی سے کھڑے ہوا کرو۔ دشمن کا خطرہ ہو تو پیدل یا سوار، جس حالت میں بھی تم ہو، نماز پڑھ لیا کرو، جب امن ہو تو اللہ کو اس طریقے سے یاد کرو جو اس نے سکھایا ہے اور جو تمہیں پہلے معلوم نہ تھا۔

اور تم میں سے جو لوگ مرنے کے قریب ہوں اور ان کی بیویاں ہوں تو وہ اپنی بیویوں کے لیے وصیت کر جائیں کہ ایک سال تک ان کو گھر میں رکھ کر خرچہ دیا جائے پھر اگر وہ خود گھر چھوڑنا چاہیں تو دستور کے مطابق اپنے بارے میں جو کچھ کریں گی، اس کا تم پر کوئی الزام نہیں۔ بے شک اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

اور جن عورتوں کو طلاق دی جائے انھیں دستور کے مطابق کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔ یہ اللہ سے ڈرنے والوں کی ذمہ داری ہے۔ اس طرح اللہ تمہارے لیے اپنے احکام کھول کر بیان کرتا ہے تاکہ تم سمجھو۔‘‘ (238-242)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

حٰفِظُوْا :...... یہ حَافَظَ یُحَافِظُ مُحَافَظَةً سے ہے حَافَظَ عَلَی الشَّیْءِ کے معنی ہیں کسی کام کو بار بار اور ہمیشہ پابندی سے کرتے رہنا۔

اَلصَّلَوٰتِ :...... اس سے پانچ وقت کی فرض نمازیں مراد ہیں جو قرآن، سنت اور اجماع امت سے ثابت ہیں۔

اَلصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى :...... اس کے معنی درمیانی یا افضل نماز کے ہیں۔ اس بارے میں اختلاف ہے کہ یہ کون سی نماز ہے۔ اکثر مفسرین نے اس سے عصر کی فرض نماز مراد لی ہے۔

قٰنِتِيْنَ :...... یہ قانت کی جمع سالم مذکر ہے۔ اس کا مصدر قنوت ہے جس کے معنی پوری توجہ اور نہایت خشوع وخضوع کے ہیں۔

حَقًّا :...... اس کے معنی حق اور ذمہ داری کے ہیں جو بعض صورتوں میں واجب اور بعض حالتوں میں مستحب ہے۔

﴿حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى﴾ (238)

فرمایا، تمام فرض نمازوں کی پابندی کرو اور خاص طور پر ’’صلوۃ الوسطیٰ‘‘ کی۔ اس میں بہت اختلاف ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے کیا مراد ہے؟

جمہور مفسرین نے اس سے عصر کی نماز مراد لی ہے اور ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے۔ کیونکہ صحیح احادیث میں صراحت کے ساتھ آیا ہے کہ اس سے نماز عصر مراد ہے۔ ظاہر ہے صحیح حدیث کی موجودگی میں کسی اور کا قول حجت اور معتبر نہیں ہو سکتا۔

صحیح بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے غزوۂ خندق کے موقع پر فرمایا:

((مَلَا اللّٰهُ بُيُوْتَهُمْ وَقُبُوْرَهُمْ نَارًا، شَغَلُوْنَا عَنْ صَلَاةِ الْوُسْطٰى حَتّٰى غَابَتِ الشَّمْسُ))

(صحیح بخاری، رقم: 2931)

''اللہ تعالیٰ ان (مشرکین) کے گھروں اور قبروں کو آگ سے بھر دے جنہوں نے ہمیں درمیانی نماز (عصر) پڑھنے کی فرصت نہیں دی، یہاں تک کہ سورج ڈوب گیا۔''

یہی حدیث صحیح مسلم، رقم 1420، اور ترمذی رقم 2984 میں بھی موجود ہے۔

تمام نمازوں کا ذکر کر کے اس میں ایک خاص نماز کا الگ سے ذکر کیا گیا تا کہ اس کی اہمیت نمایاں ہو جائے۔ یہ بھی قرآن کا ایک اسلوب ہے کہ وہ عام کو بیان کرنے کے بعد خاص کا ذکر کر دیتا ہے۔ جیسے

1۔ ﴿وَ اِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ وَ مِنْكَ وَ مِنْ نُّوْحٍ وَّ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ﴾ (الاحزاب 33: 7)

''(اے نبی ﷺ یاد کریں) جب ہم نے تمام نبیوں سے ان کا عہد لیا۔ آپ ﷺ سے بھی، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام سے بھی (عہد لیا)۔''

اس آیت میں پہلے تمام انبیائے کرام کا عام ذکر کر کے پھر ان میں سے چند کا خاص طور پر ذکر کیا گیا۔

2۔ ﴿فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّ نَخْلٌ وَّ رُمَّانٌ﴾ (الرحمٰن 55: 68)

''ان دو (باغوں) میں پھل میوے، کھجوریں اور انار ہوں گے۔''

اس جگہ پہلے پھل میووں کا عام ذکر کیا گیا اور پھر کھجوروں اور اناروں کا خاص طور پر ذکر کیا گیا حالاں کہ وہ پھل میووں میں شامل تھے۔

﴿وَ قُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ﴿٢٣٨﴾﴾ (238)

اس کے شانِ نزول کے بارے میں تفسیر طبری میں مجاہد رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول موجود ہے کہ شروع میں صحابہ کرام نماز کے دوران میں ایک دوسرے سے بات چیت بھی کر لیتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس سے یہ مراد ہے کہ نماز کی حالت میں عاجزی اور فرماں برداری کے ساتھ مؤدب ہو کر کھڑے ہونا چاہیے اور اس دوران میں گفتگو اور بات چیت بالکل منع ہے کیونکہ اس سے نماز ٹوٹ جاتی ہے۔

﴿فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا﴾ (239)

اس آیت میں نمازِ خوف کا ذکر ہے اور قرآن کی سورہ النساء 4 آیت نمبر: 101، 102 میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دشمن (یا درندوں) کے خوف کی حالت میں پیدل یا سوار، جس حالت میں بھی ہو، نماز پڑھ لو، خواہ قبلہ رُو ہو کر، یا بغیر قبلے کی طرف منہ کیے۔ اور چاہے حرکات و سکنات پوری ہوں یا کم ہوں۔

﴿فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ﴾ (239)

پھر جب خوف کی حالت باقی نہ رہے تو امن و اطمینان کے ساتھ، قبلہ رُو ہو کر، قیام کرتے ہوئے نماز پڑھو۔

اس جگہ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ (پھر اللہ کا ذکر کرو) میں ذکر سے مراد نماز ہے کیونکہ نماز دراصل ذکر اذکار ہی کا مجموعہ ہے جیسے تسبیح، تحمید، تشہد اور قرأت وغیرہ۔

قرآن نے ایک اور مقام پر ذِكْرُ اللّٰهِ (اللہ کے ذکر) سے نمازِ جمعہ مراد لی ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِيَ لِلصَّلٰوةِ مِنْ يَّوْمِ الْجُمُعَةِ فَاسْعَوْا اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ وَذَرُوا الْبَيْعَ ﴾ (الجمعہ 62:9)

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن کی نماز کے لیے پکارا جائے تو اللہ کے ذکر کی طرف چل پڑو اور خرید و فروخت چھوڑ دو۔''

اور شریعت نے ذکر اور نماز کا جو طریقہ سکھایا ہے اسی کے مطابق ذکر کرو اور نماز ادا کرو۔ جیسا کہ ایک جگہ فرمایا:

﴿وَاذْكُرُوْهُ كَمَا هَدٰىكُمْ ﴾ (البقرہ 2:198)

''اور اللہ کو ایسے یاد کرو جیسے اس نے تمہیں بتایا ہے۔''

﴿وَ الَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَ يَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ﴾ (240)

اس سے پہلے نماز کا ذکر آیا ہے لیکن اس سے بھی پہلے نکاح و طلاق وغیرہ عائلی احکام کا مضمون بیان ہوا تھا۔ اب یہ آیتیں پہلے مضمون ہی کا گویا ضمیمہ یا تتمہ (SUPPLEMENT) ہے۔

مراد یہ ہے کہ جو خاوند مرنے کے قریب ہوں اور ان کی بیویاں موجود ہوں تو وہ اپنی بیویوں کے حق میں یہ وصیت کر جائیں کہ ان کو ایک سال تک اسی گھر میں رکھ کر نان و نفقہ یعنی خرچہ دیا جائے۔

لیکن اگر وہ بیوائیں سال ختم ہونے سے پہلے ہی وہاں سے چلی جائیں اور دستور کے مطابق کہیں اور جگہ شادی کر لیں تو اس میں کوئی حرج نہیں اور ان کے کسی ولی یا سرپرست کو اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔

یاد رہے اس آیت کا حکم بعد میں منسوخ ہو گیا تھا۔ جب بیواؤں کے لیے چار (4) ماہ دس (10) دن کی عدت مقرر ہو گئی (البقرہ 2:234) اور وراثت میں بھی ان کا حصہ متعین ہو گیا۔ (النساء 4:12)

﴿وَ اللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴾ (240)

آخر میں فرمایا اللہ سبحانہٗ غالب اور زبردست ہے کہ جو اس کی نافرمانی کرے گا، اسے وہ سزا دینے کی قدرت و طاقت رکھتا ہے۔ اور حکمت والا ہے کہ بندوں کو ایسے احکام دیتا ہے جن میں ان کا مفاد ہوتا ہے۔

﴿وَ لِلْمُطَلَّقٰتِ مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِیْنَ ۝۲۴۱﴾ (241)

اس سے پہلے آیت 236 میں صرف ایسی مطلقہ عورت کو مناسب مال دے کر رخصت کرنے کا ذکر تھا جس کی ابھی رخصتی نہ ہوئی ہو اور جس کا مہر بھی مقرر نہ ہوا ہو۔

اب اس آیت کا حکم عام مطلقہ عورت کے لیے ہے کہ اسے بھی کچھ دے دلا کر رخصت کرنا چاہیے، خالی ہاتھ نہیں بھیج دینا چاہتے۔ اسے بعض فقہا نے واجب اور کچھ نے مستحب حکم مانا ہے۔

لیکن ایک رائے یہ بھی ہے کہ اس آیت کے حکم سے مطلقہ کی عدت کا وہ نان ونفقہ اور خرچہ مراد ہے جو شوہر پر اس کی مالی حیثیت کے مطابق واجب ہوتا ہے۔

﴿كَذٰلِكَ یُبَیِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰیٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝۲۴۲﴾ (242)

مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ اپنے یہ احکام (جیسے نکاح، طلاق، عدت، رضاعت وغیرہ) وضاحت سے بیان کرتا ہے تا کہ تم لوگ ان کو اچھی طرح سمجھو لو کہ یہ سارے احکام بندوں کے فائدے کے لیے ہیں۔ ان میں سے ہر حکم اپنے پیچھے عقلی بنیاد رکھتا ہے اور مصلحت وحکمت پر مبنی ہے۔ ان احکامات پر عمل کر کے دنیا اور آخرت کی فلاح و کامرانی حاصل کی جا سکتی ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ :...... (تا کہ تم عقل سے کام لو) کے الفاظ ظاہر کر رہے ہیں کہ دین اسلام کے جملہ احکام میں عقل و حکمت کارفرما ہے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِیْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ هُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۪ فَقَالَ
لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۫ ثُمَّ اَحْیَاهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ
وَ لٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْكُرُوْنَ ۝۲۴۳ وَ قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ
سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ۝۲۴۴ مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗۤ
اَضْعَافًا كَثِیْرَةً ؕ وَ اللّٰهُ یَقْبِضُ وَ یَبْصُۜطُ ۪ وَ اِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۴۵

''کیا تم نے ان لوگوں کے واقعہ پر غور کیا جو ہزاروں کی تعداد میں تھے اور موت کے ڈر سے اپنے گھروں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اللہ نے ان کو موت کی نیند سلا دیا اور پھر زندہ کر دیا۔ بے شک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل

فرماتا ہے مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔

(مسلمانو) اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور یقین رکھو اللہ سننے ولا جاننے والا ہے۔کون ہے جو اللہ کو اچھا قرض دے؟ پھر اللہ اس کے قرض کو کئی گناہ بڑھا کر ادا کرے گا۔ (روزی اللہ کے ہاتھ میں ہے) وہ جسے چاہے کم دے اور جسے چاہے زیادہ دے آخر تم سب کو اسی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔" (243-245)

آیات کی تفسیر:

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ اُلُوْفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ ۠ فَقَالَ لَهُمُ اللّٰهُ مُوْتُوْا ۣ ثُمَّ اَحْيَاهُمْ ۭ ﴾ (243)

قرآن مجید بعض اوقات کسی خاص واقعے (Event) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اَلَمْ تَرَ (کیا تو نے نہیں دیکھا؟) کا اسلوب اختیار کرتا ہے۔ اس اسلوب میں کوئی خاص فرد یا گروہ مخاطب نہیں ہوتا بلکہ یہ خطاب عام ہوتا ہے جس میں ہر وہ شخص مخاطب ہوتا ہے جس تک یہ بات پہنچے یا جو بھی یہ بات سن رہا ہے۔ پھر اس میں ءَ (کیا؟) کا حرف استفہام بھی سوال کے لیے نہیں ہوتا بلکہ تعجب کے اظہار کے لیے یا سبق آموزی کے لیے آتا ہے۔ اسی طرح تَرَ (دیکھنا) کا لفظ بھی دیکھنے کے لیے نہیں بلکہ جاننے اور علم ہونے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں اختلاف ہے۔

بعض مفسرین کے نزدیک یہ سرے سے کوئی واقعہ ہی نہیں ہے بلکہ محض ایک تمثیل (مثال) ہے جس کا مقصد سبق آموزی اور عبرت ہے۔ لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اسے ایک تمثیل سمجھنا اور اس کے ایک واقعہ ہونے کا انکار کرنا درست نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں اَلَمْ تَرَ کا اسلوب عام طور پر کسی واقعے (Event) ہی کے لیے آتا ہے اور فرضی واقعے کے لیے نہیں آتا۔ جیسا کہ آگے اسی سورۃ کی آیت 246 میں اَلَمْ تَرَ کے ساتھ بنی اسرائیل کا ایک تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ اس اسلوب کی چند مثالیں یہ ہیں:

﴿اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ﴾ (البقرہ 2 : 258)

"کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا جسے اللہ نے بادشاہی عطا کی تھی، اس نے بادشاہی کے غرور میں ابراہیم علیہ السلام سے اس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا۔"

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ﴾ (الفیل : 1)

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

﴿اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِعَادٍ﴾ (الفجر 89 : 6)

"کیا تو نے نہیں دیکھا کہ تیرے رب نے قومِ عاد کے ساتھ کیا سلوک کیا؟"

کچھ دوسرے مفسرین یہ کہتے ہیں اس آیت میں بنی اسرائیل کا ایک واقعہ بیان ہوا ہے کہ جس میں ان کے ہزاروں لوگ طاعون کی وبا سے بچنے کے لیے اپنے شہر سے نکل بھاگے تھے۔ پھر جب وہ کسی اور جگہ پہنچے تو اچانک وہ سارے مر گئے۔ پھر وہاں سے ایک نبی گزرے تو ان کی دعا سے وہ تمام مردے زندہ ہو گئے۔

ہم سمجھتے ہیں یہ واقعہ اسرائیلیات میں سے ہے اس لیے نا قابل اعتبار ہے۔ اس کے علاوہ یہ عقل ونقل کے بھی خلاف ہے۔ اسی طرح کا ایک اور واقعہ بعض لوگوں نے بیان کیا ہے کہ ایک زمانے میں بیس (20) برس تک بنی اسرائیل پر خوف اور بزدلی طاری رہی اور یہی ان کی موت تھی۔ اس کے بعد جب اس قوم میں جرأت اور بہادری پیدا ہو گئی تو یہ ان کی زندگی ہو گئی۔ ہماری رائے میں آیت کی یہ تاویل بھی اسرائیلیات کو سچا ثابت کرنے کی فضول کوشش ہے۔

ہمارے نزدیک اس آیت میں بنی اسرائیل کا وہی قصہ مجمل طور پر بیان ہوا ہے جسے قرآن نے سورۃ المائدہ (5) کی آیات 21 تا 26 میں تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے:

﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّ فِيْهَا قَوْمًا جَبَّارِيْنَ ۖ وَ اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَا حَتّٰى يَخْرُجُوْا مِنْهَا ۚ فَاِنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا فَاِنَّا دٰخِلُوْنَ ۝ قَالَ رَجُلٰنِ مِنَ الَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوْا عَلَيْهِمُ الْبَابَ ۚ فَاِذَا دَخَلْتُمُوْهُ فَاِنَّكُمْ غٰلِبُوْنَ ۚ۬ وَ عَلَى اللّٰهِ فَتَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَ رَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَ اَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝ قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾ (المائدہ 5: 21تا26)

”اے میری قوم! پاک سرزمین فلسطین میں داخل ہو جاؤ، جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے، اور الٹے پاؤں نہ پھر جانا، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ انھوں نے کہا: اے موسیٰ! وہاں ایک زبردست قوم موجود ہے ہم ہرگز وہاں نہ جائیں گے جب تک وہ وہاں سے نکل نہ جائیں۔ جب وہ نکل جائیں، پھر ہم داخل ہوں گے۔ اس پر دو آدمی جو اللہ سے ڈرنے والوں میں سے تھے، اور ان پر اللہ کا فضل بھی تھا، کہنے لگے ”تم ان پر حملہ کر کے شہر کے پھاٹک میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم اس میں داخل ہو جاؤ گے تو فتح تمہاری ہے۔ اور اللہ پر بھروسا کرو، اگر تم ایمان والے ہو۔“ انھوں نے کہا: اے موسیٰ! جب تک دشمن کے لوگ وہاں ہیں، ہم داخل نہیں ہوں گے۔ تم اور تمہارا خداوند، دونوں جا کر لڑو، ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! میرا اپنے سوا اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر زور نہیں۔ تو ہمارے اور اس نافرمان قوم کے درمیان جدائی کر دے! اللہ نے فرمایا: وہ ملک ان پر چالیس (40) سال کے لیے حرام کر دیا گیا۔ یہ لوگ زمین پر

بھٹکتے پھریں گے۔ اے موسیٰ علیہ السلام! تم ان نافرمان لوگوں کی حالت پر افسوس نہ کرو۔''

اس سے معلوم ہوا کہ مصر کی غلامی سے نجات پانے کے بعد بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنا آبائی وطن فلسطین حاصل کرنے کے لیے وہاں پر قابض، غاصب قوم کے خلاف جہاد کریں۔ مگر انھوں نے لڑنے سے انکار کر دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ سزا دی کہ وہ چالیس (40) برس تک صحراؤں میں بھٹکتے پھرتے رہیں۔ پھر جب وہ غلامانہ ذہنیت کی بزدل نسل ختم ہوئی تو صحرا میں پلی ہوئی نئی جفاکش نسل نے یوشع بن نون (حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ) کی کمان میں فلسطین فتح کر لیا کیونکہ اس وقت تک حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام وفات پا چکے تھے۔

زیرِ نظر آیت میں بنی اسرائیل کی پہلی بزدلی کے وفات پا جانے اور ان کی جگہ نئی بہادر جفاکش نسل کے پیدا ہو جانے کو بالترتیب ان کی موت اور ان کی زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝﴾ (243)

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر بڑا فضل و کرم کرتا ہے کہ ان کو جہاد کا حکم دیتا ہے جس میں ان کے لیے عزت و وقار اور دنیا و آخرت کی بھلائی ہے، مگر اکثر لوگ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہدایت و رہنمائی کی قدر نہیں کرتے اور ناشکری کرتے ہیں۔

﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (244)

بنی اسرائیل کے واقعے سے عبرت دلانے کے بعد اب مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا گیا ہے کہ دیکھو اللہ تعالیٰ، تمہاری ہر بات سنتا، تمہارے حالات سے پوری طرح واقف اور سب کچھ جانتا ہے۔ لہٰذا وہ جہاد کا حکم دے کر تمھیں بے سہارا نہیں چھوڑ دے گا بلکہ قدم قدم پر تمہاری مدد فرمائے گا۔ جس کے نتیجے میں فتح و کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔ وہ ہر مجاہد کو، جو غازی یا شہید ہوگا پورا اجر و ثواب عطا کرے گا۔ لہٰذا بنی اسرائیل کی طرح تم جہاد کو کبھی نہ چھوڑنا اور اللہ تعالیٰ کے اس حکم پر ہمیشہ عمل کرتے رہنا۔

صحابہ کرام نے قرآن کے اس حکم پر دل و جان سے عمل کر دکھایا۔ غزوۂ بدر کے موقع پر حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے، جو قبیلہ خزرج کے سردار تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا:

اللہ کی قسم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرمائیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔ (صحیح مسلم، رقم: 4621)

اسی طرح حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ نے بھی اس موقع پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا تھا کہ:

''ہم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خداوند جا کر لڑیں۔ ہم لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں، بائیں، سامنے اور پیچھے ہر طرف سے لڑیں گے۔ یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک خوشی سے چمک اٹھا۔''

(صحیح بخاری، رقم: 3952)

موجودہ دور میں اسلام دشمنوں نے اسلامی جہاد کو دہشت گردی کا نام دے کر بدنام کرنے کی بھونڈی کوشش کی ہے اس لیے اب ہم جہاد وقتال کے بارے میں قرآن وسنت کی روشنی میں تفصیلات بیان کریں گے۔

اسلام اور جہاد وقتال

تمہید:

''جہاد'' کے لفظی معنی ''انتہائی کوشش اور جدوجہد کرنے'' کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں جہاد اُس بھرپور جدوجہد کو کہا جاتا ہے جو اللہ کی راہ میں اُس کے دین کی سربلندی کے لیے کی جائے۔

اسلام امن اور سلامتی کا دین ہے۔ وہ پوری انسانیت کے لیے امن وسکون کا پیغام ہے۔ لیکن وہ ظلم و جبر اور کفر وشرک کے غلبے کے خلاف جہاد کا حکم دیتا ہے۔

جہاد کی کئی قسمیں ہیں:

جہاد بالمال، جہاد بالقلم، جہاد باللسان، جہاد بالنفس اور جہاد بالسیف وغیرہ۔

جہاد بالمال یہ ہے کہ کوئی مسلمان اللہ تعالیٰ کی راہ میں اور دین کی سربلندی کے لیے اپنا مال خرچ کرے۔

جہاد بالقلم یہ ہے کہ تحریر کے ذریعے دین کے غلبے کی کوشش کی جائے۔

جہاد باللسان یہ ہے کہ زبان کے ذریعے اعلائے کلمۃ اللہ اور دعوتِ دین کا کام کیا جائے۔

جہاد بالنفس یہ ہے کہ نفسانی خواہشات کے خلاف جہاد کیا جائے۔ اور ان پر قابو پاتے ہوئے نفس کو اللہ و رسول ﷺ کی اطاعت پر لگایا جائے۔

جہاد بالسیف یہ ہے کہ تلوار واسلحے وغیرہ کے ذریعے باطل اور کفر کی طاقتوں کے خلاف جہاد کیا جائے۔ اس جہاد کو قتال بھی کہتے ہیں۔ یہ دفاعی بھی ہوتا ہے اور جارحانہ بھی۔

یاد رہے کہ اُردو زبان میں جہاد کا لفظ جہاد کی ان تمام اقسام کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور صرف قتال کے معنوں میں بھی جہاد کا لفظ بولا جاتا ہے۔

جہاد وقتال اسلام میں ایک اہم اور مقدس فریضہ ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔ یہ اہل اسلام کے لیے شوکت و وقار کا ذریعہ ہے۔ اس کو چھوڑنے میں ذلت و نامرادی ہے۔ یہ عام حالات میں فرضِ کفایہ ہے مگر نفیرِ عام (خاص حالات) میں فرضِ عین بن جاتا ہے جیسے نماز کا حکم ہے۔

جہاد کے بارے میں فقہائے اسلام کی رائے یہ ہے کہ:

((هو (الجهاد) فريضة محكمة و امرًا ماضياً الىٰ يوم القيامة))

(الفقہ الاسلامی مع ادلتہ از دکتور وھبہ زحیلی جلد6، ص416)

''جہاد محکم فریضہ ہے جو قیامت تک جاری رہے گا۔''

جہاد کا مقصد:

اسلام میں جہاد وقتال کا اصل مقصد دنیا سے کفر وشرک کے فتنے اور غلبے کو مٹانا، اعلائے کلمۃ اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے کلمے کو بلند کرنا اور دین حق کا بول بالا کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

﴿وَ قَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال8: 39)

''اور تم ان (کافروں) سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔''

لہٰذا جب تک دنیا میں کفر وشرک کا فتنہ اور غلبہ موجود ہے ان کے خلاف مسلمانوں کا جہاد جاری رہے گا۔

((عَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا: لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، فَمَنْ قَالَهَا، فَقَدْ عَصَمَ مِنِّيْ مَالَهٗ وَنَفْسَهٗ اِلَّا بِحَقِّهٖ وَ حِسَابُهٗ عَلَى اللّٰهِ))

(صحیح بخاری، رقم2949۔ صحیح مسلم، رقم 125)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں، جب تک وہ لا الٰہ الا اللہ کے قائل نہ ہو جائیں۔ پھر جو اس کا قائل ہو گیا تو اس نے اپنے مال اور اپنی جان کو مجھ سے بچا لیا سوائے اس کے حق کے اور اس کا حساب اللہ کے سپرد ہے۔''

(یاد رہے کہ بعض حالات میں صلح بھی ہو سکتی ہے اور جزیہ لینے کی صورت میں ذمیوں کے خلاف جہاد نہیں ہوتا)۔

ایک اور صحیح حدیث میں ہے کہ:

((عَنْ اَبِيْ مُوْسٰى رضی اللہ عنہ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ اِلَى النَّبِيِّ ﷺ، فَقَالَ الرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِلذِّكْرِ، وَالرَّجُلُ يُقَاتِلُ لِيُرٰى مَكَانُهٗ، فَمَنْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ؟ قَالَ: مَنْ قَاتَلَ لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا، فَهُوَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) (صحیح بخاری، رقم: 2810۔ صحیح مسلم، رقم: 4919۔ ابو داؤد، رقم: 2517۔ نسائی، رقم: 3136۔ ابن ماجہ، رقم: 2783)

''حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے پوچھا: ایک آدمی مالِ غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شہرت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے اور ایک اس لیے تاکہ اس کی بہادری کی نمائش ہو تو ان میں سے کون اللہ کے راستے میں لڑتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: وہ جو اس لیے جہاد کرتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، صرف وہی اللہ کے راستے میں جہاد کر رہا ہے۔''

کیا جہاد کے لیے مسلمانوں کی حکومت کا اعلان شرط ہے؟

اسلام نے اقدامی یعنی جارحانہ جہاد وقتال کے لیے جو کہ فرضِ کفایہ ہے، بعض شرائط رکھی ہیں جن میں اسلامی حکومت کا قیام اوراس کی طرف سے جہاد کے اعلان کی شرط بھی ہے۔مگر دفاعی یعنی مدافعانہ جہاد کے لیے جو کہ فرضِ عین ہے کوئی شرط نہیں رکھی۔

اہل علم جانتے ہیں کہ اسلام میں نماز جمعہ کی امامت وخطبہ، نماز عیدین کی امامت اور خطبہ، زکوٰۃ کی وصولی اور تقسیم کا نظام، مناسک حج کی ادائیگی کے لیے امیر حج اور خطبۂ حج جیسے تمام امور اصلاً حکمرانوں کی ذمہ داریاں ہیں۔مگر جب سے مسلم حکمران اپنی ان ذمہ داریوں سے غافل ہوئے ہیں، اہل اسلام اپنے طور پر یہ سارے دینی کام سرانجام دے رہے ہیں۔

بالکل یہی حال جہاد وقتال کا ہے جو کہ بنیادی طور پر مسلم حکمرانوں کی ذمہ داری ہے۔مگر جب سے انہوں نے دوسرے دینی فرائض کی طرح اس اہم دینی فریضے کو فراموش کر دیا ہے اور اسلام دشمن عناصر کے 'فرنٹ لائن اتحادی' بن گئے ہیں۔تو اللہ تعالیٰ کے بعض نیک اور صالح افراد اپنے طور پر منظم ہو کر کفار کے خلاف دفاعی جہاد کر رہے ہیں اور وہ یہ کام قیامت تک کرتے رہیں گے۔خواہ دنیا پرست اُن کو دہشت گرد کہیں یا گالیاں دیں۔

صحیح حدیث میں ہے کہ:

((عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ ﷺ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَنْ يَّبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا، تُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ))

(صحيح مسلم، رقم4953)

''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ دین (اسلام) ہمیشہ قائم رہے گا۔قیامت تک مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی خاطر جہاد کرتی رہے گی۔''

قرآن و حدیث میں جہاد وقتال کی فرضیت اور اس کے بارے میں تفصیلی فضائل اور احکامات موجود ہیں۔اس حوالے سے ہم سب سے پہلے قرآنی آیات درج کریں گے اوران کے بعد احادیث بیان کی جائیں گی۔

قرآن اور جہاد وقتال:

قرآنِ مجید کفار کے خلاف جہاد وقتال کا حکم دیتا ہے۔قرآن میں جہاد فی سبیل اللہ کا ذکر 26 مقامات پر آیا ہے اور قتال کا تذکرہ 79 جگہ پر ہے۔

1۔ ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ﴾ (البقرۃ2: 216)

''(اے مسلمانو!) تم پر قتال (جہاد) فرض کیا گیا ہے۔''

2۔ ﴿وَ قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ اعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ﴾ (البقرۃ2: 244)

”اور (اے مسلمانو!) اللہ کی راہ میں لڑو اور یقین رکھو اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔“

3. ﴿ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ ۝﴾ (التوبة9:29)

”(اے مسلمانو!) تم لڑو اُن اہل کتاب سے جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر۔ جو ان چیزوں کو حرام نہیں سمجھتے جنہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے حرام قرار دیا ہے اور وہ سچے دین کو نہیں مانتے، یہاں تک کہ وہ مغلوب ہو کر خود اپنے ہاتھوں سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔“

4. ﴿ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَآءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ۝﴾ (النساء4:75)

”اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں جہاد و قتال نہیں کرتے۔ اُن بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جو اللہ کے آگے فریاد کرتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہمیں اس بستی سے نکال جس میں ظالموں کا راج ہے۔ ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی حمایتی پیدا کر دے اور ہمارے لیے اپنے پاس سے کوئی مددگار کھڑا کر دے۔“

5. ﴿فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ﴾ (محمد47:4)

”پھر جب (اے مسلمانو!) کافروں سے تمہارا مقابلہ ہو تو ان کی گردنیں مارو۔“

6. ﴿وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ﴾ (البقرة2:190)

”اور (اے مسلمانو!) تم اللہ کے راستے میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔“

7. ﴿ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِيْنَ كَآفَّةً كَمَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ كَآفَّةً ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۝﴾ (التوبة9:36)

”اور (اے مسلمانو!) تم سب مل کر مشرکین سے جنگ کرو، جیسے وہ سب مل کر تم سے جنگ کرتے ہیں۔“

8. ﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ غِلْظَةً﴾ (التوبة9:123)

”اے ایمان والو! ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس ہیں اور ضروری ہے کہ وہ تمہارے اندر سختی پائیں۔“

9. ﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ

خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ (التوبة9: 41)

''(اے مسلمانو!) تم نکلو، خواہ ہلکے ہو یا بوجھل اور اپنے مال و جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانتے ہو۔''

10۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ اَرَضِيْتُمْ بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا مِنَ الْاٰخِرَةِ فَمَا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا قَلِيْلٌ o اِلَّا تَنْفِرُوْا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا وَّيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوْهُ شَيْـًٔا وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ o﴾ (التوبة9: 38-39)

''اے ایمان والو! تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلو تو تم زمین سے چپک جاتے ہو؟ کیا تم آخرت کے معاملے میں دنیا کی زندگی پر راضی ہوگئے؟ آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کا سامان بہت تھوڑا ہے۔ اگر تم نہ نکلو گے تو اللہ تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا اور تم اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔ اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

11۔ ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال8: 39)

''اور (اے مسلمانو!) تم کافروں سے لڑو، یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین سارے کا سارا اللہ کے لیے ہو جائے۔''

12۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ﴾ (الانفال8: 65)

''اے نبی ﷺ! مومنین کو جہاد کا شوق دلائیں۔''

13۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ﴾ (التوبة9: 73)

''اے نبی ﷺ! کافروں اور منافقوں کے خلاف جہاد کریں اور اُن پر سختی کریں۔''

14۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِيْعًا﴾

(النساء4: 71)

''اے ایمان والو! اپنے دفاع کی تیاری کرو۔ پھر دستے بنا کر یا اکٹھے مل کر جہاد کے لیے نکلا کرو۔''

15۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ o﴾

(محمد47: 7)

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ تمہاری مدد فرمائے گا۔ اور تمہارے قدم جما دے گا۔''

16۔ ﴿فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْۤا اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ

وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ﴾ (التوبة 9: 81)

''پیچھے رہ جانے والے منافقین اللہ کے رسول ﷺ سے پیچھے رہنے پر بہت خوش ہوئے اور انہیں گراں گزرا کہ وہ اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔ اُنہوں نے لوگوں سے کہا: ''گرمی میں نہ نکلو۔'' آپ اُن سے کہیں: ''دوزخ کی آگ اس سے زیادہ گرم ہے۔'' کاش! اُنہیں سمجھ ہوتی۔''

17۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾

(الصف 61: 4)

''بے شک اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اُس کی راہ میں اس طرح مل کر لڑتے ہیں گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

18۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ﴾

(الانفال 8: 45)

''اے ایمان والو! جب کسی گروہ سے تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ تم فلاح پاؤ۔''

19۔ ﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗۤ اَجْرٌ عَظِيْمٌ﴾

(التوبة 9: 20تا22)

''جو لوگ ایمان لائے، اُنہوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستے میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا، اُن کا درجہ اللہ کے ہاں بہت بڑا ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ اُن کا رب اُن کو خوش خبری دیتا ہے، اپنی رحمت اور خوشنودی کی اور ایسے باغوں کی جن میں اُن کے لیے دائمی نعمتیں ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ کے پاس بڑا اجر ہے۔''

20۔ ﴿وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾

(التوبة 9: 74)

''اور جو اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کرے، پھر شہید ہو جائے یا غازی ہو، تو ہم اُسے بڑا اجر دیں گے۔''

21۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ

لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ o یَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَیُدْخِلْکُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ وَمَسٰکِنَ طَیِّبَةً فِیْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ط ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ o وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِیْنَ o﴾ (الصف 61: 10 تا 13)

''اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت بتاؤں جو تمہیں ایک دردناک عذاب سے بچالے۔ تم اللہ اور اُس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھو اور اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔ پھر اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا، تمہیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا، جن میں نہریں بہتی ہوں گی اور ہمیشہ رہنے والے باغوں میں تمہیں عمدہ گھر عطا کرے گا۔ یہ ہے بڑی کامیابی! اور ایک اور چیز جس کی تم تمنا رکھتے ہو، وہ ہے اللہ کی مدد اور جلد حاصل ہونے والی فتح۔ اور (اے نبیؐ!) آپ ایمان والوں کو خوش خبری دے دیں۔''

22۔ ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِیْتُمُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوْهُمُ الْاَدْبَارَ o وَمَنْ یُّوَلِّهِمْ یَوْمَئِذٍ دُبُرَهٗٓ اِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ اَوْ مُتَحَیِّزًا اِلٰی فِئَةٍ فَقَدْ بَآءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰهُ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِیْرُ o﴾ (الانفال 8: 15-16)

''اے ایمان والو! جب تمہارا مقابلہ کافروں کے لشکر سے ہو، تو پیٹھ نہ دکھاؤ اور جس نے ایسے موقع پر پیٹھ دکھائی تو اُس پر اللہ کا غضب نازل ہوگا۔ اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ البتہ اگر پیچھے ہٹنا جنگی چال کے لیے ہو یا اپنے دوسرے لشکر سے جا ملنے کے لیے ہو تو اس کی اجازت ہے۔''

23۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ﴾ (التوبۃ 9: 111)

''بے شک اللہ نے مومنوں سے اُن کے جان و مال خرید لیے ہیں کہ وہ انہیں ان کے بدلے میں جنت دے گا، وہ اللہ کی راہ میں دوسروں کو ہلاک کرتے ہیں اور خود بھی شہید ہوتے ہیں۔''

24۔ ﴿قُلْ اِنْ کَانَ اٰبَآؤُکُمْ وَاَبْنَآؤُکُمْ وَاِخْوَانُکُمْ وَاَزْوَاجُکُمْ وَعَشِیْرَتُکُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ کَسَادَهَا وَمَسٰکِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَیْکُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِیْ سَبِیْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰی یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ط وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ o﴾ (التوبۃ 9: 24)

''کہہ دیجیے، اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان، تمہارا وہ مال جو تم نے کمایا، تمہارا وہ کاروبار جس کے مندا ہونے کا تمہیں اندیشہ ہے اور تمہارے رہنے کے گھر جنہیں تم پسند کرتے ہو، (یہ ساری چیزیں) تمہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اُس کی راہ میں جہاد کرنے سے

زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے۔ اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

درج بالا قرآنی آیات سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں جہاد وقتال کی بڑی اہمیت ہے۔ ایک اندازے کے مطابق قرآنِ مجید میں تین پاروں کے حجم کے برابر ایسی آیات موجود ہیں جن کا تعلق جہاد وقتال سے ہے۔

جہاد قرآن کی رُو سے فرض ہے۔ یہ دفاعی بھی ہوتا ہے اور جارحانہ بھی۔ جہاد اللہ کی راہ میں اُن کافروں کے خلاف کیا جاتا ہے جو مسلمانوں کے ملک پر حملہ کریں یا اسلام کے لیے خطرہ بن جائیں۔ یا اسلام کی راہ میں اپنے کفر وشرک اور ظلم وستم کی وجہ سے رکاوٹ بنیں۔ غیر مسلموں کے کافرانہ اور ظالمانہ اقتدار کا خاتمہ کر کے اُن کو ذمی بنانا بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ پہلے قریب کے کفار سے نپٹا جائے گا، پھر دور والوں سے۔ یہ جہاد وقتال اُس وقت تک جاری رہے گا، جب تک دنیا میں کفر وشرک کے غلبے کا فتنہ باقی ہے۔ اگر مسلمان جہاد نہیں کریں گے تو وہ اللہ تعالیٰ کے قہر وغضب کے مستحق ہوں گے اور دنیا میں ذلت اور غلامی کی زندگی بسر کریں گے۔ جہاد ہر حال میں کیا جائے گا۔ خواہ وسائل کم ہوں یا زیادہ۔

اقدامی جہاد کے لیے چند شرائط ہیں، مگر مدافعانہ جہاد کے لیے کوئی شرط نہیں۔ وہ مجاہدین اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں جو اُس کی راہ میں صف باندھ کر اس طرح لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔ مسلمانوں کو جہاد کا شوق دلایا گیا ہے۔ وہ اپنا تحفظ اور دفاع بھی کریں گے اور میدانِ جنگ میں اللہ کا ذکر کرتے ہوئے ثابت قدمی بھی دکھائیں گے۔ اللہ سبحانہٗ کا وعدہ ہے کہ وہ سچے مسلمانوں کو ہمیشہ فتح وکامرانی عطا فرمائے گا۔ جہاد سے جی چرانا منافقت کی علامت ہے۔ جو مجاہد فتح پائے وہ غازی ہے اور جو مارا جائے وہ شہید ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے دونوں سے جنت کا وعدہ کر رکھا ہے۔

احادیث اور جہاد وقتال:

خود نبی ﷺ نے 27 غزوات میں حصہ لے کر جہاد کیا۔ 56 سرایا یعنی جنگی مہمات بھیجیں۔ ذیل میں جہاد سے متعلق چند احادیث پیش کی جاتی ہیں:

1۔ ((عَنْ اَبِیْ ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ؛ قَالَ: سُئِلَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اَیُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: اِیْمَانٌ بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ. قِیْلَ ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: " اَلْجِھَادُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ." قِیْلَ ثُمَّ مَاذَا؟ قَالَ: " حَجٌّ مَبْرُوْرٌ.")) (صحیح بخاری، رقم: 26۔ صحیح مسلم 248۔ نسائی: 2624)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا گیا: اس کے بعد کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: جہاد فی سبیل اللہ۔ پوچھا گیا: اس کے بعد؟ فرمایا: مقبول حج۔''

2۔ ((عَنْ اَبِیْ ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ، قَالَ: سَاَلْتُ النَّبِیَّ ﷺ: اَیُّ الْعَمَلِ اَفْضَلُ؟ قَالَ: اِیْمَانٌ بِاللّٰہِ وَجِھَادٌ فِیْ سَبِیْلِہٖ. ......)) (صحیح بخاری، رقم: 527۔ صحیح مسلم، رقم: 248)

''حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: کون سا عمل افضل ہے؟ فرمایا: اللہ پر ایمان لانا اور اُس کی راہ میں جہاد کرنا۔''

3۔ ((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَثَلُ الْمُجَاهِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ الصَّائِمِ الْقَائِمِ الْقَانِتِ بِاٰیَاتِ اللّٰهِ، لَا یَفْتُرُ مِنْ صِیَامٍ وَلَا صَلٰوةٍ حَتّٰی یَرْجِعَ الْمُجَاهِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ.)) (صحیح بخاری، رقم: 2787۔ صحیح مسلم، رقم: 4869)

'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: '' اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہد کی مثال ایسے شخص کی ہے جو روزے رکھتا ہو، قیام کرتا ہو، قرآن کی تلاوت کرتا ہو، روزے اور (نفل) نماز میں کوتاہی نہ کرتا ہو، یہاں تک کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنے والا مجاہد واپس لوٹ آئے۔''

4۔((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: اِنْتَدَبَ اللّٰهُ لِمَنْ خَرَجَ فِیْ سَبِیْلِهٖ لَا یُخْرِجُهٗ اِلَّا اِیْمَانٌ بِیْ وَتَصْدِیْقٌ بِرُسُلِیْ، اَنْ اَرْجِعَهٗ بِمَا نَالَ مِنْ اَجْرٍ اَوْ غَنِیْمَةٍ، اَوْ اُدْخِلَهُ الْجَنَّةَ.) (صحیح بخاری، رقم: 36۔ صحیح مسلم، رقم: 4859)

'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ضمانت دی ہے کہ اُس کے راستے میں جو شخص جہاد کرے گا، جب کہ اُسے صرف مجھ پر اور پیغمبروں پر ایمان کا جذبہ گھر سے نکالے گا، تو میں ایسے شخص کو ثواب یا مالِ غنیمت کے ساتھ واپس لاؤں گا، یا اُسے جنت میں داخل کروں گا۔''

5۔ ((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْلَا اَنَّ رِجَالًا مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ لَا تَطِیْبُ اَنْفُسُهُمْ اَنْ یَّتَخَلَّفُوْا عَنِّیْ، وَلَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُهُمْ عَلَیْهِ، مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِیَّةٍ تَغْزُوْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ. وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ، لَوَدِدْتُ اَنْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ، ثُمَّ اُحْیٰی، ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیٰی، ثُمَّ اُقْتَلُ، ثُمَّ اُحْیٰی، ثُمَّ اُقْتَلُ.))

(صحیح بخاری، رقم: 2797۔ صحیح مسلم، رقم: 4864۔ نسائی، رقم: 3152)

'' حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: قسم اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ کچھ مسلمان ایسے ہیں جو جہاد میں مجھ سے پیچھے رہنا پسند نہیں کرتے (مگر) میں اُن کے لیے سواری کا انتظام نہیں کرسکتا......تو میں کبھی کسی ایسے لشکر سے پیچھے نہ رہوں جو اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے نکلتا ہے۔ اس ذات کی قسم، جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، میں پسند کرتا ہوں کہ میں اللہ کی راہ میں شہید ہو جاؤں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید ہوں، پھر زندہ کیا جاؤں، پھر شہید ہوں، پھر زندہ کیا جاؤں پھر شہید ہوں۔''

6۔ ((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : مَنْ مَاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ ، مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِّنْ نِفَاقٍ .))

(صحیح مسلم، رقم: 4931۔ ابو داؤد، رقم: 2502۔ نسائی، رقم: 3097)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جو شخص اس حال میں مرا کہ اس نے نہ جہاد کیا اور نہ اُس کے دل میں جہاد کا شوق اُبھرا تو وہ منافقت کے ایک حصے پر مرا۔''

7۔ ((عَنْ اَبِیْ اُمَامَةَ رضی اللہ عنہ ، عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ: مَنْ لَمْ یَغْزُ، وَلَمْ یُجَهِّزْ غَازِیًا ، اَوْ یَخْلُفْ غَازِیًا فِیْ اَهْلِهٖ بِخَیْرٍ ، اَصَابَهُ اللّٰهُ بِقَارِعَةٍ ...... قَبْلَ یَوْمِ الْقِیَامَةِ .))

(ابو داؤد، رقم: 2503۔ ابن ماجہ، رقم: 2762)

''حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے نہ خود جہاد کیا، نہ کسی مجاہد کو جہاد کا سامان فراہم کیا اور نہ کسی مجاہد کے پیچھے اس کے گھر والوں کی بھلائی کے ساتھ دیکھ بھال کی، تو اُسے اللہ تعالیٰ قیامت سے پہلے کسی مصیبت میں مبتلا کر دے گا۔''

8۔ ((عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: رِبَاطُ یَوْمٍ ...... فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ، خَیْرٌ مِّنَ الدُّنْیَا وَمَا عَلَیْهَا .)) (صحیح بخاری، رقم: 2892)

''سہل بن سعد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں ایک دن سرحدوں پر پہرہ دینا، دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے اس سے بہتر ہے۔''

9۔ ((عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: "لَغَدْوَةٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَوْ رَوْحَةٌ خَیْرٌ مِنَ الدُّنْیَا وَمَا فِیْهَا .")) (صحیح بخاری، رقم: 6415۔ صحیح مسلم، رقم: 4874)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے راستے میں جہاد کے لیے ایک صبح جانا اور ایک شام جانا، دنیا اور جو کچھ دنیا میں ہے، اُس سے بہتر ہے۔''

10۔ ((عَنْ سُلْمَانَ الْفَارِسِیِّ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ یَقُوْلُ: رِبَاطُ یَوْمٍ وَّلَیْلَةٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ، خَیْرٌ مِّنْ صِیَامِ شَهْرٍ وَّقِیَامِهٖ ، وَاِنْ مَاتَ جَرٰی عَلَیْهِ عَمَلُهُ الَّذِیْ کَانَ یَعْمَلُهٗ وَاُجْرِیَ عَلَیْهِ رِزْقُهٗ ، وَ اَمِنَ الْفَتَّانَ .)) (صحیح مسلم، رقم: 4938۔ نسائی، رقم: 8167)

''حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ کے راستے میں ایک دن اور ایک رات سرحدوں پر پہرہ دینا ایک مہینے کے روزوں اور اس (کی راتوں) کے قیام سے بہتر ہے۔ اگر وہ شخص اسی حالت میں فوت ہوجائے تو جو عمل وہ کرتا تھا، وہ برابر جاری رہے گا اور وہ قبر کے فتنے سے محفوظ رہے گا۔''

11۔ ((عَنْ اَبِیْ عَبْسٍ رضی اللہ عنہ ، قَالَ ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ، فَتَمَسَّہُ النَّارُ .)) (صحیح بخاری، رقم: 2811۔ ترمذی، رقم: 1632۔ نسائی، رقم: 3116)

''حضرت ابوعبس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس آدمی کے قدم اللہ کی راہ میں غبار آلود ہوئے اُس پر دوزخ کی آگ حرام ہوگئی۔''

12۔ ((عَنْ عُمَرَ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰی یَقُوْلُوْا: لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ ، فَمَنْ قَالَھَا فَقَدْ عَصَمَ مِنِّیْ مَالَہٗ وَنَفْسَہٗ اِلَّا بِحَقِّہٖ وَحِسَابُہٗ عَلَی اللّٰہِ .)) (صحیح بخاری، رقم: 1400,1399۔ صحیح مسلم، رقم: 124۔ ابو داؤد، رقم: 1556۔ نسائی، رقم: 3091)

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اُس وقت تک جنگ کروں، جب تک وہ لا الہ الا اللہ کے قائل نہ ہوجائیں۔ پھر جو اس کا قائل ہوگیا تو اس نے اپنا مال اور اپنی جان کو مجھ سے بچالیا، سوائے کسی شرعی حق کے اور اُس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔''

((نوٹ:......شرعی حق سے مراد ہے جیسے قاتل کو قصاص میں قتل کرنا۔ بعض حالات میں صلح بھی ہوسکتی ہے اور جزیہ لینے کے بعد ذمیوں کے خلاف جہاد نہیں کیا جائے گا۔))

13۔ ((عَنْ زَیْدِ بْنِ خَالِدٍ رضی اللہ عنہ ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ قَالَ: مَنْ جَھَّزَ غَازِیًا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہ فَقَدْ غَزَا ، وَمَنْ خَلَفَ غَازِیا فِیْ اَھْلِہٖ ...... فَقَدْ غَزَا .)) (صحیح بخاری، رقم: 2343۔ صحیح مسلم، رقم: 4902۔ ابو داؤد، رقم: 2509۔ نسائی، رقم: 3180)

''حضرت زید بن خالد رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے کو ساز و سامان مہیا کیا، اُس نے بھی جہاد کیا۔ اور جس نے کسی مجاہد کے اہل وعیال کی دیکھ بھال کی اُس نے بھی جہاد میں حصہ لیا۔''

14۔ ((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رضی اللہ عنہما ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: عَیْنَانِ لَا تَمَسُّھُمَا النَّارُ : عَیْنٌ بَکَتْ فِیْ خَشْیَةِ اللّٰہِ، وَعَیْنٌ بَاتَتْ تَحْرُسُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ .)) (ترمذی، رقم: 1639)

''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: دو آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ ایک وہ آنکھ جو اللہ کے خوف سے روئی۔ دوسری وہ آنکھ جو اللہ کے راستے میں رات بھر پہرہ دیتی رہی۔''

15۔ ((عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رضی اللہ عنہ ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ ﷺ، فَقَالَ: اَلرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ، وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ، وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِیُرٰی مَکَانُہٗ ، فَمَنْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ؟ قَالَ: مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَةُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا، فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ .)) (صحیح بخاری، رقم: 2310، صحیح

مسلم، رقم: 4919۔ ابو داؤد، رقم: 2517۔ نسائی، رقم: 3136۔ ابن ماجہ، رقم: 2783)

''حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے پوچھا: ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے لڑتا ہے، ایک شہرت حاصل کرنے کے لیے لڑتا ہے اور ایک اس لیے لڑتا ہے کہ اُس کی بہادری کی نمائش ہو تو ان میں سے کوئی اللہ کے راستے میں لڑتا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو محض اس لیے جہاد کرتا ہے کہ اللہ کا حکم بلند ہو، صرف وہی اللہ کے راستے میں جہاد کر رہا ہے۔''

16۔ ((عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ رضی اللہ عنہ ، اَنَّهٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: مَنْ قَاتَلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَوَاقَ نَاقَةٍ ، فَقَدْ وَجَبَتْ لَهُ الْجَنَّةُ ، وَمَنْ جُرِحَ جُرْحًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، اَوْ نُكِبَ نَكْبَةً ...... فَاِنَّهَا تَجِيْءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كَاَغْزَرِ مَا كَانَتْ ، لَوْنُهَا الزَّعْفَرَانُ ، وَرِيْحُهَا الْمِسْكُ . وَمَنْ خَرَجَ بِهٖ خُرَاجٌ ...... فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، فَاِنَّ عَلَيْهِ طَابَعَ الشُّهَدَاءِ .))

(ترمذی، رقم: 1657۔ ابو داؤد، رقم: 2541۔ نسائی، رقم: 3141)

''حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ اُنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ: جس کسی نے اللہ کے راستے میں اونٹنی کا دودھ دوہنے کے وقت کے برابر جہاد کیا، اُس کے لیے جنت واجب ہوگئی۔ اور جس شخص کو اللہ کی راہ میں زخم لگا، یا چوٹ لگی تو وہ زخم یا چوٹ قیامت کے دن اتنی بڑی ہوگی جتنی دنیا میں بڑی سے بڑی ہو۔ اُس کے خون کا رنگ زعفران کی طرح ہوگا۔ اُس کی خوشبو کستوری جیسی ہوگی۔ اور جس آدمی کو اللہ کی راہ میں پھوڑا نکل آیا تو بے شک اس پر شہیدوں کا نشان ہے۔''

17۔ ((عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: اِنْطَلَقَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ وَاَصْحَابُهٗ حَتّٰى سَبَقُوا الْمُشْرِكِيْنَ اِلٰى بَدْرٍ وَجَاءَ الْمُشْرِكُوْنَ . فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ﴿قُوْمُوْا اِلٰى جَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ﴾ قَالَ عُمَيْرُ بْنُ الْحَمَّامِ: بَخٍ بَخٍ . فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا حَمَلَكَ عَلٰى قَوْلِكَ: بَخٍ بَخٍ . قَالَ: لَا ، وَاللّٰهِ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِلَّا رِجَاءَ اَنْ اَكُوْنَ مِنْ اَهْلِهَا . قَالَ: فَاِنَّكَ مِنْ اَهْلِهَا . قَالَ: فَاَخْرَجَ تَمَرَاتٍ مِنْ قَرْنِهٖ ، فَجَعَلَ يَاْكُلُ مِنْهُنَّ . ثُمَّ قَالَ: لَئِنْ اَنَا حَيِيْتُ حَتّٰى اٰكُلَ تَمَرَاتِيْ اِنَّهَا لَحَيَاةٌ طَوِيْلَةٌ . قَالَ: فَرَمٰى بِمَا كَانَ مَعَهٗ مِنَ التَّمْرِ ، ثُمَّ قَاتَلَهُمْ حَتّٰى قُتِلَ .))

(صحیح مسلم، رقم: 4915۔ مسند احمد، رقم: 12425)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام روانہ ہوئے، یہاں تک کہ مشرکین سے پہلے بدر کے مقام پر پہنچ گئے۔ اتنے میں مشرکین بھی آ گئے۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''کھڑے ہو جاؤ! اُس جنت میں جانے کے لیے جس کی چوڑائی آسمانوں اور زمین کے برابر ہے۔''

یہ سن کر حضرت عمیر بن حمام رضی اللہ عنہما نے کہا: ''واہ واہ۔'' اس پر رسول اللہ ﷺ نے اُن سے پوچھا: ''یہ تم نے کیوں کہا؟'' اُس نے جواب دیا: ''اللہ کی قسم! یا رسول اللہ ﷺ! صرف اس اُمید پر کہ میں جنتی ہو جاؤں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا:

''بے شک تو جنتی ہے۔'' راوی نے کہا: ''اُس شخص نے اپنے ترکش سے چند کھجوریں نکالیں اور کھانے لگا۔ پھر کہنے لگا: اگر میں یہ کھجوریں کھاتا رہا تو زندگی لمبی ہو جائے گی۔ راوی نے کہا: پھر اُس نے اپنے ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں اور لڑ کر شہید ہو گیا۔''

18۔ ((عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رضی اللہ عنہما ، اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ قَالَ: اَلْقَتْلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ یُكَفِّرُ كُلَّ شَیْءٍ اِلَّا الدَّیْنَ .)) (صحیح مسلم، رقم: 4884)

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: اللہ کی راہ میں شہید ہونا قرض کے سوا تمام گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔''

19۔ ((عَنْ اَنَسٍ رضی اللہ عنہ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: مَا مِنْ اَحَدٍ یَدْخُلُ الْجَنَّةَ ، یُحِبُّ اَنْ یَرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا وَلَهٗ مَا فِی الْاَرْضِ مِنْ شَیْءٍ ، اِلَّا الشَّهِیْدُ یَتَمَنّٰی اَنْ یَرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا ، فَیُقْتَلَ عَشَرَ مَرَّاتٍ لِمَا یَرٰی مِنَ الْكَرَامَةِ .))

(صحیح بخاری، رقم: 2817۔ صحیح مسلم، 4868۔ نسائی، رقم: 3160)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کوئی شخص جو جنت میں جائے گا، کبھی دنیا میں واپس لوٹنا پسند نہیں کرے گا، اگرچہ اُسے روئے زمین کی ساری دولت دی جائے، لیکن شہید یہ آرزو کرے گا کہ وہ دنیا میں واپس جا کر دس (10) بار شہید ہو۔ کیونکہ اُسے شہادت کا مقام و مرتبہ معلوم ہوگا۔''

20۔ ((عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : لَا یُكْلَمُ اَحَدٌ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ، وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَنْ یُكْلَمُ فِیْ سَبِیْلِهٖ ...... اِلَّا جَاءَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَجُرْحُهٗ یَثْعَبُ...... دَمًا ، اَللَّوْنُ لَوْنُ الدَّمِ ، وَالرِّیْحُ رِیْحُ الْمِسْكِ .)) (صحیح بخاری، رقم: 2803۔ صحیح مسلم، رقم: 4862۔ نسائی، رقم: 3147۔ ابن ماجه، رقم: 2795)

''حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو کوئی بھی اللہ کی راہ میں زخمی ہوتا ہے ...... اور اللہ کو خوب معلوم ہے کہ اُس کی راہ میں کون زخمی ہوا...... تو وہ قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے زخم سے خون بہہ رہا ہوگا، جس کا رنگ خون جیسا ہی ہوگا، مگر خوشبو کستوری جیسی ہوگی۔''

21۔ ((عَنْ اَبِیْ قَتَادَةَ رضی اللہ عنہ ، اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَامَ فِيْهِمْ ، فَذَكَرَ لَهُمْ اَنَّ الْجِهَادَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، وَالْاِيْمَانَ بِاللّٰهِ اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ ، فَقَامَ رَجُلٌ فَقَالَ: يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اَرَءَ يْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، يُكَفِّرُ عَنِّيْ خَطَايَايَ؟ فَقَالَ لَهٗ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: نَعَمْ ، اِنْ قُتِلْتَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ ، مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ . ثُمَّ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: كَيْفَ قُلْتَ؟ فَقَالَ: اَرَءَ يْتَ اِنْ قُتِلْتُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ، اَيُكَفَّرُ عَنِّيْ خَطَايَايَ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: نَعَمْ ، وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ ، مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ ، اِلَّا الدَّيْنَ ، فَاِنَّ جِبْرِيْلَ قَالَ لِيْ ذٰلِكَ .)) (صحیح مسلم، رقم: 4880۔ ترمذی، رقم: 1712۔ نسائی، رقم: 3156)

''حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہوکر صحابہ کرام کو بتایا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنا اور اللہ پر ایمان لانا افضل کام ہیں۔

یہ سن کر ایک آدمی کھڑا ہوکر کہنے لگا: ''یا رسول اللہ ﷺ! آپؐ بتائیں اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہوجاؤں تو کیا میرے گناہ معاف ہوجائیں گے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! اگر تو اللہ کی راہ میں ثابت قدم ہو اور ثواب کی خاطر ایسا کرے، آگے بڑھے ، پیچھے نہ ہٹے اور پھر شہید ہوجائے تو تیرے گناہ معاف ہوجائیں گے۔'' اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اُس آدمی سے دریافت فرمایا: ''تو نے کیا پوچھا تھا؟''

وہ بولا: ''اگر میں اللہ کی راہ میں شہید ہوجاؤں تو کیا اس سے میرے گناہ معاف ہوجائیں گے؟''

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ہاں! جب تو ثابت قدم ہو، ثواب کی نیت رکھے، آگے بڑھے، پیچھے نہ ہٹے۔ البتہ قرض معاف نہ ہوگا۔ مجھے جبرائیل علیہ السلام نے یہی بتایا ہے۔''

22۔ ((عَنِ ابْنِ عُمَرَ ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ: اِذَا تَبَايَعْتُمْ بِالْعِيْنَةِ وَاَخَذْتُمْ اَذْنَابَ الْبَقَرِ وَرَضِيْتُمْ بِالزَّرْعِ وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ ، سَلَّطَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهٗ حَتّٰى تَرْجِعُوْا اِلٰى دِيْنِكُمْ .)) (ابی داؤد ، رقم: 3462)

''حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا کہ: جب تم بیع عینہ کروگے، بیلوں کی دُمیں تھامے کھیتی باڑی سے خوش رہوگے اور جہاد چھوڑ دوگے تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کردے گا، جسے اُس وقت تک تم سے نہیں ہٹائے گا، جب تک تم اپنے دین کی طرف واپس نہیں لوٹو گے ۔(اور جہاد نہیں کروگے۔)''

غور کیجیے اس حدیث میں صرف جہاد کو دین قرار دیا گیا ہے۔

23۔ ((عَنْ جَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ رضی اللہ عنہ ، قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: لَنْ يَّبْرَحَ هٰذَا الدِّيْنُ قَائِمًا ،

تُقَاتِلُ عَلَيْهِ عِصَابَةٌ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ حَتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ .)) (صحیح مسلم، رقم: 4953)

''حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: یہ دین (اسلام) ہمیشہ قائم رہے گا۔ قیامت تک مسلمانوں کی ایک جماعت اس کی خاطر جہاد کرتی رہے گی۔''

مذکورہ بالا احادیث کی روشنی میں جہاد و قتال کی اہمیت واضح ہوجاتی ہے کہ جہاد و قتال ایک فریضہ ہے۔ ایمان لانے کے بعد جہاد افضل ترین عمل ہے۔ جہاد ایک عبادت ہے۔ مجاہد کے ساتھ فتح و نصرت اور مالِ غنیمت کا وعدہ ہے یا پھر جنت کا وعدہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے خود جہاد کیا اور صحابہ کرام کو اس کی ترغیب فرمائی۔ جہاد سے جی چرانا منافقت ہے۔ جہاد کو چھوڑ دینے میں ذلت اور مصیبت ہے۔ ایک دن رات اسلامی سرحدوں پر پہرہ دینا، ساری دنیا کے مال و دولت سے بہتر ہے۔

راہِ جہاد میں جن قدموں پر گرد و غبار پڑ جائے اُن قدموں کو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی۔ ''جہاد قیامت تک جاری رہے گا۔''

شہید کے فضائل

کشادِ درِ دل سمجھتے ہیں اس کو
ہلاکت نہیں موت ان کی نظر میں

اسلام میں شہید کے لیے بڑی فضیلت ہے اور اسے اعلیٰ مقام و مرتبہ حاصل ہے۔ شہید وہ شخص ہے جو دین کی سربلندی کے لیے کافروں اور اسلام کے دشمنوں سے لڑتا ہوا اپنی جان دے دیتا ہے اور اس طرح اپنے ایمان پر سچائی کی گواہی دے دیتا ہے۔

قرآن و حدیث میں شہید کے لیے بہت سے فضائل بیان ہوئے ہیں۔

﴿مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضٰعِفَهٗ لَهٗٓ اَضْعَافًا كَثِيْرَةً﴾ (245)

پھر جہاد میں چونکہ مال کی بہت ضرورت ہوتی ہے اس لیے جانی قربانی کے بعد اب مالی قربانی کا الگ سے ذکر کیا گیا۔ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کو ''قرض حسن'' (اچھا قرض) کہا گیا۔ اللہ تعالیٰ اس مال کو جو اس کی راہ میں خرچ کیا جائے، حالانکہ وہ مال بھی اللہ سبحانہٗ ہی کا دیا ہوا ہوتا ہے، اپنے لیے قرض سے تعبیر کرتا ہے کہ تم میرا دیا ہوا مال مجھے قرض کے طور پر دے دو، وہ بھی سارا مال نہیں بلکہ اس میں سے کچھ حصہ دو۔

پھر قرض کے ساتھ ''حسن'' کی صفت یا شرط لگا دی اور اسے ''قرض حسنہ'' کا نام دیا جس کا مطلب یہ ہے کہ مومن جو مال بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرے، وہ کھلے دل کے ساتھ خرچ کرے، اس میں بخل نہ کرے، دکھاوے اور ریا کاری

کے لیے نہ کرے۔ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اچھا مال خرچ کرے۔ اس کے صلے میں اللہ تعالیٰ، اس ایک کے بدلے میں دس سے لے کر سات سو گنا تک، بلکہ احد پہاڑ کے برابر اجر و ثواب عطا فرمائے گا۔

﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَ يَبْصُۜطُ﴾ (245)

پھر یہ حقیقت واضح کر دی کہ اللہ تعالیٰ ہی رزق میں تنگی اور کشادگی دیتا ہے۔ وہ جسے چاہے کم روزی دے اور جسے چاہے زیادہ دے۔ اس بارے میں سارا اختیار اسی کے پاس ہے۔ انسان کی ساری تدبیریں اس کی تقدیر کے آگے بے بس ہیں۔

﴿وَ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝﴾ (245)

یہ آخر میں فرمایا کہ آج اگر اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال کے ذریعے جہاد نہیں کرو گے اور بخل اور بزدلی سے کام لو گے تو یہ دنیا کی زندگی تو عارضی ہے اس کے بعد آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر کیا جواب دو گے؟

البتہ اس میں مجاہدین کے لیے تسلی اور اطمینان کا پہلو بھی ہے کہ وہ آخرت میں اللہ سبحانہٗ کے ہاں اپنے جان و مال کی قربانی کا صلہ پانے والے ہیں۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ
ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ
عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ؕ قَالُوْا وَ مَا لَنَاۤ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآىِٕنَا ؕ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا
اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ۝٢٤٦ وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ
اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ؕ قَالُوْۤا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ
عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ؕ قَالَ
اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَ الْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ
يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝٢٤٧ وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ

اٰيَةَ مُلْكِهٖٓ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا
تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۴۸﴾ ع فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ ع ۳۲/۲/۱۶
مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ
مِنِّيْٓ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ؕ فَلَمَّا
جَاوَزَهٗ هُوَ وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَ جُنُوْدِهٖ ؕ
قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ
فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۲۴۹﴾ وَ لَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ
وَ جُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّ ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَ انْصُرْنَا عَلَى
الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۵۰﴾ فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۛ وَ قَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ اٰتٰىهُ
اللّٰهُ الْمُلْكَ وَ الْحِكْمَةَ وَ عَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ؕ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ
بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۲۵۱﴾ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَ اِنَّكَ لَمِنَ
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

”کیا تم نے اس واقعے پر غور کیا جو موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو پیش آیا؟ انھوں نے اپنے نبی سے درخواست کی آپ ہمارے لیے بادشاہ مقرر کر دیں، تاکہ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔“ نبی نے جواب دیا ایسا نہ ہو جب تم پر جہاد فرض ہو تو تم لڑنے سے انکار کر دو۔“ وہ بولے: یہ کیسے ہو سکتا ہے ہم اللہ کی راہ میں جہاد نہ کریں، ہم تو پہلے ہی گھروں سے بے گھر ہوئے اور بال بچوں سے جدا ہوئے۔“ پھر جب ان کو جہاد کا

حکم دیا گیا تو تھوڑے لوگوں کے سوا سب نے پیٹھ دکھا دی۔ اللہ ایسے ظالموں کو خوب جانتا ہے۔

ان کے نبی نے ان سے کہا: اللہ نے طالوت کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے۔" وہ بولے: اسے ہم پر حکمرانی کا کیا حق ہے؟ اس کے مقابلے میں ہم باشاہی کے زیادہ حق دار ہیں۔ اس کے پاس مال و دولت نہیں۔" نبی نے کہا: اللہ نے بادشاہی کے لیے تمہارے مقابلے میں طالوت ہی کو چنا ہے۔ اسے تم سے زیادہ قابلیت اور قوت دی ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے، بادشاہی عطا کرتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا جاننے والا ہے۔

ان کے نبی نے ان سے کہا: اللہ کی جانب سے طالوت کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اس کی بادشاہی میں تمہارے پاس وہ صندوق آجائے گا جس میں تمہارے رب کی طرف سے تمہارے لیے تسکین ہے۔ اسی میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کی چھوڑی ہوئی یادگاریں ہیں۔ فرشتوں کی نگرانی میں وہ صندوق لایا جائے گا۔ اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم یقین رکھنے والے ہو۔

جب طالوت لشکر لے کر روانہ ہوا تو اس نے ان سے کہا: اللہ تمہیں راستے میں ایک دریا کے ذریعے آزمائے گا جس نے اس کا پانی پیا، وہ میرا ساتھی نہیں، اور جس نے اسے نہ چکھا وہ میرا ساتھی ہے، البتہ اگر کسی نے اپنے ہاتھ سے چلّو بھر پانی پی لیا، تو اس کی اجازت ہے۔" مگر جب وہاں پہنچے تو تھوڑے لوگوں کے سوا سب نے خوب سیر ہو کر پانی پی لیا۔ اور جب طالوت اور اس کے (سچے) مسلمان ساتھی دریا پار کر گئے تو باقی لوگ کہنے لگے: آج ہم جالوت اور اس کی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔" لیکن جو لوگ یقین رکھتے تھے کہ انھیں ایک دن (اپنے) اللہ سے ملنا ہے، وہ پکار اٹھے: ایسا کئی بار ہوا کہ چھوٹے لشکروں نے اللہ کے حکم سے بڑے لشکروں پر فتح پائی! اللہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

پھر جب جالوت اور اس کی فوجوں سے ان کا آمنا سامنا ہوا تو انھوں نے دعا کی: اے ہمارے رب! ہم پر صبر انڈیل دے ہمارے قدم جما دے، اور ان کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ اس کے بعد انھوں نے اللہ کے حکم سے کافروں کو شکست دی۔ داوٗد علیہ السلام نے جالوت کو قتل کیا۔ اللہ نے داوٗد علیہ السلام کو بادشاہی اور دانائی عطا فرمائی۔ اس کے علاوہ بھی اللہ نے جو چاہا اسے سکھا دیا۔ اگر اللہ بعض لوگوں کے ہاتھوں دوسرے لوگوں کو اقتدار سے نہ ہٹائے تو زمین فساد سے بھر جائے۔ اس لیے اللہ دنیا والوں پر اپنا فضل فرماتا رہتا ہے۔

اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا رہے ہیں، اور بے شک آپ صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسولوں میں سے ہیں۔" (246-252)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اَلْمَلَاِ: ...... اس کی اصل مَلَاَ یَمْلَاُ ہے جس کے معنی "بھرنے" (TO FILL) کے ہیں۔ لیکن اس سے مردوں

کی وہ جماعت یا مجلسیں مراد ہوتی ہے جو باہم مشورے اور فیصلے کرتی ہے۔قدیم زمانے میں اس سے بادشاہ کے درباری مراد ہوتے تھے یا سرداروں کی مجلس مراد ہوتی تھی۔اسے آج کل کی زبان میں پنچائیت، جرگہ، کونسل، کابینہ یا پارلیمنٹ کہا جا سکتا ہے۔چونکہ ایسی مجلس آنکھوں کو نظارے سے اور دلوں کو رعب سے بھر دیتی ہے اس لیے اسے یہ نام دیا گیا۔

اِصْطَفٰهُ :......اس کا مادہ ص ف و ہے۔اس کے معنی کسی کو چن لینے اور اسے فضیلت عطا کرنے کے ہیں۔

سَکِیْنَةٌ:......یہ سَکَنَ سے ہے۔اس سے مراد ایسی چیز ہے جو دلوں کو اطمینان اور روح کو تسکین دیتی ہو۔

تَحْمِلُهُ :......حمل کے معنی بوجھ اٹھانے کے ہیں۔لیکن سفر میں کسی چیز کی حفاظت اور نگرانی کرنے والے کو بھی ''حامل'' کہتے ہیں۔خواہ وہ کوئی شے اٹھا کر لائے یا نہ اٹھائے۔ہمارے ہاں کرنسی نوٹوں پر جو''حامل ہذا'' لکھا ہوتا ہے اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔

فَصَلَ :......اس کے معنی کسی مقام، گھر یا شہر کو چھوڑ کر کسی اور طرف کو روانہ ہو جانے کے ہیں۔جیسا کہ سورہ یوسف میں ہے۔

﴿وَ لَمَّا فَصَلَتِ الْعِیْرُ قَالَ اَبُوْهُمْ اِنِّیْ لَاَجِدُ رِیْحَ یُوْسُفَ لَوْ لَآ اَنْ تُفَنِّدُوْنِ٥﴾

(یوسف12 : 94)

''اور جب وہ قافلہ روانہ ہوا تو ان کے باپ (یعقوب عَلَیْہِ السَّلَام) نے کہا:اگر تم مجھے بڑھاپے میں بہکی باتیں کرنے والا نہ سمجھو تو میں کہتا ہوں کہ مجھے یوسف عَلَیْہِ السَّلَام کی خوشبو آ رہی ہے۔''

اَلْجُنُوْدُ :......یہ جُنْدٌ کی جمع ہے جس کے معنی لشکر کے ہیں۔

یَطْعَمْهُ :......طَعِمَ الشَّیْءَ کے معنی کسی چیز کو چکھنے کے ہیں، خواہ وہ کھانے کی شے ہو یا پینے کی۔

یَظُنُّوْنَ :...... ظَنٌّ کے اصل معنی ''گمان کرنے'' کے ہیں مگر یہ یقین کرنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور اس جگہ یہی معنی مراد ہیں۔

فِئَةٌ:......اس سے لوگوں کی جماعت مراد ہوتی ہے خواہ چھوٹی ہو یا بڑی۔

بَرَزُوْا ......اس کے معنی ہیں: وہ کھلی جگہ پر یا کھلے میدان میں ظاہر ہوئے۔اسی سے مبارزت ہے جس کے معنی ہیں: مقابلے کے لیے دشمن کو للکارنا کہ میدان میں آ جاؤ۔

اَفْرِغْ :...... یہ اِفْرَاغٌ سے ہے جس کے معنی ہیں: بھرے ہوئے برتن کو انڈیل کر خالی کر دینا۔اَفْرِغْ عَلَیْنَا صَبْرًا سے مراد یہ ہے کہ ہمیں بہت زیادہ صبر و ہمت اور استقامت عطا فرما۔

ثَبِّتْ اَقْدَامَنَا :......ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔گویا ہمیں ایسی قوت دے جس سے دشمن کے مقابلے میں ہمارے قدم جمے رہیں۔ہمیں دشمن پر غلبہ حاصل ہو اور ہم فتح پا لیں۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَی الْمَلَاِ مِنْ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنْ بَعْدِ مُوْسٰی ﴾ (246)

اوپر جہاد کا ذکر آیا ہے اب اسی مناسبت سے ایک تاریخی واقعہ بیان کیا جا رہا ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد بنی اسرائیل کو قوم کو پیش آیا تھا۔

﴿ اِذْ قَالُوْا لِنَبِيٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (246)

واقعہ یوں ہے کہ بنی اسرائیل کے کچھ سرداروں نے اپنے وقت کے نبی غالباً سموئیل علیہ السلام (Samuel) سے عرض کیا کہ ان کے لیے کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے تاکہ اس کی کمان میں دشمن کے خلاف جہاد کیا جا سکے۔

یاد رہے کہ بنی اسرائیل میں کبھی تو ایسا ہوتا کہ کوئی ایک ہی شخصیت ان کے لیے نبی بھی ہوتا اور بادشاہ بھی۔ جیسا کہ داؤد علیہ السلام اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام بیک وقت نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی۔ لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا کہ نبی اور بادشاہ الگ الگ ہوتے۔ نبی کا کام دعوت و تبلیغ کرنا اور بادشاہ کا کام جہاد کرنا ہوتا اور بادشاہ نبی کے ماتحت ہوتا تھا۔

﴿ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ﴾ (246)

چونکہ ہر نبی اپنی قوم کا نباض اور ان کے حالات سے واقف ہوتا ہے، اس لیے اس نبی نے بھی سرداروں سے فرمایا کہ تم لوگ جہاد کے لیے کسی بادشاہ کا تقرر چاہتے ہو، مگر کچھ بعید نہیں کہ جب وہ مقرر ہو جائے اور جہاد فرض ہو جائے تو تم لوگ جہاد کرنے سے انکار کر بیٹھو۔

﴿ قَالُوْا وَ مَا لَنَآ اَلَّا نُقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ قَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَ اَبْنَآئِنَا ﴾
(246)

سرداروں نے جواب دیا ہم جہاد کیوں نہیں کریں گے جب کہ ہماری حالت یہ ہوگئی ہے ہم تو دشمنوں کے ہاتھوں گھروں سے بے گھر ہو چکے ہیں۔ انھوں نے ہماری عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر قیدی بنا رکھا ہے۔ اور ہم یہ ذلت زیادہ عرصے تک برداشت نہیں کر سکتے۔

﴿ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ وَ اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴾
(246)

پھر جب ان پر جہاد فرض ہوا تو ان میں سے بہت کم نکلے جو لڑنے کے لیے تیار ہوئے۔ جب کہ اکثریت نے جہاد سے منہ موڑ لیا۔ ان ظالموں اور عہد توڑنے والوں کو اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے اور ان سے حساب لے گا۔

﴿ وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوْتَ مَلِكًا ﴾ (247)

پھر نبی سموئیل علیہ السلام نے ان سرداروں سے فرمایا کہ تمہارے لیے اللہ سبحانہٗ نے طالوت کو بادشاہ مقرر کر دیا ہے۔ وہ تمہارا امیر ہے۔ لہٰذا تم لوگ اس کی اطاعت کرو اور اس کی کمان میں جہاد کرو۔

﴿ قَالُوْٓا اَنّٰى يَكُوْنُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَ نَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَ لَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ﴾ (247)

مگر سرداروں نے اعتراض کیا کہ طالوت ہمارا بادشاہ کیسے بن سکتا ہے؟ وہ ایک عام اور معمولی آدمی ہے، کوئی مال دار یا سردار نہیں ہے۔اس لیے اسے ہمارا بادشاہ بننے کا کوئی حق نہیں ہے۔ہم سرداروں میں سے کسی ایک کو بادشاہ ہونا چاہیے۔ بادشاہی کے حق دار صرف ہم سردار لوگ ہیں۔

﴿قَالَ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰىهُ عَلَيْكُمْ وَ زَادَهٗ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ؕ وَ اللّٰهُ يُؤْتِيْ مُلْكَهٗ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (247)

نبی سموئیل علیہ السلام نے ان سرداروں کے اعتراض کے جواب میں فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ نے طالوت ہی کو تمہارا بادشاہ مقرر کیا ہے جو تم سے زیادہ دماغی صلاحیت، معاملہ فہمی، دین داری اور جسمانی طاقت رکھتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلام میں قیادت و امارت کا معیار دولت یا خاندان وغیرہ نہیں ہے بلکہ اس کے لیے علم، تقویٰ اور جسمانی صحت وقوت معیار ہے۔جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (الحجرات 49: 13)

”بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔“

یاد رہے کہ خلفائے راشدین کا انتخاب بھی اسی معیار کے مطابق ہوا تھا۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جسے چاہے بادشاہی عطا کر دے۔ یہ اس کا اختیار ہے۔ وہ بڑے فضل والا اور علم والا ہے اور جانتا ہے کہ کون بادشاہی کا اہل ہے اور کون نا اہل ہے۔

﴿وَ قَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ اٰيَةَ مُلْكِهٖۤ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ التَّابُوْتُ فِيْهِ سَكِيْنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَ بَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ اٰلُ مُوْسٰى وَ اٰلُ هٰرُوْنَ تَحْمِلُهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۝ؑ﴾ (248)

پھر ان کے نبی سموئیل علیہ السلام نے فرمایا کہ طالوت کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اس کے ذریعے تمہیں اپنا کھویا ہوا تابوت یعنی صندوق واپس مل جائے گا۔ فرشتے اسے اٹھا کر طالوت کے گھر پہنچا دیں گے۔ اس میں تمہارے دلوں کے لیے اطمینان اور حوصلہ افزائی کا سامان ہے۔توریت کی تختیاں ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کے خاندان کی کچھ یادگاریں ہیں، جیسے موسیٰ علیہ السلام کا عصا وغیرہ۔ اس کے بعد اگر تم واقعی اللہ پر ایمان رکھتے ہو تو تمہیں یقین ہونا چاہیے کہ طالوت کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہی کے لیے چن لیا ہے۔لہٰذا اب پہلے کی طرح پھر اس متبرک صندوق کو میدانِ جنگ میں اپنے آگے رکھ کر دشمن کے خلاف جہاد کرو۔

﴿فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوْتُ بِالْجُنُوْدِ ۙ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ ۚ وَ مَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَاِنَّهٗ مِنِّيْۤ اِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةًۢ بِيَدِهٖ ۚ﴾ (249)

پھر جب طالوت اپنے لشکروں سمیت جہاد کے لیے روانہ ہوئے تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ

تمہیں راستے میں آنے والے ایک دریا کے ذریعے آزمائے گا، تاکہ تم میں سے اصلی اور نقلی مجاہدین کی پہچان ہو جائے۔ تم اس دریا سے پانی نہ پینا۔ جو شخص اس سے پانی پئے گا وہ میرا ساتھی نہیں ہوگا اور ہمارے لشکر کا آدمی شمار نہ ہوگا۔ البتہ جو کوئی اس میں سے تھوڑا سا چکھ لے، یا چلّو بھر پی لے تو اس کی اجازت ہے اور ایسا آدمی ہمارا اپنا بندہ ہوگا۔

﴿فَشَرِبُوْا مِنْهُ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ﴾ (249)

پھر جب وہ لشکر دریا پر پہنچا تو اس کی اکثریت نے اس میں سے خوب پانی پی لیا۔ مگر وہ تھوڑے لوگ، جو اصحابِ بدر کی تعداد کے برابر (313) تھے۔ جو صابر اور ثابت قدم تھے۔ جنھوں نے اپنے امیر کے حکم کی اطاعت کی، انھوں نے زیادہ پانی نہ پیا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر کی اطاعت ضروری ہے جب تک وہ گناہ یا معصیت کا حکم نہ دے۔

﴿فَلَمَّا جَاوَزَهٗ هُوَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۙ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ﴾ (249)

پھر جب دونوں لشکر آمنے سامنے آگئے تو وہ بے صبرے مجاہد، جنھوں نے اپنے امیر کے حکم کی نافرمانی کی تھی، اب کہنے لگے: ہماری ہمت جواب دے گئی ہے۔ ہم جالوت کے لشکر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہم جہاد نہیں کریں گے۔

﴿قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةًۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (249)

اس موقع پر وہ اصلی مجاہدین جو صابر، ثابت قدم، حوصلہ منداپنے امیر کی اطاعت کرنے والے اور آخرت پر یقین رکھنے والے تھے، بول اٹھے: کئی بار ایسا ہوا ہے کہ چھوٹے لشکروں نے اللہ کے حکم سے بڑے لشکروں پر فتح پائی ہے۔ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں اور ثابت قدم رہنے والوں کا مددگار اور حامی و ناصر ہے خواہ وہ تعداد میں تھوڑے ہی کیوں نہ ہوں۔

معلوم ہوتا ہے وہ حقیقی مجاہدین اس تاریخی حقیقت سے باخبر اور واقف تھے کہ ایک چھوٹا منظم اور حوصلہ مند لشکر بھی بڑے غیر منظم اور پست ہمت لشکر کو شکست دے سکتا ہے۔

تاریخ عالم میں اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں اور ہر زمانے میں ایسا ہو سکتا ہے۔

﴿وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴾ (250)

پھر جب عمالقہ کے بادشاہ جالوت (JULIAT) کا لشکر مقابلے میں آیا تو طالوت کے سچے مجاہدین نے جنگ شروع ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی:

''اے ہمارے رب! ہمیں صبر سے بھر دے، ہمیں ثابت قدمی عطا فرما۔ دشمنِ کفار کے مقابلے میں ہماری مدد فرما تاکہ ہمیں فتح نصیب ہو۔''

﴿فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (251)

اللہ تعالیٰ نے طالوت کے مخلص مجاہدین کی دعا قبول فرمائی۔ ان کو صبر واستقامت سے نوازا۔ ان کی غیبی مدد فرمائی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے دشمن جالوت کے لشکر کو شکست فاش ہوئی۔ وہ میدان سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرح اللہ سبحانہٗ کی یہ سنت پوری ہوئی کہ وہ اہل باطل کے مقابلے میں اہل حق کی مدد کرتا اور ان کو فتح ونصرت عطا فرماتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَكَانَ حَقًّا عَلَيْنَا نَصْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الروم 30: 47)

''اور مومنوں کی مدد کرنا ہماری ذمہ داری ہے۔''

اس سے یہ سُنت اللہ معلوم ہوئی کہ کفار کے خلاف اہل ایمان کی صرف وہی دعائیں قبول ہوتی ہیں جو میدان جنگ میں جا کر مانگی جائیں۔ رہیں فتح کے لیے وہ دعائیں جو بغیر جہاد کیے مانگی جائیں وہ قبول نہیں ہوتیں، خواہ وہ مساجد میں بلکہ حرمین شریفین میں بیٹھ کر روتے ہوئے مانگی جائیں۔

﴿وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَاٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ﴾ (251)

اس جنگ میں داؤد علیہ السلام نے کافر بادشاہ جالوت کو قتل کیا۔ جالوت کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ بڑا پہلوان اور جنگجو تھا۔ اس نے ابتدا میں جب بنی اسرائیل کے لشکر کو مبارزت کی دعوت دی تو کسی کو ہمت نہ تھی کہ اس کا مقابلہ کرے۔ لیکن داؤد علیہ السلام، جو اس وقت ایک نوجوان چرواہے تھے۔ مقابلے پر آئے اور فلاخن کے ذریعے پتھر پھینک کر اسے ہلاک کر دیا۔ بعد میں انھی داؤد علیہ السلام کو، جنھوں نے عمالقہ کے کافر بادشاہ جالوت کو مار ڈالا تھا، اللہ تعالیٰ نے علم وحکمت سے نوازا۔ نبوت سے سرفراز فرمایا۔ وہ پورے فلسطین کے حکمران بنے۔ ان کے ہاتھ میں لوہا موم ہو جاتا تھا۔ یہ معجزہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا تھا۔ وہ لوہے کی زرہیں بنا کر بیچتے اور اپنے لیے حلال روزی کماتے تھے۔ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک روز ناغہ کرتے تھے۔ جیسا کہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے:

(صحیح بخاری، رقم: 3420، صحیح مسلم، رقم: 2739)

﴿وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (251)

فرمایا، اللہ سبحانہٗ کی یہ سنت ہے کہ وہ ایک سرکش اور ظالم قوم کو اس سے بہتر کسی قوم کے ذریعے ہٹاتا رہتا ہے۔ تاکہ اس کی زمین ظلم وستم سے نہ بھر جائے، دنیا بدامنی اور قتل وغارت گری کا شکار نہ ہو جائے اور انسانیت تباہ وبرباد نہ ہو۔ اگر خالق کائنات اپنے اس قانون کے ذریعے اپنے بندوں پر اپنا یہ فضل وکرم نہ فرمائے تو زمین کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔

تاریخ انسانی نے قرآن حکیم کی اس عالمگیر صداقت کی ہمیشہ گواہی دی ہے۔

﴿تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝﴾ (252)

اب نبی ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی آیتیں ہیں جو آپ ﷺ کو سنائی جا رہی ہیں۔ ان میں جو واقعات بیان کیے گئے ہیں، وہ سب حقیقت پر مبنی ہیں۔ اہل کتاب نے ان واقعات کو پنی کتابوں میں غلط طور پر پیش کر دیا ہے۔ اصل حقیقت وہ ہے جو ہم نے اس قرآن میں وحی کے ذریعے بتا دی ہے۔ ورنہ صدیوں پرانے تاریخی واقعات کو صحیح طور پر بیان کرنا کسی ایسے شخص کے لیے کیسے ممکن تھا جو نہ لکھنا پڑھنا جانتا ہو اور جس نے نہ کسی استاد سے باقاعدہ تعلیم پائی ہو۔ یہی چیز آپ ﷺ کے سچے نبی ہونے کی دلیل ہے کہ آپ ﷺ صاحبِ وحی ہیں جن کو وحی کے ذریعے ان تمام واقعات سے آگاہ کیا گیا ہے۔

آخر میں دوبارہ نبی ﷺ کو مخاطب کر کے اطمینان دلایا گیا اور تسلی دی گئی کہ آپ ﷺ فی الواقع اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں اور صرف ہٹ دھرم مخالفین ہی آپ ﷺ کی نبوت و رسالت کا انکار کرتے ہیں۔

❁❁❁❁❁❁

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ
اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ
بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِيْنَ مِنْ بَعْدِهِمْ مِّنْ بَعْدِ مَا
جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۚ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ۝٢٥٣ ع ٣٣ ٥

''ہم نے پیغمبروں میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی۔ اُن میں بعض سے اللہ نے براہِ راست کلام فرمایا۔ بعض کے درجے بہت بلند کیے۔ ہم نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کو کھلی نشانیاں دیں اور روح القدس (جبرئیل علیہ السلام) کے ذریعے ان کی مدد فرمائی۔ اللہ چاہتا تو اس کے بعد لوگ دین کے بارے میں نہ لڑتے جب کہ اُن کے پاس واضح نشانیاں آچکی تھیں۔ اس کے باوجود انہوں نے اختلاف کیا۔ پھر اُن میں سے کوئی ایمان لایا، کوئی کافر ہوگیا۔ اللہ چاہتا تو لوگ ایک دوسرے سے نہ لڑتے، مگر اللہ وہی کرتا ہے، جو چاہتا ہے۔'' (253)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

﴿تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۘ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ﴾ (253)

اوپر حضرت محمد ﷺ کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ آپ ﷺ یقیناً ہمارے بھیجے ہوئے رسولوں میں سے ہیں۔ اب یہ بتایا گیا کہ قرآن میں جن رسولوں کا ذکر ہے آپ ﷺ ان میں شامل ہیں۔ ویسے تمام رسولوں کے حالات و واقعات قرآن میں بیان نہیں ہوئے، صرف کچھ کے ناموں اور حالات کا ذکر ہوا ہے۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر چند پیغمبروں کے تذکرے کے بعد فرمایا:

﴿وَرُسُلًا قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَرُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ عَلَيْكَ﴾ (النساء4:164)

''اور ہم نے ایسے رسول بھیجے جن کا حال ہم آپ ﷺ کو پہلے سنا چکے ہیں اور ایسے رسول بھی، جن کا حال ہم نے آپ ﷺ کو نہیں سنایا۔''

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد ہوا:

﴿وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ

عَلَيْكَ﴾ (المومن 78:40)

''اور (اے نبی ﷺ) بے شک ہم نے آپ ﷺ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے جن میں سے بعض کے حالات آپ ﷺ کو سنائے ہیں اور بعض کے حالات نہیں سنائے۔''

اب یہ وضاحت فرمائی ہے کہ تمام رسولوں کے فضائل، خصائص اور درجات میں فرق ہے اگرچہ سب صاحبِ وحی تھے، سب کو معجزے دیے گئے تھے، سب کی دعوت ایک ہی تھی، سب کو اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بھیجا تا کہ لوگ اُن کی پیروی کر کے دنیا اور آخرت کی کامیابی اور فلاح حاصل کر سکیں۔

اس سے قرآن مجید کے اُس بیان کی بھی وضاحت ہوگئی جو سورہ البقرہ (2) آیت 136 میں کچھ پیغمبروں کے ذکر کے بعد آیا ہے کہ اہل ایمان کا عقیدہ یہ ہونا چاہیے کہ:

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ﴾ (البقرہ 136:2)

''ہم ان نبیوں میں سے کسی ایک کی بھی تفریق نہیں کرتے۔''

یعنی انکار نہیں کرتے (بلکہ سب کو مانتے ہیں)۔ یا جیسے آگے چل کر آیت 285 میں آئے گا کہ:

﴿لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ﴾ (البقرہ 285:2)

''ہم کسی ایک رسول کی تفریق یعنی اُس کا انکار نہیں کرتے۔''

تو مشہور اور مسلمہ اصول تفسیر کہ اَلْقُرْاٰنُ يُفَسِّرُ بَعْضَهٗ بَعْضًا (قرآن اپنے ایک حصے کی تفسیر اپنے کسی دوسرے حصے سے کر دیتا ہے) کے مطابق یہ معلوم ہوا کہ تمام نبیوں اور رسولوں میں فضائل اور درجات کا فرق ہے۔ مگر چونکہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے مبعوث ہوئے ہیں، اس لیے سب کو ماننا اور سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اور کسی ایک کا انکار یا تفریق بین الرسل جائز نہیں ہے کہ بعض کو مانا جائے اور بعض کو نہ مانا جائے۔ کیونکہ یہ بعض کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا کفر ہے اور سب کو ماننا ایمان کا تقاضا ہے۔ جیسا کہ ایک اور مقام پر پوری وضاحت موجود ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ يَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّ يُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًاo اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ وَ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًاo وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رُسُلِهٖ وَ لَمْ يُفَرِّقُوْا بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ اُولٰٓئِكَ سَوْفَ يُؤْتِيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًاo﴾

(النساء 150:4 تا 152)

''بے شک جو لوگ اللہ اور اُس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ رسولوں کو چھوڑ کر صرف اللہ کو مانیں اور کہتے ہیں کہ ''ہم بعض رسولوں کو مانتے ہیں، بعض کو نہیں مانتے'' اور وہ چاہتے ہیں کہ کفر اور اسلام کے درمیان کوئی اور راہ نکالیں۔ ایسے لوگ پکے کافر ہیں، اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت کا عذاب تیار کر

رکھا ہے۔ لیکن جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے اور انہوں نے کسی رسول کا انکار نہ کیا، اللہ انہیں اس کا اجر دے گا۔ اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔''

یہود ونصاریٰ اس لیے گمراہ ہوئے کہ انہوں نے بعض رسولوں کو مانا اور بعض کو نہیں مانا۔ یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد ﷺ کی رسالت کا انکار کیا اور گمراہی مول لی۔ نصاریٰ نے حضرت محمد ﷺ کی نبوت ورسالت کو نہیں مانا اور گمراہی اختیار کی۔

ہدایت کا راستہ صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام نبیوں اور رسولوں کو برحق مان کر اُن سب پر ایمان لایا جائے۔ اُن کی لائی ہوئی دعوت کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ کسی ایک نبی یا رسول کا انکار بھی سب نبیوں اور رسولوں کا انکار ہے جیسے قرآن مجید کی کسی آیت یا سورت کا انکار پورے قرآن کا انکار ہے۔

پھر عام (General) کے بعد خاص (Specific) کو بیان کرنے کے اسلوب میں فرمایا کہ ان رسولوں میں بعض سے اللہ تعالیٰ نے براہِ راست کلام فرمایا جیسے موسیٰ علیہ السلام جو پھر کلیم اللہ کہلائے:

﴿وَ كَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا﴾ (النساء 164:4)

''اور موسیٰ علیہ السلام سے اللہ نے خوب کلام کیا۔''

بعض رسولوں کو بلند درجات عطا کیے گئے۔ اس سے مراد جیسا کہ تفسیر طبری میں مجاہد رحمہ اللہ کا قول ہے، حضرت محمد ﷺ مراد ہیں۔ جن کے بارے میں قرآن میں ہے کہ:

﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ﴾ (الانشراح 4:94)

''اور ہم نے آپ کا ذکر بلند کیا۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ كَانَ فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا﴾ (النساء 113:4)

''اور (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔''

صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((فُضِّلْتُ عَلَى الْأَنْبِيَاءِ بِسِتٍّ:

أُعْطِيتُ جَوَامِعَ الْكَلِمِ، وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ، وَأُحِلَّتْ لِيَ الْغَنَائِمُ، وَجُعِلَتْ لِيَ الْأَرْضُ مَسْجِدًا وَطَهُورًا، وَأُرْسِلْتُ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً، وَخُتِمَ بِيَ النَّبِيُّونَ))

(صحیح مسلم، رقم: 1167، مسند احمد، رقم: 9326)

''مجھے چھ (6) چیزوں میں دوسرے نبیوں پر فضیلت عطا کی گئی:

1۔ مجھے جوامع الکلم (مختصر الفاظ اور معانی زیادہ) دیے گئے۔

2۔ دشمن پر رعب کے ذریعے میری مدد کی گئی۔

3۔ میرے لیے مالِ غنیمت حلال ہوا۔

4۔ میرے لیے ساری زمین سجدہ گاہ اور پاک قرار دی گئی۔

5۔ مجھے تمام انسانوں کی طرف بھیجا گیا۔

6۔ اور مجھ پر نبوت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔''

اور بعض رسولوں کو کھلے معجزات دیے گئے جیسے سیدنا عیسیٰ علیہ السلام جو اللہ سبحانہٗ کے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے، پیدائشی اندھوں کو بینائی دیتے اور کوڑھ (LEPROSY) کے مریضوں کو شفایاب کرتے تھے۔

﴿وَ رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰیَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّیْنِ كَهَیْـَٔةِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْهِ فَیَكُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَ الْاَبْرَصَ وَ اُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَ اُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَ مَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِكُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَۚ۝﴾ (آل عمران 49:3)

''(وہ عیسیٰ علیہ السلام کہے گا: اے لوگو!) مجھے بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے۔ میں تمہارے رب کی طرف سے نشانی (معجزہ) لے کر آیا ہوں۔ میں تمہارے لیے مٹی سے کسی پرندے کی صورت بناتا ہوں اور اس میں پھونک مارتا ہوں تو اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتا ہے۔ میں اللہ کے حکم سے پیدائشی اندھے اور کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں۔ اللہ کے حکم سے مردے کو زندہ کرتا ہوں، اور میں تمہیں بتا سکتا ہوں تم کیا کھاتے ہو اور اپنے گھروں میں کیا ذخیرہ کرتے ہو؟ بے شک میری ان باتوں میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔''

پھر مذکورہ آیت میں عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام کا نام خصوصیت کے ساتھ لے کر اُن کا ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو کھلے اور واضح معجزات دیے اور روح القدس جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے اُن کی خاص تائید فرمائی۔ کیونکہ اہل کتاب کے دونوں گروہوں، یہود ونصاریٰ نے ان کے بارے میں افراط وتفریط سے کام لیا اور گمراہ ہوئے۔ ایک گروہ نے اُن کو اللہ کا رسول ماننے سے انکار کر دیا اور دوسرے نے اُن کو ابن اللہ یعنی اللہ کا بیٹا قرار دے دیا۔

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ الَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَیِّنٰتُ وَ لٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَ مِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ یَفْعَلُ مَا یُرِیْدُ۝﴾ (البقرہ 253:2)

''فرمایا: اگر اللہ سبحانہٗ چاہتا تو اس کے واضح احکام آجانے کے بعد یہود ونصاریٰ اور دوسری قوموں میں مذہبی اختلاف اور باہم جنگ وجدال کی نوبت نہ آتی۔ سب لوگ ایمان والے ہوتے، کوئی کافر نہ ہوتا، نہ کفر

واسلام کی لڑائی ہوتی۔ اللہ تعالیٰ سب کو زبردستی اسلام پر قائم رکھتا اور کفر سے دور رکھتا۔

جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ﴾ (المائدہ 48:5)

''اور اگر اللہ چاہتا تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا مگر اُس نے چاہا کہ وہ اپنے دیے ہوئے حکموں میں تمہاری آزمائش کرے۔ پس تم نیکیوں کی طرف بڑھو۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ لَتُسْئَلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (النحل 93:16)

''اور اگر اللہ چاہتا تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا۔ لیکن وہ گمراہ کرتا جسے چاہتا ہے اور ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے۔ اور ضرور تم سے تمہارے اعمال کی پوچھ ہوگی۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ لَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ۙ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَ لِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ؕ﴾ (ھود 119,118:11)

''اور اگر آپ ﷺ کا رب چاہتا تو لوگوں کو ایک ہی طریقے پر چلنے والی امت بنا دیتا۔ لیکن لوگ آپس میں اختلاف کرتے رہیں گے۔ سوائے اُن کے جن پر آپ ﷺ کا رب رحم فرمائے۔ باہمی اختلاف کے لیے تو اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔''

اور پھر یہ بھی فرمایا:

﴿وَ لَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ﴾ (یونس 99:10)

''اور (اے نبی ﷺ) اگر آپ ﷺ کا رب چاہتا تو روئے زمین پر بسنے والے سب لوگ ایمان لے آتے۔ تو کیا آپ ﷺ ان لوگوں کو ایمان لانے پر مجبور کریں گے۔''

لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ نہ تھی۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہے اور جسے کوئی بدل نہیں سکتا کہ یہ دنیا دارالامتحان اور دارالعمل ہے۔ لوگوں کو نیکی اور بدی کی تمیز دی گئی۔ وحی کی واضح ہدایات اور احکام دیے گئے۔ معجزات دکھائے گئے۔ انسانوں کو آزادی دی گئی کہ وہ اپنی مرضی سے چاہے نیکی کی راہ اپنالیں یا بدی کا راستہ اختیار کرلیں۔ پھر جو لوگ نیکی کی راہ اپناتے ہیں، اللہ اُن سے راضی ہوتا ہے

اوران کو آخرت میں جنت کی نعمتیں دے گا۔ جو لوگ بدی کا راستہ اختیار کرتے ہیں، اللہ اُن کو ناپسند کرتا ہے اور ایسے لوگ آخرت میں دوزخ کا عذاب بھگتیں گے۔

آخر میں فرمایا: وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ کہ اللہ سبحانہ کسی کا پابند نہیں۔ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ وہ جو چاہے کرے، کوئی اُس سے پوچھنے والا نہیں۔

﴿فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ﴾ (البروج 16:85)

''وہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے۔''

﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَ هُمْ يُسْئَلُوْنَ﴾ (الانبیاء 23:21)

''اللہ جو کچھ کرے اُس سے باز پُرس نہیں ہو سکتی۔ لیکن لوگوں سے باز پُرس ہونی چاہیے۔''

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ؕ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿٢٥٤﴾ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿٢٥٥﴾

''اے ایمان والو! ہمارے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو، اس سے پہلے کہ قیامت کا دن آجائے جس میں نہ خرید وفروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئے گی اور نہ سفارش چلے گی۔ جو لوگ اس حکم کو نہ مانیں، وہ کافر ہیں اور وہ نقصان اٹھائیں گے۔

اللہ وہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ زندہ اور سب کو سنبھالنے والا ہے۔ اُسے نہ اُونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اُسی کا ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے۔ کون ہے جو اُس کے پاس اُس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ وہ سب جانتا ہے جو کچھ لوگوں کے سامنے ہے اور جو کچھ اُن سے پوشیدہ ہے۔ لوگ اُس کے علم میں سے کسی چیز کا احاطہ نہیں کر سکتے مگر جو وہ چاہے۔ اُس کی کرسی آسمانوں اور زمین پر پھیلی ہوئی ہے۔ کائنات کا نظام چلانے سے وہ ہرگز نہیں تھکتا۔ وہ بلند مرتبے والا اور بڑی عظمت والا ہے۔'' (255-254)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

يَوْمٌ:......اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔

بَيْعٌ:......اس سے مراد عام تجارت نہیں ہے بلکہ اس سے فدیے کے لین دین کی نفی کی گئی ہے۔

اَلْكَافِرِيْنَ:......اس جگہ کافروں سے مراد وہ لوگ ہیں جو زکوٰۃ کے حکم کے منکر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مانعینِ زکوٰۃ یعنی زکوٰۃ نہ دینے والوں کو غیر مسلم قرار دے کر اُن کے خلاف جہاد کیا تھا۔

اَلظّٰلِمُوْنَ:......موقع دلیل ہے کہ اس جگہ اُن لوگوں کو ظالم کہا گیا ہے جو مال کو صحیح طور پر خرچ نہیں کرتے، بلکہ بخل سے کام لیتے یا فضول خرچی کرتے ہیں۔

اَلْقَيُّوْمُ:...... یہ قائم سے مبالغے کا صیغہ ہے۔ اس سے مراد اللہ تعالیٰ ہے جو خود اپنی ذات سے قائم اور دوسروں کو قائم رکھنے والا، اُن کا کفیل، اُن کا منتظم اور اُن کو سنبھالنے تھامنے والا ہے۔ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت اور اُس کے اسمائے حسنیٰ میں سے ہے۔

جیسا کہ ارشاد ہوا:

﴿اَفَمَنْ هُوَ قَآئِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (الرعد 33:13)

''کیا پھر وہ (اللہ) جو ہر شخص کے اعمال پر نگران اور اُن کا حساب لینے والا ہے۔''

كُرْسِيٌّ:......اس سے علم الٰہی مراد لیا گیا ہے۔ اور بعض اس سے اقتدار کی کرسی مراد لیتے ہیں۔

لَا يَؤُدُهٗ:...... آدَ يَئُوْدُ اَوْدًا کے معنی ہیں کسی چیز کا بھاری، گراں اور پُر مشقت ہونا۔

اَلْعَلِيُّ:......ایسا بلند و برتر جو ہر مثال اور شریک سے بالا اور ماوراء ہے۔

اَلْعَظِيْمُ:......وہ ذات جو بڑائی اور عظمت میں بے مثال ہے۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيْهِ وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ ۭ وَالْكٰفِرُوْنَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴾ (254)

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے اہل ایمان کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی زندگی کے ہر لمحے کو غنیمت جانتے ہوئے اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کریں، ورنہ جب موت آئے گی تو پھر یہ نیکی کمانے کا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا۔

اس آیت میں درج ذیل امور بیان ہوئے ہیں:

1۔ اہل ایمان کو اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے (زکوٰۃ، صدقات، جہاد کی تیاری اور خیرات وغیرہ) کی ترغیب دی گئی ہے۔

قرآن مجید میں جہاں بھی اَنْفِقُوْا (خرچ کرو) کا لفظ آیا ہے اس سے انفاق فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا مراد ہے۔

2۔ یہ حقیقت بھی واضح کی گئی کہ لوگوں کا مال دراصل اُن کا اپنا مال نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ اس لیے وہی یہ حق رکھتا ہے کہ اسی کے حکم کے مطابق، اسی کی رضا کے لیے اور اسی کی راہ میں خرچ کیا جائے۔

3۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت وشفقت اور کمال مہربانی دیکھیے کہ وہ اپنے بندوں کو یہ حکم نہیں دے رہا کہ اس کا عطا کیا ہوا سارا مال اس کی راہ میں خرچ کردو۔ بلکہ صرف یہ حکم دے رہا ہے کہ ہمارے دیے ہوئے مال میں سے کچھ مال ہماری راہ میں بھی خرچ کرو۔ مثلاً زکوٰۃ صرف ڈھائی فیصد (2½٪) ہے۔ ظاہر ہے اگر سارا مال خرچ کرنے کا حکم دیا جاتا تو کتنا مشکل اور دشوار ہوتا۔ اس لیے اللہ سبحانہٗ نے اپنے بندوں کو ایسا حکم دیا ہے جس پر عمل کرنا ان کے لیے آسان ہے۔

4۔ اس آیت میں مرنے سے پہلے پہلے خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ کیونکہ مرنے کے بعد اس کا موقع نہیں رہے گا۔ یہ چیز بھی بندوں پر اللہ سبحانہٗ کی کمال مہربانی اور شفقت ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا کہ اس کے بندے آج غفلت میں پڑے رہیں اور آخرت میں برے انجام سے دو چار ہوں۔ لہٰذا لوگوں کو چاہیے کہ وہ نیکی کے کام میں جلدی کیا کریں، ورنہ مرنے کے بعد نیک اعمال کا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ پھر ہر شخص آخرت کے اُس عالم میں چلا جائے گا جہاں نہ خرید وفروخت ہوگی، نہ دوستی کا تعلق باقی رہے گا اور نہ کوئی سفارش چلے گی۔

آیت کے آخر میں فرمایا کہ ”کافر ہی ظالم ہیں۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اس کی راہ میں خرچ نہ کرنا کفرانِ نعمت ہے جو کہ عملی کفر بھی ہے اور ظلم بھی ہے کہ دوسرے محتاج کو اس کا حق نہیں دیا جا رہا۔

پھر ظاہر ہے کہ کافروں اور ظالموں کا انجام بہت برا ہوگا اس لیے اہل ایمان کو کافر اور ظالم بننے سے بچنا چاہیے اور انفاق فی سبیل اللہ کرتے رہنا چاہیے۔

اس آیت کی نظیر یہ ہے:

﴿وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ﴾ (البقرہ 2:123)

”اور اُس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے کام نہ آئے گا، نہ کسی سے معاوضہ لے کر چھوڑا جائے گا، نہ کوئی سفارش چلے گی اور نہ کہیں سے کوئی مدد مل سکے گی۔“

﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ۭ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ۭ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَاۗءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا يَـــُٔـــوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ ﴿۲۵۵﴾﴾ (255)

یہ ”آیت الکرسی“ ہے۔ صحیح حدیث میں اسے قرآن کی سب سے افضل آیت قرار دیا گیا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا:

((يَا اَبَا الْمُنْذِرِ! اَتَدْرِیْ اَیُّ اٰیَةٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ مَعَكَ اَعْظَمُ؟ قَالَ: قُلْتُ: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ ، قَالَ: يَا اَبَا الْمُنْذِرِ! اَتَدْرِیْ اَیُّ اٰیَةٍ مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ مَعَكَ اَعْظَمُ؟ قُلْتُ: (اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ) قَالَ: فَضَرَبَ فِیْ صَدْرِیْ ، وَقَالَ: (وَاللّٰهِ) لِيَهْنِكَ الْعِلْمُ يَا اَبَا الْمُنْذِرِ)) (صحیح مسلم، رقم: 1885)

''اے ابومنذر! (یہ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ کی کنیت ہے) کیا تم جانتے ہو تمہارے پاس اللہ کی کتاب (قرآن مجید) کی سب سے عظیم اور افضل آیت کون سی ہے؟ میں نے عرض کیا: اللہ اور اُس کا رسول ﷺ بہتر جانتے ہیں۔ آپ ﷺ نے پھر پوچھا: اے ابوالمنذر! جانتے ہو تمہارے پاس اللہ کی کتاب کی سب سے زیادہ عظمت والی اور افضل آیت کون سی ہے؟ میں نے عرض کیا: اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ: (آیت الکرسی) یہ سن کر حضور ﷺ نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر فرمایا: ابومنذر! تمہیں علم مبارک ہو۔''

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی توحید بیان ہوئی ہے اور شرک کی نفی کی گئی ہے۔

فرمایا: اللہ کے سوا کوئی اور معبود نہیں، صرف وہی عبادت کے لائق اور معبودِ برحق ہے۔ وہ ہمیشہ سے زندہ وموجود ہے اور ہمیشہ زندہ وموجود رہے گا۔ پوری کائنات کا نظام اُس کے ہاتھ میں ہے۔ وہی تمام مخلوقات کی ضروریات پوری کرتا اور سب کا نگہبان ہے۔ اُسے نہ اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ اس لیے وہ کسی لمحے بھی اپنی مخلوق سے غافل اور بے خبر نہیں ہوتا۔ وہ ساری کائنات کا مالک، خالق اور آقا ہے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے سامنے اس کی اجازت کے بغیر کسی کے لیے سفارش کر سکے۔ اُس کا علم ہر شے پر حاوی ہے۔ کوئی مخلوق اس کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ البتہ وہ جسے چاہے، اپنے علم میں سے کچھ عطا کر دے۔ اُس کے دائرۂ علم سے یا اُس کی کرسیِ اقتدار سے کوئی چیز باہر نہیں۔ ہر چیز اُسی کے تابع ہے۔ سب پر اُسی کا حکم چلتا ہے۔ کائنات کا نظام سنبھالنے اور تدبیرِ اُمور کرنے میں اُسے ذرا مشکل پیش نہیں آتی۔ اس کام کی وجہ سے نہ وہ تھکتا ہے اور نہ اُکتاتا ہے۔ وہ بلند مرتبہ، اونچی شان والا اور سب پر غالب ہے۔ وہی عظمت والا، بڑائی اور کبریائی والا اور سب سے بڑا ہے۔

یہ آیت الکرسی اس اعتبار سے قرآن مجید کی سب سے اعلیٰ اور افضل سورت ہے کہ اس میں سولہ (16) مرتبہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات اور اختیارات کا ذکر آیا ہے، اور یہ خصوصیت اور انفرادیت قرآن کی کسی اور آیت کو حاصل نہیں ہے۔

مصیبت اور آفت سے بچنے اور شیاطین کے برے اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے اس آیت کا پڑھنا بہت فائدہ مند ہے، بالخصوص جب اسے ہر نماز کے بعد پڑھا جائے یا سوتے وقت پڑھ لی جائے۔

لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ ۣۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ
وَ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ۭ
وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥٦﴾ اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ
الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ڛ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓــــُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ
مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥٧﴾ ع

وقف لازم ۳۴ ع ۲

”دین اسلام قبول کرنے میں کوئی زبردستی نہیں۔ ہدایت اور گمراہی واضح ہو چکی ہیں۔ جو شیطان کو نہ مانے اور اللہ پر ایمان لائے، اُس نے مضبوط سہارا پکڑ لیا، جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں۔ اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔
اللہ کارساز ہے ایمان والوں کا جو اُنہیں اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ مگر کافروں کے دوست شیطان ہیں جو اُن کو روشنی سے نکال کر اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ لوگ دوزخی ہیں اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔“ (257-256)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

فِي الدِّيْنِ:......اس سے فِيْ دُخُوْلِ الدِّيْنِ مراد ہے۔ کہ دین میں داخل ہونے پر جبر و اِکراہ اور زبردستی نہیں ہے۔

اَلرُّشْدُ:......رُشد اور رَشاد دونوں کے معنی ہدایت کے ہیں۔

اَلطَّاغُوْت:...... یہ طَغٰی اور طُغْيَانٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں حد سے آگے بڑھ جانا، حد سے باہر نکل جانا۔ طاغوت سے ہر وہ چیز مراد ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت وبندگی کے دائرے سے باہر نکل جائے، یا باہر نکل جانے کا سبب اور ذریعہ ہو۔ شیطان، بت اور ہر باطل شے طاغوت ہے۔

اَلْعُرْوَةِ:......اس کے معنی ہیں: گول حلقہ، دستہ یا کنڈا۔

اَلْوُثْقٰى:...... یہ اَوْثَقُ کا مونث ہے جس کے معنی مضبوط رسّے کے ہیں۔

اِنْفِصَامَ:......اس کے معنی ہیں: ٹوٹنا، کٹ جانا۔

وَلِيُّ:......اس کے معنی مددگار، حمایتی، دوست اور کارساز کے ہیں۔

اَلظُّلُمٰتِ:......(اندھیرے) اس سے کفر، شرک، نفاق اور ہر قسم کی گمراہی کے اندھیرے مراد ہیں۔

اَلنُّوْرِ:......(روشنی) اس سے ہدایت، ایمان اور نیک اعمال مراد ہیں۔

﴿لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ﴾ (256)

اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کو دین میں زبردستی داخل نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے الفاظ میں کسی انسان کو زبردستی مسلمان بنانا جائز نہیں۔ ہر کسی کو اختیار ہے خواہ وہ دینِ اسلام کو قبول کرے یا نہ کرے، ایمان لائے یا کفر پر چلے مگر اپنا انجام سوچ لے۔

جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (الکهف 18:29)

''اور کہہ دیجیے یہ قرآن حق ہے۔ تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے۔ اب جس کا جی چاہے اسے مان لے، جس کا جی چاہے نہ مانے......''

گویا ہدایت اور گمراہی کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے جبر کو پسند نہیں فرمایا:

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمانوں نے کبھی کسی غیر مسلم کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا، جب کہ دوسرے مذاہب والوں نے مثلاً ہندوؤں اور عیسائیوں نے دوسرے لوگوں کو ہندومت اور عیسائیت میں جبری طور پر داخل کیا۔

لیکن قرآن کے اس حکم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ مختلف جرائم پر مجرموں کو سزائیں نہ دی جائیں۔ یا کفار کے خلاف جہاد و قتال درست نہیں، یا اسلام میں مرتد ہونے کی کھلی چھٹی ہے۔ بلکہ اسلامی شریعت میں ہر مجرم پر حد یا تعزیر نافذ ہوگی اور ارتداد یعنی مرتد ہونے کی سزا قتل ہے۔ گویا اسلام میں داخل ہونے یا نہ ہونے کی تو آزادی ہے مگر اسلام چھوڑنے پر پابندی ہے۔ اس کی تفصیل آیت 217 کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

﴿قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا وَ اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝﴾ (256)

فرمایا: نبی ﷺ اور قرآن مجید کے ذریعے ہدایت اور گمراہی کو واضح کردیا گیا ہے۔ اب جو شخص ہدایت اور ایمان کی راہ اختیار کرے گا، اُسے ایک بڑا مضبوط سہارا مل جائے گا، جو کسی حال میں بھی اُس کا ساتھ نہ چھوڑے گا، بلکہ ہر جگہ اُس کا مددگار معاون اور رہنما ہوگا۔ مگر جو طاغوت یا شیطان کے پیچھے چلے گا اور گمراہی اختیار کرے گا تو وہ اپنا انجام بھی سوچ لے کیونکہ اللہ سبحانہٗ ہر بات سنتا اور دلوں کے بھید جانتا ہے۔ وہ ہر ایک کو اُس کے اعمال کے لحاظ سے جزا یا سزا دے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ پر ایمان لانے سے پہلے شیطان اور طاغوت سے انکار کرنا ضروری ہے۔ جب تک جھوٹے خداؤں سے سرکشی اور بغاوت نہ کی جائے، سچے خدا کی اطاعت اور فرماں برداری نہیں ہوسکتی۔ کلمہ طیبہ (یا کلمۂ اسلام) کے پہلے حصے کی تعلیم بھی یہی ہے کہ پہلے نفی کی جائے جھوٹے معبودوں کی، پھر اثبات کیا جائے اللہ واحد کے معبود برحق ہونے کا:

لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهَ: کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے۔

اور یہ بالکل ناقابل فہم بات ہے کہ اللہ سے محبت کا دعویٰ ہو اور دوستی شیطان اور طاغوت سے کی جائے۔

﴿اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۙ يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰٓـئُهُمُ الطَّاغُوْتُ ۙ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ (257)

فرمایا: اللہ سبحانہٗ اہل ایمان کا دوست، مددگار اور کارساز ہے جو اُن کو کفر وشرک، گمراہی وبدعت اور جہالت وتشکیک کے اندھیروں سے نکالتا ہے اور اُن کو علم ویقین، ایمان وہدایت اور جنت کے راستے کی روشنی کی طرف لاتا ہے۔ جب کہ کفار ومشرکین کے ساتھی طاغوت اور شیطان ہیں جو اُن کو ایمان وہدایت کی روشنی سے محروم کرکے خواہش پرستی، کفر وشرک، گمراہی وبدعت اور جہالت وتشکیک کے اندھیروں کی طرف دھکیلتے ہیں۔

آیت میں ظلمات (اندھیرے) جمع اور اُس کے مقابل میں نور (روشنی) واحد آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کفر وشرک اور گمراہی کے شیطانی راستے بے شمار ہیں جب کہ ایمان وہدایت کی شاہراہ صراط مستقیم ایک ہی ہے۔ جیسا کہ سورۂ الانعام میں فرمایا ہے:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (الانعام 153:6)

''اور یہ کہ یہی میری سیدھی شاہراہ ہے۔ اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو، ورنہ وہ تمہیں اللہ کے راستے سے جدا کر دیں گے۔ اللہ نے اس بات کی تمہیں تاکید فرمائی ہے تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ۔''

اور اسی مضمون کی تشریح میں وہ حدیث موجود ہے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے روایت کی ہے کہ

((خَطَّ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خَطًّا، ثُمَّ قَالَ: هٰذَا سَبِيْلُ اللّٰهِ، ثُمَّ خَطَّ خُطُوْطًا عَنْ يَمِيْنِهٖ وَعَنْ شِمَالِهٖ، وَقَالَ: هٰذِهٖ سُبُلٌ، عَلٰى كُلِّ سَبِيْلٍ مِنْهَا شَيْطَانٌ يَدْعُوْا اِلَيْهِ، وَقَرَءَ "وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ...... اَلْاٰيَةَ))

(ابن ماجه، رقم: 11، دارمی، رقم: 202، مسند احمد، 435/1، رقم: 4142)

''رسول اللہ ﷺ نے ہمارے لیے ایک خط کھینچا (لکیر کھینچی)۔ پھر فرمایا: یہ اللہ کا راستہ ہے۔ پھر آپ ﷺ نے اس خط کے دائیں بائیں کچھ اور خط کھینچے اور فرمایا: یہ مختلف راہیں ہیں۔ ان میں سے ہر ایک راہ پر ایک شیطان موجود ہے جو اس راہ کی طرف بلاتا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ﴾ (الانعام 153:6) (یہ پوری آیت اور اس کا ترجمہ اوپر گزر چکا ہے۔)

اسی طرح نورِ ہدایت عطا کرنے والا اللہ ایک ہے اس لیے وَلِیُّ کا لفظ واحد آیا ہے۔ مگر گمراہ کرنے والے شیاطین وطواغیت لاتعداد ہیں، اس لیے ان کے لیے جمع کا صیغہ اَوْلِیَآءُ استعمال ہوا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ ایسے کافروں اور گمراہوں کا انجام دوزخ کی آگ ہے جس کے عذاب میں وہ ہمیشہ گرفتار رہیں گے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِيْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّيَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَ يُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْيٖ وَ اُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِيْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ﴿۲۵۸﴾

''کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا جسے اللہ نے بادشاہی عطا کی تھی۔ اُس نے بادشاہی کے غرور میں ابراہیم علیہ السلام سے اُس کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میرا رب وہ ہے جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت ہے۔ وہ بولا: ''زندگی اور موت میرے اختیار میں بھی ہے۔'' ابراہیم علیہ السلام نے کہا: ''اچھا، اللہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے، تم اسے مغرب سے نکال دکھاؤ؟'' اس پر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔ اور اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' (258)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اَلَمْ تَرَ: ......اس میں (اَ) کا استفہام انکاری ہے۔ گویا یہ سوال کے لیے نہیں بلکہ تعجب کے لیے ہے اور اس کا مقصد مخاطب کو متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ سورۃ الفیل کے شروع میں بھی یہ اسی مفہوم میں ہے۔ یہ خطاب عام ہوتا ہے اور کوئی خاص شخص یا گروہ اس کا مخاطب نہیں ہوتا۔

الَّذِیْ: ......اس سے ایک کافر بادشاہ نمرود مراد ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ہم عصر (CONTEMPORARY) تھا۔

حَآجَّ: ......اس کے معنی جَادَلَ کے ہیں۔ گویا ایسا مکالمہ اور مباحثہ جس میں ہر فریق اپنی بات کو دلیل کے ساتھ پیش کرے۔

اَنْ: ......اس سے پہلے کوئی حرفِ جار جیسے لِ یا بِ وغیرہ محذوف ہے۔ جو وجہ اور سبب کو ظاہر کردے۔

فَبُهِتَ: ......بُهِتَ یہ اگرچہ مجہول ہے مگر اسی حالت پر مبنی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی مثال يُهْرَعُوْنَ ہے، جو مجہول ہے اور مبنی کی حالت میں مستعمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَ جَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ﴾ (ھود 11:78)

''اور اُس کی قوم اُس کی طرف دوڑتی ہوئی آئی۔''

بُهِتَ:...... کے معنی ہیں: مبہوت ہونا، ہکّا بکّا رہ جانا، لاجواب ہو جانا۔

اَلظّٰلِمِیْنَ:...... اس جگہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو واضح دلائل اور کھلے حقائق کا انکار کر دیتے ہیں۔

﴿ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ﴾ (258)

اس سے پہلے یہ مضمون بیان ہوا تھا کہ اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دوست اور مددگار ہے جو اُن کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی کی طرف لاتا ہے۔ جب کہ کافروں کے دوست شیطان اور طاغوت ہیں جو اُن کو ہدایت کی روشنی سے نکال کر گمراہی کے اندھیروں کی طرف دھکیل دیتے ہیں۔

اب اسی حقیقت کو ایک واقعاتی مثال کے ذریعے سمجھایا جا رہا ہے جس میں ہدایت اور گمراہی کے دونوں نمونے پائے جاتے ہیں۔

اس آیت میں نمرود (بن کنعان بن سام بن نوح عَلَیْہِ السَّلام) کا واقعہ ہے جو بابل (عراق) کا ایک مشرک، متکبر اور خدائی کا دعوے دار کافر بادشاہ تھا۔ وہ ابراہیم عَلَیْہِ السَّلام کا ہم عصر (CONTEMPORARY) تھا۔ اُس نے ابراہیم عَلَیْہِ السَّلام سے اُس کے معبود رب کے بارے میں مناظرہ کیا تھا جس کا ذکر تالمود (TALMUD) میں، جو کہ توریت کی شرح ہے، موجود ہے۔

نمرود کو اپنی بادشاہی اور اقتدار کا غرور بھی تھا اور وہ خدائی کا دعوے دار بھی تھا۔ لوگ اُسے سورج دیوتا کا اوتار سمجھ کر اُس کی پوجا بھی کرتے تھے۔ اس طرح وہ خدائی بادشاہ (KING GOD) تھا۔ جب ابراہیم عَلَیْہِ السَّلام نے قوم کے بت خانے میں گھس کر اُن کے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تو اس پر نمرود نے ابراہیم عَلَیْہِ السَّلام کو بلایا اور آپ سے سوال کیا کہ تم کس رب کو معبود مان کر اُس کی عبادت کرتے ہو۔

﴿ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَ يُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَ اُمِيْتُ ؕ ﴾ (258)

جواب میں ابراہیم عَلَیْہِ السَّلام نے فرمایا: میں صرف اُس رب کو معبود مانتا ہوں جس کے ہاتھ میں زندگی اور موت کا اختیار ہے۔ نمرود بولا: یہ اختیار تو میرے ہاتھ میں بھی ہے۔ پھر جیسا کہ عبداللہ بن عباس رَضِیَ اللہُ عَنْہُ کا قول ہے، اُس نے قید خانے سے دو قیدی منگوائے۔ اُن میں سے ایک کو آزاد اور بری کر دیا، دوسرے کو قتل کر دیا اور بعد میں کہنے لگا: دیکھو، میں بھی زندگی اور موت کا اختیار رکھتا ہوں۔ اس طرح اُس نے مغالطہ دینے کی کوشش کی جو ظاہر ہے ایک نامعقول حرکت تھی۔

﴿ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ ﴾ (258)

اس پر ابراہیم عَلَیْہِ السَّلام نے فرمایا: اچھا، میرا اللہ جس کو میں معبود اور رب مانتا ہوں، وہ سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ اگر تو بھی رب اور خدا ہے تو سورج کو مغرب سے نکال دکھا۔ اس پر وہ کافر بادشاہ ہکّا بکّا رہ گیا۔ وہ لاجواب ہو گیا۔ کیونکہ

اب وہ کوئی مغالطہ نہیں دے سکتا تھا۔

اس مباحثے (DEBATE) سے معلوم ہوا کہ انبیائے کرام عام پیشہ ور مناظرہ بازوں کی طرح بحث برائے بحث میں نہیں اُلجھتے۔ بلکہ وہ داعی اور مبلغ ہوتے ہیں۔ وہ ایک نباض طبیب کی طرح دیکھتے ہیں کہ اگر ایک دوا کا مریض پر اثر نہیں ہو رہا۔ تو وہ کوئی دوسرا نسخہ دے دیتے ہیں۔ اُن کا مقصد دوسرے فریق کو زِچ کر کے چپ کرانا نہیں ہوتا۔ نہ وہ اُسے بحث برائے بحث میں الجھائے رکھتے ہیں بلکہ وہ اپنی دلیل بدل کر کوئی ایسی دوسری دلیل پیش کر دیتے ہیں جس سے مخاطب کو اصل حقیقت دکھائی دینے لگتی ہے۔

﴿وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۲۵۸﴾ (258)

آخر میں فرمایا: کہ اللہ تعالیٰ اس قسم کے ظالموں کو سیدھی راہ نہیں دکھاتا۔ کیونکہ ان کی سوچ اپنے ذاتی مفاد اور اپنی خواہشاتِ نفسانی سے آگے نہیں بڑھتی۔ اس لیے یہ لوگ عقل کے اندھے اور بے بصیرت ہوتے ہیں۔ یہ نہ صرف حق کی تلاش اور سچائی کی جستجو نہیں کرتے بلکہ واضح دلائل اور کھلے حقائق کا انکار کر دیتے ہیں۔ اپنے غلط اور جھوٹے موقف کے حق میں کوئی مضبوط دلیل نہیں رکھتے۔ محض اِدھر اُدھر کی بے تکی ہانکتے ہیں اور نامعقول باتوں اور بہانوں کا سہارا لیتے ہیں۔ ایسے لوگ باطل کے کُند ہتھیاروں سے حق کا مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور ظاہر ہے حق و باطل کی ہر لڑائی میں حق کی فتح اور باطل کی شکست یقینی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ (بنی اسرائیل 81:17)

''اور کہہ دیجئے: حق آ گیا اور باطل مٹ گیا۔ بے شک باطل مٹ جانے والی چیز ہے۔''

اس جگہ ظالموں کے بارے میں ہے کہ اللہ سبحانہٗ ان کو سیدھی راہ پر نہیں چلاتا اور ہدایت نہیں دیتا۔ لیکن بعض دوسرے مقامات پر آیا ہے کہ کافروں اور فاسقوں نافرمانوں کے بارے میں بھی اللہ تعالیٰ کی یہی سنت ہے:

﴿وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (البقرہ 264:2)

''اور اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (التوبہ 24:9)

''اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

کیونکہ یہ لوگ...... ظالم، کافر، فاسق...... ہدایت کے طلب گار نہیں ہیں اور ہدایت صرف اُسے ملتی ہے جو ہدایت کا طلب گار ہو اور اس کی طرف رجوع کرے:

﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ (الشوریٰ 13:42)

''اللہ جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے اور ہدایت اُسے دیتا ہے جو اُس کی طرف رجوع کرتا ہے۔''

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَ انْظُرْ اِلٰی حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾

’’یا اُس آدمی کے بارے میں تم نے غور نہیں کیا جس کا گزر ایک ایسی بستی پر ہوا جس کے مکانات چھتوں سمیت زمین بوس ہو چکے تھے۔ اُس نے تعجب سے کہا: ’’اللہ اِس بستی کو دوبارہ کیسے زندہ کرے گا؟‘‘ اللہ نے اُس آدمی پر سو (100) برس تک کے لیے موت طاری کردی۔ پھر اسے زندہ کیا اور پوچھا: ’’تم کتنا عرصہ اس حالت میں رہے؟‘‘ اس نے کہا: ایک دن، یا ایک دن سے بھی کچھ کم۔‘‘ اللہ نے فرمایا: ’’نہیں، تم سو (100) سال رہے۔ اپنے کھانے پینے کی چیزوں کو دیکھو، وہ گلی سڑی نہیں، لیکن اپنی سواری کے گدھے کا پنجر دیکھ لو۔ یہ سب کچھ ہم نے اس لیے کیا تاکہ اسے لوگوں کے لیے اپنی قدرت کی نشانی بنادیں۔ اور تم اپنے مردہ گدھے کو زندہ ہوتے دیکھو، کس طرح ہم اُس کی ہڈیوں کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں، پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ جب اس آدمی پر ساری حقیقت ظاہر ہوگئی تو وہ پکار اُٹھا: میرا یقین ہے کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔‘‘ (259)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

خَاوِیَةٌ:......اس کے معنی سَاقِطَةٌ یعنی گری ہوئی کے ہیں۔ خَوَی الْبَیْتُ کے معنی ہیں: گھر گر گیا۔

عُرُوْش:......اس کا واحد عَرْشٌ ہے جس کے اصل معنی چھت کے ہیں۔ ہر وہ چیز جو دھوپ سے بچنے کے لیے سائے کے طور پر بنائی جائے وہ عرش یا عَرِیْشَةٌ ہے۔ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا کا مطلب یہ ہے کہ پہلے چھتیں گریں اور پھر دیواریں گر گئیں۔

اَنّٰی:......اس کے معنی اَیْنَ (کہاں) کے بھی ہوتے ہیں اور کَیْفَ (کیسے) کے بھی۔ اس جگہ یہ دوسرے معنی مراد

ہیں۔

لَمْ يَتَسَنَّهْ:...... (س ن ن) اس کے معنی ہیں لَمْ يَتَغَيَّرْ، وَلَمْ يَفْسُدْ کے ہیں کہ نہ وہ بدلا اور نہ خراب ہوا۔ یہ تَسَنَّهَ الشَّيْءُ کے معنی میں ہے کہ کسی چیز پر کئی برس گزر گئے، یا کوئی چیز برسوں تک پڑی رہی۔

نُنْشِزُهَا:...... اَنْشَزَ يُنْشِزُ اِنْشَازًا کے معنی ہیں ہڈیوں کو زمین سے اٹھا کر جسم میں اُن کی مناسب جگہ پر لگا دینا۔

﴿اَوْ كَالَّذِيْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ وَّ هِيَ خَاوِيَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا﴾ (259)

اس "اَوْ" (یا) کا عطف اوپر "اَلَمْ تَرَ" (کیا تم نے غور کیا) پر ہے جو آیت 258 میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یا تم اس دوسرے واقعے پر غور کرلو۔

اس سے پہلے ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کے درمیان بحث ومباحثے سے یہ حقیقت سامنے آئی تھی کہ ابراہیم علیہ السلام کا رب اور معبود صرف سورج پر کنٹرول رکھتا ہے (جس کو خود نمرود بھی ایک دیوتا مان کر پوجتا تھا) بلکہ پوری کائنات کا نظام بھی اُسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اب اسی بنیاد پر ایک نبی (حضرت عزیر علیہ السلام) کا واقعہ بیان کرکے بتایا جارہا ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ ہر چیز پر قادر ہے تو وہ قیامت کے دن مردہ انسانوں کو بھی دوبارہ زندہ کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور یہ کہ آخرت کی زندگی ایک حقیقت ہے۔

اس آیت میں بنی اسرائیل کے ایک نبی حضرت عزیر علیہ السلام کے ایک مشاہدے کا ذکر ہے جن کا گزر فلسطین میں بیت المقدس کے قریب ایک بستی پر ہوا، جو بابل کے ایک ظالم بادشاہ بخت نصر کی غارت گری کے نتیجے میں تباہ ہوئی تھی۔ جس کے مکانات چھتوں سمیت زمین بوس ہو چکے تھے، جانور تک مر چکے تھے اور اب وہ بستی ایک کھنڈر کا منظر پیش کر رہی تھی۔

﴿قَالَ اَنّٰى يُحْيٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ۭ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ۭ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَ شَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ۚ﴾ (259)

حضرت عزیر علیہ السلام کے دل میں خیال گزرا اور اُن کو تعجب ہوا کہ اس تباہ شدہ بستی کے انسانوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کیسے دوبارہ زندہ کرے گا اور یہ ویرانہ بھی کبھی آباد ہوسکتا ہے!

اس پر اللہ سبحانہٗ نے عزیر علیہ السلام کو سو (100) سال تک موت کی نیند سلائے رکھا اور پھر زندہ کرکے پوچھا: تم کتنی مدت مردہ حالت میں رہے؟ انہوں نے اپنے گمان کے مطابق عرض کیا: ایک دن، یا دن کا کچھ حصہ نیند میں گزرا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تم پورے سو (100) برس تک موت کی آغوش میں بے جان پڑے رہے تھے۔ اب میری قدرت کا کرشمہ دیکھو، تمہارے سفر کے کھانے پینے کی چیزیں بالکل محفوظ اور اپنی اصلی حالت پر ہیں۔ نہ وہ باسی ہوئی ہیں اور نہ اُن کا ذائقہ بدلا ہے۔

﴿وَ انْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ وَ لِنَجْعَلَكَ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَ انْظُرْ اِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا﴾ (259)

مگر اپنی سواری کے جانور گدھے کو غور سے دیکھ لو، جو مرنے کے بعد صرف چند بوسیدہ ہڈیاں رہ گئی ہیں، کہ ہم اب اُسے دوبارہ کیسے زندہ کرتے ہیں۔ پہلے اُس کی ہڈیوں کو جوڑ کر اُن کا ڈھانچہ کھڑا کریں گے۔ پھر ان ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیں گے اور وہ دوبارہ پہلے جیسا جیتا جاگتا گدھا بن جائے گا۔

اس طرح یہ واقعہ سیدنا عزیر علیہ السلام کے لیے علم الیقین سے بڑھ کر عین الیقین کی حد تک اللہ تعالیٰ کی اِس قدرت کی نشانی بن گیا کہ وہ آخرت میں لوگوں کو دوبارہ زندہ فرمائے گا اور یہی واقعہ آئندہ کے لوگوں کے لیے بھی اللہ سبحانہٗ کی قدرت کی نشانی بن گئی۔

﴿فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهٗ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٢٥٩﴾﴾ (259)

پھر جب حضرت عزیر علیہ السلام نے گدھے کے دوبارہ زندہ ہونے کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو پکار اُٹھے: مجھے اب پختہ یقین ہو گیا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ قیامت کے دن تباہ شدہ بستی کے انسانوں کو بھی دوبارہ زندہ کر دے گا۔

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَيْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَاْتِيْنَكَ سَعْيًا وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٦٠﴾ ع ٣٥/٣

”اور یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے میرے رب! مجھے دکھا تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ فرمایا: کیا تمہیں اس کا یقین نہیں؟ عرض کیا: یقین تو ہے لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں تاکہ میرا دل پوری طرح مطمئن ہو جائے۔ فرمایا: چار پرندے لو، اُنہیں اپنے ساتھ ہلا لو تاکہ وہ مانوس ہو جائیں۔ پھر اُن کے ٹکڑے کر کے الگ الگ پہاڑی پر اُن کا ایک ایک ٹکڑا رکھ دو۔ پھر ان کو بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑ کر آئیں گے۔ اور یاد رکھو، اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔“ (260)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

لِيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ:...... (تاکہ میرے دل کو اطمینان حاصل ہو جائے) اس سے آخرت پر یقین کے بارے میں اطمینان مراد نہیں ہے کیونکہ وہ تو اُن کو پہلے ہی وحی کے ذریعے حاصل تھا۔ بلکہ اس جگہ تخلیق کی حالت کا مشاہدہ مراد ہے۔

فَصُرْهُنَّ:...... یہ صَوَرَ سے ہے۔ صَارَ یَصُوْرُ کے معنی ہیں مائل کرنا، جھکانا۔ اپنے سے ہلانا اور مانوس کر لینا۔

جُزْءًا:......اس سے پرندوں کے ٹکڑے کرنا مراد ہے۔

سَعْیًا:......اس سے مراد ہے پرندوں کا تیزی سے بیک وقت چلنا، دوڑنا اور اُڑنا۔

﴿ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰكِنْ لِّیَطْمَىِٕنَّ قَلْبِیْ ؕ﴾ (260)

اب آخرت کی زندگی کو ثابت کرنے کے لیے یہ دوسری مثال دی گئی۔ جس سے ایک تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے مومن بندوں کا دوست اور مددگار ہے۔ دوسرے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہے جس میں لوگوں کا حساب کتاب ہوگا۔

اوپر آیت 258 میں اللہ تعالیٰ کے رب اور معبود ہونے کے بارے میں صرف ایک ہی واقعے کی مثال کافی ہوئی۔ مگر آیت 259 اور 260 میں آخرت کی زندگی کے ثبوت میں دو واقعات کی مثالیں دی گئیں۔ کیونکہ پہلی حقیقت کو ماننے والے بہت لوگ ہیں۔ جب کہ دوسری حقیقت پر یقین رکھنے والوں کی تعداد دنیا میں کم رہی ہے جن کے لیے ایک سے زیادہ واقعات کی مثالیں بیان کرنے کی ضرورت تھی۔

ارشاد ہوا کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے ایک موقع پر اللہ سبحانہٗ سے عرض کیا: میرے رب! مجھے دکھا کہ تو مردہ انسانوں کو کیسے زندہ کرے گا؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: کیا تمہیں اس کا یقین نہیں؟ عرض کیا: یقین تو ہے مگر میں اپنے دلی اطمینان اور شرح صدر کے لیے اس کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔

﴿ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰی كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًا ؕ﴾ (260)

اس پر اللہ سبحانہٗ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا: اچھا، چار پرندے لے لو۔ ان کو اپنے سے ہلا لو اور اپنے ساتھ اچھی طرح مانوس کر لو۔ پھر ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُن کو الگ الگ پہاڑی پر رکھ دو۔ اس کے بعد اُن کو اپنی طرف بلاؤ۔ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آجائیں گے۔ تم ان کو پہچان لو گے کہ یہ واقعی وہی پرندے ہیں جو پہلے میرے پاس تھے۔

یہ انبیاء علیہم السلام کا خاص مرتبہ ومقام ہے کہ عقائد وحقائق کے بارے میں ان کا علم فلسفیوں اور دانشوروں کی طرح محض عقلی اور استدلالی نہیں ہوتا بلکہ مشاہداتی اور عین الیقین کے درجے کا ہوتا ہے۔

معلوم ہے اسی طرح نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ کو بھی معراج کے موقع پر جنت ودوزخ وغیرہ کے مشاہدات کرائے گئے تھے۔

یاد رہے کہ ابراہیم علیہ السلام کا مذکورہ معجزہ اُن کے اپنے اطمینانِ قلب اور ذاتی شرحِ صدر کے لیے تھا اور عام معجزوں کی

طرح اُن کی قوم پر اتمامِ حجت کے لیے نہ تھا۔

﴿وَ اعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ ۝۲۶۰﴾ (260)

آخر میں فرمایا: کہ اس حقیقت کا یقین ہونا چاہیے کہ اللہ سبحانہٗ عزیز اور حکیم ہے۔ وہ غالب اور زبردست ہے کہ اپنی قدرت وطاقت سے انسانوں کو دوبارہ زندہ کرکے آخرت کی زندگی برپا کرسکتا ہے۔ اور وہ حکمت والا ہے اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ آخرت کی جزاوسزا ضرور ہو۔ ورنہ انسانوں کی تخلیق اور دنیا کی یہ زندگی فضول، بے مقصد اور عبث ہو کر رہ جاتی ہیں۔

مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ وَ اللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝۲۶۱ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا یُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَ لَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝۲۶۲

”جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اُن کے ثواب کی مثال بیج کے اُس دانے کی ہے جس سے سات (7) بالیں پیدا ہوں۔ ہر بالی میں سوسو (100) دانے ہوں۔ اللہ جس کے لیے چاہتا ہے، اس سے بھی زیادہ بڑھاتا ہے۔ اللہ بڑی وسعت والا سب کچھ جاننے والا ہے۔

جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی پر احسان نہیں جتلاتے اور نہ تکلیف پہنچاتے ہیں، وہ اپنے رب کے ہاں اجر پائیں گے۔ اُن کو نہ کوئی ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

آیات کی تفسیر:

﴿مَثَلُ الَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِیْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ﴾ (261)

اس سے پہلے یہ مضمون بیان ہوا کہ آخرت کی زندگی یقینی ہے۔ اب اس زندگی کی تیاری کے لیے اچھے اعمال کا ذکر ہے اور ان میں سے ایک اچھا عمل یہ ہے کہ اپنا مال اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے۔ یہ انفاق فی سبیل اللہ صرف اللہ سبحانہٗ کی رضا حاصل کرنے کے لیے ہونا چاہیے۔ اس لیے نہ ہو کہ جس پر خرچ کیا جائے اُس پر احسان جتلایا جائے، یا اُسے

تنگ کیا جائے اور تکلیف پہنچائی جائے۔ ورنہ اس طرح کا صدقہ دینے سے تو نہ دینا بہتر ہے۔

فرمایا جو لوگ اللہ کی رضا کے لیے اُس کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اُن کے ثواب کی مثال ایسی ہے جیسے کھیت میں ایک دانہ بویا جائے۔ (یاد رہے حَبَّۃ (دانہ) واحد ہے اس کی جمع حَبٌّ (دانے، اناج، غلہ) ہے۔) جس سے سات بالیاں نکلیں اور ہر بالی میں سو سو دانے ہوں، تو یہ ایک دانے کے سات سو دانے ہوئے۔

دہقان اگر نہ ہو تن آساں

ہر دانہ ہے صد ہزار دانہ!

اسی طرح ایک نیکی سات سو (700) نیکیوں کے برابر ہو جاتی ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾ (261)

پھر فرمایا: ''اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اُس کا اجر کئی گنا بڑھا دیتا ہے۔''

اس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ کسی ایک نیکی کا سات سو نیکیاں ہو جانا آخری حد نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ اضافہ ہو سکتا ہے۔

صحیح حدیث میں ہے کہ بعض اوقات کسی ایک نیکی کا ثواب پہاڑ یا اس سے بھی بڑھ کر ہو جاتا ہے۔

((حَتّٰى تَكُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ اَوْ اَعْظَمَ))

(صحیح بخاری، رقم: 1410، نسائی، رقم: 2526، ابن ماجہ، رقم: 1842)

''یہاں تک کہ وہ (نیکی) پہاڑ جیسی یا اس سے بھی بڑی ہو جاتی ہے۔''

بعض لوگ جو حدیث وسنت کی اہمیت کو نہیں سمجھتے وہ وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ (اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اس سے بھی زیادہ بڑھاتا ہے) کو ایک خدائی ضابطہ تصور کر کے ایک نیکی کے ثواب کو صرف سات سو (700) گنا بڑھنے تک محدود اور منحصر خیال کرتے ہیں، لیکن وہ نہیں جانتے کہ اگر یہ ضابطہ ہے تو فقط یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کسی ایک نیکی کا اجر بہت سی نیکیوں کے اجر کے برابر کر دیتا ہے۔ یہ ضابطہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف سات سو (700) تک اضافہ کرنے کا مجاز ہے اور وہ اس سے زیادہ کا اضافہ کرنے میں بے بس ہے۔

مثال کے طور پر یہ ایک ضابطہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کی روزی کم کر دیتا یا بڑھا دیتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُۜطُ﴾ (البقرہ 245:2)

''اور اللہ کم دیتا ہے اور زیادہ دیتا ہے۔''

تو کیا اس کا یہ مطلب لیا جائے گا کہ اللہ تعالیٰ کسی کی روزی 2 روپے سے کم اور ایک کروڑ روپے سے زیادہ نہیں کر سکتا کیوں کہ یہ اُس کے ضابطے کے خلاف ہے۔ جب کہ قرآن کا اعلان ہے کہ:

﴿وَاللّٰهُ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ (البقرہ 212:2)

''اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے۔''

دوسرے جب ایک صحیح حدیث موجود ہے کہ ایک نیکی کا ثواب ایک پہاڑ کے برابر یا اس سے بھی زیادہ ہوسکتا ہے تو اس حدیث کو قرآن ہی کی تشریح کے طور پر کیوں نہ مانا جائے؟

جب کوئی نیکی مشکل حالات میں تنگ وسائل سے بڑے جوش وجذبے کے ساتھ کی جائے گی، اس میں ریاکاری اور دکھاوا شامل نہ ہوگا، اور وہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُس کی خوشنودی کی خاطر کی جائے گی تو اس کا اجر وثواب سات سو (700) گنا سے زیادہ بڑھ سکتا ہے۔

یہ سراسر خدائے رحمان ورحیم کا فضل واحسان اور اُس کی بے پایاں رحمت وشفقت ہے کہ وہ ایک نیکی کو کم سے کم دس (10) نیکیوں کے برابر قرار دیتا ہے مگر کوئی برائی صرف ایک ہی برائی شمار کرتا ہے۔ پہلی صورت اُس کا فضل ہے اور دوسری صورت اُس کا عدل ہے۔ سورۃ الانعام میں ہے:

﴿مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا وَ مَنْ جَآءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ (الانعام 160:6)

''جو شخص ایک نیکی لائے گا اُسے دس نیکیوں کا ثواب ملے گا۔ اور جو برائی لے کر آئے گا اُسے اُس برائی کے برابر بدلہ ملے گا۔ اور اُن سے کوئی ناانصافی نہیں کی جائے گی۔''

اور بعض اوقات وہ کسی ایک نیکی کو سات سو (700) گنا بلکہ ایک پہاڑ کے برابر یا اس سے بھی زیادہ تک بڑھا دیتا ہے۔

﴿وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٦١﴾﴾ (261)

اللہ ایک نیکی کا ثواب کئی گنا بڑھا دیتا ہے کیونکہ وہ وَاسِعٌ (وسعت والا) ہے۔ اُس کے وسیع خزانوں میں کوئی کمی نہیں۔ اُس کے ہاں ہر شے کی فراوانی ہے۔ پھر وہ عَلِيْمٌ (علم والا) بھی ہے۔ ہر بات جانتا ہے۔ کوئی نیکی خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی، اُس کی نگاہ سے چھپ نہیں سکتی اور وہ دلوں کی نیتوں اور ارادوں کو بھی جانتا ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّ لَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ﴾ (262)

فرمایا: جو لوگ اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے اُس کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ پھر جن کو وہ صدقہ وخیرات دیتے ہیں، اُن پر نہ کوئی احسان جتلاتے ہیں، نہ اُن کی دل آزاری کرتے ہیں تو ایسے لوگوں کو اُن کے رب کے ہاں ضرور اجر ملے گا۔

﴿وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٢٦٢﴾﴾ (262)

یہ اُس اجر کی وضاحت ہے جو انفاق فی سبیل اللہ کرنے والوں کو ملے گا کہ وہ آخرت میں ایک ایسے مقام پر رہیں گے جہاں اُن کو نہ آئندہ کا خوف وخطر ہوگا اور نہ وہ ماضی کی کسی بات کی وجہ سے غمگین ہوں گے۔

یاد رہے قرآن کی اِس تعبیر سے جنت اور اس کی ابدی نعمتیں مراد ہوتی ہیں۔ جیسا کہ سورۃ الاعراف میں ہے:

﴿اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمْ وَ لَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ۝﴾ (الاعراف 49:7)

''تم جنت میں داخل ہو جاؤ۔ اب تمہارے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ تم غمگین ہو گے۔''

قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾

''بھلی بات کہنا اور درگزر کرنا اُس صدقے سے بہتر ہے جس کے بعد تنگ کرنا ہو۔ اور اللہ بے نیاز اور تحمل والا ہے۔''(263)

آیات کی تفسیر:

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ﴾ (263)

فرمایا: سائل یا محتاج سے اچھے انداز میں بات کرنا، اُس سے عفو و درگزر کرنا اور بھلے طریقے سے معذرت کر لینا، جیسے یوں کہہ دیا جائے:

''معاف کیجئے''، ''اللہ بھلا کرے''، ''اللہ خیر کرے گا'' وغیرہ۔ یہ ایسے صدقہ وخیرات سے کہیں بہتر ہے جس کے بعد اُس بیچارے محتاج کی دل آزاری کی جائے، خواہ احسان جتلا کر، یا اُس کی تحقیر کر کے، یا اُسے کسی طرح سے تنگ کر کے۔

﴿وَ اللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ﴿۲۶۳﴾﴾ (263)

فرمایا: اللہ تعالیٰ غنی اور بے نیاز ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ جو کوئی اُس کی راہ میں صدقہ وخیرات کرتا ہے تو وہ اپنے فائدے کے لیے کرتا ہے کہ اُسے اس کا اجر ملے گا۔ پھر جو شخص صدقہ کر کے صدقہ لینے والے کی دل آزاری کرتا ہے تو اللہ ایسے صدقے کا کوئی ثواب نہیں دے گا۔

اور اللہ حلیم اور تحمل والا بھی ہے کہ جو مال دار صدقہ نہیں کرتا، یا صدقہ کر کے محتاج کی دل آزاری کرتا ہے تو اللہ ایسے لوگوں کو فوری طور پر سزا نہیں دیتا۔ بلکہ مہلت دیتا ہے کہ وہ توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کر لیں۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَ اللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۶۴﴾

''اے ایمان والو! دوسروں پر احسان جتا کر اور اُنہیں تکلیف پہنچا کر اپنے صدقے کا ثواب ضائع نہ کرو۔ جیسے وہ شخص اپنا ثواب ضائع کر دیتا ہے جو دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے، نہ اللہ پر اُس کا ایمان ہوتا ہے اور نہ آخرت کے دن پر۔ ایسے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر کی ایک چٹان ہو، جس پر کچھ مٹی پڑی ہو، پھر اس پر زور کی بارش ہو، اور اسے بالکل صاف کر دے۔ ایسے لوگوں کو اپنی کمائی سے کچھ حاصل نہ ہوگا اور ایسے کافروں کو اللہ ہدایت نہیں دیتا۔'' (264)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

صَفْوَانٍ:......اس کے معنی ہیں چکنا اور ملائم پتھر یا چٹان۔

اَلْوَابِلُ:......اس کے معنی زوردار بارش کے ہیں۔

صَلْدًا:......اس کا مطلب ہے بالکل صاف، چٹیل چیز، جس پر کوئی گرد وغبار نہ ہو۔

لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ:...... اس کے معنی ہیں لَا يَجِدُوْنَ وَلَا يَمْلِكُوْنَ الشَّيْءَ یعنی وہ کچھ حاصل نہیں کر پاتے اور نہ کسی چیز کے مالک ہوتے ہیں۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَ الْاَذٰى ۙ﴾ (264)

اس آیت میں ایسی تین چیزوں کا ذکر ہے جن کی وجہ سے صدقے کا اجر وثواب ضائع ہو جاتا ہے۔

سب سے پہلی چیز جو صدقہ وخیرات کو برباد کر دینے والی ہے وہ ''مَنٌّ'' یعنی احسان جتلانا ہے۔ جو شخص صدقہ کر کے کسی مستحق پر اس کا احسان جتلاتا ہے اسے صدقے کا کوئی ثواب نہیں ملتا۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث میں جن تین قسم کے آدمیوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن نہ تو کلام فرمائے گا، نہ ان کی طرف رحمت کی نظر سے دیکھے گا اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا، اُن میں سے ایک وہ شخص ہوگا جو صدقہ کر کے کسی پر احسان جتلاتا ہے۔

((اَلْمَنَّانُ الَّذِیْ لَا یُعْطِیْ شَیْئًا اِلَّا مَنَّهُ))

(صحیح مسلم، رقم: 294، ترمذی، رقم: 1211، نسائی، رقم: 2563)

''ایسا احسان جتلانے والا جو احسان جتلائے بغیر کچھ نہیں دیتا۔''

دوسری چیز جو صدقے کا اجر ختم کر دیتی ہے وہ ''اَذٰی'' یعنی ستانا اور تکلیف پہنچانا ہے۔ یہ ستانا اور تکلیف پہنچانا ذہنی طور پر بھی ہو سکتا ہے اور جسمانی طور پر بھی۔ جس کو صدقہ دیا ہے اس سے بدزبانی کرنا، اسے صدقے کا طعنہ دینا، اس کی بے عزتی کرنا، یہ سب ''اَذٰی'' میں داخل ہیں۔

﴿ كَالَّذِىۡ يُنۡفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَ لَا يُؤۡمِنُ بِاللّٰهِ وَ الۡيَوۡمِ الۡاٰخِرِ‌ؕ ﴾ (264)

اب تیسری چیز بیان کی جا رہی ہے جس سے صدقے کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے اور وہ ہے ریا کاری اور دکھاوا۔ جو شخص اللہ سبحانہٗ کی رضا حاصل کرنے کے لیے صدقہ نہیں دیتا بلکہ لوگوں کو دکھانے کے لیے صدقہ دیتا ہے تو اس کی نیت ہی درست نہیں ہے جب کہ تمام اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے۔ اس لیے ریا کاری کو اس کے بظاہر نیک کام کا کوئی ثواب نہیں ملتا خواہ وہ دکھاوے کا صدقہ کرے، یا دکھاوے کی نماز پڑھے یا دکھاوے کا حج کرے۔ ریا کاری کے ساتھ کی گئی کوئی عبادت اور کوئی نیکی مقبول نہیں ہے اور اس کا کوئی ثواب نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں نیت دکھاوے کی ہوتی ہے۔

ایک صحیح حدیث میں ریا کاری کو شرک قرار دیا گیا ہے۔

مسند احمد میں حضرت شداد بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا:

((مَنْ صَلّٰى يُرَائِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ ، وَمَنْ صَامَ يُرَائِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ ، وَمَنْ تَصَدَّقَ يُرَائِىْ فَقَدْ اَشْرَكَ)) (مسند احمد، رقم: 17270)

''جس نے دکھاوے کی نماز پڑھی اُس نے شرک کیا، جس نے دکھاوے کا روزہ رکھا اُس نے شرک کیا، اور جس نے دکھاوے کا صدقہ کیا اُس نے شرک کیا۔''

حقیقت یہ ہے کہ ریا کار شخص کا ایمان کمزور اور ناقص ہوتا ہے۔ اسے اللہ تعالیٰ اور آخرت کے دن پر یقین نہیں ہوتا۔ آیت کے الفاظ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ میں اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

﴿ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفۡوَانٍ عَلَيۡهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلۡدًا‌ ؕ ﴾ (264)

اب اسی بات کو کہ احسان جتلانے، تکلیف پہنچانے اور ریا کاری کے نتیجے میں صدقہ وخیرات کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے، ایک مثال کے ذریعے سمجھایا گیا ہے کہ جیسے کسی چکنے سخت پتھر پر کچھ گرد پڑی ہو اور اس پر زور کی بارش ہو جائے تو ساری گرد ڈھل جائے گی اور نیچے صاف چکنا پتھر نمایاں ہو جائے گا۔ جیسے وہ پہلے تھا اب بھی وہی ہے۔ اس مثال میں مٹی کا گرد وغبار صدقہ ہے اور احسان جتلانے، تکلیف پہنچانے اور ریا کاری کرنے کو بارش سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے بعد صدقے کا سارا ثواب ختم ہو جاتا ہے۔

﴿ لَا يَقۡدِرُوۡنَ عَلٰى شَىۡءٍ مِّمَّا كَسَبُوۡا‌ ؕ ﴾ (264)

اُوپر مثال دے کر سمجھایا گیا کہ جو لوگ ریا کاری سے، یا دل آزاری سے، یا طعنے دے کر صدقہ وخیرات کرتے ہیں،

وہ اپنا ثواب ضائع کر دیتے ہیں۔ یہ ایک منافقانہ حرکت ہے جس کا نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ اجر، بلکہ اُلٹا اس کا گناہ ہوگا۔ گویا نیکی برباد ہو جائے گی اور گناہ لازم ہو جائے گا۔

﴿وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (264)

آخر میں فرمایا کہ ''اللہ کافروں کو ہدایت نہیں دیتا'' اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ صدقہ کر کے احسان جتلانا، ایذا دینا اور دکھاوا کرنا انسان کو کفر کی حد تک پہنچا سکتا ہے جس سے بچنا ضروری ہے ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہوئی کہ صدقہ محض اللہ تعالیٰ کی رضا اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کی نیت سے دینا چاہیے۔ صرف ایسے ہی صدقے کا ثواب ملتا ہے اور وہ قبول ہوتا ہے۔ لیکن اگر کسی کو صدقہ دے کر اس پر احسان جتلایا جائے، یا اسے کوئی تکلیف پہنچائی جائے، یا دکھاوے کے لیے صدقہ دیا جائے تو ان تمام صورتوں میں اللہ سبحانہٗ کسی صدقے کو نہ تو قبول فرماتا ہے اور نہ اس پر کوئی اجر دیتا ہے۔

وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا
ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۶۵
اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهٗ ذُرِّيَّةٌ
ضُعَفَآءُ ۖۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۶۶ ع

''جو لوگ اپنا مال اللہ کی رضا کے لیے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ان کی اس نیکی کی مثال ایسی ہے جیسے ایک باغ ہو جو کسی بلند اور ہموار جگہ پر ہو۔ اگر زور کی بارش ہوگئی تو دگنا پھل پیدا ہوگیا۔ اگر زیادہ بارش نہ ہوئی تو اُس کے لیے ہلکی پھوار کافی ہے۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔

کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرے گا کہ اگر اُس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو، جس میں نہریں بہتی ہوں، اُس باغ میں اُس کے لیے کثرت سے پھل پیدا ہوتا ہو، مگر حال یہ ہو کہ وہ خود بوڑھا ہو چکا ہو اور اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہوں۔ پھر اچانک اُس باغ میں بگولا آجائے جس میں آگ ہو۔ اس سے سارا باغ جل کر

راکھ ہو جائے؟ اللہ اس طرح تمہارے لیے نشانیاں بیان کرتا ہے تا کہ تم غور وفکر کرو۔" (265-266)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

تَثْبِيْتًا:......اس کے معنی مضبوط مستحکم کرنے اور جمانے کے ہیں۔ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ سے مراد ہے کہ اس طرح وہ اپنے دلوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مضبوط و مستحکم کرتے ہیں اور کھلے دل سے مال خرچ کرتے ہیں۔

رَبْوَةٍ:......اس کے معنی ایسی بلند اور اونچی جگہ کے ہیں جو ہموار بھی ہو۔

اُكُلَهَا:......اُكُلٌ کے اصل معنی ایسی چیز کے ہیں جو کھائی جاسکے (EDIBLES)۔ لیکن اس جگہ اس سے پھلوں کی پیداوار مراد ہے۔

اَلطَّلُّ:......معمولی بارش، بوندا باندی اور پھوار کو کہتے ہیں۔

اِعْصَارٌ:......اس کے معنی گردباد اور بگولے کے ہیں۔ (CYCLONE)

نَارٌ:......اس جگہ اس کے معنی آگ کے نہیں ہیں بلکہ اس سے گرم لُو مراد ہے جس کو بادِ سموم بھی کہتے ہیں۔

﴿وَ مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَ تَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ﴾ (265)

اوپر کی مثال میں جس گروہ کا ذکر تھا وہ احسان جتا کر، دل آزاری کر کے اور ریا کاری کی وجہ سے اپنے صدقہ وخیرات کا ثواب ضائع کر دیتا ہے۔ اب اس کے مقابل میں دوسرے گروہ کا ذکر ہے جو اللہ سبحانہٗ کی رضا کی خاطر اپنا مال دل کھول کر نیک نیتی سے خرچ کرتا ہے اور کئی گنا زیادہ اجر پاتا ہے۔ یہ لوگ نہ احسان جتاتے ہیں، نہ دل آزاری کرتے ہیں اور نہ ریا کاری کرتے ہیں۔ اس لیے ان کے انفاق کا بڑا اجر ہے۔ ان لوگوں کے ثواب کو ایک ایسے باغ کی مثال دے کر سمجھایا گیا ہے، جو کسی بلند، ہموار اور زرخیز زمین پر واقع ہو۔ جہاں کی آب وہوا خوشگوار ہو۔ وہاں جب خوب بارش برسے تو دُگنا پھل پیدا ہوتا ہے۔ اگر بارش نہ بھی ہو تو ایسی زمین کے باغ کے لیے ہلکی پھوار یا شبنم ہی کافی ہے۔ اس سے بھی پورا پھل حاصل ہو جاتا ہے۔

﴿وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۲۶۵﴾ (265)

اس میں اسی دوسرے نیک گروہ کے لیے تسلی اور اطمینان ہے جو اپنا مال صرف اللہ سبحانہٗ کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے۔ کسی پر احسان نہیں جتاتا۔ کسی کی دل آزاری نہیں کرتا اور ریا کاری نہیں کرتا۔ ایسے مخلص بندوں کے انفاق کو اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے اور ان کو اس کا پورا ثواب دے گا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی نیکی کرنے والے کا اجر ضائع نہیں کرتا۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝﴾ (التوبہ 120:9)

''بے شک اللہ نیکی کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کرتا۔''

﴿ اَيَوَدُّ اَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهٗ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ لَهٗ فِيْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۙ وَ اَصَابَهُ الْكِبَرُ وَ لَهٗ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَآءُ ۚ فَاَصَابَهَآ اِعْصَارٌ فِيْهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ؕ ﴾ (266)

اوپر آیت 264 میں جس برے انفاق کی مثال دی گئی ہے یہ اسی کی مزید وضاحت ہے۔

فرمایا، کیا تم میں سے کوئی شخص یہ پسند کرے گا کہ اُس کے پاس قیمتی کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو، جس میں نہریں بہتی ہوں۔ اس کا پھل کثرت سے پیدا ہوتا ہو، مگر حالت یہ ہو کہ وہ شخص خود بوڑھا ہو چکا ہو اور اُس کے بچے ابھی چھوٹے ہوں۔ اچانک اُس باغ پر گرم لُو کا بگولا یا گرد باد (WHIRLWIND, CYCLONE) آجائے جو اُسے جھلسا کر تباہ کر دے۔ اور اس آدمی کے ہاتھ میں کچھ نہ آئے، جب کہ وہ خود بڑھاپے کی وجہ سے محتاج ہو اور اس کے چھوٹے بچے بھی بے سہارا ہوں۔

یہ مثال بھی ایسے شخص کی ہے جو اپنا مال اللہ کی راہ میں ریاکاری اور دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے۔ جس کسی پر خرچ کرتا ہے اُس پر احسان جتاتا ہے اور اُس کی دل آزاری کرتا ہے۔ ایسے آدمی کو آخرت میں اس کی کوئی نیکی نہیں ملے گی جب کہ وہ اُس وقت نیکیوں کا سخت محتاج ہوگا اور پھر حسرت و پشیمانی کی تصویر بن کر رہ جائے گا۔ کیونکہ اس کی اس نیکی کو ریاکاری، احسان جتانے اور دل آزاری کے بگولے نے جلا کر راکھ کر دیا ہوگا۔

عربوں کے ہاں ایک مثالی باغ کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ وہ کسی بلند اور ہموار جگہ پر واقع ہو، جہاں کی آب و ہوا خوش گوار ہو زمین زرخیز ہو۔ پاس ہی سے نہر گزرتی ہو جس کا پانی اس باغ کو سیراب کرتا ہو۔ کناروں پر کھجوروں کے درخت ہوں جو باغ کو گرمی اور اُڑتی ریت سے بچاتے ہوں۔ بیچ بیچ میں انگور کی بیلیں اور دوسرے پھل دار درخت ہوں۔ خالی ٹکڑوں اور قطعات میں گندم اور جَو کی کاشت ہوتی ہو۔ اس طرح باغ ہی سے پھل اور اناج دونوں پیدا ہوتے ہوں۔ کیونکہ ''ثمرات'' کا لفظ عربی زبان میں ان دونوں کے لیے آتا ہے اور صرف پھل کے لیے فَاكِهَةٌ کا لفظ ہے۔

خود قرآن نے سورہ الکہف میں ایک ایسے ہی مثالی باغ کا نقشہ یوں کھینچا ہے:

﴿ وَ اضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّ حَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّ جَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ۝ كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَ لَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا وَّ فَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۝ ﴾ (الکہف 18:32,33)

''اور (اے نبی ﷺ) اُن لوگوں کو ایک مثال سنایئے دو آدمی تھے۔ ان میں سے ایک کو ہم نے انگوروں کے دو باغ دیئے۔ ان کے چاروں طرف کھجوروں کے درختوں کا احاطہ بنایا۔ دونوں کے درمیان کھیتی رکھ دی۔ دونوں باغ اپنا پورا پھل لائے۔ ان کی پیداوار میں کچھ کمی نہ ہوئی۔ ان باغوں کے اندر ہم نے نہر

جاری کر دی۔"

﴿ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الۡاٰيٰتِ لَعَلَّكُمۡ تَتَفَكَّرُوۡنَ ۝﴾ (266)

مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اپنی آیتوں کے مضامین کو مثالون کے ذریعے واضح کرتا ہے تا کہ تم لوگ غور وفکر کرو۔ شریعت کے احکام کی حکمت اور ان کا مقصد سمجھو۔ اپنے اعمال برباد نہ کرو۔ صدقہ وخیرات کا ثواب ضائع نہ کرو۔ اس بات کا یقین کرلو کہ یہ دنیا عارضی اور فانی ہے اور حقیقی اور دائمی زندگی آخرت کی زندگی ہے۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُوا الۡخَبِيۡثَ مِنۡهُ تُنۡفِقُوۡنَ وَلَسۡتُمۡ بِاٰخِذِيۡهِ اِلَّاۤ اَنۡ تُغۡمِضُوۡا فِيۡهِ ؕ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيۡدٌ ۝

"اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں پاکیزہ اور عمدہ مال خرچ کرو، خواہ وہ تمہاری عام کمائی سے ہو، یا جسے ہم نے تمہارے لیے زمین سے پیدا کیا ہو۔ اور اللہ کی راہ میں ردّی چیز دینے کا ارادہ نہ کرو۔ کیونکہ اگر وہی چیز تمہیں دی جاتی تو تم اسے لینا گوارا نہ کرتے، یا ناپسندیدگی سے لیتے۔ یاد رکھو، اللہ بے نیاز اور خوبیوں والا ہے۔" (267)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

طَيِّبَاتٍ:...... یہ طَيِّبَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی پاکیزہ، عمدہ اور ستھری چیز کے ہیں۔ اس کی ضد خَبِيْثَةٌ ہے جس کی جمع خَبِيْثَاتٌ ہے۔

لَا تَيَمَّمُوْا:...... اس کے معنی ہیں: لَا تَقْصِدُوْا مطلب یہ ہے کہ کبھی اس کا ارادہ بھی نہ کرو۔

تُغْمِضُوْا:...... یہ إِغْمَاضٌ سے ہے جس کے معنی چشم پوشی کرنے یا آنکھیں بند کرنے کے ہیں۔

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبۡتُمۡ وَمِمَّاۤ اَخۡرَجۡنَا لَكُمۡ مِّنَ الۡاَرۡضِ ﴾ (267)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو خطاب کر کے انہیں حلال اور پاکیزہ مال میں سے انفاق کرنے یعنی زکوٰۃ، عشر اور صدقہ وخیرات کرنے کا حکم دیا ہے اور اس حوالے سے خراب اور ردّی مال دینے سے منع فرمایا ہے۔

اس میں پہلے ایمان والوں کو مخاطب کر کے حکم دیا گیا کہ تم اپنی حلال اور پاکیزہ کمائی میں سے اللہ کی راہ میں مال خرچ کیا کرو، خواہ وہ زکوٰۃ اور عشر کی شکل میں ہو، یا عام صدقہ وخیرات کی صورت میں ہو۔ کیونکہ حرام کمائی سے زکوٰۃ اور صدقہ دینا نہ صرف حرام ہے بلکہ اس کا کوئی اجر وثواب نہیں ملتا۔

پھر فرمایا کہ جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین میں سے پیدا کیا، اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اس سے زرعی پیداوار پر عشر مراد ہے جس کا واضح حکم سورۂ الانعام میں آیا ہے کہ:

﴿وَ اٰتُوْا حَقَّهٗ یَوْمَ حَصَادِهٖ﴾ (الانعام 141:6)

''اور فصل اٹھاتے وقت اللہ کا حق یعنی عُشر ادا کرو۔''

عشر اور زکوٰۃ کے تفصیلی احکامات فقہ کی کتابوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

﴿وَ لَا تَیَمَّمُوا الْخَبِیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَ لَسْتُمْ بِاٰخِذِیْهِ اِلَّاۤ اَنْ تُغْمِضُوْا فِیْهِ﴾ (267)

ارشاد ہوا کہ زکوٰۃ ہو یا صدقہ وخیرات، اس میں ایسا ردّی اور خراب مال نہ دو کہ اگر وہ تمہیں دیا جاتا تو تم اسے لینا گوارا نہ کرتے۔ ہاں آنکھیں بند کر کے شاید لے لیتے۔

﴿وَ اعْلَمُوْۤا اَنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ۝۲۶۷﴾ (267)

آخر میں فرمایا کہ اللہ بے نیاز اور خوبیوں والا ہے۔ یہ نہ سمجھو کہ وہ تمہارے مال کا محتاج ہے۔ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ تم اگر اس کے دیے ہوئے مال میں سے کچھ اس کی راہ میں خرچ کرتے ہو تو یہ اللہ تعالیٰ پر احسان نہیں ہے بلکہ اس کا احسان ہے کہ اس نے تمہیں مال سے نوازا ہے

پھر جو کچھ تم خرچ کرو گے اس کا صلہ تمہیں آخرت میں ملے گا اور دنیا میں بھی تمہارے بھائی بندوں ہی کو اس کا فائدہ پہنچے گا۔ اللہ تعالیٰ تو غنی اور بے نیاز ہے، اسے کسی کے مال کی حاجت نہیں۔ وہ ساری خوبیوں کا مالک اور حمد وثنا کے لائق ہے۔

اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ یَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَ اللّٰهُ یَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا ؕ وَ اللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ۝۲۶۸ۙ

''دیکھو، شیطان تمہیں محتاجی سے ڈراتا اور بخل سکھاتا ہے، مگر اللہ تمہارے لیے بخشش اور فضل کا وعدہ فرماتا ہے، اور اللہ وسعت والا جاننے والا ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے اور جسے دین کی سمجھ مل گئی اُسے سب کچھ مل گیا۔ اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔'' (268)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

یَعِدُكُمْ:...... وَعَدَ کے معنی وعدہ کرنے کے بھی آتے ہیں اور اسکے معنی وعید یعنی خوف دلانے کے بھی ہوتے ہیں اور اس جگہ یہی مراد ہیں۔

يَاْمُرُكُمْ:...... اَمَرَ صرف حکم دینے کے معنوں میں نہیں آتا بلکہ اس سے اور بھی کئی معنی مراد ہوتے ہیں۔ اس جگہ قرینہ دلیل ہے کہ اس کے معنی ہیں: غلط مشورہ دینا، وسوسہ ڈالنا۔

فَحْشَآء:...... اس کے عام معنی بے حیائی کے ہیں۔ اس کے اصل معنی ایسے کام یا بات کے ہوتے ہیں جس کو لوگوں کے سامنے کرتے ہوئے انسان شرم یا عار محسوس کرتا ہے۔ لیکن اس جگہ یہ بخل کے معنوں میں آیا ہے کیونکہ موقع دلیل ہے۔ لغت میں بھی فَحْشَاء کے ایک معنی بخل کے موجود ہیں۔

اَلْحِكْمَةَ:...... اس کے معنی دانائی کے ہیں۔ اس سے مراد وہ نافع علم ہوتا ہے جو کسی شخص کے دل میں یقین پیدا کرتا اور اسے صالح اعمال پر آمادہ کرتا ہے۔

﴿اَلشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَ يَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ﴾ (268)

فرمایا کہ شیطان تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے اور وہ دو طریقوں سے روکتا ہے:

ایک یہ کہ وہ وسوسہ ڈالتا ہے کہ اگر تم نے اپنا مال خرچ کر دیا تو خود محتاج اور کنگال ہو جاؤ گے۔ اس لیے انفاق نہ کرو۔ دوسرے وہ تمہیں بخل سکھاتا ہے۔ اس مقام پر فَحْشَآءِ کے معنی بخل کے ہیں جس کی لغت اور سیاقِ کلام دونوں سے تائید ہوتی ہے۔ شیطان کہتا ہے تمہیں کیا پڑی ہے دوسروں پر اپنا مال خرچ کرو۔ کماؤ تم اور کھائیں دوسرے لوگ۔ یہ تمہارا اپنی محنت سے کمایا ہوا مال ہے اسے تم جتنا چاہو، جیسے چاہو، اپنی مرضی سے اپنے اوپر خرچ کرو۔ اپنے لیے آسائشیں خریدو۔ عیش و عشرت کے سامان مہیا کرو۔ سیر سپاٹے کرو۔ چار دن کی زندگی ہے خوب مزے اُڑاؤ۔ دوسروں کو کچھ دینے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود کمائیں کھائیں۔ تمہاری ذمہ داری نہیں ہے کہ سارے جہان کو کھلاتے پھرو۔ شیطان اس قسم کے کئی اور وسوسوں اور ہتھکنڈوں سے انسان کو انفاق فی سبیل اللہ سے روکتا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَ فَضْلًا﴾ (268)

دوسری طرف اس کے مقابل میں اللہ سبحانہٗ بھی دو چیزوں کا وعدہ فرماتا ہے اور وہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔ اگر تم اس کے حکم پر اُس کی رضا کے لیے اُس کی راہ میں مال خرچ کرو گے تو وہ تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور اپنے فضل سے تمہیں اور زیادہ دے گا اور آخرت میں جنت عطا فرمائے گا۔

یہ بات کہ خرچ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے، اس میں اضافہ ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ مزید عطا فرماتا ہے خود قرآن و حدیث سے ثابت ہے۔

سورہ سبا میں ہے کہ:

﴿وَ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهٗ وَ هُوَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ﴾ (سبا 39:34)

''اور تم جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تمہیں اس کا بدلہ ملے گا اور وہ بہترین رزق دینے والا ہے۔''

اسی مضمون کی یہ حدیث بھی ہے کہ:

((مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْبِحُ فِيهِ الْعِبَادُ اِلَّا مَلَكَان يَنْزِلَانِ، يَقُوْلُ اَحَدُهُمَا: اَللّٰهُمَّ اعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا۔ وَيَقُوْلُ الْاٰخِرُ: اَللّٰهُمَّ اعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا)) (صحیح مسلم، رقم: 2336)

''بندوں پر ایسی کوئی صبح نہیں آتی کہ جس میں دو فرشتے نہ اُترتے ہوں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اُس کا بدل عطا فرما۔ جب کہ دوسرا فرشتہ کہتا ہے: اے اللہ! خرچ نہ کرنے والے کے مال کو تباہ کر دے!''

یاد رہے کہ یہ قرآن کا ''اسلوبِ مقابلہ'' ہے جس میں پہلی دو چیزوں فقر اور فحشاء کے مقابل میں دو چیزوں مغفرت اور فضل کا ذکر آیا ہے۔

﴿وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴾ (268)

کیونکہ اللہ سبحانہٗ وَاسِعٌ (وسعت والا) ہے۔ اس کے خزانوں میں کوئی کمی نہیں۔ اس کے ہاں ہر شے کی بہتات اور فراوانی ہے۔ پھر وہ عَلِيْمٌ (خوب جاننے والا) بھی ہے۔ وہ جانتا ہے تم نے کتنا اُس کی راہ میں خرچ کیا اور کس نیت اور ارادے سے کیا اور اسکے مطابق تمہیں اجر دے گا۔

يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾

''وہ جسے چاہتا ہے دین کی سمجھ عطا کرتا ہے۔ اور جسے دین کی سمجھ مل گئی اُسے سب کچھ مل گیا۔ اور نصیحت وہی قبول کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔''

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

فرمایا: اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے اور وہ صرف اُسی کے لیے چاہتا ہے جو اس کا اہل اور مستحق ہوتا ہے۔ جو اسے حاصل کرنے کے لیے محنت اور کوشش کرتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اُسے یہ حکمت یعنی دین کی سمجھ اور اس میں پختگی اور مضبوطی عطا کرتا ہے۔ جس سے بندے کا ایمان مضبوط ہوتا ہے۔ وہ ایسے نیک اعمال بڑی خوشی سے کرتا ہے جس سے اُس کا رب راضی ہو جائے جیسے انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ۔

پھر بتایا جسے یہ حکمت مل گئی اُسے ''خیر کثیر'' مل گیا۔ جس کے معنی ہیں بہت زیادہ بھلائی، فائدے، نعمتیں اور خیر وبرکت۔ جس کے نتیجے میں انسان راہِ ہدایت پر چلتا اور دنیا و آخرت میں فلاح و کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔

بعض لوگ اِس ''حکمت'' سے علمِ فلسفہ مراد لیتے ہیں جو درست نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن فلسفے کی کتاب نہیں ہے بلکہ ہدایت کی کتاب ہے۔ حکمت سے مراد صرف دینی بصیرت اور علمِ نافع ہی ہے۔

﴿وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ﴾ (269)

آخر میں فرمایا یہ حکمت، یہ بصیرت اور یہ دین کی سمجھ صرف ان لوگوں کو میسر آتی ہے جو عقل والے ہیں۔ عقل سے کام لیتے ہوئے راہِ ہدایت پر چلتے ہیں۔ فانی دنیا کی بجائے آخرت کی ہمیشہ کی زندگی کو ترجیح دیتے ہیں۔ پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ اپنے جان و مال کی قربانی دے کر جنت خرید لیتے ہیں۔

اس سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ جو لوگ ایمان نہیں لاتے، دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتے ہیں۔ اللہ کو راضی کرنے کی بجائے اپنے نفس کو راضی کرنے میں لگے رہتے ہیں، وہ عقل والے نہیں ہیں بلکہ جاہل اور بے وقوف ہیں اگرچہ وہ پی ایچ ڈی کیوں نہ ہوں۔

وَ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ وَ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾ اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَ يُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّاٰتِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿٢٧١﴾

”تم اللہ کی راہ میں جو خرچ کرتے ہو، یا نذر مانتے ہو، اللہ اُسے جانتا ہے۔ اور یاد رکھو، ظالموں کو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی مددگار نہ ملے گا۔ اگر تم اپنے صدقات ظاہر کر کے دو تو بھی اچھا ہے اور اگر تم اُنہیں چھپا کر محتاجوں کو دو، تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اگر تم اُنہیں چھپا کر دو گے اور وہ تمہارے کاموں سے واقف ہے۔“

(271-270)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

نَذْر:...... لغت میں نذر کے معنی اَلْعَزْمُ عَلٰی اِلْتِزَامِ شَیْءٍ خَاصٍ فِعْلًا اَوْ تَرْكٍ کے ہیں یعنی کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا پختہ ارادہ کر لینا۔ شریعت میں اسے اِلْتِزَامُ طَاعَةٍ تَقَرُّبًا اِلَی اللّٰهِ تَعَالٰی کہتے ہیں جس کا مطلب ہے اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کسی خاص نیکی اور اطاعت کے کام کی پابندی کرنا۔ عام فہم زبان میں اس کے معنیٰ منت ماننے کے ہیں کہ اگر میری فلاں مراد پوری ہوگئی تو میں فلاں عبادت کروں گا یا اتنا صدقہ کروں گا۔

﴿وَ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ نَّفَقَةٍ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُهٗ ؕ﴾

(270)

فرمایا: تم جو مال بھی خرچ کرتے ہو...... کم یا زیادہ، جائز یا ناجائز طور پر، نیک نیتی سے اللہ کی رضا کے لیے یا

ریاکاری اور دکھاوے کے ساتھ، یا دوسروں پر احسان جتا کر، یا اُن کی دل آزاری کر کے، پوشیدہ طور پر یا علانیہ...... بہر حال اللہ تعالیٰ اُسے جانتا ہے اور اسی کے مطابق تمہیں جزا و سزا دے گا۔

یہی معاملہ نذر و نیاز کا ہے اگر تم نیکی کے کام کی نذر مانو گے، یا برائی کے لیے نذر مانو گے تو اسے بھی اللہ سبحانہٗ جانتا ہے اور اس کے مطابق تمہیں اچھا یا برا بدلہ دے گا۔

اسلامی شریعت میں نذر ماننا جائز ہے اور اس کو پورا کرنا واجب ہے۔ لیکن کسی برے کام کے لیے، یا قطع رحمی کے لیے نذر ماننا اور اسے پورا کرنا جائز نہیں ہے۔ بلکہ وہ برا کام نہیں کرنا چاہیے اور ایسی نذر کا کفارہ دے دینا چاہیے جو کہ قسم کے کفارے کے برابر ہے۔

﴿وَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۲۷۰﴾﴾ (270)

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بخل کریں گے، صدقہ کر کے احسان جتائیں گے، دوسرے کی دل آزاری کریں گے، انفاق میں ریاکاری اور دکھاوا کریں گے۔ غریبوں اور مسکینوں کے حقوق ادا نہیں کریں گے، وہی ظالم ہوں گے جن کا آخرت میں کوئی مددگار نہیں ہوگا اور وہ اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔

﴿اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ ۚ وَ اِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ؕ﴾ (271)

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ جب اوپر کی آیت 270 نازل ہوئی تو صحابہ کرام نے نبی ﷺ سے عرض کیا کہ کون سا صدقہ افضل ہے؟ وہ جو چھپا کر دیا جائے یا جو ظاہر کر کے دیا جائے۔ اس پر یہ آیت اُتری۔ فرمایا: اگر صدقہ و خیرات ظاہر کر کے دو گے تو یہ بھی اچھا ہے کیونکہ اس سے دوسروں کو بھی انفاق کی ترغیب ملے گی اور اگر پوشیدہ طور پر محتاجوں کو دے دو تو یہ زیادہ بہتر ہے کیونکہ اس میں ریاکاری اور دکھاوا نہیں ہوگا۔

اکثر اہل علما اور فقہا کے نزدیک فرض صدقہ یعنی زکوٰۃ کو علانیہ دینا اور اسی طرح تمام دینی فرائض مثلاً نماز، روزہ، حج وغیرہ کو سب کے سامنے ادا کرنا پسندیدہ اور بہتر ہے۔ کیونکہ اس سے اسلامی شعائر کا اظہار اور فروغ ہوتا ہے۔ لیکن نفلی صدقہ و خیرات میں عام طور پر اظہار کی بجائے اِخفاء پسندیدہ اور بہتر ہے کہ یہ پوشیدہ طور پر ہو تا کہ اس میں ریاکاری اور دکھاوا نہ ہو سکے۔ البتہ جہاں دوسروں کو ترغیب دینی مقصود ہو وہاں نفلی صدقے کا اظہار بھی درست ہے۔ یعنی سب کے سامنے اسے دینا درست ہے

فَنِعِمَّا هِیَ کے معنی ہیں فَنِعْمَ شَیْءٍ هٰذَا (یہ اچھی چیز ہے)۔

اس مقام پر "اَلْفُقَرَآءَ" (محتاج لوگ) کا لفظ آیا ہے جس کے مفہوم میں مسلم اور غیر مسلم دونوں قسم کے محتاج شامل ہیں۔

﴿وَ یُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ ؕ﴾ (271)

یہ ایسے صدقہ وخیرات کا صلہ اور بدلہ ہے جو اللہ تعالیٰ اُس بندے کو دے گا جو صرف اُس کی رضا اور خوشنودی کے لیے اِنفاق کرتا ہے، خواہ وہ فرض صدقے کو ظاہر کر کے یا نفلی صدقہ چھپا کر دیتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اُس کے گناہوں کو بخش دے گا۔ گویا صدقے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

﴿وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۷۱﴾﴾ (271)

فرمایا اللہ تمہارے تمام اعمال سے باخبر ہے کہ تم نے کون سا کام کس نیت اور ارادے سے اور کیسے کیا۔ خاص طور پر جو تم صدقہ کرو گے پوشیدہ یا علانیہ، وہ اُسے جانتا ہے اور اس کا تمہیں اجر دے گا۔

قرآن کے ان الفاظ میں صدقہ وخیرات کو پوشیدہ طور پر دینے کی ترغیب پائی جاتی ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ؗ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۲۷۳﴾ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

"(اے نبی ﷺ) لوگوں کو ہدایت دینا آپ ﷺ کی ذمہ داری نہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ اور جو مال تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے، اپنے لیے کرو گے۔ تمہیں اسی لیے خرچ کرنا چاہیے کہ اللہ کی رضا حاصل ہو۔ اور تم جو مال خرچ کرو گے، اُس کا تمہیں پورا اجر ملے گا اور تمہاری کوئی حق تلفی نہ ہوگی۔

صدقہ وخیرات میں اُن لوگوں کا زیادہ حق ہے جو اللہ کے کاموں میں اس طرح گھرے ہوئے ہیں کہ روزی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ناواقف آدمی ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے اُنھیں خوش حال سمجھتا

ہے۔ لیکن تم اُنہیں اُن کی صورت سے پہچان سکتے ہو۔ وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔ اور جو مال تم خرچ کرو گے، اللہ اُسے جانتا ہے۔

جو لوگ دن رات اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، پوشیدہ یا علانیہ، اُنہیں اپنے رب کے ہاں اس کا اجر ملے گا۔ اُنہیں نہ کوئی خوف ہوگا، نہ وہ غمگین ہوں گے۔" (272-274)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

هُدٰىهُمْ:...... (اُن کو ہدایت دینا) اِس جگہ ہدایت سے مراد ایمان ہے جس کی توفیق صرف اللہ تعالیٰ ہی دیتا ہے۔

ہدایت کا لفظ کئی اور معنوں میں بھی آتا ہے جیسے:

1۔ راستہ دکھانا:

﴿وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (الشوریٰ 52:42)

"اور بے شک آپ ﷺ ضرور سیدھا راستہ دکھاتے ہیں۔"

2۔ راستے پر چلانا:

﴿اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ﴾ (الفاتحہ)

"ہمیں سیدھے راستے پر چلا۔"

3۔ منزل تک پہنچانا:

﴿وَ قَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ هَدٰىنَا لِهٰذَا﴾ (الاعراف 43:7)

"شکر ہے اللہ کا جس نے ہمیں اس (جنت کی منزل) تک پہنچایا۔"

لِلْفُقَرَاءِ:...... اس سے پہلے ایک مبتدا محذوف ہے جو صدقہ یا انفاق کے ہم معنی کوئی لفظ ہو سکتا ہے جو محتاجوں کی خاطر ہو۔

اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ:...... اس کے معنی ہیں مُنِعُوْا وَحُبِسُوْا فِيْ طَاعَتِهٖ لِغَزْوٍ اَوْ تَعَلُّمِ عِلْمٍ یعنی اس سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں جہاد یا دینی تعلیم کے حصول میں اس قدر مصروف ہو جائیں کہ اپنی روزی کمانے سے رہ جائیں۔ گویا کسی دینی خدمت کی مصروفیت میں اس طرح گھر گئے ہوں کہ کسبِ معاش کے لیے دوڑ دھوپ نہ کر سکیں۔

ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ:...... اس کے معنی سفر کرنے کے ہیں۔ جیسے سورہ المزمل میں ارشاد ہوا ہے کہ:

﴿وَآخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِي الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (المزمل 20:73)

"اور بعض دوسرے ہوں گے جو اللہ کے فضل (روزی) کی تلاش میں زمین میں سفر کریں گے۔"

اَلْجَاهِلُ:......اس سے مراد ناواقف اور بے خبر شخص ہے۔

اَلتَّعَفُّفُ:...... یہ عِفَّةٌ (بچنا) سے ہے۔ اس جگہ مراد ہے کہ خودداری کی وجہ سے سوال کرنے اور مانگنے سے بچنا۔

سِیْمَا:......اس کے معنی علامت اور نشانی کے ہوتے ہیں جس سے کوئی چیز پہچانی جاسکتی ہے۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ عَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰهُمْ﴾ (الاعراف 46:7)

''اور اَعراف (جنت اور دوزخ کے درمیان ایک مقام) پر کچھ آدمی ہوں گے جو ہر ایک کو اُس کی علامت سے پہچانیں گے۔''

سورۂ الرحمٰن میں ہے کہ:

﴿يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ﴾ (الرحمٰن 41:55)

''مجرم لوگ اپنی نشانیوں سے پہچانے جائیں گے۔ پھر اُنہیں پیشانی کے بالوں سے اور پاؤں سے پکڑ کر (دوزخ میں پھینکا جائے گا)۔''

بعض اردو مترجمین کو غلط فہمی ہوئی ہے اور انہوں نے سِیْمَا کو فارسی زبان کا لفظ سمجھ کر اسے ''چہرے'' کے معنوں میں لے لیا ہے جو کہ عربیت کے خلاف ہے۔

لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا:...... اِلْحَافًا کے معنی اِلْحَافًا کے ہیں یعنی لپٹ کر سوال کرنا۔ گویا کوئی سائل کسی کے پیچھے اس طرح پڑ جائے کہ کچھ لے کر ہی ٹلے گا۔

اصل میں لَا يَسْئَلُوْنَ سے سوال کی نفی مراد ہے کہ وہ کبھی سوال نہیں کرتے۔ اِلْحَافًا کی قید مانگنے کی گھٹیا حالت کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ ورنہ یہ کوئی شرط نہیں ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کے بعض مقامات پر اس اسلوب کی کئی مثالیں اور نظائر موجود ہیں جیسے:

1۔ ﴿وَ لَا تَقْتُلُوْۤا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ﴾ (بنی اسرائیل 31:17)

''اور اپنی اولاد کو تنگ دستی کے خوف سے قتل نہ کرو۔''

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اگر تنگ دستی کا خوف نہ ہو تو اولاد کو قتل کرنا جائز ہے۔

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہوا۔

2۔ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰۤوا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً﴾ (آل عمران 130:3)

''اے ایمان والو! کئی گنا بڑھا کر سود نہ کھاؤ۔''

اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کئی گنا نہ ہو تو اس سے کم سود لینا جائز ہوگا۔

اسی طرح ایک اور جگہ فرمایا:

3۔ ﴿وَلَا تُكْرِهُوا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَاءِ إِنْ أَرَدْنَ تَحَصُّنًا﴾ (النور 24:33)

''اور اپنی لونڈیوں کو بدکاری کا پیشہ اختیار کرنے پر مجبور نہ کرو اگر وہ پاک دامن رہنا چاہتی ہوں۔''

اس کا بھی یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر وہ لونڈیوں پاک دامن نہ رہنا چاہتی ہوں تو پھر اُن کو پیشہ کرانے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔

﴿لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ﴾ (272)

اس آیت کے شانِ نزول کے بارے میں کئی روایات ہیں لیکن سب کا مضمون ایک ہی ہے:

1۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے صرف مسلمان محتاجوں پر صدقہ وخیرات کرنے کا حکم دیا تھا۔ مگر اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں ہر محتاج کو...... خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم...... صدقہ وخیرات دیے جانے کا حکم دیا گیا۔

2۔ تفسیر طبری میں ہے کہ مشرکین قریش سے بعض انصاری صحابہ کی رشتہ داری تھی اور وہ اپنے غریب رشتہ دار مشرکین کو اس لیے صدقہ وخیرات نہیں دینا چاہتے تھے کہ جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو اُن کو صدقہ دیں گے، ویسے نہیں دیں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

3۔ مصنف ابن ابی شیبہ میں سعید بن جبیر رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں سے فرمایا تھا کہ:

''تم صرف (محتاج) مسلمانوں کو صدقہ وخیرات دو اور غیر مسلموں کو نہ دو۔''

تو اس پر یہ آیت اُتری کہ ہر محتاج کو صدقہ دو خواہ وہ مسلمان ہے یا غیر مسلم ہے۔

فرمایا: نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام دعوت وتبلیغ ہے۔ اُن کا کام کسی کو زبردستی ہدایت دینا یا ایمان کی توفیق دینا نہیں ہے۔ صرف اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت اور ایمان کی توفیق عطا کرتا ہے۔

یہی مضمون قرآن مجید کے کئی اور مقامات پر بھی آیا ہے:

1۔ ﴿إِنَّكَ لَا تَهْدِيْ مَنْ أَحْبَبْتَ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۝﴾ (القصص 28:56)

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ صلی اللہ علیہ وسلم جسے چاہیں ہدایت نہیں دے سکتے۔ اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور وہ ہدایت قبول کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔''

2۔ ﴿إِنْ تَحْرِصْ عَلٰى هُدٰىهُمْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ يُّضِلُّ وَ مَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ۝﴾ (النحل 16:37)

''(اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان لوگوں کے ہدایت پانے کی کتنی ہی آرزو ہو مگر اللہ ان کو ہدایت نہیں دیتا جن کو وہ گمراہ کرتا ہے۔ پھر ان کا کوئی مددگار نہیں ہوتا۔''

3. ﴿قُلْ إِنَّ اللّٰهَ يُضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ أَنَابَ﴾ (الرعد 13:27)

”کہہ دیجیے! بے شک اللہ جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جو اُس کی طرف رجوع کرتا ہے اُسے وہ ہدایت دیتا ہے۔“

4. ﴿اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ إِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ﴾ (الشوریٰ 42:13)

”اللہ جسے چاہتا ہے چُن لیتا ہے اور ہدایت اُسے دیتا ہے جو اُس کی طرف رجوع کرتا ہے۔“

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ وہ صرف ایسے شخص کو ہدایت اور ایمان کی توفیق دیتا ہے جو اسے حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے۔

اور جو شخص ہدایت کی جستجو نہیں کرتا، اپنی خواہش کے پیچھے چلتا ہے اور شیطان کی پیروی کرتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اُسے گمراہی کی طرف دھکیل دیتا ہے۔

﴿وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ﴾ (صٓ 38:26)

”اور خواہش کی پیروی نہ کر، ورنہ وہ تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔“

﴿وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَ مَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ؕ﴾ (272)

فرمایا: تمہارے اِنفاق کرنے میں اللہ تعالیٰ کا کوئی مفاد نہیں ہے بلکہ اس میں تمہارا اپنا ہی فائدہ ہے جو تمہیں آخرت میں اجر وثواب کی صورت میں ملے گا۔ اس کے علاوہ دنیا میں بھی اس انفاق سے ایک منصفانہ اور صالح معاشرہ قائم کرنے میں مدد ملتی ہے جس کے فوائد تمہیں حاصل ہوں گے۔

پھر فرمایا تمہارا وہی انفاق مقبول ہوگا جو صرف اللہ کی رضا طلبی کے لیے ہوگا۔ مَا تُنْفِقُوْنَ (نہیں تم خرچ کرو گے) یہ خبریہ انداز میں انشائیہ جملہ ہے۔ اس اسلوب کی کئی مثالیں قرآن میں موجود ہیں۔ مراد یہ ہے کہ تمہیں جو کچھ خرچ کرنا ہے وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے۔

﴿وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝﴾ (272)

ارشاد ہوا کہ تم جو انفاق کرو گے اُس کا ثواب تمہیں کئی گنا بڑھا کر دیا جائے گا۔ تمہارے ثواب میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی نیکی کا قدردان ہے اور وہ کسی کی نیکی ضائع نہیں کرتا۔

﴿لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ٚ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ﴾ (273)

اوپر صدقہ وخیرات کا ذکر تھا۔ اب اس کے سب سے زیادہ حق داروں کا ذکر ہے جن کے پانچ اوصاف یہ بیان

ہوئے ہیں۔

1۔ وہ اللہ کے کاموں میں گھرے ہوئے ہیں۔ جیسے دینی تعلیم کے حصول، درس وتدریس اور جہاد وغیرہ میں ہر وقت مصروف لوگ۔ اگر یہ لوگ بھی دوسروں کی طرح روزی کمانے میں لگ جائیں تو اس سے اسلامی معاشرے کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی حکومت کے کل وقتی ملازمین کی تنخواہیں بھی بیت المال سے ادا کی جائیں گی اور اُن کو کوئی اور کاروبار کرنے کی اجازت نہ ہوگی۔

2۔ ایسے لوگ اپنی ہمہ وقتی مصروفیت کی وجہ سے روزی کمانے کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔

3۔ وہ بڑے خود دار ہوتے ہیں اور مال و دولت کے حریص نہیں ہوتے۔ ناواقف آدمی ان کو خوش حال سمجھتا ہے حالانکہ وہ ضرورت مند ہوتے ہیں۔

4۔ لیکن سمجھ دار شخص ایسے سفید پوش محتاجوں کو پہچان لیتا ہے خواہ اُن کی وضع قطع کیسی بھی ہو۔

5۔ وہ کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔ کسی سے کچھ نہیں مانگتے۔ نہ لپٹ کر، نہ پیچھا کر کے اور نہ کسی اور طریقے سے۔

ایک متفق علیہ حدیث جس کو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ يَطُوْفُ عَلَى النَّاسِ تَرُدُّهُ اللُّقْمَةُ وَاللُّقْمَتَانِ، وَالتَّمْرَةُ وَالتَّمْرَتَانِ، وَلٰكِنِ الْمِسْكِيْنُ الَّذِيْ لَا يَجِدُ غِنًى يُغْنِيْهِ، وَلَا يُفْطَنُ بِهِ فَيُتَصَدَّقُ عَلَيْهِ، وَلَا يَقُوْمُ فَيَسْأَلُ النَّاسَ))

(صحیح بخاری، رقم: 1479، صحیح مسلم، رقم: 2393، ابو داؤد، رقم: 1631، نسائی، رقم: 2571)

''وہ شخص مسکین نہیں جو ایک دو لقموں، یا ایک دو کھجوروں کے لیے لوگوں سے سوال کرتا پھرتا ہے۔ بلکہ اصل مسکین وہ ہے جو اتنا خوش حال نہیں ہوتا کہ اس کی ضروریات پوری ہو سکیں۔ اور بظاہر اس کے محتاج ہونے کا بھی پتہ نہیں چلتا کہ کوئی اسے صدقہ دے دے، اور وہ خود بھی لوگوں سے نہیں مانگتا پھرتا۔''

بعض مفسرین کی رائے میں یہ آیت اصحابِ صفہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی جو مسجد نبوی کے صحن میں ایک چبوترے کے نیچے رہتے تھے۔ ان کا اپنا کوئی گھر نہ تھا۔ یہ سب مہاجرین تھے۔ یہ حضرات قرآن مجید حفظ کرتے، احادیث یاد کرتے، ذکر و فکر کی مجلسیں برپا کرتے اور جہاد و قتال میں شرکت کرتے تھے۔

قرآن میں انہی اصحابِ صفہ کے بارے میں نبی ﷺ کو حکم ہوا تھا کہ آپ ﷺ ان حضرات میں تشریف لے جایا کریں اور ان کو خصوصی طور پر وقت دیا کریں۔

﴿وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَ الْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَ لَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ﴾ (الکھف 28:18)

''اور (اے نبی ﷺ) آپ ﷺ اُٹھنا بیٹھنا اُن لوگوں کے ساتھ رکھیں جو صبح و شام اپنے رب کو یاد

کرتے ہیں اور اُس کی رضا کے طالب ہیں۔ آپ ﷺ کی نظرِ کرم اُن سے ہٹنے نہ پائے۔"

﴿وَ مَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴾ (273)

یہ آخر میں فرمایا کہ اخلاص اور نیک نیتی کے ساتھ تم جو انفاق بھی کرو گے۔ اُسے اللہ سبحانہٗ جانتا ہے اور وہ تمہیں اس کا اجر دے گا۔

اس فقرے میں انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب پائی جاتی ہے۔ خاص طور پر اُن سفید پوش محتاجوں پر صدقہ وخیرات کرنے کی، جن کا اوپر ذکر ہوا ہے۔

﴿اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَ النَّهَارِ سِرًّا وَّ عَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ﴾ (274)

اس سے پہلے صدقہ وخیرات اور انفاق فی سبیل اللہ کا حکم تھا۔ اب اس کے اجر وثواب کا ذکر ہے۔

فرمایا: جو لوگ دن رات، ہر موقع اور ہر حال میں اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں، کبھی پوشیدہ طور پر اور کبھی علانیہ، تو ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ ایسا اجر وثواب عطا فرمائے گا جس کے بعد اُن کو نہ کوئی خوف وخطر رہے گا اور نہ کوئی غم واندوہ۔

اس سے پہلے واضح کیا جاچکا ہے کہ قرآن مجید کی اس تعبیر سے جنت مراد ہوتی ہے کیونکہ ہماری دنیا میں خوف وغم سے نجات ممکن نہیں۔

اس آیت میں رات کو دن پر اور پوشیدہ کو علانیہ پر مقدم رکھا گیا ہے جس سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ چھپا کر دیا ہوا صدقہ دوسروں کے سامنے دیے ہوئے صدقے سے افضل ہے۔

اس کے علاوہ پھر پوشیدہ اور علانیہ صدقات کو ملا دیا گیا ہے۔ کہ بعض حالات میں یہ دونوں صدقات یکساں فضیلت رکھتے ہیں۔ ایک اِس اعتبار سے کہ اِس میں ریاکاری اور دکھاوا نہیں ہوتا، اور دوسرا اِس لحاظ سے کہ اس سے اوروں کو بھی انفاق کی ترغیب ملتی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یہ آیت سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی تھی جنہوں نے ایک موقع پر چالیس (40) دینار (سونے کا سکہ۔ اشرفی) صدقہ کیے تھے جن میں دس (10) دینار رات کے وقت، دس (10) دن کو، دس (10) پوشیدہ طور پر اور دس (10) علانیہ خیرات کیے تھے۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ
الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَ
اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَ حَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ
فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۷۵﴾ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ
وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ﴿۲۷۶﴾

''جولوگ سود کھاتے ہیں، قیامت کے دن (قبروں سے) اس طرح اُٹھیں گے جیسے کسی پر جن بھوت کا سایہ ہو۔ اُن کا یہ حال اس لیے ہوگا کہ وہ کہتے تھے تجارت بھی سود کی طرح ہے۔ حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ پھر جس کے پاس اُس کے رب کی طرف سے نصیحت پہنچی اور وہ سود کھانے سے باز آ گیا تو جو پہلے لے چکا، سو لے چکا۔ اس کا معاملہ اللہ کے حوالے۔ مگر جو لوگ اس کے بعد بھی سود کھائیں گے، وہ دوزخی ہیں اور ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔

اللہ سود کے مال سے برکت ختم کر دیتا ہے اور صدقے کے مال میں برکت دیتا ہے۔ یاد رکھو، اللہ کسی ناشکرے اور گناہگار کو پسند نہیں کرتا۔'' (275-276)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

يَاْكُلُوْنَ:...... اس کھانے سے مراد سود کا مال حاصل کرنا اور اُسے اپنے تصرف میں لانا ہے۔

اَلرِّبٰوا:...... یہ رِبَا يَرْبُوْ سے ہے۔ اس کے اصل معنی بڑھنے یا اضافہ ہونے کے ہیں۔

رَبَا الشَّيْءُ کے معنی ہیں کوئی چیز بڑھ گئی، اُس میں اضافہ ہوگیا۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَ مَآ اٰتَيْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّيَرْبُوَا فِيْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا يَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ﴾ (الروم: 38:30)

''اور جو سودی قرض تم دیتے ہو تا کہ دوسرے لوگوں کے مال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے تو اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا۔''

شرعی اصطلاح میں رِبا یعنی سود سے مراد ہے: اَلْقَرْضُ الْمَشْرُوْطُ فِيْهِ الْاَجَلُ وَزِيَادَةٌ عَلَى الْمُسْتَقْرِضِ ''یعنی قرض کا ایسا معاملہ جس میں میعاد مقرر کی گئی ہو اور قرض لینے والے پر قرض کی اصل رقم سے کچھ زیادہ دینے کی شرط

لگائی گئی ہو۔" (احکام القرآن للجصاص 429/1)

يَتَخَبَّطُهُ:...... یہ خبط ہے جس کے اصل معنی اندھیرے میں بھٹکنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے اس شخص کو شیطان نے چھوت کے اثر سے یا آسیب کے نتیجے میں پاگل اور دیوانہ بنا دیا ہو۔

اَلْمَسُّ:......اس کے اصل معنی چھونے کے ہیں مگر اس جگہ مراد ہے: جنون، دیوانگی، آسیب، جن کا سایہ۔

يَمْحَقُ:...... مَحَقَ کے معنی ہیں: کسی چیز کو تھوڑا تھوڑا کر کے ختم کر دینا اور مٹا دینا۔ دوسرے لفظوں میں اسے گھٹانا اور مٹانا کہہ سکتے ہیں۔

يُرْبِىْ:...... یہ رِبَا سے ہے۔ اس کے معنی ہیں: وہ بڑھاتا ہے اور کئی گنا زیادہ کر دیتا ہے۔

اَثِيْم:...... یہ اِثْمٌ (گناہ) سے صفت مشبہ ہے جس کے معنی عادی گناہ گار اور جرائم پیشہ کے ہیں۔

﴿ اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِىْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ﴾ (275)

انفاق فی سبیل اللہ کے بعد اب اُس کے مقابل میں سود کی حرمت کا ذکر ہے۔ یا پھر اسے مالی معاملات میں حلال وحرام جیسی دو متضاد (OPPOSITE) چیزوں کا بیان بھی کہہ سکتے ہیں۔ بہر حال یہ قرآن کا ایک اسلوب ہے جس میں وہ جنت کے ساتھ دوزخ کا اور اہل ایمان کے ساتھ اہل کفر کا ذکر کرتا ہے۔ بعض لوگ جن کے اعصاب پر "نظم" سوار ہے وہ اسے قرآن کے "نظم" کی ایک خصوصیت قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ یہ قرآن حکیم کے مختلف اسالیب میں سے ایک اسلوب ہے جس کا نام نہاد "نظم" سے کوئی تعلق نہیں۔ اصطلاح میں اسے "اسلوب مقابلہ" کہتے ہیں۔

فرمایا: جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت کے دن قبروں سے اس طرح اُٹھیں گے جیسے کسی پر جن بھوت کا سایہ ہو، اُسے مرگی (EPILEPSY) کے دورے پڑ رہے ہوں اور اُس کی حالت پاگلوں جیسی ہو۔

یہ ایک سود خوار کی ذہنی کیفیت کی تمثیل ہے کہ ویسے وہ معمول کا (NORMAL) انسان ہوتا ہے مگر جب اُس کے پاس کوئی پریشان حال ضرورت مند قرض لینے آتا ہے تو اچانک اُس کی طبیعت میں درندگی آجاتی ہے۔ اور وہ خونخوار ہو جاتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایک تازہ شکار ہاتھ آگیا ہے۔ وہ اس کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اُٹھاتا ہے۔ اُس کی کوئی قیمتی چیز اپنے پاس رہن (PLEDGE) رکھ کر اُسے اپنی من مانی شرائط کے ساتھ سود پر کچھ رقم دیتا ہے۔ اُس وقت وہ انسانی ہمدردی سے عاری، عقل وشعور سے بے بہرہ، ایک سنگ دل درندے کا رُوپ دھار لیتا ہے۔ دنیا میں اس کی یہی ذہنی حالت قیامت کے دن اس صورت میں تبدیل ہو جائے گی جس کا ذکر اس آیت میں بیان ہوا ہے کہ وہاں جب اُسے قبر سے اُٹھایا جائے گا تو وہ پاگلوں کی سی حرکتیں کرے گا۔

﴿ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ﴾ (275)

مطلب یہ ہے کہ آخرت میں سود خواروں کا انجام پاگلوں جیسا اس لیے ہو جائے گا کہ جب دنیا میں اُن سے کہا جاتا تھا کہ تم سود کیوں کھاتے ہو تو وہ یہ نامعقول جواب دیتے تھے کہ تجارت کا نفع بھی تو سود ہے۔ اگر تجارت کا نفع لینا جائز ہے تو سود لینا بھی جائز ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے اُن کے اس غلط دعوے کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ بے شک تجارت کے ذریعے نفع لینا تو حلال ہے مگر سود کی کمائی حرام ہے:

تجارت اور سود میں اتنا واضح فرق ہے کہ کوئی ہوش مند شخص اس کا انکار نہیں کرسکتا اور جو انکار کرتا ہے اور ان دونوں کو ایک جیسا سمجھتا ہے وہ قرآن کی نظر میں مخبوط الحواس اور بے عقل ہے۔

تجارت اور سود میں فرق:

1۔ تجارت میں زائد روپیہ کسی کام یا مال کا معاوضہ ہوتا ہے لیکن سود میں جو زائد رقم سود خوار وصول کرتا ہے، وہ نہ کسی کام کا معاوضہ ہے اور نہ مال کا۔

2۔ تجارت سے دولت گردش میں آتی اور پھیلتی ہے لیکن سود میں یہ سمٹ کر صرف چند ہاتھوں میں مرتکز (CONCENTRATE) ہو جاتی ہے۔

3۔ تجارت میں ہر شخص اپنے مال کے نفع ونقصان دونوں کا ذمہ دار ہوتا ہے لیکن سود خوار صرف نفع کا حق اپنے لیے محفوظ رکھتا ہے مگر نقصان کی ذمہ داری مقروض پر ڈالتا ہے۔

4۔ تجارت میں کوئی معاملہ ایک بار ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس سود خوار اکثر اپنے مقروض کی جان نہیں چھوڑتا۔ اس کے مطالبات پورے ہونے میں نہیں آتے۔ سود مرکب (COMPOUND USURY) کی صورت میں کئی خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔

5۔ تجارت میں نفع کی جو بھی شرح طے ہو، وہ ایک بار وصول ہو جائے تو بیچنے والے کے مطالبات ختم ہو جاتے ہیں۔ لیکن سود خوار کے مطالبات وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔

6۔ تجارت میں انسان کی محنت، ذہانت، صلاحیت اور وقت سب صرف ہوتے ہیں پھر کہیں جا کر کچھ نفع ہوتا ہے۔ لیکن سود خوار بغیر محنت کیے سود وصول کرتا رہتا ہے۔

﴿فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَ اَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَ مَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝﴾ (275)

مراد یہ ہے کہ اب سود کی حرمت کا حکم آجانے کے بعد جو شخص سود لینا چھوڑ دے گا اُسے اس پر گناہ نہیں ہوگا جو اس سے پہلے وہ سود لے چکا۔ کیونکہ اُس وقت تک سود حرام نہ تھا۔ اس لیے پہلے کا لیا ہوا سود واپس کرنا بھی ضروری نہیں۔ ایسے شخص کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے ہے۔ وہ چاہے گا تو اُسے معاف کر دے گا۔ لیکن جو لوگ سود کی حرمت کا حکم آجانے کے بعد بھی سود لینا نہیں چھوڑیں گے تو ایسے لوگوں کا انجام دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

﴿هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ﴾ (وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے) سے دو معنی مراد ہو سکتے ہیں:

1۔ اس جگہ خلود فی النار یعنی دوزخ میں ہمیشہ رہنے کا مطلب طویل مدت ہے نہ کہ ہمیشہ رہنا۔ اس مفہوم کی بعض مثالیں قرآن میں موجود ہیں جیسے قاتل کے بارے میں فرمایا گیا ہے۔

﴿وَ مَنْ يَّقْتُلْ مُؤْمِنًا مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآؤُهٗ جَهَنَّمُ خٰلِدًا فِيْهَا وَ غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ لَعَنَهٗ وَ اَعَدَّ لَهٗ عَذَابًا عَظِيْمًا﴾ (النساء 93:4)

''اور جو شخص کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے تو اس کی سزا دوزخ ہے جس میں وہ ہمیشہ رہے گا۔ اس پر اللہ کا غضب اور اس کی لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

اسی طرح بعض احادیث سے بھی اس مضمون کی تائید ملتی ہے۔

(صحیح بخاری، رقم: 6571,6560، صحیح مسلم، رقم: 461,457)

2۔ جو شخص سود کی حرمت کا حکم آجانے کے بعد بھی اُسے حلال سمجھے گا، خواہ وہ زبان سے اس کا اظہار کرے یا نہ کرے، تو وہ قرآن کے ایک منصوص اور واضح حکم کا انکار کرنے کی وجہ سے کافر (یا مرتد) ہو جائے گا جس کا انجام بہرحال دوزخ میں ہمیشہ کے لیے رہنا ہے۔

﴿يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ﴾ (276)

فرمایا: اللہ سبحانہٗ سود کو گھٹاتا اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سود کے مال سے اور اُس مال سے جس میں سود ملا ہوا ہو، برکت ختم کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس اُس مال میں برکت دیتا ہے جس میں سے صدقات دیے جائیں۔ یہ برکت مادی طور پر (MATERIAL) اضافے کی شکل میں ہوتی ہے اور روحانی (SPIRITUAL) طور پر ثواب کی صورت میں ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے اسے صرف آخرت سے متعلق سمجھا ہے کہ وہاں سود کی کمائی نیکی کے پلڑے میں صفر (ZERO) ہوگی اور صدقات کے بدلے میں بہت سی نیکیاں حاصل ہوں گی۔

لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے سود کو گھٹانے اور صدقات کو بڑھانے کا تعلق ہماری موجودہ زندگی سے بھی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سودی نظام سے معیشت آہستہ آہستہ زوال پذیر ہو جاتی ہے اور صدقات کے نظام سے معاشی ترقی ہوتی ہے۔ اس معاملے کی تفصیل ان شاء اللہ آیت 280 کی تفسیر کے آخر میں بیان کی جائے گی۔

﴿وَ اللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۝۲۷۶﴾ (276)

آخر میں فرمایا: اللہ کسی ناشکرے اور گناہ گار کو پسند نہیں کرتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا شخص جو اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے مال کی نعمت کی قدر نہیں کرتا، اُس کا صحیح حق ادا نہیں کرتا اور اُس کے حکم کے مطابق مال کو استعمال نہیں کرتا وہ ناشکرا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ سود کی حرمت کے حکم پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے پاپی اور گناہ گار ہو جاتا ہے۔ یہی دونوں صفات ایک سودخوار میں بیک وقت جمع ہو جاتی ہیں کیونکہ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ (پاپی ناشکرا) کے درمیان واؤ (وَ) نہیں آیا ہے۔

اس لیے ان کو الگ الگ انسانوں کی صفات نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ یہ جڑواں صفات ہر سود خوار کا خاصہ ہیں۔

پھر جب اللہ تعالیٰ ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو ناشکرا گناہ گار ہو تو اس کے معنی یہ بھی ہیں کہ اگر وہ آدمی توبہ کیے بغیر مر گیا تو اللہ تعالیٰ اُسے آخرت میں ایسا عذاب دے گا جس کا ذکر اوپر آیت 275 میں آچکا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ لَهُمْ
اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۷﴾

''جو لوگ سچے ایمان والے ہیں، نیک کام کرتے ہیں، نماز کی پابندی کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، (غرض ایمان کے تقاضے کے مطابق اللہ تعالیٰ کے تمام احکام پر عمل کرتے ہیں) تو ان کا اجر اُن کے رب کے ہاں آخرت میں محفوظ ہے۔ وہاں اُن کو عیش و آرام کی جنت ملے گی۔ اُن کو نہ ماضی کا کوئی غم ہوگا اور نہ مستقبل کا کوئی خوف ہوگا۔'' (277)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اعمالِ صالحہ کے بعد نماز اور زکوٰۃ کا ذکر الگ طور پر کیا گیا۔ حالانکہ وہ بھی اعمال صالحہ میں شامل تھے۔ اس کی وجہ دین میں ان دونوں کی خاص اہمیت ہے۔ نماز سب سے بڑی بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ سب سے بڑی مالی عبادت ہے۔ دونوں دین اسلام کے بنیادی ارکان میں سے ہیں۔ قرآن نے اکثر مقامات پر ان کا ذکر ایک ساتھ کیا ہے۔

اس آیت میں سود کھانے والوں پر تعریض بھی ہے کہ اگر وہ سچے ایمان والے ہوتے اور نیک اعمال کرنے والے ہوتے تو کبھی سود کی کمائی نہ کھاتے اور اس سے بچنے کی پوری کوشش کرتے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ كُنْتُمْ
مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ وَ
اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَ اِنْ
كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾ وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ۛ ثُمَّ تُوَفّٰى

كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾

''اے ایمان والو! اگر تم واقعی مومن ہو تو اللہ کے عذاب سے ڈرو اور تمہارا جو سود لوگوں کے ذمے باقی ہے، اُسے چھوڑ دو۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ اگر تم توبہ کر و تو اصل رقم کے حق دار ہو۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ کوئی تم پر ظلم کرے۔
مقروض جب تک تنگ دست ہے، اُسے خوش حالی تک مہلت دو۔ لیکن اگر قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھو۔ اُس دن سے ڈرو جب تمہیں اللہ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ پھر ہر ایک کو اُس کے اچھے برے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا اور کسی کی حق تلفی نہ ہوگی۔'' (278-281)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

اِتَّقُوا اللّٰهَ: ...... اس سے مراد اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنا ہے۔

فَاْذَنُوْا: ...... اس کے معنی ہیں فَاعْلَمُوْا (پس تم خوب جان لو)

حَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ: ...... (اللہ تعالیٰ کی طرف سے لڑائی) اس سے مراد اللہ تعالیٰ کا غصہ اور غضب ہے۔

حَرْبٍ مِّنْ رَّسُوْلِهٖ: ...... اس سے مراد ہے کہ رسول اللہ ﷺ سود خواروں سے وہ سلوک کریں گے جو باغیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور وہ عملی طور پر جنگ کی صورت میں ہوگا۔ ویسے ہر زمانے کے سود خواروں کو رسول اللہ ﷺ کا دشمن سمجھا جائے گا۔

لَا تَظْلِمُوْنَ: ...... اس سے مراد ہے اصل مال سے زیادہ لے کر دوسروں پر ظلم نہ کرو۔

لَا تُظْلَمُوْنَ: ...... اس کا مطلب ہے اپنا اصل مال پورا لو اور کم نہ لو کہ اس طرح اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔

ذُوْ عُسْرَةٍ: ...... یہ اِعْسَارٌ سے ہے جس کے معنی مال نہ ہونے یا کاروبار میں مندا ہونے کے ہیں۔

نَظِرَةٌ: ...... اس کے معنی انتظار کرنے کے ہیں۔

مَيْسَرَةٍ: ...... اس کے معنی ہیں: آسانی، سہولت، گنجائش، خوش حالی۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰٓوا اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ ﴾

(278)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کو خطاب کر کے دو باتوں کا حکم دیا ہے۔ ایک تقویٰ اختیار کرنے یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرنے کا، اور دوسرے سود یا سود کی بقایا رقم چھوڑ دینے کا۔

پہلے اہل ایمان سے فرمایا گیا کہ تقویٰ اختیار کرو اور ہر حال میں اللہ سبحانہٗ کے عذاب سے ڈرتے رہو۔ تقویٰ

دراصل تمام نیکیوں کی بنیاد ہے۔ قرآن مجید نے اسے اختیار کرنے کا حکم کئی مقامات پر دیا ہے۔ تقویٰ وہ ایمانی کیفیت ہے جس میں بندہ اپنے رب کے احکام کی پابندی کرتا ہے۔ اس کی نافرمانی کے برے انجام سے ڈرتا ہے۔ پھر متقی شخص کے لیے نیکی کرنا آسان اور برائی کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

پھر فرمایا کہ اگر کسی کا کچھ سود کسی کی طرف بقایا رہ گیا ہے تو وہ اسے چھوڑ دے اور اس کو نہ لے۔ تقویٰ اور ایمان کا یہی تقاضا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بندے کو کسی کام سے روک دے تو وہ رک جائے۔ اب جب کہ سود کو حرام قرار دے دیا گیا ہے تو اس کا ہر قسم کا لین دین بند ہونا چاہیے اور کسی کا جو بقایا رہ گیا ہو تو وہ اسے بھی چھوڑ دے۔

﴿فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ۚ﴾ (279)

ارشاد ہوا کہ اگر تم سود کی رقم یا اس کا بقایا نہیں چھوڑو گے تو پھر یاد رکھو تمہاری اللہ و رسول ﷺ سے جنگ ہے۔

یہ قرآن مجید میں سخت ترین وعید ہے جس میں سود کھانے کو اللہ و رسول ﷺ سے جنگ کرنے کے مترادف قرار دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے جو اللہ و رسول ﷺ سے جنگ کرے گا، شکست و بربادی اس کا مقدر بنے گا۔

﴿وَ اِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ وَ لَا تُظْلَمُوْنَ ۝﴾ (279)

فرمایا، سود پر دیے ہوئے قرض کی اصل رقم لینے کے تم حق دار ہو وہ تم لے سکتے ہو، لیکن اس پر اضافہ جو سود کی شکل میں ہے وہ حرام ہے، اُسے چھوڑ دو۔ اس طرح سود لے کر نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ اصل رقم چھوڑ کر اپنا نقصان کرو۔ بلکہ اپنا حق لو اور دوسروں کو اُن کا حق دو، نہ صرف سود کے معاملے میں بلکہ ہر معاملے میں یہی اصول پیش نظر رکھو۔

﴿وَ اِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ﴾ (280)

پھر ارشاد ہوا کہ اگر مقروض تنگ دست ہے اور فی الحال قرض ادا نہیں کرسکتا تو اسے خوشحال ہونے تک مہلت دو تاکہ وہ آسانی سے تمہارا قرض لوٹا سکے۔ اس طرح مقروض کو مہلت دینے کا تمہیں اجر ملے گا۔

﴿وَ اَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝﴾ (280)

پھر فرمایا اگر مقروض قرضہ ادا نہیں کرسکتا تو اس کا قرض معاف کردو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔ اس سے تمہیں صدقے کا ثواب ملے گا۔ اگر تم کو اس کا صحیح اجر معلوم ہو تو تم ضرور اپنا قرض معاف کردو گے۔

حقیقت یہ ہے کہ سود ایک لعنت ہے جو اسلامی معاشرے میں اخوت، باہمی ہمدردی و تعاون اور برادرانہ محبت کے پاکیزہ جذبات ختم کر دیتی ہے۔ اس کے نتیجے میں دلوں میں مال کی ہوس پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔

سود کی حرمت:

سود کے مسئلے کی اہمیت کے پیش نظر اب ہم اس پر تفصیلی گفتگو کریں گے۔

سود کے بارے میں یہ آخری آیات (278 تا 280) ہیں جو حجۃ الوداع سے ذرا پہلے نازل ہوئیں۔ ان کے

ذریعے سود کو بالکلیہ ختم کر دیا گیا اور اس کی واجب الادا رقوم کو بھی کالعدم قرار دیا گیا۔

پھر نبی ﷺ نے خطبۂ حجۃ الوداع میں اعلان فرما دیا کہ سود کا ہر معاملہ کالعدم ہے۔ اس حکم پر سب سے پہلے خود عمل کرتے ہوئے آپ ﷺ نے اپنے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے تمام سودی معاملات کالعدم قرار دیے اور غیر مسلموں کے ذمے جو سودی رقوم واجب الادا تھیں وہ بھی چھوڑ دی گئیں۔

اس مقام پر قرآن نے راس المال (رُءُ وْسُ اَمْوَالٌ) کی اصطلاح استعمال کی ہے جس میں اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ یہ حکم تجارتی، صرفی اور سرمایہ کاری کی ہر نوعیت پر یکساں طور پر لاگو ہوتا ہے۔

احادیث اور سود:

صحیح احادیث میں سود کھانے کو سات مہلکات (موبقات) میں سے ایک قرار دیا گیا ہے، جو اسلام میں اکبر الکبائر یعنی سب سے بڑے گناہ ہیں۔ اس کے علاوہ سود لینے والے پر، سود دینے والے پر، اس کی تحریر لکھنے والے پر اور اس کے گواہوں پر لعنت کی گئی ہے۔

ایک متفق علیہ حدیث جس کو سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِجْتَنِبُوا السَّبْعَ الْمُوْبِقَاتِ، قَالُوْا: وَمَا هُنَّ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: الشِّرْكُ بِاللّٰهِ، وَالسِّحْرُ، وَقَتْلُ النَّفْسِ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ إِلَّا بِالْحَقِّ، وَأَكْلُ الرِّبَا، وَأَكْلُ مَالِ الْيَتِيْمِ، وَالتَّوَلِّیْ يَوْمَ الزَّحْفِ، وَقَذْفُ الْمُحْصَنَاتِ الْغَافِلَاتِ الْمُؤْمِنَاتِ))

(صحیح بخاری، رقم: 2766، صحیح مسلم، رقم: 262، ابو داؤد، رقم: 2874، نسائی، رقم: 2874)

''سات مہلک چیزوں سے بچو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ سات مہلک چیزیں کون کون سی ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، کسی جان کو قتل کرنا جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، سود کھانا، یتیم کا مال کھانا، جنگ کے وقت میدانِ جہاد سے بھاگنا، اور بھولی بھالی پاک دامن مسلمان عورتوں پر تہمت لگانا۔''

صحیح مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((لَعَنَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ آكِلَ الرِّبَا، وَمُوْكِلَهٗ، وَكَاتِبَهٗ، وَشَاهِدَيْهِ، وَقَالَ: هُمْ سَوَاءٌ))

(صحیح مسلم، رقم: 4093، ترمذی، رقم: 1206)

''رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، سود کھلانے والے، اس کی تحریر لکھنے والے اور اس کے دونوں گواہوں پر لعنت فرمائی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ ''یہ سب (گناہ میں) برابر ہیں۔''

توریت میں بھی سود کو حرام قرار دیا گیا تھا۔ اس کے دو حوالے درج ذیل ہیں:

1۔ ''اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو، کچھ قرض دے تو اس سے بیاجیوں کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اُس سے سود لینا۔'' (خروج باب 25:22)

2۔ ''تو اس سے سود اور نفع مت لے، اپنے خدا سے ڈر، تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے، تو اُسے سود پر روپیہ قرض مت دے، نہ ایسے نفع کے لیے کھانا کھلا۔'' (احبار باب 25، ص 38،37)

''رِبا'' (یا رِبٰو) کے لفظی معنی ''اضافے اور زیادتی'' کے ہیں۔ اردو اور فارسی زبان میں اس کا ترجمہ ''سود'' کیا جاتا ہے۔

سود کی دو قسمیں ہیں: رِبا النَّسیئہ اور رِبا الفضل۔

رِبَا النَّسِيْئَةُ:

یہ قرض پر اضافے کا سود ہے۔ قرآن نے اسے حرام قرار دیا ہے اور اسے ''اللہ اور رسول ﷺ سے جنگ'' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ حرام لِذَاتِہٖ ہے۔ (البقرہ 279:2)

رِبَا الْفَضْلِ:

یہ اس اضافے کو کہتے ہیں جو بعض اجناس کے ہم جنس تبادلے پر لیا جائے۔ حدیث وسنت میں اسے بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ یہ حرام لِغَیْرِہٖ ہے۔

صحیح مسلم میں سیدنا ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((الذَّهَبِ بِالذَّهَبِ ، وَالْفِضَّةِ بِالْفِضَّةِ ، وَالْبُرِّ بِالْبُرِّ ، وَالشَّعِيْرِ بِالشَّعِيْرِ ، وَالتَّمْرِ بِالتَّمْرِ ، وَالْمِلْحِ بِالْمِلْحِ ، مِثْلًا بِمِثْلٍ ، يَدًا بِيَدٍ ، فَمَنْ زَادَ أَوِ اسْتَزَادَ فَقَدْ أَرْبٰى ، اَلْآخِذُ وَالْمُعْطِي فِيْهِ سَوَاءٌ)) (صحیح مسلم، رقم: 4046)

''سونا سونے کے بدلے، چاندی چاندی کے بدلے، گندم گندم کے بدلے، جَو جَو کے بدلے، کھجور کھجور کے بدلے اور نمک نمک کے بدلے، برابر برابر اور نقد بنقد ہوں۔ جس شخص نے زیادہ دیا، یا جس نے زیادہ کا مطالبہ کیا تو اس نے سودی کام کیا۔ اور اس میں لینے والا اور دینے والا دونوں (گناہ میں) برابر ہیں۔''

ربا الفضل بنیادی طور پر ربا النسیئہ سے روکنے کا ذریعہ ہے اور یہ بھی حرام ہے۔ یہ ایک انسدادی (PREVENTIVE) حکم ہے جسے اصول فقہ کی اصطلاح میں سدِّ ذریعہ کہا جاتا ہے۔

ربا کی تعریف (DEFINITION OF RIBA):

فقہ میں ربا یعنی سود کی یہ تعریف کی گئی ہے

''هو القرض المشروط فيه الاجل و زيادةٌ على المستقرض''

(امام جصاص، احکام القرآن، ج: 1، ص: 429)

''قرض کا ایسا معاملہ جس میں ایک خاص مدت ادائیگی کے لیے طے کی گئی ہو اور قرض لینے والے پر کچھ اضافہ مقرر کیا گیا ہو۔''

دوسرے الفاظ میں قرض پر ہر قسم کا اضافہ، جو معاہدے میں طے کر لیا گیا ہو، سود کہلاتا ہے۔

یاد رہے ربا (سود) کی اس تعریف میں سود مفرد کے علاوہ سود مرکب بھی شامل ہے اور یہ دونوں حرام ہیں۔

موجودہ زمانے کے تجارتی بنک جو منافع (INTEREST) اپنے قرض داروں سے لیتے اور امانت داروں کو دیتے ہیں وہ بھی رِبا (سود) ہے۔

ربا النسیہ کے حرام ہونے کا حکم مدینے میں ہجرت کے بعد نازل ہوا۔ سورۂ الروم (30) میں اگرچہ ربا کا ذکر آیا ہے کہ:

﴿وَ مَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ رِّبًا لِّیَرْبُوَا فِیْٓ اَمْوَالِ النَّاسِ فَلَا یَرْبُوْا عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَمَآ اٰتَیْتُمْ مِّنْ زَكٰوةٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْهَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُضْعِفُوْنَ﴾ (الروم 39:30)

''جو سود تم دیتے ہو تاکہ دوسرے لوگوں کے مال میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے تو اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا۔ لیکن جو زکوٰۃ تم اللہ کی رضا کے لیے دیتے ہو تو ایسے لوگ اللہ کے ہاں اپنا مال بڑھا رہے ہیں۔''

مگر مفسرین کے نزدیک اس کا مطلب سود نہیں ہے بلکہ ''نوتہ'' مراد ہے جسے اردو زبان میں ''نیوتہ'' اور پنجابی میں ''نیوندرا'' کہتے ہیں۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو اس نیت سے کوئی ہدیہ یا تحفہ دینا تاکہ بعد میں وہ اس سے بہتر ہدیہ یا تحفہ پیش کرے۔

قرآن وحدیث پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ربا یعنی سود کے بارے میں اس بات کو کوئی دخل نہیں کہ قرض کس غرض کے لیے لیا گیا ہے۔ نبی ﷺ اور صحابہ کرام کے دور میں ہر قسم کے قرض پر اضافہ لینا رِبا (سود) کہلاتا تھا۔ خواہ وہ قرض کسی عام صرفی ضرورت کے لیے تھا، یا کسی تجارتی یا پیداواری ضرورت کے لیے۔ اس لیے یہ خیال بالکل غلط، لغو اور غیر اسلامی ہے کہ تجارتی مقصد کے لئے لیے گئے قرضے پر سود لینا ربا (سود) نہیں ہے، اور یہ کہ دورِ اوّل میں صرف صرفی اور ذاتی ضرورت کے لیے سود کا رواج تھا اور تجارتی قرضوں اور اُن پر سود کا رواج نہ تھا۔

اسلام میں ربا یعنی سود کی حرمت کا ایک بڑا مقصد معیشت میں دولت کو چند ہاتھوں میں جمع ہونے اور اُس کے ارتکاز (CONCENTRATION OF WEALTH) کو روکنا ہے، جو سرمایہ دارانہ نظام (CAPITALISM) کی سب سے بڑی خرابی ہے کہ اس سے دولت چند ہاتھوں میں سمٹ جاتی ہے اور وہ گردش دولت (CIRCULATION OF WEALTH) نہیں ہو پاتی جس سے سب لوگ فائدہ اُٹھا سکیں۔

یاد رہے کہ کرنسی کی قیمت (VALUE) میں کمی بیشی کا اثر قرض پر نہیں پڑتا۔

بعض لوگ سرمائے (CAPITAL) کو پیداوار کا ذریعہ تصور کر کے اس کے استعمال کا معاوضہ (کرایہ) لیتے ہیں

تو یہ بھی حقیقت میں سود ہے جو کہ حرام ہے لیکن مکان، سواری، زمین اور دوسری چیزوں کے استعمال کا کرایہ اور معاوضہ جائز ہے۔ مگر نقد رقم یا کرنسی کے استعمال کا کرایہ اور معاوضہ حرام ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ دارالحرب میں سود کا لین دین جائز ہے لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ قرآن میں سود کو حرام قرار دینے والی آیتوں کا حکم عام ہے اور اس میں کسی قسم کا استثنیٰ (EXCEPTION) نہیں ہے۔ کسی صحیح حدیث سے بھی اس استثنیٰ کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر مقام پر اسلام کے احکام کی پابندی کرے۔ جس طرح ایک مسلمان کے لیے شراب، جوا، زنا، چوری ڈاکہ دنیا میں ہر جگہ حرام ہے اسی طرح سود بھی ہر جگہ حرام ہے۔ سود سے جو اخلاقی اور معاشی خرابیاں ایک مقام پر پیدا ہوتی ہیں وہی دوسری جگہ بھی پیدا ہوتی ہیں۔ خود غرضی، مادہ پرستی، سنگ دلی اور بے رحمی جیسی اخلاقی قباحتیں اور معاشی عدم توازن اور دولت کا ارتکاز یعنی چند ہاتھوں میں جمع ہونا جیسی معاشی خرابیاں سودی معیشت کے وہ برے اثرات ہیں جو ہر جگہ اور ہر مقام پر یکساں طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس لیے دارالاسلام ہو، یا دارالحرب ہو، دارالکفر ہو یا دارالصلح ہو، کوئی ''دار'' ہو، اسلام نے ہر فرد، ادارے اور حکومت کے لیے سود کو حرام قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ اسلامی حکومت اور اداروں کے سودی معاہدات اور سودی ادائیگیاں بھی حرام ہیں۔

مشہور حنفی دیوبندی مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ کا فتویٰ ہے کہ: ''کفار سے بھی سود لینا درست نہیں ہے۔''

اس کے علاوہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''سود'' میں دارالحرب میں سودی لین دین کو ناجائز لکھا ہے۔

سود کی خرابیاں:

سود اپنے اندر بے شمار اخلاقی، معاشرتی اور معاشی خرابیاں اور قباحتیں رکھتا ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے چند ایک خرابیوں کا ذکر کریں گے۔

تمہید کے طور پر سمجھ لیجئے کہ اسلام چاہتا ہے کہ وہ معاشرے میں ایسا عادلانہ اور منصفانہ نظام قائم کرے جس میں کوئی کسی پر ظلم وزیادتی نہ کرے اور نہ کسی کی حق تلفی کرے۔ لوگوں میں باہمی اخوت، الفت، خیر خواہی، ہمدردی اور تعاون وتکافل کا جذبہ کارفرما ہو۔

اس کے برعکس سود سے جو ذہنیت پیدا ہوتی ہے وہ اسلامی اقدار واخلاق کے سراسر خلاف ہے۔ ایک سود خوار دوسرے کے نقصان پر خود فائدہ اٹھاتا ہے۔ سود خواری سے خود غرضی، ظلم وزیادتی اور سنگ دلی جنم لیتی ہے۔ اس سے تین بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

(ا) اخلاقی خرابیاں:

1۔ سود ایک ظالمانہ سلسلہ پیدا کرتا اور دن بدن اسے پھیلاتا رہتا ہے۔ بہت سے لوگ اس ظلم کا شکار ہو کر دیوالیہ (BANKRUPT) ہو جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں کسی کا گھر لٹتا ہے تو کسی کی رہی سہی پونجی بھی ڈوب

جاتی ہے۔

2۔ سودخواری سے انسان میں ایسی خودغرضی، سنگدلی اور شائیلا کی پیدا ہوتی ہے جو دوسروں کے نقصان پر اپنا فائدہ حاصل کرنا چاہتی ہے۔ سودخوار کو اپنے سود کی رقم وصول کرنے سے غرض ہوتی ہے چاہے غریب اپنے گھر کے برتن اور تن کے کپڑے بیچے۔

3۔ سودی نظام سے لوگوں میں مال ودولت کی ہوس پیدا ہو جاتی ہے جس کے بعد انسان کی اہمیت کم اور مال ودولت کی وقعت زیادہ ہوتی ہے۔ ایک انسان کی محنت وکوشش کے ضائع ہونے پر کسی کو افسوس نہیں ہوتا مگر سود کے چار پیسے کم ہونے کا سب رونا روتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روپے کو انسان پر برتری دینے کا نام سود ہے۔

4۔ ایک سودخوار محنت کر کے اور خون پسینہ بہا کر حلال اور پاکیزہ روزی کا تصور نہیں کرسکتا۔ وہ گھر بیٹھے مفت کی کھانے کا عادی ہو جاتا ہے۔

(ب) معاشرتی خرابیاں:

سودی نظام سے درج ذیل معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں:

1۔ سود کے نتیجے میں دولت کی گردش (CIRCULATION OF WEALTH) رُک جاتی ہے اور ارتکازِ دولت (CONCENTRATION OF WEALTH) پیدا ہو جاتا ہے۔ جس سے دولت چند ہاتھوں میں جمع ہو جاتی ہے اور معاشرہ دو مختلف طبقوں میں بٹ جاتا ہے۔ ایک قلیل طبقہ سودخوار سرمایہ داروں پر مشتمل ہوتا ہے جو ساری دولت اور وسائلِ رزق پر قابض ہو کر من مانیاں کرتا ہے۔ دوسرا کثیر طبقہ نانِ جویں اور اپنی بنیادی ضروریات کو ترستا ہے۔ پھر یہ دونوں طبقے باہمی نفرت، حسد وبغض اور جنگ وجدال کی کشمکش کا شکار ہو جاتے ہیں۔

2۔ عام مشاہدہ ہے کہ بغیر محنت ومشقت کے جو دولت مل جائے اُس کی قدر نہیں ہوتی۔ جس طبقے میں گھر بیٹھے دولت کی ریل پیل ہو جائے وہ فضول خرچی اور عیاشی میں مبتلا ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرے میں ہر طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

3۔ چونکہ سودی نظام کوئی اخلاقی بنیاد نہیں رکھتا اس لیے اس سے معاشرے میں وہ مضبوط باہمی تعاون وتکافل پیدا نہیں ہوسکتا جو کسی قوم کی حقیقی ترقی کا ضامن ہوتا ہے۔

(ج) معاشی خرابیاں:

سودی نظام سے جو معاشی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اُن میں سے چند حسب ذیل ہیں:

1۔ سود کے سبب سے امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں غریب لوگوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔ وہ بے روزگاری اور مہنگائی کے ہاتھوں سخت پریشان رہتے ہیں۔

2۔ سود کے باعث سرمائے کی کارکردگی (EFFICIENCY) کم ہو کر رہ جاتی ہے۔ شرح سود اور سرمائے کی

صلاحیت کار میں ایک منفی تعلق قائم ہو جاتا ہے جس سے کئی قدرتی وسائل کا حصول ممکن نہیں رہتا۔ خاص طور پر کوئی چھوٹا کاروبار جو سود کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتا، وہ شروع ہی نہیں کیا جاسکتا، یا شروع کرنے کے بعد نقصان اُٹھا کر چھوڑنا پڑتا ہے۔ جس سے بے روزگاری میں اضافہ ہوتا ہے۔

3۔ سودی رقم سے جو کاروبار شروع کیا جاتا ہے اُس میں منافع کی شرح زیادہ رکھنی پڑتی ہے تاکہ سود کی اقساط بھی ادا کی جاسکیں اور نفع بھی کمایا جاسکے۔ اس کے نتیجے میں ناجائز منافع خوری کا رجحان پیدا ہوتا ہے۔ پھر مکانوں اور دکانوں کی تعمیری لاگت زیادہ ہونے سے اُن کے کرائے بہت زیادہ ہو جاتے ہیں۔ پھر مہنگائی بھی بڑھتی ہے۔

4۔ سودی نظام میں منافع خوری کے لیے ضروری ہے کہ مزدوروں کو اُن کی محنت کا پورا معاوضہ نہ دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں طبقاتی کشمکش پیدا ہوتی ہے جو معاشرے کا امن وسکون برباد کر دیتی ہے۔

5۔ سود کی وجہ سے چیزیں مہنگی ہو جاتی ہیں اور غریب لوگوں کو اپنی ضروریاتِ زندگی حاصل کرنے میں سخت دشواری پیش آتی ہے۔

6۔ سودی کاروبار میں ایک بنیادی خرابی یہ ہے کہ اس میں منافع کی بلند سطح قائم رکھنے کے لیے پیداوار نہ صرف کم کر دی جاتی ہے بلکہ بعض اوقات زیادہ پیداوار کو تلف (DESTROY) کر دیا جاتا ہے جو انسان کی محرومی اور سرمائے کی طاقت کا نہایت عبرت ناک منظر ہوتا ہے۔

﴿وَ اتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ (281)

فرمایا: اُس دن سے ڈرو جب تمہیں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کیا جائے گا۔ وہاں سود کھانے والوں کے جھوٹے عذر بہانے نہیں چلیں گے اور وہ اپنے کیے کی سزا پائیں گے۔ البتہ جنہوں نے سود کھانا چھوڑ دیا، توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لی اور نیک اعمال بھی کیے تو اُن کو پورا اجر وثواب ملے گا۔

آخر میں فرمایا: ﴿وَ هُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ﴾ (اور اُن کی حق تلفی نہ ہوگی) اس کا مطلب ہے کہ لوگوں کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ نہ کسی کے ثواب میں کمی ہوگی اور نہ کسی کی سزا میں اضافہ ہوگا۔

اس آیت کے بارے میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا قول ہے کہ یہ قرآن مجید کی سب سے آخری آیت ہے جو نازل ہوئی۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں اکیس (21) دن رہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اکیاسی (81) دن رہے تھے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ
وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا
عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ
رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ
ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ وَاسْتَشْهِدُوْا
شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ
مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا
الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ
تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ
اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً
تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا
اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيْدٌ ؕ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ
فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٨٢﴾
وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّلَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ ؕ فَاِنْ اَمِنَ
بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ ؕ وَلَا
تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ؕ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا

٣٩ ع ٧

تَعۡمَلُوۡنَ عَلِيۡمٌ ﴿٢٨٣﴾ ع

"اے ایمان والو! جب تم کسی مقررہ مدت کے لیے آپس میں اُدھار کا لین دین کرو تو اُسے لکھ لیا کرو۔ خود نہ لکھ سکو تو تمہارے درمیان کوئی اور لکھنے والا انصاف سے لکھ دے۔ لکھنے والے کو چاہیے کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جیسے اللہ نے اُسے سکھایا ہے لکھ دے۔ وہ شخص لکھواتا جائے جس کے ذمے قرض ہے اور وہ اللہ سے ڈرتا رہے جو اُس کا رب ہے۔ ایسا نہ ہو قرض کی رقم میں سے کچھ کم کرکے لکھوادے۔ مقروض اگر بے سمجھ یا کمزور ہو، یا خود نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کا کوئی سر پرست انصاف کے ساتھ لکھوادے۔ اپنے مسلمان مردوں میں سے دو آدمیوں کو گواہ بنا لو۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی ہو۔ سارے گواہ تمہارے نزدیک معتبر ہونے چاہئیں۔ دو عورتوں کی گواہی اس لیے کہ ایک سے کچھ بھول چوک ہو تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ گواہوں کو جب بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں۔ قرض تھوڑا ہو یا زیادہ میعاد کے مطابق اُسے لکھنے میں سستی نہ کرو۔ یہی طریقہ اللہ کے نزدیک انصاف کا ہے۔ اس سے گواہی ٹھیک ہوتی ہے اور کوئی شک باقی نہیں رہتا۔ لیکن اگر نقد یا تھوڑی دیر کے لیے آپس میں لین دین کرو، پھر نہ لکھنے میں حرج نہیں۔ آپس میں سودا طے کرو تو اس پر گواہ بنا لو۔ یاد رکھو، کسی لکھنے والے کو، یا گواہ بننے والے کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اگر ایسا کرو گے تو تمہیں گناہ ہوگا۔ ہر حال میں اللہ سے ڈرو۔ اللہ تمہیں اچھی بات سکھاتا ہے اور وہ ہر چیز کے بارے میں خوب جانتا ہے۔

اگر تم سفر میں ہو اور کوئی لکھنے والا نہ ہو، تو کوئی چیز رہن رکھ کر قرض لے لو۔ اگر کوئی شخص دوسرے پر اعتبار کرے اور اُسے بغیر رہن کے قرض دے دے تو قرض لینے والے پر اعتبار کیا گیا ہے اُسے چاہیے قرض دینے والے کا قرض جو کہ امانت ہے، اسے پوری طرح واپس ادا کرے اور اللہ سے ڈرے جو اُس کا رب ہے۔ دیکھو، گواہی کو ہرگز نہ چھپاؤ، جو گواہی چھپائے گا اُس کا دل گناہ گار ہوگا۔ اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اُسے جانتا ہے۔" (282-283)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

تَدَايَنْتُمْ: ...... یہ تَدَايَنَ سے ہے جس کے معنی ہیں: ایک دوسرے سے قرض کا معاملہ کرنا۔

وَلْيُمْلِلِ: ...... (اور چاہیے کہ وہ لکھوائے) اَمَلَّ يُمِلُّ اِمْلَالًا کے معنی ہیں: لکھوانا (TO DICTATE) یہی معنی اَمْلٰى يُمْلِي اِمْلَاءً ا کے بھی ہوتے ہیں:

سَفِيْهًا: ...... اس سے مراد وہ بے وقوف شخص ہے جو لین دین کے معاملے میں کم عقل ہو۔

ضَعِيْفًا: ...... اس سے بچہ یا زیادہ بوڑھا شخص مراد ہے۔

اَنْ تَضِلَّ: ...... اس کے معنی بھول چوک ہونے کے ہیں۔

تُدِيْرُوْنَ:...... ایک دوسرے سے نقد یا دست بدست سودا کرتے ہو۔

فَرِھَانٌ:...... رِھَانٌ جمع ہے رَھْنٌ (PLEDGE) کی اور اس جگہ اس سے مراد وہ شے ہے جو رہن رکھی جائے (مرہون شے)۔ رہن یا گروی رکھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ قرض لینے والا اپنی کوئی شے قرض دینے والے کے قرض کی ضمانت کے طور پر اس کے قبضے میں دے۔

اَمَانَتَهٗ:...... اِس سے مراد قرض کی رقم یا قرض کا مال ہے۔ کیونکہ اس صورت میں قرض لینے والے پر اعتماد کیا جاتا ہے اور اُس کی کوئی چیز رہن یا گروی نہیں رکھی جاتی۔

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ﴾ (282)

سود جو کہ قرض کی ایک شکل ہے، کے بعد اب قرض کا ذکر ہے۔

اسلام میں مال کی بڑی اہمیت ہے قرآن نے روزی کو اللہ کا فضل قرار دیا ہے۔ سورۃ الجمعہ میں ہے کہ جمعے کی نماز کے بعد زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی روزی تلاش کرو:

﴿فَاِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ﴾ (الجمعہ 10:62)

''پھر جب نماز (جمعہ) پوری ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ اور اللہ کا فضل یعنی روزی تلاش کرو۔''

پھر لوگوں کو اپنی زندگی کی ضروریات کے لیے ایک دوسرے سے قرض لینا پڑتا ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے بھی دوسروں سے قرض کا معاملہ کیا ہے اور قرض لیا ہے۔ اسی قرض کے بارے میں اللہ سبحانہٗ نے اس آیت میں تفصیلی طور پر احکام وہدایات کی تاکید فرمائی ہے۔ ان میں سے پہلا حکم یہ ہے کہ قرض کا معاملہ لکھ لینا چاہیے تاکہ بھول چوک کا امکان نہ رہے اور کسی کی وفات کے بعد بھی اس معاملے کا لین دین ہو سکے۔

﴿وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ﴾ (282)

فرمایا: لکھنے والا انصاف کے ساتھ تحریر یا دستاویز (DOCUMENT) لکھے۔ کسی فریق کی طرف داری نہ کرے اور نہ قرض کی رقم میں کوئی کمی بیشی کرے۔ لکھنے والا ایسا شخص ہونا چاہیے جو اس طرح کی تحریر لکھنی جانتا ہو اور جب اسے لکھنے کے کام کے لیے بلایا جائے تو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے بلکہ اللہ تعالیٰ کے سکھائے ہوئے طریقے پر لکھ دے۔

﴿وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا﴾

(282)

اور چاہیے کہ اس تحریر کی عبارت وہ شخص لکھوائے جس نے قرضہ لیا ہے تاکہ اس میں اس کا اقرار اور اعتراف بھی شامل ہو جائے اور وہ بعد میں انکار نہ کر سکے۔ لکھوانے والا قرض لی ہوئی پوری رقم لکھوائے اس میں کمی کر کے نہ لکھوائے بلکہ اُس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے پوری رقم لکھوائے جو اُس کا رب اور آقا و مالک ہے۔

﴿فَإِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ﴾ (282)

پھر اگر قرض لینے والا کسی وجہ سے خود نہ لکھوا سکتا ہو تو اس کی طرف سے اس کا کوئی ولی یا سرپرست انصاف کے ساتھ یہ تحریر لکھوائے اور اس میں کوئی کمی وبیشی یا زیادتی نہ کرے۔

﴿وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ﴾ (282)

اور قرض کی اس دستاویز (DOCUMENT) پر دو معتبر مردوں کی گواہی بھی ثبت ہونی چاہیے تاکہ بعد میں کسی اختلاف اور جھگڑے کی صورت میں وہ صحیح گواہی دے کر معاملے کا فیصلہ کرنے میں مدد دے سکیں۔ مالی معاملات میں گواہی کا یہی نصاب ہے جس میں دو مردوں کی گواہی لی جاتی ہے۔

﴿فَإِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى﴾ (282)

پھر اگر دو معتبر مرد گواہ میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہونی چاہئیں۔ یہ سب گواہ بھی معتبر اور قابل اعتماد ہونے چاہئیں۔

ایک مرد کے مقابل میں دو عورتوں کو اس لیے گواہ بنایا جائے کہ اگر اُن میں کسی ایک کو بھول چوک ہو جائے تو دوسری اُسے یاد دلا دے اور اصلاح کر دے۔ گویا ایک کی گواہی میں جو کمی رہ گئی ہو دوسری اُسے پوری کر دے۔ یوں بظاہر ایک گواہی دینے والی اور دوسری اُسے یاد کرانے والی (REMINDER) ہوگی۔ مگر حقیقت میں دونوں ہی گواہ اور دونوں ہی یاد کرانے والیاں ہو جائیں گی۔

﴿وَ لَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا﴾ (282)

فرمایا: جب قرض کے معاملے کے لیے گواہوں کو طلب کیا جائے تو وہ حاضر ہونے سے انکار نہ کریں۔ بلکہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں۔ ایسا کرنا اُن پر واجب ہے۔

﴿وَ لَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ﴾ (282)

پھر اللہ تعالیٰ نے یہ تاکید فرمائی ہے کہ قرض کی رقم تھوڑی ہو یا زیادہ ہو، کم مدت کے لیے ہو یا زیادہ مدت کے لیے، بہر حال اسے لکھنے میں کوتاہی اور سستی نہ کی جائے تاکہ بعد میں کوئی جھگڑا پیدا نہ ہو۔

﴿ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَ اَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَلَّا تَكْتُبُوْهَا﴾ (282)

فرمایا: اس طرح قرض کی رقم کو تحریر کر لینا اور ان پر گواہیاں ثبت کر دینا ایسا طریقہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک عدل وانصاف کا ہے۔ اس سے گواہی بھی ٹھیک ہوتی ہے اور کسی قسم کا کوئی شک بھی باقی نہیں رہتا۔

لیکن اگر قرض کا معاملہ تھوڑی دیر کے لیے ہو یا چند گھنٹوں کے لیے ہو تو پھر اسے نہ لکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

﴿وَ اَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ﴾ (282)

اور اگر خرید وفروخت کا کوئی بڑا معاملہ ہو جیسے کوئی شخص اپنا مکان، گاڑی یا باغ بیچ رہا ہو تو اس سودے پر بھی گواہی ہونی چاہیے۔ لیکن یہ گواہی مستحب اور پسندیدہ ہے، ضروری اور واجب نہیں ہے۔

﴿وَ لَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّ لَا شَهِيْدٌ ؕ وَ اِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌۢ بِكُمْ ؕ﴾ (282)

فرمایا: قرض کی تحریر اور دستاویز لکھنے والے کو، یا گواہوں کو کسی قسم کا جانی یا مالی نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اُن پر کوئی دباؤ نہ ڈالا جائے اور نہ اُن کو ہراساں کیا جائے۔ ایسی کوئی حرکت کرنا سخت گناہ ہے۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ﴾ (282)

آخر میں تقویٰ اختیار کرنے اور اللہ سے ڈرنے کی تاکید فرمائی گئی کہ ہر حال میں گناہ اور زیادتی سے بچو۔ اللہ سبحانہٗ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ کرو بلکہ اُس کے ہر حکم کی پابندی کرو ورنہ تمہیں آخرت میں اس کی سزا بھگتنی پڑے گی۔ ممکن ہے تم دنیا کے قانون اور اُس کی عدالت سے بچ جاؤ مگر اللہ کی عدالت سے بچ نہیں سکتے۔

﴿وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ﴾ (282)

فرمایا: اللہ سبحانہٗ تمہیں ایسے احکام سکھاتا ہے جن پر عمل کر کے تم دنیا اور آخرت کی فلاح وکامیابی حاصل کر سکتے ہو۔

﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٢٨٢﴾﴾ (282)

آخر میں فرمایا کہ اللہ سے کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ وہ سب کچھ جانتا ہے۔ پھر جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ویسی جزا وسزا ہوگی۔

اسلام میں عورت کی گواہی:

اوپر اس آیت میں قرض کے لین دین میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ بالکل یہی بات صحیح احادیث سے بھی ثابت ہے کہ مالی معاملات میں عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف ہے۔

1۔ صحیح مسلم میں سیدنا عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((فَشَهَادَةُ امْرَاَتَيْنِ تَعْدِلُ شَهَادَةَ رَجُلٍ)) (صحيح مسلم، رقم: 241)

''پس دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔''

2۔ صحیح بخاری میں سیدنا ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں سے پوچھا کہ:

((اَلَيْسَ شَهَادَةُ الْمَرْءَةِ مِثْلَ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ)) (صحيح بخاری، رقم: 304)

''کیا ایک عورت کی گواہی مرد کی گواہی سے آدھی نہیں ہے۔''

تو عورتوں نے جواب دیا: بَلٰی (جی ہاں، کیوں نہیں)۔

اسی مضمون کی احادیث ابوداؤد اور ترمذی میں بھی موجود ہیں۔
اس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ قرآن وسنت میں کامل مطابقت پائی جاتی ہے۔ پھر اسی پر اجماعِ امت بھی ہے کہ مالی معاملات میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کی گواہی کے برابر ہے۔
اسلامی شریعت میں عورت کی گواہی کی درج ذیل چار صورتیں ہیں:

1۔ ایسے معاملات جو عام طور پر مردوں سے مخفی رہتے ہیں اور عورتیں اُن سے زیادہ باخبر ہوتی ہیں۔ جیسے حمل، ولادت، رضاعت وغیرہ۔ ایسے تمام معاملات میں ایک عورت کی گواہی دو مردوں کی گواہی کے برابر ہے۔
2۔ بعض معاملات میں عورت اور مرد کی گواہی برابر ہے اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ جیسے رؤیت ہلال (چاند دیکھنے) کی خبر دینا۔
3۔ ہر قسم کے مالی معاملات میں عورت کی گواہی مرد کی گواہی کا نصف ہے۔ گویا دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کی شہادت کے برابر ہے۔
4۔ حدود وتعزیرات میں عورت کی گواہی قابل قبول نہیں ہے۔

بعض لوگ جو اسلامی شریعت اور اس کے مزاج سے ناواقف ہیں یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ عورت کی گواہی مرد کی گواہی کے برابر کیوں نہیں۔ حالانکہ اوپر ہم بیان کر آئے ہیں کہ بعض معاملات میں عورت کی گواہی نہ صرف مرد کے برابر ہے بلکہ کئی معاملات میں ایک عورت کی گواہی دو مردوں کی گواہی کے برابر ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی مرد فاسق وفاجر ہے تو اس کی گواہی معتبر نہیں ہے۔ بہرحال اس حوالے سے چند قابل غور امور یہ ہیں:

(1) اگرچہ مرد اور عورت دونوں انسان ہیں مگر ان کی جسمانی وذہنی صلاحیتیں، مزاجی خصوصیات اور معاشرتی مشاغل الگ الگ ہیں جن کے باعث فطری طور پر دونوں کا دائرۂ کار اور حقوق وفرائض جدا جدا ہیں۔ چونکہ مالی معاملات کے سلسلے میں عدالت میں گواہی دینے کی ذمہ داری عورت کے مزاج اور احوال کے لحاظ سے ایک بھاری ذمہ داری تھی اس لیے ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو گواہ بنایا گیا ہے۔ اس میں عورت کے لیے کوئی تحقیر کا پہلو نہیں ہے۔

(2) بعض لوگ کہتے ہیں کہ عورت کو گواہی میں کم حیثیت دینا اُس کی حق تلفی ہے۔ لیکن یہ بات اس لیے درست نہیں ہے کہ گواہی دینا سرے سے کوئی قانونی یا شرعی حق (RIGHT) نہیں ہے بلکہ یہ ایک فرض (DUTY) ہے۔ دنیا میں کہیں بھی گواہی دینے کو حق (RIGHT) تسلیم نہیں کیا جاتا۔

(3) کچھ لوگ ''لِعان'' کے معاملے کو دلیل بنا کر کہتے ہیں کہ جب اُس میں عورت اور مرد کی گواہی برابر ہے تو ہر معاملے میں کیوں برابر نہیں۔ ایسے لوگ ایک تو قرآن کے ایک صریح حکم کا انکار کرتے ہیں جس میں دو عورتوں کی گواہی کو ایک مرد کی گواہی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ (البقرہ (2) آیت 282)۔ دوسرے ''لعان'' کی گواہی جیسا کہ فقہائے اسلام نے تصریح کی ہے، شہادت نہیں ہے بلکہ ''یمین'' (اپنے بارے میں حلفیہ بیان) ہے اور یہ گواہی سے بالکل مختلف

چیز ہے۔ اسے گواہی پر ہرگز قیاس نہیں کیا جاسکتا۔

(4) بعض لوگ یہ سوال اُٹھاتے ہیں کہ جب حدیث کی روایت کرنے میں مرد اور عورت برابر ہیں تو گواہی میں بھی برابر ہونے چاہئیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ادائے شہادت (گواہی دینا) اور روایتِ حدیث (حدیث کی روایت کرنا) دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ ان کو ایک دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ ایسا قیاس، قیاس مع الفارق ہے جو تسلیم نہیں کیا جاسکتا۔

مثال کے طور پر کوئی حدیث ایک معتبر راوی (خبر واحد) سے بھی صحیح ثابت ہو جاتی ہے اور وہ قابل قبول اور حجت ہوتی ہے مگر جس معاملے میں شریعت نے دو گواہوں کا نصاب مقرر کیا ہے وہاں کسی ایک معتبر گواہ (خواہ وہ صحابی ہی کیوں نہ ہو) کی گواہی قابل قبول نہیں اور نہ اس کی بنیاد پر کوئی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

دوسرے روایتِ حدیث میں سنی ہوئی بات (سماع) بھی معتبر ہوتی ہے جب کہ شہادت یا گواہی میں سنی سنائی بات کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔

(5) یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اگر عورت کی گواہی نہ ہوگی تو معاشرے میں جرائم بڑھیں گے۔ مگر ایسے لوگ اس سوال کا کیا جواب دیں گے کہ جن ملکوں میں عورت اور مرد کی گواہی برابر ہے وہاں جرائم کی شرح اُن ملکوں سے زیادہ کیوں ہے جہاں عورت کی گواہی مردوں سے کم ہے۔ اس سلسلے میں امریکہ اور سعودی عرب کی مثال سامنے رکھ کر دیکھا جاسکتا ہے۔ امریکہ میں جرائم کی شرح خوفناک حد تک زیادہ ہے جب کہ سعودی عرب میں جرائم انتہائی کم ہیں۔

﴿وَاِنْ كُنْتُمْ عَلٰى سَفَرٍ وَّ لَمْ تَجِدُوْا كَاتِبًا فَرِهٰنٌ مَّقْبُوْضَةٌ﴾ (283)

قرض کے بعد اب رہن یا گروی (PLEDGE) رکھنے کا ذکر ہے۔ اگر قرض کا لین دین کرنے والے افراد سفر پر ہوں اور قرض کی تحریر یا دستاویز لکھنے والا کوئی کاتب وہاں موجود نہ ہو تو قرض دینے والے کے لیے جائز ہے کہ وہ قرض لینے والے سے کوئی چیز ضمانت کے طور پر اپنے پاس رہن رکھ کر اُسے قرض دے دے۔ پھر جب مقروض اپنا قرض ادا کرے تو اُس کی رہن شدہ چیز اُسے واپس لوٹا دی جائے۔

اس رہن کے لیے جمہور فقہا کے نزدیک شرط یہ ہے کہ وہ با قبضہ ہو جیسا کہ قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ لیکن امام مالک رحمہ اللہ کے ہاں رہن کے با قبضہ ہونے کی شرط نہیں ہے اور بغیر قبضہ کرائے بھی رہن ہوسکتا ہے۔

﴿فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ﴾ (283)

پھر اگر فریقین کو باہمی اعتماد ہو، یا حسنِ ظن سے کام لیا جائے تو کوئی چیز رہن رکھنے کی ضرورت نہیں ہے اور بغیر رہن رکھے قرض دیا جاسکتا ہے۔ لیکن قرض لینے والے کو وہ قرض بعد میں وقت پر واپس کر دینا چاہیے کیونکہ قرض بھی ایک طرح کی امانت ہے جو اُس کے حق دار کو لوٹانی ضروری ہے۔ اس امانت میں کسی طرح کی خیانت یا کمی کوتاہی نہیں ہونی

چاہیے۔ اپنے رب اللہ سے ڈرتے ہوئے پورا قرض ادا کرنا چاہیے کیونکہ جس طرح اُس پر اعتماد کیا گیا اور اُسے بغیر تحریر اور گواہوں کی ضمانت کے قرض دیا گیا تھا، تو اب اُسے بھی دوسرے کے اعتماد پر پورا اُترنا چاہیے۔ شیطان کے وسوسے میں آ کر بے ایمانی نہیں کرنی چاہیے کیونکہ اللہ سب سے بڑا گواہ ہے اور اُس سے ہر حال میں ڈرنا چاہیے۔

اس مقام پر قرض کو امانت اس لیے کہا گیا کہ بغیر کوئی چیز رہن رکھے جو قرض دیا جاتا ہے اُس کی حیثیت بالکل ایک امانت کی ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں کے عرف میں بھی قرض کو امانت ہی سمجھا جاتا ہے۔

اس پر تمام فقہا اور مفسرین کا اتفاق ہے کہ جس طرح سفر کی حالت میں رہن رکھنے کی اجازت ہے اسی طرح حضر اور مقیم ہونے کی حالت میں بھی اس کی اجازت ہے اور یہ تحریر اور گواہیوں کے قائم مقام اور ایک متبادل (ALTERNATE) چیز ہے کیونکہ اس کی دلیل وہ متفق علیہ حدیث ہے جس کو سیدہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مقیم ہوتے ہوئے بھی ایک یہودی سے کچھ عرصے کے لیے غلہ ادھار لیا تو اپنی لوہے کی ایک زرہ اُس کے پاس گروی (رہن) رکھی۔

(صحیح بخاری، رقم: 2068، 4467، صحیح مسلم، رقم: 4115، نسائی، رقم: 4609، ترمذی، رقم: 1214، ابن ماجه، رقم: 2436)

البتہ مجاہد رحمہ اللہ کے بارے میں ہے کہ وہ رہن کو صرف سفر کی حالت میں جائز سمجھتے تھے مگر اُن کا یہ قول شاذ ہے اس لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا۔

اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ غیر مسلموں سے تجارت، خرید وفروخت اور لین دین جائز ہے۔ غالباً اس کی دلیل بھی مذکورہ حدیث ہی ہے۔

﴿وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَ مَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗٓ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ۚ﴾ (283)

پھر فرمایا: وَ لَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ کہ گواہی نہ چھپاؤ۔ اس ٹکڑے کا تعلق اوپر کے فقرے وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا دُعُوْا (اور جب گواہوں کو بلایا جائے تو وہ انکار نہ کریں) سے ہے۔ مراد یہ ہے کہ نہ تو گواہوں کو گواہی دینے سے انکار کرنا چاہیے اور نہ گواہی سے متعلق کوئی بات چھپانی چاہیے، بلکہ ٹھیک ٹھیک گواہی دینی چاہیے۔ ایسا کرنا اُن پر واجب اور ضروری ہے۔

آگے فرمایا: لیکن اگر وہ گواہی نہیں دیں گے، یا گواہی میں سے کوئی بات چھپائیں گے تو جس طرح ہاتھ اور زبان کے افعال کے ذریعے گناہ ہوتے ہیں، اسی طرح اُن کے دل بھی بد نیتی، حسد، یا بغض جیسی خرابیوں کی وجہ سے سخت گناہ گار ہو جائیں گے۔ جب کہ اللہ تعالیٰ نے کان، آنکھ، زبان اور دل سب کا حساب لینا ہے۔

﴿اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا﴾ (بنی اسرائیل 36:17)

"بے شک کان، آنکھ اور دل سب کے بارے میں باز پُرس ہوگی۔"

یاد رہے کہ اسلامی شریعت میں لوگوں کے باہمی معاملات کے فیصلوں کا زیادہ تر دارومدار گواہوں کی شہادت پر ہوتا ہے کہ وہ صحیح ہو ورنہ لوگوں کے حقوق ضائع ہونے کا اندیشہ ہے۔

﴿وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ﴾ (283)

آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو جانتا ہے۔ تم اگر ایک دوسرے کی حق تلفی کرو گے، صحیح گواہی نہ دو گے، اور اللہ تعالیٰ کے دوسرے احکام کی پابندی نہیں کرو گے تو پھر تمہارے یہ گناہ اور نافرمانیاں اللہ تعالیٰ کی نظروں سے چھپ نہیں سکتیں اور وہ اس پر تمہیں سزا دے گا۔

ہمارے زمانے کے بعض لوگ جن کو قرآن کی تفسیر میں حدیث وسنت کی تشریح لینے سے چڑ ہے، اس آیت کی درج ذیل تاویل کرتے ہیں:

1۔ صرف سفر کے دوران ہی قرض کی ضمانت کے طور پر کوئی چیز رہن رکھنی چاہیے اور حضر وقیام میں رہن جائز نہیں۔

2۔ صحیح حدیث میں نبی ﷺ نے غلہ ادھار لینے کے لیے جو اپنی زرہ ایک یہودی کے پاس رہن رکھی تھی وہ آپ ﷺ کی شدید مجبوری اور اضطرار تھا کیونکہ وہ یہودی رہن لیے بغیر غلہ ادھار دینے پر تیار نہ تھا۔

3۔ قرض دینے والا سفر ختم ہوتے ہی رہن شدہ چیز واپس اُس شخص کو لوٹائے گا جس سے لی گئی تھی اور آیت میں اسی رہن کی چیز کو امانت کہا گیا ہے کیونکہ ''اسلامی اخوت ومروت'' کا یہی تقاضا ہے۔

اب ہم ان تینوں دعوؤں کا شق وار جائزہ لیتے ہیں:

1۔ جہاں تک قرض کی ضمانت کے طور پر رہن رکھنے کا تعلق ہے، تمام فقہائے اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ جس طرح سفر میں یہ جائز ہے اسی طرح حضر وقیام میں بھی جائز ہے اور یہ ضرورت کے وقت قرض کی تحریر اور گواہوں کی عدم موجودگی میں ایک متبادل (ALTERNATE) صورت ہے۔ کیونکہ اس کا ثبوت اُس متفق علیہ حدیث سے ہو جاتا ہے جس کا ہم نے ابھی اوپر حوالہ دیا ہے اور جس میں نبی ﷺ نے ایک یہودی سے کچھ غلہ ادھار لینے کے بدلے میں اپنی زرہ رہن رکھی تھی۔ کیونکہ سنت نے قرآن کے اس حکم کی تشریح کر دی ہے، بالکل اُسی طرح جس طرح سنت نے ہر قسم کے پُرامن سفر میں بھی نماز قصر کرنے کی اجازت دی ہے جب کہ قرآن میں یہ اجازت صرف ایسے سفر کے لیے تھی جس میں دشمن کا خوف ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَ اِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ الصَّلٰوةِ اِنْ خِفْتُمْ اَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ؕ اِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا﴾ (النساء 4:101)

''اور جب تم زمین میں سفر کرو اور تمہیں خوف ہو کہ کافر تمہیں ستائیں گے تو تم پر کوئی گناہ نہیں کہ تم نماز میں قصر کرلیا کرو۔ بے شک کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔''

قرآنی آیت کی غلط تاویل کرنے کے بعد ان لوگوں نے اس متفق علیہ حدیث کی بھی بھونڈی تاویل کر دی کہ معاملہ

چونکہ ایک یہودی سے تھا اس لیے نبی ﷺ کو غلہ ادھا لینے کے لیے ''شدید مجبوری اور اضطرار'' کی حالت میں اپنی زرہ اُس کے پاس گروی رکھنی پڑی۔ حالانکہ یہ ایک عام ضرورت تھی جسے اپنی طرف سے ''شدید مجبوری اور اضطرار'' بنا دیا گیا ہے جس کا کوئی ثبوت مذکورہ حدیث میں نہیں ملتا۔

یہودی سے ادھار کا معاملہ کرنے میں کئی حکمتیں تھیں، جیسے:

(1) اگر حضور ﷺ اپنے کسی صحابی سے قرض لیتے تو وہ عقیدت کی بنا پر غلے کی صحیح قیمت نہ لگاتا اور اُسے بظاہر مالی نقصان پہنچ جاتا جو حضور ﷺ کو گوارا نہ تھا۔

(2) کسی مسلمان کی طرف سے دیا گیا قرض آپ ﷺ کو معاف بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ اس طرح اس کی حیثیت ایک صدقے کی ہو جاتی اور صدقہ حضور ﷺ کے لیے جائز نہ تھا۔

(3) اپنے اس عمل کے ذریعے نبی ﷺ اس بات کا جواز فراہم کرنا چاہتے تھے کہ غیر مسلموں سے بھی تجارت، خرید و فروخت اور مالی لین دین ہو سکتا ہے جب کہ صرف قرآن سے اس چیز کا جواز ثابت نہیں ہو سکتا۔

2۔ اگر یہی بات ہوتی کہ قرض دینے والا شخص سفر ختم ہو جانے کے بعد رہن شدہ چیز اُس آدمی کو واپس کر دے جس سے اُس نے لی ہے تو اس کے لیے آیت کی عبارت میں فَاِذَا (پھر جب) آتا اور فَاِنْ (پھر اگر) نہ آتا۔

3۔ دوسرے رہن کی چیز کو ''امانت'' کہنے کی سرے سے کوئی ضرورت نہ تھی۔ رہن تو ہوتا ہی امانت ہے اسے امانت کہنا تو تحصیلِ حاصل ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ قرض کا جو معاملہ بغیر کسی تحریر اور گواہوں کے کیا جائے گا اُس کی نوعیت بالکل ایک امانت کی ہو جائے گی۔ اس لیے آیت میں اُسے امانت کہا گیا ہے اور اسے ادا کرنے کی غیر معمولی تاکید آئی ہے کہ:

﴿فَلْيَتَّقِ اللّٰهِ رَبَّهٗ﴾ (پس وہ اللہ سے ڈرے جو اُس کا رب ہے۔) ورنہ صرف رہن کی ''امانت'' ادا کرنے کے لیے اتنی سخت تاکید کی ضرورت نہ تھی۔ رہا قرض تو یہ بھی امانت ہوتی ہے اور اس جگہ یہی مراد ہے ہمارے ہاں کے عرف میں بھی اسے امانت تصور کیا جاتا ہے لیکن کیا کیا جائے منکرین حدیث کی منطق اس کو گوارا نہیں کرتی کہ قرض کو امانت کہا جائے۔

4۔ پھر اگر قرض دینے والے شخص کو سفر ختم ہونے کے بعد بغیر قرض وصول کیے رہن کی چیز بھی واپس کر دینے کا پابند بنایا جائے تو اس بیچارے کے پاس اپنے قرض دینے کا کیا ثبوت باقی رہ جائے گا اور اگر قرض لینے والا اس معاملے سے انکار کر دے تو دنیا کی کون سی عدالت قرض دینے والے کو اُس کے قرض کی رقم دلا سکے گی۔

باقی رہی قرض کے لین دین میں ''اسلامی اخوت و مروت'' کی دہائی، تو خود قرآن نے اسے تحریر میں لا کر اور اس پر دو گواہوں کی شہادت ہونے کا حکم دے کر اسے غیر موثر (INEFFECTIUE) کر دیا ہے۔ اور خود ہمارے موجودہ معاشرے میں بھی اس چیز کا بیڑہ غرق ہو چکا ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۸۴

''جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے سب اللہ کا ہے۔ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے اُسے تم ظاہر کرو، یا چھپاؤ، اللہ تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر جسے وہ چاہے گا بخشے گا اور جسے چاہے گا سزا دے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔'' (284)

الفاظ کی تحقیق اور آیت کی تفسیر:

﴿لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ (284)

فرمایا: اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین، پوری کائنات کا خالق، مالک اور اس میں تصرف کا اختیار رکھنے والا ہے۔ یہ گویا اس سے پہلی آیت کے فقرے وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ (اور اللہ تمہارے اعمال کو جانتا ہے) کی وضاحت ہوگئی کہ جو خالق ہے وہی مالک ہے اور وہ اپنی ہر چیز پر پورا تصرف رکھتا ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ؕ﴾ (الملك 14:67)

''کیا وہ نہ جانے گا جس نے پیدا کیا ہے۔''

﴿وَ اِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲۸۴﴾ (284)

اوپر اللہ سبحانہٗ کی جن صفات کا ذکر ہوا اُن کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ تم لوگ اپنے دل کی بات کو ظاہر کرو یا اسے چھپاؤ، دونوں صورتوں میں اللہ تم سے حساب لے گا اور تمہارے کاموں کا بدلہ دے گا۔ پھر جسے چاہے گا اپنے فضل و رحمت سے بخش دے گا اور جسے چاہے گا عدل و انصاف کے ساتھ سزا دے گا۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

لیکن یاد رہے برائی کر لینے پر تو پکڑ ہوگی مگر محض اس کی نیت یا ارادہ کرنے پر کوئی پکڑ نہ ہوگی۔ اس لیے جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہر برے کام کے ارادے پر بھی پکڑ ہوگی تو ان کی یہ رائے ایک متفق علیہ حدیث کے خلاف ہے جس میں یہ واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ نہ صرف یہ کہ برائی کا ارادہ کرنے پر پکڑ نہ ہوگی بلکہ اُس برائی کو نہ کرنے پر ایک نیکی بھی ملے گی:

((عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمَا عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ فِيمَا يَرْوِيْ عَنْ رَبِّهِ

عَزَّ وَجَلَّ ، قَالَ: إِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ الْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ ثُمَّ بَيَّنَ ذٰلِكَ فَمَنْ هَمَّ بِحَسَنَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً ، فَإِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ عَشْرَ حَسَنَاتٍ إِلٰى سَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ إِلٰى أَضْعَافٍ كَثِيرَةٍ ، وَمَنْ هَمَّ بِسَيِّئَةٍ فَلَمْ يَعْمَلْهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ عِنْدَهُ حَسَنَةً كَامِلَةً فَإِنْ هُوَ هَمَّ بِهَا فَعَمِلَهَا كَتَبَهَا اللّٰهُ لَهُ سَيِّئَةً وَاحِدَةً))

(صحیح بخاری، رقم: 6491، صحیح مسلم، حدیث: 338)

''سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ عزوجل فرماتا ہے: اللہ تعالیٰ نے نیکیاں اور برائیاں لکھنے کا حکم دیا۔ پھر ان کو واضح فرما دیا۔ اب جو شخص کسی نیکی کا ارادہ کرتا ہے اسے کر نہیں پاتا تو اللہ اس کے لیے پوری نیکی کا ثواب لکھ دیتا ہے۔ اگر وہ اس نیکی کا ارادہ کرنے کے بعد اسے کر لیتا ہے تو اللہ اس کے لیے دس (10) نیکیوں سے لے کر سات سو (700) نیکیوں تک ثواب لکھ دیتا ہے۔ اور جو شخص کسی برائی کا ارادہ کرتا ہے اور اسے کرتا نہیں تو اللہ اُس کے اعمال نامے میں ایک نیکی لکھ دیتا ہے۔ اور اگر وہ ارادہ کر کے برائی کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کے نامۂ اعمال میں صرف ایک ہی برائی لکھتا ہے۔''

البتہ بعض امور ایسے ہیں جن کا تعلق صرف دل کے ساتھ ہے اس لیے اُن پر گرفت ہوگی جیسے اللہ تعالیٰ یا دینِ اسلام کے بارے میں شک میں مبتلا ہونا، منافقت، ریا کاری، حسد، دین کے کسی حکم کو جھٹلانا اور گواہی کو چھپانا وغیرہ۔

بعض روایات میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ کرام بہت غمگین ہوئے کہ اگر ہمارے دل میں گناہ کا خیال آنے پر بھی پکڑ ہوگی تو پھر معلوم نہیں ہماری بخشش ہوگی یا نہیں۔ کیونکہ دل میں خیالات اور وسوسے آنے پر ہمارا اختیار نہیں۔ پھر انہوں نے اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کیا تم اہل کتاب کی طرح یہ کہنا چاہتے ہو کہ ''سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا'' (ہم نے سنا اور ہم نے نہ مانا) بلکہ تمہیں کہنا چاہیے ''سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا'' (ہم نے سنا اور ہم نے مانا)۔

پھر صحابہ کرام نے جب یہی بات کہی تو آگے کی دونوں آیات نازل ہوئیں اور اُن کے الفاظ ''لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا'' (اللہ کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا) نے مذکورہ آیت 284 کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ گویا دل میں آنے والے خیالات اور وسوسوں کا حساب نہیں ہوگا۔ وہ سب معاف ہیں۔ اس پر صحابہ کرام کے دلوں کو اطمینان حاصل ہو گیا۔

(صحیح بخاری، رقم: 2528، صحیح مسلم، رقم: 332، ترمذی، رقم: 2992,1183)

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ
وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟ وَ قَالُوْا
سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۟ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ
نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ رَبَّنَا لَا
تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا
حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا
بِهٖ ۚ وَ اعْفُ عَنَّا ۟ وَ اغْفِرْ لَنَا ۟ وَ ارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۲۸۶﴾ ع ۴۰

’’اللہ کا رسول ﷺ اُس کلام پر ایمان رکھتا ہے جو اُس کے رب کی طرف سے اُس پر نازل ہوا۔ مسلمان بھی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ سب ایمان رکھتے ہیں اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اور اُس کے رسولوں پر اور کہتے ہیں: ہم کسی رسول کا انکار نہیں کرتے۔ ہم نے تیرا حکم سنا اور مانا۔ اے ہمارے رب! ہم تجھ سے بخشش چاہتے ہیں! آخر تیرے پاس جانا ہے۔ اللہ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ جو نیکی کرے گا اجر پائے گا، جو برائی کرے گا اُسے بھگتے گا۔

ایمان والے دعا کرتے ہیں: اے ہمارے رب ہم سے بھول ہو جائے، یا ہم غلطی کر بیٹھیں تو ہمیں نہ پکڑ! اے ہمارے رب! جو لوگ ہم سے پہلے ہو گزرے، اُن کے گناہوں کی وجہ سے جس طرح تو نے اُن پر سخت احکام کا بوجھ ڈالا، وہ بوجھ ہم پر نہ ڈال۔ اے ہمارے رب! جو بوجھ ہم اُٹھا نہیں سکتے، وہ ہم سے نہ اُٹھوا! ہماری کوتاہیوں سے درگزر فرما! ہمارے گناہ بخش دے! ہمارے حال پر رحم فرما! تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما!‘‘ (286-285)

الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر:

لَا نُفَرِّقُ:......اس کی وضاحت البقرہ آیت 136 میں کی جا چکی ہے۔

سَمِعْنَا:......اس سے صرف سننا مراد نہیں ہے بلکہ غور سے سننا، سمجھنا اور ماننا مراد ہے۔

لَا یُكَلِّفُ:......"تکلیف" کے معنی کسی پر ایسی ذمہ داری ڈالنے کے ہیں جس میں کچھ محنت درکار ہو۔

وُسْعَ:......ایسی قوت جس سے کوئی کام آسانی سے کیا جاسکے اور اُس میں کوئی تنگی یا سخت مشقت نہ اٹھانی پڑے۔

اِكْتَسَبَتْ:...... یہ اِكْتِسَابٌ سے ہے جس کے معنی ہیں زیادہ محنت اور تگ ودو سے کوئی کام کرنا۔ اس کے برخلاف كَسَبٌ کے معنی ہیں معمولی محنت سے کوئی کام کرلینا۔ البتہ اس مقام پر كَسَبَتْ سے نیکی کرنا اور اِكْتَسَبَتْ سے برائی کرنا مراد ہے۔

لَا تُؤَاخِذْنَا:...... یہ مواخذہ سے ہے جس کے معنی ہیں مُعَاقَبَةٌ یعنی سختی سے احتساب کرنا اور سزا دینا۔

لَا طَاقَةَ:......"طاقت" کے معنی ایسی کم قوت کے ہیں جس سے کوئی کام سخت وقت اور مشقت کے بعد کیا جاسکے۔

اِصْرًا:......اس کے اصل معنی عہد اور ذمہ داری کے ہیں لیکن اس جگہ اس سے مراد بھاری بوجھ ہے۔

اِصْرٌ عہد اور ذمہ داری کے معنوں میں اس مقام پر آیا ہے:

﴿قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰی ذٰلِكُمْ اِصْرِیْ﴾ (آل عمران 81:3)

"فرمایا: کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور تم نے اس عہد کی ذمہ داری قبول کی۔"

اس کے علاوہ اِصْرًا کا لفظ بھاری بوجھ کے معنوں میں درج ذیل آیت میں استعمال ہوا ہے:

﴿وَ یَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَ الْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ﴾ (الاعراف 157:7)

"اور وہ (رسول) اُن پر سے (جاہلیت کے) بھاری بوجھ اور طوق ہٹاتا ہے۔"

مَوْلٰنَا:......اس کے معنی ہیں: ہمارے آقا، مالک اور منتظم۔

﴿اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ ؕ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ كُتُبِهٖ وَ رُسُلِهٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ ۟﴾ (285)

فرمایا: رب کی طرف سے نازل شدہ اس قرآن پر رسول اللہ ﷺ اور سارے مسلمان ایمان رکھتے اور اسے مانتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح اللہ تعالیٰ کے قانون اور احکام کے مکلّف اور پابند تھے۔ آپ ﷺ دنیا کے دوسرے بادشاہوں کی طرح نہ تھے جو رعایا کو قانون دیتے ہیں مگر خود قانون سے بالاتر ہوتے ہیں۔

پھر فرمایا: تمام مسلمان اللہ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ: ہم کسی ایک رسول کا بھی انکار نہیں کرتے، بلکہ سب کو مانتے ہیں۔

اس میں اُن اہل کتاب پر مسلمانوں کی فضیلت کی طرف اشارہ ہے جو اللہ کے بعض رسولوں کو مانتے اور بعض کا انکار کرتے تھے اور کہتے تھے:

﴿نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّ نَكْفُرُ بِبَعْضٍ﴾ (النساء 150:4)

''ہم بعض (رسولوں) کو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔''

﴿وَ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۗ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ اِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿٢٨٥﴾﴾ (285)

مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! ہم نے تیرا حکم سنا اور اُسے مانا۔ پھر اس سمع وطاعت میں ہم سے جو کمی کوتاہی ہو جائے، اُس پر ہم تجھ سے معافی مانگتے اور بخشش چاہتے ہیں۔ آخر ہمیں تیرے پاس ہی جانا ہے اور اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔

﴿لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ﴾ (286)

فرمایا: اللہ تعالیٰ کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اُس پر اتنی ہی ذمہ داری کا بوجھ ہے جتنا وہ اُٹھا سکتا ہے۔ کیونکہ دین میں کوئی تنگی نہیں ہے۔ جیسا کہ فرمایا:

﴿وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج 78:22)

''اور اُس (اللہ) نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

پھر یہی مضمون، کہ اللہ سبحانہٗ کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا، قرآن نے کئی اور مقامات پر بھی بیان کیا ہے جیسے:

﴿لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ 233:2)

''کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جاتا۔''

﴿لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ (الانعام 152:6)

''ہم کسی جان پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔''

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ؕ﴾ (286)

جو شخص کوئی نیکی کرے گا اُس کا اجر پائے گا اور جو برائی کرے گا اُسے بھگتے گا۔

اس جگہ نیکی کے لیے کَسَبَتْ اور برائی کے لیے اِكْتَسَبَتْ کے الفاظ آئے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ نیکی انسان کی فطرت میں ہے اور اسے وہ آسانی سے کرسکتا ہے۔ گویا نیکی اور انسانی فطرت میں موافقت اور مطابقت ہے جیسے سچ بولنا۔ اس لیے اس کے لیے کَسَبَ کا لفظ آیا۔ جب کہ برائی ایک غیر فطری چیز ہے جس کے ساتھ انسانی فطرت کو مناسبت نہیں ہے۔ اس لیے اس کے کرنے میں تکلف، تصنع اور مشقت ہے جیسے جھوٹ بولنا۔ لہٰذا اس کے لیے اِكْتَسَبَتْ کا لفظ استعمال ہوا۔

یاد رہے قرآن کے اِس اسلوب میں نیکی کی ترغیب اور برائی سے بچنے کا اشارہ بھی ملتا ہے۔

﴿رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَاۤ اِنْ نَّسِيْنَاۤ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ﴾ (286)

یہ اہل ایمان کی دعا ہے جو اوپر آیت 285 سے شروع ہوئی تھی۔ درمیان میں جملہ معترضہ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ؕ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَ عَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (اللہ کسی پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ جو نیکی کرے گا اجر پائے گا، جو برائی کرے گا اُسے بھگتے گا۔) آ گیا اور اب وہی دعا پھر سے شروع ہو رہی ہے کہ اے ہمارے رب! تیرے کسی حکم کی سمع وطاعت میں احتیاط کے باوجود اگر ہم سے کوئی بھول چوک ہو جائے تو اُسے معاف کر دینا اور اس پر گرفت نہ کرنا۔ ہماری کسی ایسی خطا اور غلطی سے بھی درگزر فرما جس میں ہمارا کوئی ارادہ، ہماری کوئی بے احتیاطی اور لاپروائی شامل ہو۔

ایک صحیح حدیث میں ہے جسے سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ تَجَاوَزَ عَنْ اُمَّتِي الْخَطَأَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْتُكْرِهُوْا عَلَيْهِ))

(ابن ماجه، رقم: 2043، مشکوٰة، رقم: 6293)

”بے شک اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کی خطا (بے ارادہ غلطی)، نسیان (بھول چوک) اور اِکراہ (جان کے خطرے کی مجبوری) سے کیے گئے کاموں کو معاف کر دیا۔“

لیکن یاد رہے اس خطا، غلطی اور بھول چوک کے معاف ہونے کا تعلق آخرت سے ہے لیکن دنیا میں اگر ہماری بھول چوک یا خطا اور غلطی سے کسی کا حق تلف ہو جائے تو اس پر ضمان (PENALTY) یا جرمانہ یا سزا ہوگی۔ جیسے کسی نے شکار کے جانور پر گولی چلائی اور وہ گولی کسی انسان کو جا لگی تو یہ قتل خطا ہے اور یہ جرم ہے جس پر دیت کی سزا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿وَ مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـًٔا ۚ وَ مَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّ دِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰۤى اَهْلِهٖۤ اِلَّاۤ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ؕ﴾ (النساء 4:92)

”اور کسی مسلمان کا کام نہیں کہ وہ دوسرے مسلمان کو قتل کرے مگر یہ کہ غلطی اور خطا سے ایسا ہو جائے۔ جو کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے، اُسے چاہیے ایک مسلمان غلام آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خوں بہا ادا کرے۔ البتہ مقتول کے وارث خوں بہا معاف بھی کر سکتے ہیں۔“

﴿رَبَّنَا وَ لَا تَحْمِلْ عَلَيْنَاۤ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ﴾ (286)

اہلِ ایمان دعا کرتے ہیں اے ہمارے رب! ہم پر سخت احکام کا وہ بوجھ نہ ڈال جو تو نے پہلی قوموں پر اُن کی سرکشی کی وجہ سے ڈالا تھا۔ جیسے بنی اسرائیل کے لیے حکم تھا کہ جس کپڑے پر گندگی یا نجاست لگ جائے تو اُس کا اتنا ٹکڑا پھاڑ کر الگ کر دیا جائے ورنہ وہ کپڑا پاک نہ ہوگا۔ یا جیسے اُن کے لیے زکوٰۃ کی شرح 25٪ تھی۔ یا جیسے اُن کے لیے حلال جانوروں کی چربی کا استعمال حرام تھا، وغیرہ۔

﴿رَبَّنَا وَ لَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ﴾ (286)

اے ہمارے رب! ہم سے وہ بوجھ نہ اُٹھوا جس کے اُٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں۔ ہمیں ایسے احکام کا مکلّف اور پابند نہ بنا جن کی پابندی کرنا ہمارے بس میں نہیں۔ ہمیں ایسی آزمائشوں، امتحانوں، حادثات اور مصائب سے بچا جو ہمارے لیے ناقابل برداشت ہوں۔

گویا ہم تیری اس عنایت اور بشارت پر تیری نعمت کا شکر ادا کرتے ہیں جو تو نے یہ فرمایا ہے کہ:

﴿وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ﴾ (الحج 22:78)

''اور اُس (اللہ) نے دین کے معاملے میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی۔''

﴿وَ اعْفُ عَنَّا وَ اغْفِرْ لَنَا وَ ارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝﴾ (286)

اے ہمارے رب! ہمیں معاف کردے، ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا مالک اور کارساز ہے جس نے ہمیں ایمان اور ہدایت کی توفیق دی۔ کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما! دعوت وتبلیغ کے میدان میں دلائل کے ذریعے اور جہاد وقتال کے معرکے میں فتح وکامیابی کے ساتھ!

ایک اثر میں ہے کہ:

((اِنَّ هٰذِهِ الْاُمَّةَ لَا تُغْلَبُ مِنْ قِلَّةٍ .))

''یہ امت مسلمہ تھوڑی تعداد میں ہونے کے باوجود کبھی مغلوب نہ ہوگی۔''

اوپر کی اِس دعا میں تین باتیں تین باتوں کے مقابل میں ایک خاص ترتیب سے آئی ہیں:

(1) لَا تُؤَاخِذْنَا (تو ہمیں نہ پکڑنا) کے مقابل میں وَاعْفُ عَنَّا (ہمیں معاف کردے) ہے۔

(2) وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْرًا (اور ہم پر بوجھ نہ ڈالنا) کے مقابل میں وَاغْفِرْ لَنَا (اور تو ہمیں بخش دے) آیا ہے۔

(3) وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ (اور ہم سے وہ بوجھ نہ اُٹھوا جو ہم اُٹھا نہیں سکتے) کے مقابل میں وَارْحَمْنَا (اور ہم پر رحم فرما) ہے۔

ضروری ہے کہ یہ دعا محض زبان ہلانے تک محدود نہ رہے بلکہ دل سے نکلے اور اس میں اخلاص ہو، خشوع وخضوع ہو، گریہ زاری ہو اور اس کی قبولیت کا یقین ہو۔

صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِذَا دَعَا اَحَدُكُمْ فَلْيَعْزِمْ فِي الدُّعَاءِ، وَلَا يَقُلْ: اَللّٰهُمَّ! اِنْ شِئْتَ فَاَعْطِنِيْ، فَاِنَّ اللّٰهَ لَا مُسْتَكْرِهَ لَهٗ))

(صحیح مسلم، رقم: 6812)

''تم میں سے جب کوئی دعا مانگے تو پورے یقین کے ساتھ مانگے، اور یوں نہ کہے کہ اے اللہ! اگر تو چاہے تو

مجھے دے..... کیونکہ اللہ تعالیٰ کو کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔''

ایک متفق علیہ حدیث میں ہے کہ:

((لَا يَقُلْ اَحَدُكُمْ: اَللّٰهُمَّ اغْفِرْلِيْ اِنْ شِئْتَ، اِرْحَمْنِيْ اِنْ شِئْتَ، اُرْزُقْنِيْ اِنْ شِئْتَ، وَالْيَعْزِمْ مَسْئَلَتَهٗ، اِنَّهٗ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ، وَلَا مُكْرِهَ لَهٗ))

(صحیح بخاری، رقم: 7464,7477، صحیح مسلم، رقم: 6811,6813)

''تم میں سے کوئی یوں دعا نہ کرے کہ ''اے اللہ! اگر تو چاہے تو مجھے بخش دے۔ یا اگر تو چاہے تو مجھ پر رحم کر۔ یا اگر تو چاہے تو مجھے روزی دے۔ بلکہ اُسے چاہیے کہ پورے عزم اور یقین کے ساتھ دعا مانگے۔ بے شک اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے، اُسے کوئی مجبور کرنے والا نہیں۔''

صحیح حدیث میں سورۂ البقرہ کی اِن آخری دو آیتوں کی یہ فضیلت بیان ہوئی ہے کہ جو شخص رات کو سوتے وقت ان کو پڑھ لے تو یہ اُس کے لیے کافی ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد حاصل ہوگی۔ (صحیح بخاری، رقم: 5009)

سورۃ البقرہ کا اختتام ایک جامع دعا پر ہوا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے مضامین پر ایک تفصیلی نظر ڈال لی جائے۔

تمہیدی طور پر یہ سمجھ لیجیے کہ دعا اصل میں ایک پکار ہے جو کسی عاجز اور بے بس بندے کے دل و زبان سے نکلتی، اُس کے رب تک پہنچتی اور اُس کی رحمت کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

دعا عبادت ہے:

جیسا کہ سورہ الفاتحہ کی تفسیر میں ہم لکھ چکے ہیں کہ دعا ایک عبادت ہے بلکہ عبادت کا مغز ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ دعا صرف اللہ تعالیٰ سے مانگی جا سکتی ہے کسی اور سے دعا کرنا شرک ہے۔

دعا بنیادی ضرورت ہے:

دعا انسان کی بنیادی ضرورت ہے۔ اگر چہ انسان اپنی عقل کے ذریعے بہت سے اسباب و وسائل سے کام لیتا اور اپنی ضرورتیں اور حاجتیں پوری کر لیتا ہے لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اسباب و وسائل یا تو سرے سے ملتے ہی نہیں ہیں یا اگر مل جائیں تو ان سے مطلوبہ نتائج حاصل نہیں ہوتے۔ ایسے حالات میں بندے کو اپنے خالق سے دعا کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے کیونکہ اُس وقت وہ اپنے آپ کو بالکل بے بس اور لاچار پاتا ہے۔

دعا کے فائدے:

دعا سے ہمیں بہت سے فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ دعا ہی ہے جو ہمیں سکون مہیا کرتی ہے۔ ہمیں بیماریوں اور خودکشی (Suicide) کرنے سے بچاتی ہے۔ ہمیں مشکل حالات میں حوصلہ دیتی اور ثابت قدمی عطا کرتی ہے۔ یہ بندے اور اُس کے رب کے درمیان تعلق کو مضبوط کرتی اور قائم رکھتی ہے جس کے نتیجے میں انسان کے دل میں نیا جذبہ، تازہ حوصلہ اور جوش و ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد کوئی مصیبت اُس کے لیے مصیبت نہیں رہتی اور کوئی پریشانی

اُسے پریشان نہیں کر سکتی کیونکہ وہ بندہ اپنے رب کی رحمت کے سائے میں آجاتا ہے۔

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ہمیں دعا مانگنے کا حکم دیا ہے۔(الاعراف 55:7) جو شخص اللہ تعالیٰ سے دعا نہیں کرتا اور اپنی حاجت اُس کے سامنے پیش نہیں کرتا، تو اللہ تعالیٰ اُس سے ناراض ہوتا ہے۔ یہ بات ایک صحیح حدیث سے ثابت ہے۔(ترمذی، رقم: 3373)

دعا کے آداب:

لیکن یاد رکھیے کہ ہر کام کی طرح دعا کے بھی کچھ خاص آداب ہیں جن کے ساتھ اگر دعا کی جائے تو وہ دعا قبول ہو جاتی ہے:

1۔ اپنے گناہوں سے توبہ واستغفار کرنا۔
2۔ صرف اللہ تعالیٰ سے مانگنا۔
3۔ دعا کے شروع میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کرنا اور پھر اپنی حاجت بیان کرنا۔
4۔ دعا سے پہلے اور بعد میں درود شریف پڑھنا۔
5۔ حلال روزی کھانا اور حرام روزی سے بچنا۔
6۔ پوری توجہ، دھیان اور اخلاص کے ساتھ دعا کرنا۔
7۔ اِس عزم ویقین کے ساتھ دعا کرنا کہ میری دعا ضرور قبول ہوگی۔
8۔ عاجزی، انکساری اور گریہ زاری سے دعا کرنا۔
9۔ دعا کے وقت ہاتھ اُٹھانا اور اللہ تعالیٰ کے آگے ہاتھ پھیلا کر سوالیوں کی طرح دعا مانگنا۔
10۔ آہستہ آواز سے چپکے چپکے دعا کرنا۔
11۔ قرآن وحدیث سے ثابت شدہ دعائیں مانگنا۔
12۔ خاص قبولیت کے اوقات میں دعا کرنا جیسے تہجد کے وقت، اذان کے وقت، جمعے کے دن، سفر کی حالت میں اور بارش کے وقت وغیرہ۔

اس دعا کی ترتیب:

سورۂ البقرہ کی اس دعا میں سب سے پہلے ایمان لانے کا ذکر ہے۔اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ دعا سے پہلے ایمان ضروری ہے۔اللہ تعالیٰ اپنے اہل ایمان بندوں کی دعائیں قبول کرتا ہے۔

پھر ایمان کو ذرا وضاحت سے بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ پر، اُس کے فرشتوں پر، اُس کی کتابوں پر، اُس کے تمام نبیوں اور رسولوں پر اور آخرت کے دن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ان سب پر ایمان لانے سے ایمان مکمل ہوتا ہے ورنہ ناقص اور نامکمل رہتا ہے۔ ایمان کے بعد سمع وطاعت کا ذکر ہے کہ بندہ اپنی دعا سے پہلے اللہ تعالیٰ اور اُس کے

رسول ﷺ کے ہر حکم کو ماننے اور اُس پر عمل کرنے کا اقرار کرتا ہے۔ اس طرح وہ اللہ کا ایک فرماں بردار اور اطاعت گزار بندہ بن کر اپنے رب سے دعا کرتا ہے۔

اس کے بعد غُفْرَانَكَ (ہم تجھ سے بخشش چاہتے ہیں) آیا ہے۔ کیونکہ انسان خطا کار ہے (To err is human) اس لیے وہ اللہ تعالیٰ سے اپنی خطاؤں اور اپنے گناہوں کی بخشش چاہتا ہے۔ کیونکہ اُس کے سوا کوئی اور نہیں ہے جو گناہوں کو بخشتا ہو۔ پھر اس کے بعد آخرت کے عقیدے پر زور دیا گیا ہے کہ ایک دن ہم سب کو اپنے اعمال کے حساب کے لیے اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔ اسی فکرِ آخرت اور خوفِ آخرت کے جذبے سے یہ دعا کی جا رہی ہے۔

پھر اس دعا میں اللہ تعالیٰ کے ایک قانون کا ذکر ہے کہ وہ اپنے بندوں پر اُن کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ اُن کو مشکل احکام کا پابند نہیں بناتا۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی خاص رحمت ہے۔

پھر اس کے بعد بندہ اپنے رب سے اپنے اُن گناہوں سے جو غلطی اور بُھول چُوک سے ہو گئے، اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا ہے۔ پھر بندہ اپنے رب سے یہ دعا کرتا ہے کہ وہ اسے سخت احکام کا پابند بنانے کی بجائے آسان احکام اور سہل شریعت دے جس پر آسانی سے عمل ہو سکے۔

پہلی قوموں پر اُن کی سرکشی اور نافرمانی کی وجہ سے اُن کے لیے جو سخت احکام دیے گئے تھے۔ اے اللہ! ہمیں اس طرح کے سخت حکموں کا پابند نہ بنانا۔

اس کے بعد اس دعا میں اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی تفصیلی بخشش مانگی گئی ہے کہ وہ ہمارے ہر قسم کے چھوٹے اور صغیرہ گناہ معاف فرما دے۔ ہم اپنے بڑے اور کبیرہ گناہوں سے توبہ اور استغفار کرتے ہیں۔ ہمارا رب ان کو بھی بخش دے۔ ہر حال میں ہم پر رحم فرمائے۔ ہم پر اپنی برکتیں اور رحمتیں نازل فرمائے۔ ہمیں ہر آفت اور مصیبت سے نجات دے۔ ہمیں دنیا اور آخرت کی ہر بھلائی، نعمت اور سعادت عطا فرمائے۔

سب سے آخر میں کافروں کے مقابلے میں فتح و نصرت کی دعا کی گئی ہے کیونکہ جس زمانے میں یہ سورت نازل ہوئی ہے اُس وقت اہل اسلام چاروں سے ایسے کفار و مشرکین میں گھرے ہوئے تھے جو اسلام کو مٹانے پر تُلے ہوئے تھے۔ جو آگے چل کر مسلمانوں پر جنگ بدر، جنگ اُحد اور جنگ احزاب مسلط کرنے والے تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کو اس دعا کی شدید ضرورت تھی۔ آج بھی اُمتِ مسلمہ کفار کے نرغے میں ہے۔ غیر مسلم قومیں ہمیشہ کی طرح آج بھی مسلمانوں کا نام و نشان مٹانے پر کمر بستہ ہو چکی ہیں اور ہمیں جہاد کی تیاری کے ساتھ ساتھ اس دعا کی بھی سخت ضرورت ہے۔

((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ بِنِعْمَتِهٖ وَبِتَوْفِيْقِهٖ تَتِمُّ الصَّالِحَاتُ))

"(شکر ہے اللہ کا جس کے فضل و احسان اور توفیق سے نیک کاموں کی تکمیل ہوتی ہے۔)"

وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِهٖ وَصَحْبِهٖ اَجْمَعِيْنَ.

✿✿✿✿✿✿

فہرست مضامین تفسیر البلاغ

(سورۃ الفاتحہ تا سورۃ البقرہ)

- اصول ترجمہ وتفسیر ---------- 3
- تفسیر بالرائے سے کیا مراد ہے؟ ---------- 10
- تفسیر بالرائے محمود ---------- 11
- تفسیر بالرائے مذموم ---------- 11
- تفسیر بالرائے مذموم کی بعض صورتیں ---------- 11
- کچھ اس کتاب کے بارے میں ---------- 15

تفسیر بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

- الفاظ کی تحقیق ---------- 17
- نظائر وشواہد (PRECEDENTS) ---------- 18
- تسمیہ اور قرآن ---------- 19
- تسمیہ سے کام کے آغاز میں حکمتیں ---------- 19

تفسیر سورۃ الفاتحہ

- اس کے مختلف نام ---------- 21
- زمانۂ نزول ---------- 21
- مرکزی مضمون ---------- 22
- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر ---------- 23
- 'حمد' کے ایک معنی ---------- 23
- 'حمد' کے دوسرے معنی ---------- 23
- 'رب' کے معنی ---------- 24
- عالمین کے معنی ---------- 24
- خلاصۂ مضمون ---------- 25

- آیات کی تفسیر ---------- 25
- صراطِ مستقیم سے کیا مراد ہے؟ ---------- 31
- سورۃ الفاتحہ کے فضائل ---------- 33
- سورۃ الفاتحہ کے مسائل و احکام ---------- 35

تفسیر سورۃ البقرہ

- اس کا نام ---------- 36
- زمانۂ نزول ---------- 36
- سورۃ البقرہ کے فضائل ---------- 36
- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی تفسیر ---------- 37
- ''حروفِ مقطعات'' کے معنی ---------- 38
- ذٰلِكَ (وہ) کے معنی هٰذَا (یہ) کے بھی ہیں ---------- 38
- الکتاب کا مطلب ---------- 38
- لَا رَیْبَ فِیْهِ کا معانقہ ---------- 39
- لَا رَیْبَ فِیْهِ کی وضاحت ---------- 39
- هُدًى کے معنی ---------- 39
- متقین سے کون لوگ مراد ہیں؟ ---------- 40
- کیا قرآن صرف متقین کے لیے ہدایت ہے؟ ---------- 40
- تقویٰ کے معنی ---------- 40
- متقین کی پہلی صفت ...... ایمان بالغیب ---------- 41
- ایمان بالغیب اندھا ایمان نہیں ہوتا ---------- 41
- متقین کی دوسری صفت ...... نماز قائم کرنا ---------- 42
- اقامتِ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے؟ ---------- 42
- متقین کی تیسری صفت ...... اِنفاق فی سبیل اللہ ---------- 43
- اِنفاق سے کیا مراد ہے؟ ---------- 43
- متقین کی یہ تینوں صفات اجمالی ہیں ---------- 43
- آیت 3 کے بارے میں ایک عمدہ تفسیری قول ---------- 44

- یقین کے معنی ---------- 44
- آیت 4 میں حق پسند اہلِ کتاب کا ذکر ہے ---------- 44
- کفر کے لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 47
- آیت 6 میں قریش کے پکے کافروں کا ذکر ہے ---------- 49
- دل پر مُہر لگنے سے کیا مراد ہے؟ ---------- 49
- اس بارے میں ایک حدیث ---------- 50
- آیت 8 میں جن منافقین کا ذکر ہے اُس سے عام اہل کتاب کے منافق لوگ مراد ہیں ---------- 52
- ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت سے کیا مراد ہے؟ ---------- 54
- فِیْ قُلُوْبِہِمْ مَّرَضٌ کا مطلب ---------- 55
- فساد فی الارض سے کیا مراد ہے؟ ---------- 56
- آیت 14 میں 'شیاطین' سے مراد کفار و یہود کے سردار ہیں ---------- 57
- آیت 15 میں قرآن کا ایک اسلوب ''مشاکلہ'' ---------- 58
- 'طغیان' کے معنی ---------- 58
- یَعْمَهُوْنَ کے معنی ---------- 58
- عرب یہودیوں کی اکثریت نے اسلام قبول نہیں کیا تھا ---------- 59
- آیت 18 میں بلاغت کا ایک نکتہ ---------- 59
- 'صَیِّبٌ' کے معنی ---------- 60
- 'صَوَاعِقُ' کے معنی ---------- 60
- آیت 19 میں بارش سے مراد اسلام کی دعوت ہے ---------- 60
- سب کا خالق ایک ہے تو معبود بھی ایک ہی ہے ---------- 62
- مشرکینِ عرب بھی اللہ کو خالق مانتے تھے ---------- 62
- 'بِنَاۗءً' کے معنی ---------- 62
- 'اَنْدَادًا' کے معنی ---------- 62
- قرآن مجید کا چیلنج ---------- 63
- اعجاز القرآن اور اُس کے مختلف پہلو ---------- 65
- 'اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ' کے معنی ---------- 69

- جنت کی نعمتوں اور جنتیوں کے بارے میں احادیث ---------- 69
- "مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ" کا مطلب ---------- 69
- ضرب المثل (مثال دینے) سے کیا مراد ہے؟ ---------- 72
- 'فاسقین' کے لغوی اور اصطلاحی معنی ---------- 72
- فاسقین کی چند نشانیاں ---------- 73
- خالق کا انکار ممکن نہیں ہے ---------- 74
- شرک کرنا انسانیت کی توہین ہے ---------- 75
- فرشتے محض قوتیں نہیں ہیں بلکہ انسانوں کی طرح ایک مستقل مخلوق ہے ---------- 78
- خلیفہ کے معنی ---------- 78
- "علم اسماء" سے کیا مراد ہے؟ ---------- 80
- علم کو عبادت پر فضیلت حاصل ہے ---------- 80
- تعظیمی سجدہ ---------- 81
- ابلیس جن تھا فرشتہ نہ تھا ---------- 82
- آدم سے حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں نہ کہ نوعِ انسانی ---------- 83
- آدم علیہ السلام کی غلطی اُن کو نبوت ملنے سے پہلے ہوئی تھی ---------- 84
- آدم علیہ السلام کی توبہ ---------- 85
- "لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ" کے الفاظ سے جنت مراد ہوتی ہے ---------- 86
- قصۂ آدم علیہ السلام وابلیس میں حکمتیں ---------- 86
- بنی اسرائیل سے خطاب ---------- 88
- نِعْمَتِيَ (میری نعمت) کا مطلب ہے "میری نعمتیں" ---------- 88
- یہودی قوم بدعہد اور عہد شکن ہے ---------- 89
- قصۂ بنی اسرائیل بیان کرنے کے مقاصد ---------- 90
- مُصَدِّقًا کے معنی ---------- 90
- یہودی علماء حق بات کو چھپاتے تھے ---------- 92
- دین میں نماز کی اہمیت ---------- 92
- قول وفعل میں تضاد ---------- 93

- مشکل حالات میں نماز اور صبر سے کام لو ---------- 94
- صبر کے معنی ---------- 94
- "یَظُنُّوْنَ" کے معنی ---------- 95
- بنی اسرائیل کو آخرت کے حساب سے ڈرایا گیا ---------- 100
- بنی اسرائیل پر فرعونیوں کے مظالم ---------- 101
- بنی اسرائیل پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور احسانات ---------- 102
- موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ......عصا مارنے سے سمندر میں راستہ بن گیا ---------- 102
- بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پوجا کی ---------- 103
- بنی اسرائیل کی شریعت میں بھی مرتد کی سزا قتل تھی ---------- 105
- بنی اسرائیل کے لیے من وسلویٰ ---------- 106
- موسیٰ علیہ السلام کا ایک اور معجزہ......عصا مارنے سے پانی کے بارہ چشمے پھوٹ نکلے ---------- 109
- بنی اسرائیل کی ناشکری ---------- 110
- آخرت کی نجات کا دار و مدار صرف اور صرف ایمان اور عملِ صالح پر ہے ---------- 112
- حضرت محمد ﷺ کی نبوت پر ایمان لائے بغیر اہلِ کتاب کے لیے نجات نہیں ---------- 113
- بنی اسرائیل سے توریت کی پابندی کا عہد زبردستی نہیں لیا گیا تھا ---------- 115
- بنی اسرائیل نے ہفتے کے دن (سَبْت) کی بے حرمتی کی تو اُن کو بندر بنا دیا گیا ---------- 117
- بنی اسرائیل کو گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ---------- 120
- گائے ذبح کرنے کے حکم کی حکمت ---------- 123
- دین میں فضول سوالات کرنے کی ممانعت ---------- 123
- بنی اسرائیل کے دل پتھروں سے زیادہ سخت ہو گئے ---------- 126
- یہود کے اَن پڑھ لوگوں کی مذہبی غلط فہمیاں ---------- 129
- یہودی علماء کی دین فروشی ---------- 130
- اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے چند باتوں کا عہد لیا ---------- 132
- بنی اسرائیل کی عہد شکنی ---------- 134
- بنی اسرائیل نے نبیوں اور رسولوں کو قتل کیا ---------- 140
- عیسیٰ علیہ السلام کو جبریل علیہ السلام کی تائید حاصل ہونے کا مطلب ---------- 140

- بعض لوگوں کا یہ غلط دعویٰ کہ کوئی رسول کبھی قتل نہیں ہوا ---- 142
- یہود کا حسد اور تعصب ---- 143
- یہود کو قرآن نے ایک چیلنج دیا جس کا وہ جواب نہ دے سکے ---- 145
- ہزار برس جینے کا محاورہ اور استعارہ ---- 146
- جبرئیل علیہ السلام سے یہود کی دشمنی اور اس کا انجام ---- 148
- ہاروت ماروت کا قصہ ---- 151
- حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہود نے جادوگر کہا ---- 151
- جادوگری کے بارے میں چند قابلِ غور باتیں ---- 151
- جادو کرنا کفر ہے اور اسلام میں جادوگر کی سزا قتل ہے ---- 151
- نبی ﷺ کی شان میں یہودیوں کی ایک گستاخی ---- 155
- ناسخ ومنسوخ احکام کی حقیقت ---- 156
- دین کے بارے میں فضول سوالات کرنا منع ہے ---- 158
- مدینے کے یہودی قبائل سے مسلمانوں کا سلوک ---- 159
- دین میں نماز اور زکوٰۃ کی اہمیت ---- 160
- آخرت میں نجات پانے کا صحیح معیار ---- 160
- یہودیوں اور عیسائیوں کے باہمی اختلاف ---- 161
- عبادت گاہوں کو گرانا ظلم ہے ---- 163
- اللہ تعالیٰ کی اولاد نہیں ہے ---- 165
- مشرکین عرب کی ایک غلط فرمائش ---- 166
- یہود ونصاریٰ مسلمانوں سے کبھی راضی نہیں ہوں گے ---- 168
- اہل کتاب کے حق پرست لوگوں کا ذکر ---- 168
- ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ اور اس کی حکمت ---- 173
- خانہ کعبہ کی تعمیر نو ---- 174
- ابراہیم علیہ السلام کی دعا ---- 174
- نبی ﷺ کی بعثت کی اہم ذمہ داریاں ---- 176
- تفریق بین الرسل غلط ہے کہ بعض رسولوں اور نبیوں کو مانا جائے اور بعض کا انکار کیا جائے ---- 184

- ملتِ ابراہیمی کے سچے اور جھوٹے دعوے دار کون ہیں؟ ---- 184
- آیت 137 سے تعاملِ صحابہ اور اجماعِ امت کا حجت ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ---- 185
- "صِبْغَةَ اللّٰهِ" (اللہ کا رنگ) سے کیا مراد ہے؟ ---- 185
- اہل کتاب کا کتمانِ حق یعنی حق کو چھپانا ---- 186
- تحویلِ قبلہ کا حکم ---- 188
- اُمَّةً وَّسَطًا سے کیا مراد ہے؟ ---- 189
- شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (لوگوں پر گواہ) کا مطلب ---- 189
- آیت 143 میں نماز کو ایمان قرار دیا گیا ہے ---- 190
- خواہشات کے پیچھے چلنا دین داری نہیں ہے ---- 193
- رسول اللہ ﷺ کی بعثت عظیم نعمت ہے ---- 197
- ایک متفق علیہ حدیث قدسی ---- 197
- شکر کرنے اور ناشکری نہ کرنے کا حکم ---- 198
- شہیدوں کو مردہ نہ کہا جائے ---- 200
- اہل ایمان کے لیے آزمائشوں کا ذکر ---- 201
- انبیائے کرام کے لیے آزمائش ---- 201
- حدیثِ خباب رضی اللہ عنہ ---- 202
- مصیبت کے وقت إِنَّا لِلّٰهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ پڑھنا چاہیے ---- 203
- رسول اللہ ﷺ اپنے صاحبزادے ابراہیم کی وفات پر روئے تھے ---- 203
- صفا اور مروہ اللہ تعالیٰ کے شعائر (نشانیوں) میں سے ہیں ---- 205
- صفا اور مروہ کے درمیان سعی کا واجب ہونا سنت سے ثابت ہے ---- 206
- حق بات یا علمِ وحی کو چھپانا بہت بڑا گناہ ہے ---- 208
- توبہ کی ترغیب ---- 209
- اصل معبود صرف ایک ہے اور وہ اللہ تعالیٰ ہے ---- 212
- توحید کے عقلی دلائل ---- 212
- اہل ایمان سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرتے ہیں ---- 213
- مشرک لوگ دوزخ میں جائیں گے ---- 214

❀ حلال روزی کھانے کا حکم ---------- 216
❀ اسلام میں حلال وحرام کا ضابطہ ---------- 216
❀ باپ دادا کی اندھی تقلید کی مذمت ---------- 218
❀ جائز تقلید کون سی ہے؟ ---------- 218
❀ مجتہد کے لیے کسی کی تقلید جائز نہیں ---------- 218
❀ عام آدمی کسی صاحب علم سے مسئلہ پوچھ کر اُس کے مطابق عمل کرسکتا ہے ---------- 218
❀ حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے اور اس پر شکر کرنے کا حکم ---------- 221
❀ وہی چیزیں حرام ہیں جو جسمانی یا روحانی طور پر مضر ہیں ---------- 222
❀ چار حرام چیزوں کا ذکر ---------- 222
❀ شریعت میں صرف چار چیزیں حرام نہیں ہیں ---------- 223
❀ ''فطرت'' یا ''بیانِ فطرت'' سے کوئی چیز حلال یا حرام نہیں ہوتی ---------- 223
❀ یہ رخصت کہ مجبوری اور جان کے خطرے کی صورت میں حرام بھی بقدرِ ضرورت حلال ہو جاتا ہے ---------- 224
❀ علمائے سوء کا کردار ---------- 224
❀ حق چھپانے کی آخرت میں سزا ---------- 224
❀ فقہی اور مذہبی اختلاف کو دور کرنے کا طریقہ ---------- 225
❀ آیت بِرّ اور نیکی کا جامع تصور ---------- 228
❀ قصاص اور دیت کے بارے میں حکم ---------- 232
❀ قصاص میں زندگی ہے ---------- 233
❀ وصیت کا عارضی حکم ---------- 235
❀ ہر ناجائز وصیت کی اصلاح کر لینا درست ہے ---------- 235
❀ ''یُطِیْقُوْنَہٗ'' کا مطلب ---------- 238
❀ روزے کی فرضیت کا حکم ---------- 240
❀ بیمار اور مسافر روزہ قضا کر کے بعد میں ادا کرسکتا ہے ---------- 240
❀ قرآن مجید رمضان المبارک میں نازل ہونا شروع ہوا ---------- 241
❀ دین میں آسانی رکھی گئی ہے ---------- 242
❀ اللہ تعالیٰ اتنا قریب ہے کہ ہر دعا سنتا ہے ---------- 243

- دعا کی قبولیت کے لیے اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری ضروری ہے ---------- 244
- میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے لباس کی طرح ہیں ---------- 244
- رمضان المبارک کی راتوں میں ازدواجی تعلق جائز ہے ---------- 244
- اِلَى اللَّيْلِ (رات تک) کا کیا مطلب ہے؟ ---------- 245
- عورت کے لیے مسجد میں اعتکاف ضروری نہیں ---------- 246
- رشوت اور باطل طریقوں کی کمائی حرام ہے ---------- 248
- اَهِلَّةٌ (نئے چاندوں) سے مراد حرمت والے مہینے نہیں ہیں ---------- 251
- لفظ "فتنہ" کے ایک معنی "کسی کو مذہب بدلنے کے لیے مجبور کرنے" کے ہیں ---------- 251
- رویتِ ہلال ---------- 252
- قمری کیلنڈر ہی قدرتی کیلنڈر ہے ---------- 253
- نمازوں کا تعلق سورج کے طلوع وغروب سے ہے ---------- 253
- حج سے متعلق دور جاہلیت کی ایک بری رسم اور بدعت ---------- 254
- دفاعی جنگ کی اجازت ---------- 255
- جنگ کا ضابطۂ اخلاق ---------- 256
- جہاد کا اصل مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہے ---------- 256
- "عُدْوَانَ" کے معنی تادیبی (جوابی) کاروائی کے بھی ہیں ---------- 256
- انفاق فی سبیل اللہ نہ کرنے میں ہلاکت ہے ---------- 258
- حج اور عمرہ پورا کرنے کا حکم ---------- 259
- حج اور عمرے سے متعلق بعض احکامات ---------- 259
- "تَزَوَّدُوْا" کا صحیح مفہوم ---------- 264
- ایک جامع دعا ---------- 268
- منافق شخص کا کردار ---------- 271
- مخلص مسلمان کا کردار ---------- 271
- بعض حالات میں فدائی حملہ جائز ہے ---------- 272
- اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ ---------- 274
- مسلمانوں کے زوال کا بڑا سبب جزوی اسلام پر عمل کرنا ہے ---------- 275

- بندے کو اپنے گناہوں سے جلد توبہ کر لینی چاہیے ---- 275
- ناشکری کی سزا ---- 277
- مسلمانوں کے لیے ایک بڑا سبق ---- 277
- مال و دولت کامیابی کا معیار نہیں ہے ---- 277
- انسانیت کی ابتدا شرک سے نہیں توحید سے ہوئی ہے ---- 278
- راہِ حق کی مشکلات ---- 280
- آیت 214 میں لف ونشر غیر مرتب ہے ---- 280
- جہاد کی فرضیت اور اس کے فائدے ---- 283
- حرمت والے مہینوں میں لڑائی کے بارے میں حکم ---- 284
- اسلامی شریعت میں مُرتد کی سزا قتل ہے ---- 286
- اس سزا کے عقلی دلائل ---- 289
- شراب اور جوئے کے بارے میں ابتدائی حکم ---- 294
- اللہ کی راہ میں کتنا مال خرچ کیا جائے؟ ---- 295
- یتیموں سے حسن سلوک ---- 296
- مشرک مرد یا عورت سے نکاح حرام ہے ---- 297
- قرآن میں ہر جگہ "مشرکین" سے عرب کے مشرکین مراد نہیں ہیں ---- 298
- غیر مسلموں سے مسلمانوں کا نکاح جائز نہیں ---- 299
- حیض کے بارے میں احکام ---- 302
- نکاح کا اصل مقصد ---- 303
- خاندانی منصوبہ بندی یا بہبود آبادی قرآن کے خلاف ہے ---- 303
- غلط قسمیں نہ کھاؤ ---- 304
- اِیلاء کے بارے میں اسلامی حکم ---- 305
- طلاق یافتہ عورت کی عدت ---- 306
- مردوں کو عورتوں کی سربراہی کا درجہ حاصل ہے ---- 307
- طلاق دینے کا صحیح طریقہ ---- 310
- طلاق سے متعلق بعض احکام ---- 310

- ایک مجلس میں تین طلاقوں کا مسئلہ اجماعی نہیں ہے ---------- 311
- خلع کے بارے میں حکم ---------- 312
- 'حلالہ' حرام ہے ---------- 314
- طلاق یافتہ عورت نکاح ثانی کر سکتی ہے ---------- 317
- نکاح میں ولی کا ہونا ---------- 318
- رضاعت کی مدت ---------- 319
- رضاعت کے بارے میں چند احکام ---------- 319
- بیوہ کی عدت ---------- 320
- عدت کی حالت میں عورت پر پابندیاں ---------- 320
- ایک غلط فہمی کا ازالہ ---------- 321
- بیوہ کا نکاحِ ثانی ---------- 321
- حق مہر کے بارے میں احکام ---------- 323
- "اَلصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی" (درمیانی نماز) سے نمازِ عصر مراد ہے ---------- 325
- قرآن کا ایک اسلوب ---------- 326
- "قُوْمُوْا لِلّٰہِ قٰنِتِیْنَ" کا شانِ نزول ---------- 326
- نمازِ خوف کا ذکر ---------- 326
- بیواؤں کے نان ونفقہ کے لیے ابتدائی عارضی حکم ---------- 327
- مطلقہ عورت کو کچھ دے دلا کر رخصت کرنے کا حکم دیا گیا ہے ---------- 328
- "اَلَمْ تَرَ" کا قرآنی اسلوب اور اس کا مطلب ---------- 329
- آیت 243 کی صحیح تاویل ---------- 330
- جہاد کا حکم ---------- 331
- اسلام اور جہاد وقتال پر تفصیلی بحث ---------- 332
- جہاد کا مقصد ---------- 333
- کیا جہاد کے لیے مسلمانوں کی حکومت کا اعلان شرط ہے؟ ---------- 334
- قرآن اور جہاد ---------- 334
- احادیث اور جہاد ---------- 339

- شہید کے فضائل ---------- 346
- سموئیل علیہ السلام کا واقعہ ---------- 351
- قیادت کا اسلامی معیار ---------- 352
- طالوت کی سرگردگی میں بنی اسرائیل کا جہاد کرنا ---------- 352
- چھوٹے لشکر بھی بڑے لشکروں پر فتح پا سکتے ہیں ---------- 353
- مجاہدین کی دعا ---------- 353
- داؤد علیہ السلام نے جالوت (کافر بادشاہ) کو قتل کیا ---------- 354
- داؤد علیہ السلام کا ایک تعارف ---------- 354
- قوموں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ایک قانون ---------- 354
- حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی ایک دلیل ---------- 355
- بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت حاصل ہے ---------- 357
- تمام نبیوں پر ایمان لانا ضروری ہے ---------- 357
- ایمان اور کفر کا ہونا اللہ کی مشیت سے ہے ---------- 360
- صدقہ کرنے کی ترغیب اور حکم ---------- 362
- آیت الکرسی اور اس کی فضیلت ---------- 363
- کسی شخص کو زبردستی مسلمان بنانا جائز نہیں ---------- 366
- مجرم کو اُس کے جرم پر سزا ہوگی ---------- 366
- اللہ پر ایمان لانے سے پہلے شیطان اور طاغوت سے سرکشی اور بغاوت ضروری ہے ---------- 366
- اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا دوست، مددگار اور کارساز ہے ---------- 367
- ''نورٌ'' واحد کے مقابل میں ظُلُمَاتٌ جمع کیوں ہے؟ ---------- 367
- ایک حدیث کے ذریعے صراطِ مستقیم کی وضاحت ---------- 367
- آیت 258 میں اَلَمْ تَرَ کا (اَ) استفہام انکاری ہے ---------- 368
- ہدایت اور اور گمراہی کا ایک نمونہ...... ابراہیم علیہ السلام اور نمرود ---------- 369
- انبیائے کرام کا طریقۂ دعوت وتبلیغ مجادلہ ہے نہ کہ مناظرہ ---------- 370
- حضرت عزیر علیہ السلام اور اُجڑی بستی کا واقعہ ---------- 372
- علم الیقین اور عین الیقین ---------- 373

- ابراہیم علیہ السلام اور چار پرندوں کا واقعہ ---------- 374
- انبیائے کرام اور فلسفیوں کے علم میں بنیادی فرق ---------- 374
- صدقے کا ثواب ---------- 376
- ایک نیکی کا بدلہ سات سو (700) نیکیاں ---------- 376
- صدقہ دینے کے آداب ---------- 377
- احسان کرنے اور ستانے سے صدقے کا ثواب ضائع ہو جاتا ہے ---------- 379
- ریاکاری اور دکھاوے سے کیے ہوئے صدقے کی پہلی مثال ---------- 380
- اخلاص اور نیک نیتی سے کیے ہوئے صدقے کی مثال ---------- 382
- ریاکاری اور دکھاوے سے کیے ہوئے صدقے کی دوسری مثال ---------- 383
- حلال کمائی سے صدقہ کیا جائے ---------- 384
- عُشر کے بارے میں حکم ---------- 385
- آیت 268 میں یَعِدُکُمْ کے معنی وعید اور ڈرانے کے ہیں ---------- 385
- آیت 268 میں "اَلْفَحْشَآءُ" کے معنی "بخل" ہیں ---------- 386
- لفظ "حکمت" کی وضاحت ---------- 387
- انفاق کے بارے میں ایک حدیث ---------- 387
- قرآن کا ایک اسلوب "مقابلہ" ---------- 387
- حکمت کے معنی فلسفہ مراد لینا درست نہیں ---------- 387
- "نذر" کیا ہوتی ہے ---------- 388
- "نذر" کی شرعی حیثیت ---------- 389
- فرض صدقے اور عبادت میں اظہار افضل ہے اور نفلی صدقے اور عبادت میں اِخفا بہتر ہے ---------- 389
- لفظ "سِیْمَا" کے معنی علامت اور نشانی کے ہیں۔ اس سے چہرہ مراد لینا درست نہیں ہے۔ ---------- 392
- "لَا یَسْئَلُوْنَ" سے سوال کی نفی مراد ہے، یہ شرط نہیں ہے ---------- 392
- نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کام دعوت و تبلیغ ہے، آگے ایمان کی توفیق اللہ تعالیٰ دیتا ہے ---------- 393
- صدقے کے خصوصی حق دار لوگ کون ہیں؟ ---------- 394
- اصل مسکین کون ہے؟ ---------- 395
- انفاق فی سبیل اللہ کرنے سے جنت ملے گی ---------- 396

❁ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مثالی صدقہ ---------- 396

❁ ''رِبا'' (سود) کے لفظی اور اصطلاحی معنی ---------- 397

❁ قرآن کا ایک اور اُسلوب ---------- 398

❁ سود خوار کی ذہنی کیفیت کی تمثیل ---------- 398

❁ سود حرام ہے اور تجارت حلال ہے ---------- 399

❁ تجارت اور سود میں فرق ---------- 399

❁ خلود فی النار (دوزخ میں ہمیشہ رہنے) کا ایک مطلب طویل مدت بھی ہے ---------- 400

❁ سود کے مال میں برکت نہیں ہوتی ---------- 400

❁ قرآن کا ایک اُسلوب...... عام کے بعد خاص کا ذکر ---------- 401

❁ تقویٰ اختیار کرنے کا حکم ---------- 402

❁ سود کھانا اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلانِ جنگ کرنا ہے ---------- 403

❁ سود کا بقایا چھوڑ دینے کا حکم ---------- 403

❁ تنگ دست مقروض کو مہلت دی جائے ---------- 403

❁ قرض معاف کر دینا بہتر ہے ---------- 403

❁ سود کی حرمت ---------- 403

❁ سود کبیرہ گناہ ہے بلکہ سات مہلک ترین گناہوں میں سے ہے ---------- 404

❁ توریت میں سود کی حرمت ---------- 405

❁ رِبا النسیہ اور ربا الفضل ---------- 405

❁ رِبا کی تعریف (DEFINITION) ---------- 405

❁ ہر قسم کا سود حرام ہے خواہ صرفی اور ذاتی ضرورت کے لیے ہو یا تجارتی غرض کے لیے ---------- 406

❁ دارالحرب میں بھی سود لینا جائز نہیں ---------- 407

❁ سود کی خرابیاں ---------- 407

❁ سود کی اخلاقی خرابیاں ---------- 407

❁ سود کی معاشرتی خرابیاں ---------- 408

❁ سود کی معاشی خرابیاں ---------- 408

❁ قرض کے لین دین کے بارے میں تفصیلی احکام ---------- 412

- مالی معاملات میں دو مردوں کی گواہی یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کا نصاب شہادت ہے ---------- 413
- خرید وفروخت کے کسی بڑے معاملے پر گواہ بنا لینا پسندیدہ اور مستحب ہے ---------- 414
- اسلام میں عورت کی گواہی پر تفصیلی بحث ---------- 414
- آیت 283 میں امانت کا لفظ قرض کے معنوں میں ہے نہ کہ رہن کی چیز کے بارے میں ---------- 416
- سفر میں رہن کا حکم ---------- 417
- حضر اور مقیم ہونے کی حالت میں بھی رہن رکھنے کی اجازت ہے ---------- 417
- گواہی کو چھپانا گناہ ہے ---------- 417
- برائی کا ارادہ کرنے پر پکڑ نہ ہوگی ---------- 420
- نیکی کے ثواب اور برائی کے گناہ کے بارے میں ایک جامع صحیح حدیث ---------- 420
- رسول اللہ ﷺ بھی اللہ تعالیٰ کے احکام کے پابند اور مکلف تھے ---------- 423
- اللہ تعالیٰ کسی شخص پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ---------- 424
- کَسَبَتْ اور اِکْتَسَبَتْ کا معنوی فرق ---------- 424
- خطا اور بھول چوک کے معاف ہونے کا تعلق آخرت سے ہے، دنیا سے نہیں ہے ---------- 425
- بنی اسرائیل کو اُن کی سرکشی کی وجہ سے سخت شریعت دی گئی ---------- 425
- قرآن کی ایک جامع دعا ---------- 425
- اِس دعا میں تین باتیں تین چیزوں کے مقابل آئی ہیں ---------- 426
- دعا کے آداب ---------- 426
- قبولیتِ دعا کے بارے میں ایک صحیح حدیث ---------- 426
- سورۃ البقرہ کی آخری دو آیتوں کی فضیلت ---------- 427

اِشاریہ مضامین قرآن مجید

(سورۃ الفاتحہ تا سورۃ البقرہ) مع سورت نمبر اور آیت نمبر

(ا)

آدم علیہ السلام (البقرہ2:31)
آزمائش (البقرہ2:155 تا 157)
ابلیس (دیکھیے ''شیطان'')
احسان (البقرہ2:195)
احسان جتلانا (البقرہ2:246,262)
اسلام (البقرہ2:208)
ابراہیم علیہ السلام (البقرہ2:124)
اُدھار (دیکھیے ''قرض'')
اِرتداد (دیکھیے ''مُرتد'')
اسماعیل علیہ السلام (البقرہ2:136)
اعتکاف (البقرہ2:187,125)
اللہ تعالیٰ (الفاتحہ1:1، البقرہ2:255)
اللہ کی عبادت (البقرہ2:21)
امتحان (دیکھیے ''آزمائش'')
اُمت مسلمہ (البقرہ2:143,128)
اولاد (البقرہ2:233)
اہل کتاب (البقرہ2:109)
ایلاء (البقرہ2:226)

(ب)

بادل (البقرہ2:164)
بارش (البقرہ2:146)
بنی اسرائیل (2:40)
بیت اللہ (البقرہ2:125)
تقویٰ (البقرہ2:197)
توحید (البقرہ2:163)

(ج)

جادو (البقرہ2:102)
جالوت (البقرہ2:249)
جبرائیل علیہ السلام (البقرہ2:98,97,87)
جلاوطنی (البقرہ2:85)
جوا (البقرہ2:219)
جہاد (البقرہ2:216)

(خ)

خلافت (البقرہ2:30)
خلع (البقرہ2:229)
خیرات (دیکھیے ''صدقہ'')

(د)

دانائی (البقرہ2:269)
درگزر (دیکھیے ''عفو'')

دعا (البقرہ 2:186)

(ذ)

ذکر الٰہی (البقرہ 2:152)

(ر)

رِبا (دیکھیے ''سُود'')
رشوت (البقرہ 2:188)
رضاعت (البقرہ 2:233)
رمضان المبارک (البقرہ 2:185)
روح القدس (البقرہ 2:87)
روزہ (البقرہ 2:183)
رہن (البقرہ 2:283)
ریا کاری (البقرہ 2:264)

(س)

سَبْت (البقرہ 2:65)
سوال (دیکھیے ''فضول سوالات'')

(ش)

شراب (البقرہ 2:219)
شکر (البقرہ 2:152)
شہید (البقرہ 2:154)
شیطان (البقرہ 2:34,203,268)

(ص)

صابی (البقرہ 2:62)
صبر (البقرہ 2:153)
صدقہ وخیرات (البقرہ 2:261 تا 265,276)
صراط مستقیم (الفاتحہ 1)
صفاومروہ (البقرہ 2:153)
صلوٰۃ (البقرہ 2:3,153,238)
صوم (دیکھیے ''روزہ'')

(ط)

طاغوت (البقرہ 2:256)
طالوت (البقرہ 2:247)
طلاق (البقرہ 2:226 تا 232)
طُور (البقرہ 2:63,93)

(ع)

عِدت (البقرہ 2:231,234)
عرفات (البقرہ 2:198)
عفوو درگزر (2:234)
عمرہ (البقرہ 2:196)

(ف)

فاسق (البقرہ 2:99)
فتنہ (البقرہ 2:103,191,193,217)

فرشتے (البقرہ 2:102,177)

فرعون (البقرہ 2:49,50)

فضول سوالات (البقرہ 2:108)

(ق)

قبلہ (البقرہ 2:143 تا 145)

قرآن (البقرہ 2:185)

قرض (البقرہ 2:282)

قسم اٹھانا (البقرہ 2:225)

قصاص (البقرہ 2:178,179)

(گ)

گروی (دیکھیے ''رہن'')

(ل)

لعنت (البقرہ 2:88)

(م)

مرتد (البقرہ 2:217)

مسافر (البقرہ 2:177)

مسجد حرام (البقرہ 2:150)

مقروض (البقرہ 2:280,282,283)

منافق (البقرہ 2:8,20)

من وسلویٰ (البقرہ 2:57)

موسیٰ علیہ السلام (البقرہ 2:54)

(ن)

ناشکری (البقرہ 2:152)

نذر (البقرہ 2:270)

نصاریٰ (البقرہ 2:62,113)

نعمت (البقرہ 2:150,151)

نکاح (البقرہ 2:221)

نماز (البقرہ 2:3,153,238)

نیکی (البقرہ 2:177)

(و)

وصیت (البقرہ 2:180,181)

(ہ)

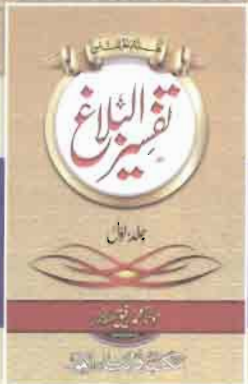
ہجرت (البقرہ 2:218)

ہدایت (الفاتحہ 1)

(ی)

یعقوب علیہ السلام (البقرہ 2:132)

یہود (البقرہ 2:131,120)



تفسیر البلاغ کی چند نمایاں خصوصیات

مفسر: مولانا محمد رفیق حفظہ اللہ تعالیٰ

- یہ تفسیر آسان اور عام فہم اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔
- اس میں قرآنی / مشکل الفاظ کے معانی اور اُن کی تشریح الگ سے کی گئی ہے۔
- اس میں تفسیر کے علاوہ آیات کے نظائر وشواہد (precedents) دیے گئے ہیں کیونکہ قرآن اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔
- اس میں صحیح احادیث کے مکمل حوالے جابجا ملتے ہیں۔
- یہ تفسیر اجماعِ امت اور دینی مسلّمات کے بالکل مطابق ہے۔
- اس میں قرآنی احکام کی تفسیر کرتے ہوئے تمام مسالک کا لحاظ رکھا گیا ہے۔
- اس میں متجددِ دین، منکرینِ حدیث اور دوسرے گمراہ طبقوں کی غلط تاویلوں کا محاسبہ کیا گیا ہے
- اس میں دورِ جدید کی ضروریات اور نئے مسائل کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے۔
- یہ تفسیر قدیم وجدید دونوں طرح کے اسلوبوں کا حسین امتزاج ہے۔
- اس کے مخاطبین میں جدید تعلیم یافتہ اور دینی طبقہ دونوں شامل ہیں۔

NooN Printers 0321-4167895-4503606

مکتبہ قرآنیات لاہور

A-3 یوسف مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار لاہور

0321-7724032, 0333-4399812